اسیرِخواب
ایم الیاس

شکیلہ ایک لمحے کے لئے جیسے پتھر کی بن کر رہ گئی تھی۔ وہ جس جگہ کھڑی تھی کسی مورتی کی طرح کھڑی رہ گئی تھی۔ اس کا نازک بدن سُن ہو رہا تھا اور جامد و ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دل کی حرکت بند ہوئی جا رہی ہے۔ صبیحہ نے اُسے ابھی ابھی جو خبر سنائی تھی اس خبر کی وحشت ناکی نے اس کی نس نس سے جیسے ایک ایک قطرہ خون نچوڑ لیا تھا۔ وہ اپنی منجمد اور وحشت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے صبیحہ کو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ وہ جس حیرت و صدمے سے گزر رہی تھی اس کا اندازہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ صدمہ اس پر اس قدر بھاری ہو رہا تھا کہ وہ اپنی پلکیں جھپکانا بھی بھول گئی تھی۔ اس نے بولنے کی کوشش کی تو ایسا لگا کہ سینہ اس کی آواز کا ساتھ نہیں دے رہا ہے اور پھر اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا ہے۔ پھر اس نے اس خبر کو اپنی سماعت کا فتور سمجھ کر جھٹک دینا چاہا مگر یہ اس کے لئے اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ چند لمحوں بعد خود پر قابو پاتے ہوئے ہونٹوں کو دانتوں سے چباتے ہوئے بولی۔ ”تم مذاق تو نہیں کر رہی ہو صبیحہ!“

”مذاق؟“ صبیحہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ ”میں اور تم سے اس معاملے میں مذاق کروں گی‘ اس میں مذاق کی کیا بات ہے؟ تم میرے بارے میں اچھی طرح واقف ہو بلکہ میری رگ رگ جانتی ہو۔ میں تمہاری آج کی نہیں بچپن کی سہیلی ہوں۔ ایک عزیز از جان دوست ہوں۔ ہم ایک جان دو قالب ہیں اور پھر ہم دونوں کے مزاج میں ایک واضح اور نمایاں فرق ہے۔ تم شوخ مزاج ہو اور میں بے حد سنجیدہ ہوں۔ سوچ اور خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس تضاد کے باوجود ہم دونوں کی دوستی برابر پروان چڑھتی رہی ہے۔ میں نے تم سے کبھی کسی لمحے فضول مذاق نہیں کیا جبکہ عموماً گہری سہیلیاں آپس میں ایک دوسرے سے مذاق کرتی رہتی ہیں اور پھر میں تم سے ایسا مذاق کیوں کرنے لگوں جس سے تمہارے دل پر بجلی کا سا جھٹکا لگے۔ میں تمہارے چہرے سے یہ محسوس کر رہی ہوں کہ اس خبر نے تمہیں ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ خبر

تمہاری امی نے مجھے کل ہی سنائی ہے۔ شاید وہ یہ بات میرے ذریعے سے تم تک پہنچانے کے لئے میرے گھر آئی تھیں۔ وہ شاید چاہتی ہیں کہ تمہیں بھی علم ہو جائے کہ تمہارے لئے ارشد بھائی کا رشتہ آیا ہے اور انہیں یہ رشتہ منظور ہے۔"

صبیحہ نے بغیر کسی توقف کے اس سے ایک ہی سانس میں کہہ دیا تھا مگر اسے ایسا لگ رہا تھا کہ سارا کمرہ چکرا رہا ہو۔ دل میں کوئی چیز چبھی جا رہی ہو۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ صبیحہ کے شانوں پر رکھ کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ارشد کا رشتہ میرے لئے آیا اور اسے منظور بھی کر لیا گیا؟" اس کی آواز گلے میں رندھ گئی تھی۔ "کیا امی کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا؟ کیا ابو کو ان کی بیٹی پیاری نہیں رہی؟ کیا......... کیا میں کوئی سوتیلی بیٹی ہوں؟ کیا میں اس قابل ہوں کہ وہ مجھے اپنے ہاتھوں سے جہنم میں دھکیل دیں؟ کیا ارشد میرے لائق ہے صبیحہ! ایمانداری سے بتانا۔" اس نے نفرت و حقارت سے کہا۔

"ارشد میں آخر کیا خرابی ہے شکیلہ!" صبیحہ کے چہرے پر استعجاب چھا گیا۔ "تمہارے ماں باپ نے تمہاری بہتری ہی کے لئے ارشد کا رشتہ منظور کیا ہو گا۔ ماں باپ اپنی اولاد کے دشمن نہیں ہوتے۔ ان کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے کہ اولاد جہاں بھی جائے سکھ سے رہے' خوش رہے۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو صبیحہ! کہ ارشد میں کیا برائی ہے؟" شکیلہ کی بادام جیسی بڑی بڑی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "گویا تم اسے ہر لحاظ سے میرے لئے بہتر سمجھتی ہو۔ میں اس ارشد سے شادی کر لوں جو ایک پرچون فروش ہے' جس کی شکل ہے نہ صورت ہے۔ اس کا رنگ بے حد سیاہ ہے۔ کیا میں ایک کالے مرد سے اور ایک پرچون فروش سے شادی کر لوں؟ کیا میرا اور اس کا کوئی جوڑ ہے؟ کیا میرے ساتھ یہ ظلم نہیں ہے؟"

"مجھے ارشد میں اس لئے کوئی برائی نظر نہیں آتی ہے کہ وہ ایک تو تمہارا قریبی رشتہ دار ہے' دوسرا یہ کہ مرد کی ظاہری خوبصورتی دیکھی نہیں جاتی ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ دیکھا نہیں جاتا۔ مرد کا کالا ہونا برائی نہیں ہے۔ تم مرد کے چہرے کی رنگت دیکھنے کی بجائے اس کا دل کیوں نہیں دیکھتیں۔ اس کے سیاہ بدن کے اندر ایک اجلا دل ہو گا۔ کسی چاند کی طرح' اور وہ دل تمہاری زندگی کی تمام سمتوں میں اجالا بکھیر دے گا۔"

"یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں۔" شکیلہ نے برہمی کے انداز میں کہا۔ "اگر تم سے یہ کہا جائے کہ تم ارشد سے شادی کر لو تو کیا تم اس سے شادی کر لو گی؟"

"کیوں نہیں؟" صبیحہ مسکرائی۔ "اگر میرے والدین کی یہی مرضی ہو گی تو میں اس

سے شادی کر لوں گی۔ میرے نزدیک ارشد ایک نیک آدمی ہے اور پھر میں کیا......... دنیا کی ہر لڑکی ساری زندگی ایک نیک اور شریف سیرت مرد کی گھنی چھاؤں میں گزارنا پسند کرتی ہے اور پھر ایک لڑکی یا عورت کے لئے اس کا شوہر ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ شکیلہ! ایک شوہر کی چاہت اور محبت اسے اس قدر خوبصورت بنا دیتی ہے کہ ایک عورت اپنی ساری زندگی کبھی کسی اور مرد کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتی ہے۔ اسے ایک مرد کی خوبصورتی کی نہیں بلکہ محبت کی ضرورت ہوتی ہے۔ محبت ہی نہ ہو تو وہ مرد دنیا کا سب سے بدصورت مرد ہوتا ہے۔ وہ عورت کے وجود پر ساری زندگی کسی پھوڑے کی طرح دکھتا اور تکلیف دیتا رہتا ہے۔"

"صبیحہ!" شکیلہ متحیر سی ہو گئی۔ "تم پڑھی لکھی لڑکی ہو کر ماں باپ کے غلط انتخاب کی بھینٹ چڑھ جاؤ گی۔ کہیں تم یہ سب اس لئے تو نہیں کہہ رہی ہو کہ میں تمہاری بات مان لوں' تم شاید میری امی کی وکالت کر رہی ہو۔"

"کیا ایک پڑھی لکھی لڑکی ہونے کے ناطے مجھے ایک باغی لڑکی ہونا چاہیے؟ والدین کے انتخاب کو غلط قرار دے کر نافرمانی کرنی چاہیے؟" صبیحہ نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "میں کسی کی وکالت نہیں کر رہی ہوں۔ میں نے تمہاری امی کا پیغام تم تک پہنچایا ہے۔ میں نے ایک لڑکی اور تمہاری سہیلی ہونے کے ناتے اپنے خیالات سے تمہیں آگاہ کر دیا ہے۔ میں ایک بات جانتی ہوں کہ ہم والدین سے بہتر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ والدین سے زیادہ کوئی ہماری خوشیوں کا خواہشمند نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمارے مستقبل کے لئے ساری زندگی کوشاں رہتے ہیں۔ ہمیں پڑھاتے لکھاتے ہیں۔ اچھی طرح پرورش کرتے ہیں۔ ہم جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہیں تو ہماری عزت و ناموس کی حفاظت کرتے ہیں اور پھر ہمارے تابناک مستقبل کے لئے اچھے سے اچھا رشتہ تلاش کرتے ہیں۔ انہوں نے یقیناً ارشد میں کوئی نہ کوئی ایسی خوبی پائی ہو گی جس نے انہیں متاثر کیا ہو گا۔ انہوں نے اس رشتے کو موزوں پایا تو رسمی طور پر ہاں کر دی۔ اگر ارشد میں کوئی کمی یا خامی ہوتی تو وہ صاف انکار کر دیتے۔ اس لئے کہ شادی کوئی گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہے۔ مذاق نہیں ہے۔ لڑکی کا گھر ایک بار ہی تو بسایا جاتا ہے۔"

"میں اپنے آپ کو والدین کی پسند اور فیصلے پر قربان نہیں کر سکتی۔ میں مرنا پسند کر لوں گی مگر اس ارشد سے شادی نہیں کروں گی۔" شکیلہ تپیدہ لہجے میں بولی۔

"ارشد کا ایک چلتا ہوا جنرل اسٹور ہے۔ اس کی دکان میں تین چار نوکر ہیں۔ پھر

اس کی آمدنی بھی معقول ہے۔ اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ شراب وہ نہیں پیتا' جوئے کی لت اُسے نہیں ہے۔ اس نے کبھی لڑکیوں اور عورتوں کو بُری نظر سے نہیں دیکھا۔ اس کا کردار صاف و شفاف آئینے کی طرح ہے۔"

"وہ صرف میٹرک پاس ہے جبکہ میں بی اے کی طالبہ ہوں۔ وہ کالا ہے' میرا رنگ گورا ہے۔ کیا میں اپنے سے بہت کم تعلیم والے کی بھینٹ چڑھ جاؤں؟"

"اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس کی تعلیمی قابلیت تم سے بہت کم ہے مگر اس کے خیالات اعلیٰ و ارفع ہیں۔ ذہین ہے' روشن خیال ہے۔ بہت سے پڑھے لکھے مردوں کی طرح دقیانوسی خیالات کا مالک نہیں ہے۔ تم بھی تو اکثر و بیشتر اس کی تعریف کرتی رہتی تھیں۔ میں نے اکثر تقریبات میں دیکھا اور پرکھا ہے۔ اس سے باتیں کرنے کا بھی موقع ملا ہے' اب تم اس میں کیڑے نکال رہی ہو۔ وہ آج اس لئے بُرا ہو گیا ہے کہ وہ کالا ہے؟" صبیحہ سانس لینے کے لئے رکی تو شکیلہ اس کے جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی۔ صبیحہ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور گہری سانس لے کر اپنی بات جاری رکھی۔ "دنیا میں ہر کالی چیز کی سفید چیز کے مقابلے میں زیادہ قدر کی جاتی ہے۔ کالی سیاہی' کالی قلم' کالے بال' کالا فرنیچر اور کالے رنگ کی گاڑی' کالے رنگ کا برقعہ اور پھر یہ کالی کالی آنکھیں جن پر دنیا کا ہر شخص مرتا ہے۔ یہ کالا رنگ ہی ہوتا ہے جو عورت کے حُسن کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ کالے بادل ہی ہوتے ہیں جن کی اوٹ میں چاند کا حسن نکھر جاتا ہے' تو پھر شکیلہ! ایک کالا مرد تمہاری زندگی کو خوبصورت کیوں نہیں بنا سکتا۔ آخر تم میری بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی ہو؟"

"یہ تقریر اور مکالمے تم کسی کہانی یا ڈرامے کے لئے اٹھا رکھو۔ میں ایک کالے مرد کے لئے پیدا نہیں ہوئی ہوں۔ میں ارشد کو اپنا جیون ساتھی نہیں بنا سکتی۔ مجھے اس دنیا میں رہنا ہے تو اس دنیا کے ساتھ ساتھ چلنا ہو گا۔ میں جانتی ہوں کہ یہ دنیا کیسی ہے۔ ارشد کا جنرل اسٹور دیکھ کر میرے والدین کی مت ماری گئی ہے۔" وہ کرسی پر کسی کٹی پتنگ کی طرح گر پڑی۔ "میں اپنی شادی اپنی پسند سے کروں گی۔ میں اپنے آپ کو والدین کی خوشیوں پر قربان نہیں کر سکتی۔"

"یہ دنیا ویسی نہیں ہے جیسی تمہیں نظر آتی ہے۔" صبیحہ تنک کر بولی۔ "تمہیں ابھی دنیا اور مردوں کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ اگر تم نے اپنے والدین کی پسند کو ٹھکرا کر اپنی پسند کی شادی کی تو اپنے پیروں پر کلہاڑی مارو گی۔ جوانی دنیا کو آنکھوں سے دیکھتی ہے اور بڑھاپا

دماغ سے۔ جوانی لغزشیں کرتی ہے' ٹھوکریں کھاتی ہے' وہ کسی کو جانچ اور پرکھ نہیں سکتی ہے' پھر جوانی فریب کھا جاتی ہے جبکہ بڑھاپا ان میں سے کسی سے شکست نہیں کھاتا ہے۔ وہ اڑتی چڑیا کے پَر گنتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ مجھے اس کالے بھینسے سے شادی کر لینی چاہئے جو روزانہ اپنے جنرل اسٹور سے کسی بھینس کی طرح منوں دودھ دیتا رہے گا' جس کے جسم سے گھی تیل اور مرچ مسالوں کی خوشبو آتی رہے گی' جو صبح چھ بجے جا کر رات دس بجے واپس آئے گا۔ وہ مجھ سے شادی کر کے مجھے ڈولی میں بٹھا کر اپنے گھر لے جائے گا۔ اپنے گھر کی چاردیواری میں قید کر کے ایک چارپائی پر لٹا کر' چار چھ بچے پیدا کر کے اپنی مردانگی کا جشن منائے گا۔ میں اس کے بدصورت بچوں کی ماں بننا نہیں چاہتی ہوں۔ مجھے خوبصورت بچے چاہئیں۔ پیارے پیارے سے۔"

"جذبات کی رَو میں بہہ کر فضول باتیں مت کرو شکیلہ!" صبیحہ نے اُسے ڈانٹا۔ "تم جامے سے باہر ہو رہی ہو۔ اپنی زبان سے ایسی باتیں نکال رہی ہو جس کی حیا اجازت نہیں دیتی۔ تم ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ تمہارے پاس ابھی وقت ہے۔ ارشد سے تمہاری شادی دو برسوں کے بعد ہو گی۔ منگنی بھی ہو گی تو چھ سات مہینے بعد۔ اس لئے کہ ارشد اپنا ایک خوبصورت گھر بنانا چاہتا ہے۔ خوابوں جیسا گھر۔ وہ تمہاری ڈولی اس گھر میں لے جائے گا۔ اس لئے اسے شادی کی ایسی جلدی بھی نہیں ہے۔ اگر تم دوسروں کے گھروں کی لڑکیوں کو دیکھو تو تمہاری زندگی کا سب سے خوبصورت وقت یہی ہے جو تیزی سے گزر جاتا ہے۔ تم بیس برس کی ہو رہی ہو اور ارشد ستائیس برس کا ہو رہا ہے۔ خواب بڑے دغاباز ہوتے ہیں۔ سراب ہوتے ہیں' تم ان کے پیچھے مت بھاگو۔ نوجوانی کے خواب انتظار کے بہت طویل اور صبر آزما دور کے بعد بھی پورے نہیں ہوتے۔ اب تمہیں ارشد کے ساتھ جلد از جلد گھر بسا لینا چاہئے۔ اس لئے تمہارے گھر والے کسی شہزادے کو اس چوکھٹ پر قدم نہیں رکھنے دیں گے۔ پھر یہ ہو گا شکیلہ کہ خوابوں کی حسین دنیا ناامیدی کی خزاں کی نذر ہو جائے گی۔ پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ارشد کی ان خوشیوں سے بھی محروم ہو جاؤ۔ جو مسرت آج ملے گی اور مل رہی ہے اسے تم ٹھکرا دو گی تو کل عمر گزشتہ کو تاہیوں کا پچھتاوا بن جائے گی۔ اگر آج تم نے ارشد کو کھو دیا تو کبھی نہ پا سکو گی۔"

"بس .... بس کرو صبیحہ!" شکیلہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ سانسوں کے زیر و بم سے اس کے سینے میں ایک ہیجان برپا تھا۔

"میں نے ایسے مکالمے بہت ساری فلموں میں سنے ہیں۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی کہ تم میری مدد کرنے کی بجائے اور میری مشکل کا کوئی حل ڈھونڈنے کی بجائے بڑی بوڑھیوں کے انداز میں مجھے نصیحت کرنا شروع کر دو گی۔ میں جانتی ہوں کہ ہر عورت کے اندر ایک حاسدانہ جذبہ چھپا ہوتا ہے وہ ہر عورت سے اپنا موازنہ کرتی ہے۔ تم بھی میرے ساتھ اپنا موازنہ کر رہی ہو۔ تم بھی شاید نہیں چاہتی کہ مجھے میرے خوابوں جیسا شہزادہ مل جائے' مجھے میرے رنگین سپنے مل جائیں۔ اس لئے تم مجھے مشورہ دے رہی ہو کہ میں ارشد جیسے بدصورت مرد سے شادی کر کے اپنا گھر بسا لوں اور تم کسی خوبصورت' وجیہہ اور اسمارٹ مرد سے شادی کر کے ساری زندگی مجھے منہ چڑاتی رہو۔"

"شکیلہ!" صبیحہ اس کی باتیں سن کر بھونچکی سی رہ گئی۔ "یہ تم اپنی اس سہیلی کے بارے میں کہہ رہی ہو جو وقت آنے پر تم پر اپنی جان بھی قربان کر سکتی ہے۔ تم مجھ پر اتنا بڑا بہتان لگاؤ گی' یہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ نہیں شکیلہ نہیں' تم ہماری دوستی کے آبگینے پر ایسے نوکیلے پتھر نہ مارو ورنہ اس کی کرچیاں دل میں ایک بار چبھ گئیں تو میں انہیں نکال نہ سکوں گی۔ محبت کا جذبہ جتنا گہرا ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ نازک بھی ہوتا ہے۔ اس محبت کو اس بے رحمی سے روندو نہیں۔"

شکیلہ کا دل صبیحہ کی ان باتوں سے ذرہ برابر بھی نہیں پسیجا۔ اس نے ان باتوں کا ذرہ برابر بھی اثر قبول نہیں کیا تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار صبیحہ سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ وہ بھڑک کر بولی۔ "اگر مجھ سے تمہیں اتنی ہی محبت تھی تو پھر کیا ضرورت تھی مجھے یہاں بلا کر اس اذیت ناک طریقے سے یہ فضول باتیں سنانے کی؟"

پھر وہ رُکی نہیں۔ اس نے اپنا برقع اٹھایا اور پہنا۔ صبیحہ نے اُس کی تلخ و تند اور زہر میں بجھی ہوئی باتیں سننے کے بعد بھی اُسے روکنا چاہا تھا مگر وہ رُکی نہیں۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی رُکنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کسی سنسناتے تیر کی طرح صبیحہ کے ہاں سے نکلی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گلی سے سڑک کی طرف جا رہی تھی تو اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اس کے وجود میں ایک دھماکہ سا ہوا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک کوندا سا لپکا تھا۔ اس کے دماغ میں صبیحہ کسی بدروح کے شیطانی سائے کی طرح رقص کرتی نظر آ رہی تھی۔ ادھر شکیلہ سوچ رہی تھی' اپنی عزیز ترین دوست کو پہچانو جو تم پر اپنی زندگی تک قربان کرنے کا دعویٰ کرتی ہے۔ آج تمہاری یہی دوست تمہیں ایک ایسی پستی میں دھکیل دینا چاہتی ہے جہاں سے تم کبھی نہ نکل سکو گی۔ وہ تمہیں پستی میں دیکھ کر ساری زندگی

ہنستی رہنا چاہتی ہے۔ قہقہے لگانا چاہتی ہے۔

"نادان!" صبیحہ نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر تیزی کے ساتھ جاتی ہوئی شکیلہ کو دیکھا اور تلخی سے سوچا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تو نہیں تھا کہ شکیلہ سراب کی طرف دوڑ پڑے گی۔ اس نے کتنی ہی ایسی لڑکیوں اور عورتوں کے بارے میں سنا تھا جنہوں نے اپنے والدین سے بغاوت کر کے اپنی پسند کی شادی کر لی تھی۔ اس نادانی' بغاوت اور انجانے راستے پر چلنے سے وہ لڑکیاں اور عورتیں ایک طرف تنہا رہ گئی تھیں۔ مردوں نے ان کے اکیلے پن اور بے بسی سے ہمیشہ فائدہ اٹھایا تھا۔ انہوں نے ان عورتوں کو غلاموں سے بھی بدتر انداز سے رکھا تھا۔ ان کو اتنا ستایا اور ان پر اس قدر ظلم کیا تھا کہ وہ موت مانگنے لگی تھیں لیکن انہیں موت بھی نہیں ملی تھی۔ ان باتوں کا علم شکیلہ کو بھی تھا۔ اس لئے معاشرے کے یہ واقعات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ اپنی اردگرد کی زندگی میں نظر آتے تھے۔ صبیحہ کو بھی اس بات کا بہت زیادہ دکھ تھا کہ شکیلہ بھی ان عورتوں کے نقشِ قدم پر آنکھیں بند کر کے چلنا چاہتی تھی۔ اس سے زیادہ رنج کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی خواہشوں پر قربان ہونے کے لئے اپنی آنکھیں بند کئے چلنے کی خواہش میں پاگل ہو رہی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس دیوانگی کا انجام کبھی مختلف ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ ایسی سر پھری لڑکیاں خوابوں کو پانے کے لئے اپنی خوبصورت زندگی ہوس پرست شوہروں کے پاس رہن رکھ دیتی ہیں پھر انہیں اپنے کئے کی یہ سزا ملتی ہے کہ انہیں جینے مرنے کا اختیار بھی نہیں ملتا ہے۔

اگر شکیلہ نے ارشد کو ٹھکرا کر اپنی پسند کے کسی مرد سے شادی کر لی تو اس دیوانگی سے اسے کیا حاصل ہو گا۔ اسے صرف ایک مرد مل جائے گا جس کے بدن اور چہرے کی جلد گوری ہو گی۔ اگر اس مرد کے سینے میں محبت بھرا دل نہ ہوا تو وہ کیا کرے گی؟ مرد تو بڑی جلدی اپنی بیوی کی محبت اور اس کے جسم سے اکتا جاتا ہے۔ یہ تو ہر مرد کی فطرت کا خاصا ہے۔ اس کی اپنی باجی کا کیا انجام ہوا تھا۔ اس کی باجی کتنی حسین' پُرکشش ہوا کرتی تھیں۔ باجی نے محبت کی شادی کی تھی۔ شادی کے تین برس بعد دولہا بھائی نے دوسری عورت سے شادی کر لی تھی۔ اس لئے نہیں کہ باجی کا حُسن ماند پڑ گیا تھا یا ان میں کوئی عیب یا خرابی تھی۔ وہ شادی کے بعد اور نکھر گئی تھیں مگر گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے۔ ان کے شوہر رنگین مزاج واقع ہوئے تھے۔ پھر انہوں نے دوسری شادی پر تیسری کی اور یہ سلسلہ جاری رہا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی عزیز از جان دوست شکیلہ بھی اپنی زندگی

اسی طرح خراب کرے۔ آخر شکیلہ نے اس کی باجی کی زندگی کو سامنے رکھ کر سوچا کیوں نہیں۔

جو لڑکیاں ماں باپ کی پسند سے شادی کر کے اور ان کی دعائیں اور نیک تمنائیں ساتھ لے کر گھر سے رخصت ہوتی ہیں وہ جیسے ان دعاؤں کے مستجاب ہونے کی وجہ سے خوشگوار ازدواجی زندگی گزارتی ہیں۔ ان کی جھولی محبت اور بے پناہ مسرتوں سے بھری رہتی ہے۔ پھر ایسی لڑکیوں کے شوہروں کی مجال نہیں ہوتی تھی کہ ان لڑکیوں کی زندگی کو اجیرن بنا دیں اس لئے کہ وہ لڑکیاں ان کی زندگیوں میں چور دروازوں سے نہیں آتی تھیں اور پھر ایک نہیں سینکڑوں ہاتھ ان کا گریبان پکڑنے والے ہوتے تھے۔ اس لئے وہ لڑکیاں بڑی عزت و احترام اور باوقار انداز سے گھروں کو رخصت ہوتی تھیں۔ ان کا ایک مقام ہوتا تھا جس سے کوئی انہیں گرا نہیں سکتا تھا۔

شکیلہ اوجھل ہو گئی تو صبیحہ نے کھڑکی کا پردہ درست کر دیا اور کرسی پر اپنے آپ کو گرا دیا۔ اس نے سوچا اگر شکیلہ نے اپنے آئیڈیل کے اندھے جنون میں مبتلا ہو کر کسی مرد سے شادی کر لی تو وہ ارشد سے ضرور شادی کرے گی اور پھر شکیلہ کو بتائے گی کہ ان دونوں میں کون خوش نصیب ہے!

رات شکیلہ پر بہت بھاری تھی۔ اس کے ابو اپنے کمرے میں جا کر سو گئے تھے۔ اس کی امی عشاء کی نماز پڑھ کر بڑی دیر تک صحن میں ٹہل ٹہل کر تسبیح پڑھتی رہی تھیں۔ پھر وہ کچن میں جا کر برتن دھوتی رہی تھیں۔ پھر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ کچھ دیر تک وہ اپنے ابو امی کو باتیں کرتے ہوئے سنتی رہی تھی پھر اس نے خراٹوں کی آواز سنی۔ کمرے کی بتی بجھ گئی تھی۔ ان کے کمرے سے گھپ اندھیرا جھانکنے لگا تھا۔ وہ دونوں گہری نیند میں ڈوب چکے تھے۔ اب فجر کی اذان پر ہی ان کی آنکھ کھل سکتی تھی مگر وہ بستر پر ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتی رہی تھی۔ صبیحہ سے آج جو اس کی باتیں ہوئی تھیں اور صبیحہ نے اسے جو خبر سنائی تھی وہ اس کے وجود پر ڈنک مارتی رہی اور وہ درد و جلن سے تڑپتی رہی تھی۔ پھر ارشد اس کے خیالوں میں آ کھڑا ہوا تو اس کو ارشد کے تصور ہی سے وحشت ہونے لگی۔ اس نے ارشد کے تصور سے پیچھا چھڑانے کی بہت کوشش کی تھی مگر ارشد تو جیسے اس کے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ارشد اسے کسی بھیڑیے کی طرح دبوچنے کے لئے اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی جیسے ارشد واقعی کمرے میں داخل ہو گیا ہو۔ اسے کمرے میں اپنا دم گھٹتا ہوا سا محسوس ہو

رہا تھا۔ ایک بے چینی اس کے بدن کے نہاں خانوں میں بھری جا رہی تھی۔ اس نے سرہانے سے دوپٹہ اٹھا کر سینے پر ڈالا۔ پلنگ کے نیچے سے چپل گھسیٹ کر پہنی۔ اس نے سوچا کچھ دیر چھت پر جا کر کھلی فضا میں سانس لینا چاہئے۔ جبھی اسے سکون مل سکتا ہے۔

وہ کمرے سے نکلی تو دبے پاؤں سانس روکے دروازے کے پاس کھڑی رہی۔ اپنے امی ابو کے کمرے کی طرف دیکھا وہاں اندھیرا تھا' گہری تاریکی میں خراٹے گونج رہے تھے۔ پھر وہ بے آواز قدموں سے آئینے کی طرف بڑھی۔ اس کے دل میں ایک خوف سا دامن گیر تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی جاگ نہ جائے۔ امی اسے صرف راتوں کو نہیں بلکہ سرِ شام بھی چھت پر جانے سے منع کرتی تھیں۔ کہتی تھیں۔ "جوان لڑکیوں کو اکیلے چھت پر نہیں جانا چاہئے۔" کیوں نہیں جانا چاہئے؟ یہ سوال بارہا اس کی زبان کی نوک پر آ کے رک گیا تھا۔ مگر وہ پھر بھی اکثر راتوں کو چھت پر چلی جاتی تھی۔ خصوصاً چاندنی راتوں میں اسے چھت پر جانا اچھا لگتا تھا۔ چاندنی سے جیسے اس کا گہرا تعلق تھا۔ وہ اکثر جاڑوں میں چھت پر جاتی تھی۔ جاڑے کی چاندنی اسے سب سے اچھی لگتی تھی۔ اس میں عجیب سا حُسن بے پناہ طلسم اور غضب کی دلفریبی ہوتی تھی۔

اس وقت وہ زینے کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے قدم بے صدا تھے مگر دل کی دھڑکنیں جیسے فضا میں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے دل کے دھڑکنے پر قابو پانا بڑا دشوار سا ہو رہا تھا۔ زینے کے پاس پہنچ کر اس نے چپل ہاتھ میں لئے اور سیڑھیاں تیزی سے پھلانگتی ہوئی اوپر جا پہنچی۔ اس نے زینے کا وہ دروازہ جو چھت پر کھلتا تھا چوروں کی طرح بڑی آہستگی سے اور محتاط ہو کر کھولا تھا۔ چھت پر آئی تو اس کی نظریں ارادی طور پر آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ آسمان پر چودھویں کا چاند تھا۔ کھلی چھت پر تو چاندنی کا کچھ عجیب عالم ہوتا تھا۔ آج بھی وہی عالم تھا۔ وہ چھت پر کھڑی چاندنی میں بھیگتی رہی تھی اور اس کا پورا وجود دودھیا چاندنی کی آغوش میں بھرا ہوا تھا۔ پھر یہ کرنیں اس کے جسم میں جذب ہونے لگی تھیں۔ جذب ہوتے ہوتے نس نس میں ٹھنڈک بن کر سمونے اور پھر اس کی روح میں دھیرے دھیرے فرحت کی لہریں بن کر اترتی جا رہی تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر تک چاندنی کا بے پناہ حُسن دیکھتی رہی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے چاندنی کا بہتا ہوا سمندر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منجمد ہو گیا ہے۔ وہ منڈیر کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

اس کی نگاہ ساتھ والے مکان پر پڑی۔ اس مکان میں ایک چھوٹا سا خاندان آباد تھا۔ دو میاں بیوی اور ان کے دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ جب تک یہ لوگ اس مکان میں

آباد رہے تھے یہ مکان آٹھوں پہر بچوں کی شرارتوں سے اور انسانوں کے باتیں کرنے کی آوازوں سے گونجتا رہتا تھا مگر ان کے جانے کے بعد یہ مکان دو مہینے تک خالی رہا تھا۔ کرائے پر اس لئے نہیں اٹھا تھا کہ مالک مکان نے نہ صرف کرایہ بہت زیادہ بڑھا دیا تھا بلکہ پیشگی رقم میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ وہ اکثر اس گھر میں جا کر گلاب کے پھول توڑ کر لایا کرتی تھی مگر اب گلاب کے پھول مرجھاتے چلے گئے تھے ان کی پتیاں ویران ہو گئی تھیں۔ بہار کے موسم میں بھی ان پر خزاں آ گئی تھی۔ مگر اب اس گھر میں ایک نیا شادی شدہ جوڑا آ گیا تھا۔ بڑا حسین جوڑا تھا۔ نہ صرف بیوی حسین تھی بلکہ اس کا شوہر شہزادوں کی طرح وجیہہ اور اسمارٹ تھا۔ ان کے آنے سے اس گھر میں اور اس گھر کے باغیچے میں جیسے بہار آ گئی تھی۔ اسے اس لمحے جیسے ہی اس جوڑے کا خیال آیا اس کے دل میں کوئی چیز سی چبھ گئی۔

جب اس حسین عورت کو خوبصورت شوہر مل سکتا ہے تو کیا اسے نہیں مل سکتا؟ اس نے بڑے کرب اور دکھ سے سوچا اور چاند کی طرف دیکھا جو کھل کر چاندنی بکھیر رہا تھا۔ اس برستی چاندنی میں اس کا برا حال ہو رہا تھا۔ اس کے کرب اور دکھ میں جیسے اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پورے چاند کی اس دہکتی چاندنی میں اس کی جوانی جل رہی تھی اور وہ جیسے تڑپ رہی تھی۔

وہ چاند کے سحر میں ڈوبی ہوئی، کھوئی ہوئی اور خیالوں کی دنیا میں بھٹکتی ہوئی بہت دور چلی جا رہی تھی کہ اس کے کانوں میں رسیلی آواز کسی نغمے کی طرح گونجی تھی۔ "میں نے کہا نہیں تھا کہ آج چودھویں کا چاند ہے۔ مجھے چاند کی تاریخیں یاد رہتی ہیں۔ میں کئی برسوں سے چاند کی تاریخوں کو ذہن نشیں کرتی چلی آ رہی ہوں۔"

"اس لئے کہ تم خود بھی چاند ہو۔" یہ مرد کی آواز تھی۔ "میرے خیال میں چاند تم سے زیادہ حسین نہیں ہے بلکہ عورت سے زیادہ حسین دنیا میں کوئی چیز موجود ہی نہیں ہے۔"

اس نے چاند کی دنیا سے نکل کر، خیالوں کی دنیا سے واپس آ کر، چونک کر اس مکان کی چھت کی طرف دیکھا تھا۔ وہ حسین جوڑا ادھر آ گیا تھا یعنی اپنے مکان کی چھت پر تھا۔ ان دونوں نے اسے نہیں دیکھا تھا مگر اس نے ان دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ پھر وہ جلدی سے پانی کی ٹنکی کی آڑ میں جا کر کھڑی ہو گئی تھی جہاں اندھیرا سا تھا اور دونوں کی نظریں اس طرف نہیں اٹھ سکتی تھیں۔ ان دونوں نے اوپر آ کر سپنوں کو جگا دیا تھا۔ یہ سپنے اس طرح

سے جاگ اٹھے تھے کہ اب انہیں تھپک تھپک کر سلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

وہ ان دونوں کو اپنی نظروں کی گرفت میں لئے ہوئی تھی۔ دونوں میاں بیوی خوشگوار موڈ میں تھے۔ انہیں جیسے کوئی غم نہیں تھا، فکر نہیں تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پا کر خوش تھے۔ اتنے خوش تھے کہ ان کی خوشیوں کا اندازہ ان کے چہروں پر بکھری ہوئی سرخی اور گلابی گلابی رنگوں سے ہو رہا تھا۔ ان دونوں کی آنکھوں میں محبت کی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ عورت کا چہرہ بھی نسوانیت کی چاندنی کی تفسیر بنا ہوا تھا۔ پھر عورت نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ جیسے اس نے مرد کی آنکھوں میں کچھ پڑھ لیا تھا۔ مرد کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ لیا تھا۔ پھر اس کی پلکیں اور ہونٹوں کی تھرتھراہٹ بڑھ گئی تھی اور شکیلہ کی آنکھوں کے سامنے ایک دھند سی چھا گئی تھی۔ اس نے بھی اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

شکیلہ نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو عورت کے چہرے پر گلنار مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی اور وہ دونوں منڈیر سے لگے کھڑے چاند کو دیکھ رہے تھے۔ مرد نے عورت سے سچ ہی کہا تھا کہ وہ چاند سے کہیں زیادہ حسین ہے۔ مرد نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا ہوا تھا۔ عورت کی آنکھوں ہی میں ہزاروں واٹ کے طاقتور بلب روشن نہیں تھے بلکہ اس کے چہرے پر بلبوں کی روشنی بکھری ہوئی تھی۔ عورت کو چاند سے بہت ہی زیادہ جذباتی لگاؤ معلوم ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ وہ چاند کو ایک ٹک دیکھتے ہوئے دنیا ومافیہا سے بے نیاز ہو گئی تھی۔ اسے اپنی سدھ بدھ نہیں رہی تھی مگر مرد پر ایسی کوئی جذباتی کیفیت نہیں تھی۔ وہ وقفے وقفے سے ایک نظر آسمان کے چاند پر ڈالتا اور ایک نظر زمین کے اس چاند پر جو اس کے پہلو میں پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔ مرد کی ایک ایک حرکت پر عورت چونک کر سرخ ہو جاتی تھی اور اس کے چہرے پر حیا کا نور بکھر جاتا۔ وہ مرد کے ہاتھوں پر اپنا حنائی ہاتھ رکھ دیتی۔ "یہ کیا حرکت ہے؟ کوئی دیکھ لے گا۔" عورت کی آواز رس گھول جاتی۔

مرد مسکرا کر جواب دیتا تھا۔ "چاند ہی تو دیکھ رہا ہے، تو اسے دیکھنے دو۔ یہ تو ہماری محبت کا چشم دید گواہ ہے۔"

"اچھا!" عورت کھلکھلا پڑتی تھی۔ پھر وہ اپنے مرد کو مخمور نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ شکیلہ کے دل میں ایک درد سا جاگ اٹھا تھا۔

ان دونوں میں کتنی محبت ہے۔ یہ عورت اپنے مرد سے اس قدر پیار اس لئے کرتی ہے کہ اس کا مرد خوبصورت ہے۔ ایک شہزادے کی طرح ہے۔ عورت کی نگاہ مرد کے

چہرے پر پڑتی تھی۔ عورت جیسے نشے میں ڈوب ڈوب جاتی تھی۔ اس نے عورت کی نگاہ میں چاہت کو کسی چاند کی طرح جھانکتے ہوئے دیکھا تھا جیسے اس نگاہ نے اپنی نگاہوں کی ساری چاندنی مرد کی آنکھوں میں بکھیر دی ہو۔ اب وہ چاندنی اس کی آنکھوں میں نہیں اپنے مرد کی آنکھوں میں تھی۔ مرد نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس سے خوابناک لہجے میں بولا۔

"چلو افشاں! اب نیچے چلتے ہیں۔ رات بھیگتی جا رہی ہے اور............"

"اتنی جلدی۔" عورت نے کہا۔ "اس چاند کو دیکھو اس کا اجالا تمہیں اپنی بانہوں میں لئے ہوئے ہے اور تم اس چاند سے کہیں زیادہ خوبصورت لگ رہے ہو۔"

"چاند کو میرا رقیب نہ بناؤ۔ تم نہیں جانتی ہو کہ مرد اپنی محبت اور اپنی عورت کے مقابلے میں کس قدر شکی ہوتا ہے۔ میں تو اس چاند کی بانہوں میں سمانا چاہتا ہوں۔" عورت کے رخسار دمک اٹھے تھے اور چاندنی نے اس کے رخساروں کی سرخی کو اور تیز کر دیا تھا۔ پھر مرد نے اس کا ہاتھ تھاما اور زینے کی طرف بڑھ گیا۔

ان دونوں کے جاتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے چاند بھی بجھ گیا ہے' چاندنی بھی پھیکی پڑ گئی ہے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ چاندنی نے اپنے حُسن کو کھو دیا ہو۔ اس کی دل کشی میں اب وہ پہلی جیسی کشش نہیں رہی تھی۔ وہ دونوں چھت پر سے نہیں گئے اس کی زندگی سے جیسے چلے گئے تھے۔ جب وہ دونوں چھت پر آئے تھے تو اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس کی زندگی میں ان کے پیار نے دبے پاؤں قدم رکھا ہے اور جب یہ گئے تو جیسے اس کی زندگی میں خزاں کی ویرانی بھرتا یہ جوڑا محبت کی اس راہ کو سنسان کرتا چلا گیا تھا۔ اس کے اردگرد محبت کی جو پنکھڑیاں گرتی رہی تھیں اب وہ محبت کی پنکھڑیاں نہیں رہی تھیں۔ اب تو تمناؤں کے سوکھے ہوئے پتے اس کی تنہائی کی شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر جیسے اس پر گر رہے تھے۔ ان سوکھے ہوئے پتوں کا ڈھیر جیسے بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس کا وجود اس میں جیسے اس میں چُھپ گیا تھا۔ اس نے چودھویں کے چاند کی طرف دیکھا جو اپنی تابانیوں کو کھو چکا تھا۔

پھر وہ تھکے تھکے قدموں سے نیچے آئی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو اس کے کمرے میں چاندنی بکھر گئی۔ وہ بجھے بجھے دل سے اس کی لطافتیں اور نرماہٹیں دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کھڑکی پر پردہ برابر کر دیا تھا۔ اس لئے کہ یہ چاندنی کسی قاتل کے خنجر کی طرح اس کے دل کے گوشوں میں پیوست ہوئی جا رہی تھی۔ پھر اسے

اماں کی بات یاد آئی۔ ماں نے اسے ہمیشہ اکیلے چھت پر جانے سے منع کیا تھا۔ وہ شاید اس لئے منع کرتی تھیں کہ اکیلی چھت پر جانے سے ایک جوان لڑکی پر کسی آسیب کا سا اثر ہو جاتا ہے۔ واقعی وہ ایک آسیب ہی میں تو مبتلا ہو گئی تھی۔ وہ بستر پر لیٹی تو اس جوڑے کی تصویر اس کی آنکھوں میں گھومتی رہی تھی۔ اس کے بدن پر اس وقت بھی سنسنی دوڑی تھی اور اب بھی سنسنی دوڑ رہی تھی' جیسے وہ لمحات ابھی اس کی نظروں کے سامنے جکڑے ہوئے ہیں۔

کوئی تین دن بعد جب اس کے ابو دکان پر چلے گئے تھے' وہ کالج جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ کپڑے بدل کر میز پر آئی تو ماں نے اس کے سامنے ناشتہ لا کر رکھ دیا اور وہ خود بھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تھی۔ ماں کے اس انداز سے اس کے سامنے بیٹھنے سے اسے یہ انداز کچھ پُراسرار اور عجیب سا لگا تھا اور پھر ماں پر گہری سنجیدگی کی ایسی چادر تنی ہوئی تھی جو اس نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ معلوم نہیں کیوں اس کے سینے میں ایک عجیب سی دھک دھک بڑھ گئی تھی۔ اس نے پراٹھے کا نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے ماں کا سپاٹ اور جذبات سے عاری چہرہ دیکھا تو وہ سمجھ گئی کہ ضرور کوئی ایسی خاص بات ہے جو ماں اس سے کرنا چاہتی ہے۔ ایسی کیا بات ہو سکتی ہے؟ اس نے ذہن پر زور دے کر سوچا۔ پھر اسے ایک دم ارشد کا خیال آیا۔ وہ ارشد کے متعلق اس سے بات کرنا چاہتی تھیں' ٹھیک ہے' بات کرتی ہیں تو کریں۔ وہ بھی آج صاف صاف انہیں اپنے خیالات کے بارے میں بتا دے گی تاکہ وہ کسی غلط فہمی میں نہ رہیں۔ وہ جو چار پانچ راتوں سے ایک عذاب میں مبتلا ہے' اس سے تو اس کی جان چھوٹ جائے گی۔

"شکیلہ بیٹی!" ماں کی ممتا بھری آواز نے گہرے سکوت کو توڑ دیا۔ "کل صبیحہ آئی تھی۔ بہت دیر تک تمہارا انتظار کر کے چلی گئی۔ میں تم سے بتانا بھول گئی تھی۔"

"وہ کالج نہیں آئی تھی۔ شاید نوٹس وغیرہ لینے آئی ہو گی۔" اس نے جواب دیا۔
"آج تو کالج میں اس سے ملاقات ہو ہی جائے گی۔ میں اس سے پوچھ لوں گی کہ کس لئے آئی تھی؟"

"وہ نوٹس لینے نہیں آئی تھی بلکہ میں نے اسے خود بلایا تھا۔" ماں اصل موضوع کی طرف آئی تھی۔ "میں نے اس کے ذریعے سے جو رائے تم سے طلب کی تھی اس کے بارے میں سننا چاہتی تھی۔"

اس میں اتنا حوصلہ ہی نہیں تھا کہ وہ ماں سے آنکھیں ملاتی۔ اس کا سر کسی مجرم کی

طرح جھکا رہا تھا۔ وہ چند لمحوں بعد آہستگی سے بولی تھی۔ "میں نے اپنی رائے دے دی تھی۔"

"اور مجھے تمہاری رائے اور خیالات جان کر بے حد دکھ ہوا بیٹی!" ماں کی آواز میں بلا کا کرب تھا۔ "مجھے تم سے ایسی توقع نہیں تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم اس انداز سے بھی سوچتی ہو۔ تعلیم تو انسان کو آدمی بناتی ہے۔ اس کی سوچ کو اعلیٰ وارفع بناتی ہے۔ اس کے ذہن کے گوشوں میں اجالے پھیلاتی ہے۔ انسانیت کا سبق سکھاتی ہے۔ یہی سوچ کر تو میں نے تمہیں اعلیٰ تعلیم دلائی۔ حالانکہ تمہارے والد کالج بھیجنے کے خلاف تھے۔ وہ صرف تمہیں میٹرک تک تعلیم دلوانے کے حق میں تھے۔ ان دنوں تمہارے لئے جو رشتے آرہے تھے ان میں سے کوئی ایک رشتہ قبول کر کے تمہارے ہاتھ پیلے کر دینا چاہتے تھے مگر میں نے ان کی مخالفت کے باوجود تمہیں اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ محض یہ سوچ کر کہ میری بیٹی اپنی تعلیم سے نہ صرف روشنی حاصل کرے گی بلکہ اس روشنی کو پھیلائے گی۔ مگر مجھے آج احساس ہو رہا ہے کہ میں غلطی پر تھی۔"

شکیلہ کو فوری طور سے جواب دینا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ماں اور بیٹی کے درمیان حجاب کی جو انجانی دیوار برسوں سے کھڑی ہے وہ ایک دم سے کیسے گرا دے؟ مگر اس دیوار کو گرانے کے سوا اسے کوئی اور چارہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اگر آج وہ خاموش رہ جاتی ہے تو اس کی خاموشی رضامندی بن جائے گی۔ ایسا سنہری موقع پھر کبھی نہیں مل سکتا تھا۔ یہی موقع تھا کہ وہ اپنی ماں کو سمجھائے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی ماں اس سے کتنا پیار کرتی ہے۔ اسے کتنا چاہتی ہے۔ وہ ان کے کلیجے کی ٹھنڈک ہے' آنکھوں کا تارا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنا چہرہ اٹھایا اور جھکی جھکی پلکوں کی چلمن اٹھائی تو ماں نے ایک سوال داغ دیا۔

"آخر تمہیں ارشد پسند کیوں نہیں ہے؟"

"میں .... اس کی وجہ صبیحہ کو بتا چکی ہوں امی!" اس نے ماں کی آنکھوں کی تاب نہ لا کر نظریں نیچی کر لیں۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے آپ نے میرے لئے یہ انتخاب کیسے کر لیا؟" وہ جب دل کی بات زبان پر لائی تو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے سر سے کوئی بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ اسے اپنے اعصاب ہلکے پھلکے سے محسوس ہوئے۔ بدن پر فرحت کی لہر سی دوڑ گئی۔

ماں نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے پوچھا۔ "میں تمہارے منہ سے

سننا چاہتی ہوں کہ ارشد تمہیں کیوں پسند نہیں۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گی کہ میں نے اور تمہارے ابو نے ارشد کو کس لئے پسند کیا۔ اس کے انتخاب میں کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ ارشد کو ہم سے زیادہ کوئی نہیں جانتا ہے کہ وہ کیسا ہے' کیا ہے؟"

شکیلہ نے اپنے سامنے سے پلیٹ ہٹا دی۔ اس میں انڈا اور پراٹھا بچ گیا تھا۔ اس کا جی ایک لقمہ کھانے کو بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ ماں نے کچھ ایسے تاروں کو چھیڑ دیا تھا جس نے اس کی بھوک ہی ختم کر کے رکھ دی تھی۔ پھر اس نے اپنے سامنے چائے کی پیالی رکھ کر اس پر اپنی نظریں رکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے کبھی ارشد بھائی کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ میں نے کبھی خاندان کے کسی لڑکے کے بارے میں بھی نہیں سوچا اور نہ ہی میں کسی لڑکے کو پسند کرتی ہوں جو اس سے شادی کی خواہش کروں۔ مگر امی! میں یہ چاہتی ہوں کہ میرے لئے آپ جو بھی لڑکا پسند کریں وہ کم از کم میرے لائق تو ہو۔ آپ لوگ بھی دنیا والوں کے سامنے کہہ سکیں کہ میری بیٹی کتنی خوش نصیب ہے۔ امی!" اس نے توقف کر کے گہرا سانس لیا۔ "میں اس بے ادبی اور گستاخی کی معاف چاہتی ہوں۔ آپ میری باتوں کو زبان درازی کا نام نہ دیں تو میں آپ سے اتنا کہوں گی کہ آپ لوگوں نے ارشد بھائی کا رشتہ میرے لئے پسند کرنے میں جلد بازی سے کام لیا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ ارشد بھائی آپ لوگوں کو کیسے پسند آ گئے۔ اپنی اس عزیز از جان بیٹی کے لئے جس کے سنہرے مستقبل کے لئے آپ ہمیشہ پریشان اور فکرمند رہیں۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ کر بتائیں' کہ ایک ایسا شخص جس کی سیاہ رنگت دیکھ کر اس پر کسی حبشی کا گمان ہوتا ہو' جس میں کوئی کشش بھی نہیں ہے' رنگ روپ بھی نہیں ہے اور پھر اس کی تعلیم بھی مجھ سے بہت کم ہے۔ اس کی حیثیت ہی کیا ہے؟ وہ ایک معمولی شخص ہے' ایک دکان کا مالک ہے۔ کیا وہ شخص اس گھر کے لائق ہے؟"

ماں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ان کی بیٹی کے ذہن میں ایسے باغیانہ خیالات بھی پرورش پا سکتے ہیں' وہ اس انداز سے بھی سوچ سکتی ہے۔ اس خاندان کی کسی لڑکی نے کبھی ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔ ان میں ایسی سرکشی نہیں تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پڑھی لکھی لڑکیاں نہیں تھیں۔ انہوں نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالے تھے اور گھر کی لاج ان کے لئے سب سے بڑی لاج تھی۔ وہ اس لاج کی خاطر ہر دکھ اور ہر مصیبت سہہ جاتی تھیں۔

"بیٹی! معلوم نہیں خواب ناک راحتوں کا یہ زہر کس نے تمہارے وجود میں بھر دیا ہے؟" ماں کے لہجے میں تیزی و تندی تھی اور ان کے ستے ہوئے چہرے پر ناگواری کی لہر دوڑ گئی۔

"کسی نے بھی میرے ذہن میں کوئی بات نہیں ڈالی۔ ہر شخص اپنے بارے میں اور اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ میں نے بھی سوچا۔"

"مگر تم جس انداز سے سوچ رہی ہو اور تمہاری جو سوچ ہے وہ ایک ایسا زہر ہے جو ایک عورت کو دیمک کی طرح چاٹ لیتا ہے۔" ماں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "جو خوابوں کی دنیا میں رہتا ہے وہ کبھی کچھ نہیں پاتا۔ خوابوں اور حقائق میں اتنا ہی فرق ہوتا ہے جتنا زمین اور آسمان میں ہوتا ہے۔ تم خوابوں کے پیچھے اپنی زندگی اپنے ہاتھوں سے برباد نہ کرو۔ عورت کا گھر ایک بار بستا ہے۔ ایک بار اجڑ گیا تو پھر ساری زندگی نہیں بستا۔"

"لیکن میں کوئی بچی تو نہیں ہوں امی جان! کہ میں اپنا برا بھلا نہ سمجھوں۔ آخر مجھے بھی تو حق ہے کہ میں اپنی پسند کو ترجیح دوں؟ کسی ناپسندیدہ شخص کو اپنے اوپر مسلط نہ ہونے دوں۔"

"یہ حق تمہیں کس نے دیا ہے؟" ماں نے برہمی سے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔ "پسند ناپسند کرنے کا فیصلہ ہمارا حق ہے۔"

"یہ حق مجھے قانون و شریعت نے دیا ہے۔ میں عاقل و بالغ لڑکی ہوں۔ مجھ پر از روئے شریعت آپ اپنی پسند نہیں ٹھونس سکتی ہیں۔"

"میں تسلیم کرتی ہوں کہ تمہیں پسند ناپسند کا حق قانون اور مذہب نے دیا ہے۔ اگر تم کسی غلط راستے پر جا رہی ہو تو یہ ہمارا فرض ہے کہ تمہیں ٹوکیں، سمجھائیں۔ ایک سیدھا راستہ دکھائیں۔ تم تو خوابوں کے اندھے جنون میں مبتلا ہو کر اپنی زندگی اجاڑ دینا چاہتی ہو۔ مگر میں ایک بات تم سے کہہ دوں کہ ارشد سے اچھا اور محبت کرنے والا شوہر تمہیں نہیں ملے گا۔ تم خود بھی جانتی ہو کہ ارشد نے اپنی زندگی کیسے بنائی ہے۔ اس کی زندگی کھلی کتاب کی طرح تمہارے سامنے ہے۔ وہ بچپن ہی سے ماں باپ کے سائے سے محروم ہو گیا تھا۔ نہ تو اس کا بڑا بھائی تھا جو اسے سہارا دیتا اور نہ ہی سگا چچا اور پھر خاندان والوں میں سے بھی کسی نے اسے سہارا نہیں دیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کسی سے بھی بھیک لے کر نہیں بنائی بلکہ اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔ اپنی جدوجہد سے وہ آج اس مقام تک پہنچا ہے کہ اس کا اپنا مکان ہے، کاروبار ہے اور پھر اس نے اپنی زندگی گزارنے کے

لئے ایک معقول رقم پس انداز کر رکھی ہے۔ اس کا کاروبار بھی خوب چل رہا ہے۔ مجھے اس بات سے انکار نہیں ہے کہ وہ ظاہری طور پر خوبصورت نہیں ہے۔ تم جیسی حسین لڑکی کے مقابلے میں وہ بے کشش معلوم ہوتا ہے مگر اندرونی طور پر وہ بے حد خوبصورت ہے۔ مرد کی خوبصورتی اس کی محبت اور اس کے برتاؤ میں ہوتی ہے۔ اب تم اپنے باپ کو ہی دیکھ لو، وہ کون سے خوبصورت ہیں جبکہ میں آج بھی بہت خوبصورت ہوں مگر میں نے کبھی تمہارے باپ سے نفرت نہیں کی۔ لمحے بھر کے لئے بھی نہیں۔ ابتدائی دنوں میں مجھے دھچکا سا ضرور لگا تھا کہ میرے ماں باپ نے آخر کیوں ایسے شخص سے میری شادی کر دی مگر رفتہ رفتہ وہ میرے لئے سب کچھ بن گئے۔ میں نے کبھی بھی کسی دوسرے مرد کو چاہے وہ کتنا ہی خوبصورت اور شہزادوں کی طرح کیوں نہ رہا ہو، اسے نظر بھر کے نہیں دیکھا۔ اس لئے کہ تمہارے ابو کی محبت نے مجھے اپنا اسیر بنا لیا تھا۔ میں آج بھی ان کی اسیر ہوں اور آخری سانس تک رہوں گی۔"

"آپ کچھ بھی کہہ لیں امی!" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی تو اس کی کرسی الٹ کر گر پڑی۔ "میں ساری زندگی اپنے وجود پر کوئی پھوڑا دیکھنا نہیں چاہتی ہوں۔ میں کسی قیمت پر ارشد سے شادی نہیں کروں گی۔ اگر آپ لوگوں نے زبردستی اس سے شادی کرنی چاہی تو میں گھر سے بھاگ جاؤں گی یا پھر زہر کھا لوں گی۔"

پھر شکیلہ رکی نہیں۔ نہ تو اس نے زمین پر گری ہوئی کرسی اٹھا کر رکھی اور نہ ہی اپنی ماں کی بات کے جواب کا انتظار کیا۔ تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے میں آئی۔ برقع پہنا اور کتابیں اٹھا کر گھر سے نکل گئی۔ اس کا دماغ سنسنا رہا تھا اور اس کے سارے بدن میں لہو اُبل رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس گھر سے، اس شہر سے اور اس ملک سے اتنی دور چلی جائے کہ اس کے گھر والوں کی بھی اس تک رسائی نہ ہو سکے۔ وہ آخری سانس تک اپنے گھر والوں کا منہ تک نہ دیکھے۔

ماں پر شکیلہ کی اس حرکت پر سکتہ سا چھا گیا تھا، وہ اپنی جگہ دم بخود ہو کر بیٹھی تھیں۔ ان کی قوت گویائی جیسے شکیلہ چھین کر ساتھ لے گئی تھی۔ اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ سوچ سوچ کر ششدر سی ہوئی جا رہی تھیں۔ ارشد جیسا شوہر ان کی بیٹی کے لئے کہیں نہیں مل سکتا تھا۔ اس لئے کہ وہ محبت کا بھوکا تھا۔ اُسے محبت کی ضرورت تھی۔ وہ کسی بھوکے پیاسے بے سہارا جانور کی طرح تھا۔ اگر اسے ذرا سی بھی محبت ملتی تو وہ قدموں پر سر رکھنے کے لئے تیار ہو جاتا مگر ان کی بیٹی تو ایسے شخص سے شادی کرنے کے

لئے کسی صورت اور کسی قیمت پر تیار نہیں تھی اور جاتے جاتے وہ جو دھمکی دے کر گئی تھی اس دھمکی نے ان کے سینے میں برچھی سی اتار دی تھی۔ ان کے دل کے گوشے میں دکھ کی لہر کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی پیدا ہوا تھا کہ اس میں شکیلہ کا کوئی قصور نہیں۔ جب جوانی اٹھان پر آتی ہے تو اسے ہر چمکتی ہوئی چیز سونے کی طرح نظر آتی ہے۔ پھر اچھے بُرے کی تمیز نہیں رہتی ہے۔ پھر وہ سراب کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگتی ہے۔ وہ کئی دنوں سے یہ محسوس کر رہی تھیں کہ شکیلہ کی بڑی بڑی آنکھوں میں خواب رقص کرتا رہتا ہے۔ سنہرے مستقبل کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ حسین زندگی کا عکس جھلکتا رہتا ہے۔ پھر اس کی حرکات و سکنات اس کے خیالات کو تقویت بخشتی تھیں اور پھر انہیں اپنی بیٹی کے رگ و پے میں بھڑکتے شعلوں کا احساس ہوا تھا۔ ان کے خیال میں اس کا سبب شکیلہ کی بھرپور جوانی تھی۔ خاموش اور سنسان ماحول میں پرورش پا کر ایک نوجوان اور پُرشباب لڑکی کے جذبات کا برانگیختہ ہونا فطری امر تھا۔ جبھی تو انہوں نے اپنے شوہر سے کہا تھا کہ امتحان ہوتے ہی اس کے ہاتھ پیلے کر دیں گے۔ اگر کوئی اچھا رشتہ آ جائے۔ ان کے شوہر کو ارشد بہت پسند تھا۔ ان کے شوہر نے سوچا کہ کسی طرح سے ارشد کو دامادی میں لینے کی کوشش کریں گے۔ اتفاق سے کنواں ہی پیاسے کے پاس آ گیا تھا۔ اندھے کو کیا چاہئے تھا؟ دو آنکھیں۔ انہوں نے فوراً ہی رشتہ منظور کر لیا تھا۔

بیٹی کے انکار سے زیادہ اس کے خیالات سن کر انہیں دھچکا لگا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شکیلہ کو کس طرح سمجھائیں۔ اگر انہوں نے جذبات کے اس سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوئی کوشش کی تو اس کا رُخ کسی اور سمت بھی ہو جائے گا اور پھر وہ جذبات کی رو میں بہہ کر جاتے جاتے گھر سے بھاگ جانے اور زہر کھانے کی دھمکی دے گئی تھی۔ ان کے نزدیک یہ خالی خولی دھمکی نہ تھی۔ انہوں نے دنیا دیکھی تھی۔ سر پھری لڑکیاں جذبات میں آ کر ایسے قدم اٹھا لیا کرتی تھیں۔ وہ بڑی دیر تک بیٹھ کر سوچتی رہی تھیں کہ بیٹی کو کس طرح راہِ راست پر لایا جا سکتا ہے۔ اسے راہِ راست پر لانے کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر تو کرنی ہی پڑے گی۔

شکیلہ کا دل کالج جانے کو نہیں چاہ رہا تھا اور وہاں جانے کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ تانگے میں جاتے وقت اسے ہر مرد ارشد کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اسے جیسے ارشد کی سی نظروں سے دیکھتا محسوس ہو رہا تھا۔ راستے سے گزرتے مردوں' تانگوں' سائیکلوں اور گاڑیوں میں سے گزرتے مردوں کی ہوس ناک نگاہیں اس کے چہرے سے اتر کر برقع کے

اندر کچھ کھوجتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے سوچا تھا کہ دنیا کا ہر مرد اسی طرح عورت کے حسن' بدن اور شباب کا بھوکا ہوتا ہے۔ کیا وہ اپنے گھر کی تمام عورتوں کو بھی اسی طرح اور ایسی ہی نگاہوں سے دیکھتا ہو گا۔ اس کے نزدیک پاکیزگی اور تقدس کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔ یہ ہر وقت کسی بھوکے بھیڑیے کی طرح رال ٹپکاتے پھرتے ہیں۔ کیا ارشد کو اس خاندان میں کوئی لڑکی نظر نہیں آئی تھی؟ ارشد نے اس کا رشتہ صرف اس لئے مانگا ہے کیونکہ وہ بہت حسین و جمیل لڑکی ہے اور اس کی اُجلی اُجلی رنگت نے ارشد کو متاثر کر دیا ہے ورنہ وہ کسی بھی اپنے جیسے رنگ والی لڑکی سے شادی کر سکتا تھا اور اسے واقعی کر لینی چاہئے۔

دو بجے کالج سے نکل کر گھر جانے کی بجائے وہ سینما ہال کی طرف چل پڑی۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ شو دیکھ کر گھر جائے۔ اتنی جلدی گھر جا کر کیا کرے گی۔ گھر میں ماں پھر اس موضوع پر بات چیت شروع کر دے گی۔ صبح ویسے ہی گھر کی فضا مکدر ہو کر رہ گئی تھی۔ گھر جا کر پھر اس موضوع پر بات کرنے سے گھر کی فضا میں تلخی گھل جائے گی۔ پھر اس کے خودنمائی کے جذبے پر چوٹ پڑے گی۔ اس سے بہتر ہے کہ وہ کوئی فلم دیکھ کر گھر پہنچے۔ ایک تو اس سے کوئی بازپُرس بھی نہ ہو گی دوسرے یہ کہ امی عشاء کی نماز سے کچھ دیر پہلے تک باورچی خانے میں رہتی ہیں۔

اس کی کچھ سہیلیوں نے کالج میں فلم دیکھنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ وہ دو پیریڈ پہلے ہی کالج سے گھر چلی گئی تھیں تاکہ تیار ہو کر سینما ہال پہنچ سکیں۔ وہ اپنی سہیلیوں سے پہلے ہی ریگل سینما پہنچ گئی تھی۔ ابھی ٹکٹ گھر کھلے نہیں تھے' کچھ دیر باقی تھی رش تھا کہ برابر بڑھتا جا رہا تھا۔ صبیحہ اور سنتوش کمار کی نئی فلم حسرت لگی ہوئی تھی۔ وہ لڑکیوں اور عورتوں کے ہجوم کے پاس کھڑی ہو کر باہر دیکھ رہی تھی۔ تانگوں سے اترنے والی برقع پوش لڑکیوں پر اسے اپنی سہیلیوں کا دھوکا ہو رہا تھا۔ پونے تین ہو رہے تھے اس کی سہیلیاں ابھی تک نہیں پہنچی تھیں۔ انتظار میں اس کی آنکھیں پتھرا رہی تھیں۔ وہ دل میں اپنی سہیلیوں کو صلواتیں سنا رہی تھی۔

معاً اس کی نگاہ ایک شخص پر پڑی اور جم کر رہ گئی۔ اسے اس لمحے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے خوابوں کا شہزادہ چلا آ رہا ہو۔ وہ اپنی موریس کار سے اترا تھا۔ اس کے چلنے کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی فوجی افسر ہو۔ اس کی دلآویز شخصیت میں بڑا وقار سا تھا۔ ویسے وہ کسی امریکی فلمی ہیرو کی طرح تھا۔ اس کا چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ اس کے

ہنستے ہوئے حسین چہرے کا رنگ سرخ و سپید تھا۔ وہ براؤن سی قمیض اور گہرے سیاہ رنگ کی پتلون میں ملبوس تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ابرق کے ٹکڑوں کی سی چمک تھی۔ جیسے وہ آنکھیں نہ ہوں بلکہ جواہر ریزے ہوں۔ وہ بڑی سحرانگیز سی شخصیت کا مالک تھا۔

دوسرے لمحے وہ چونکی جیسے کسی خواب کے عالم سے چونکی ہو۔ یہ خواب نہ تھا' یہ حقیقت تھی کہ اس کے خوابوں کا شہزادہ سیدھا چلتا ہوا' متوازن قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف چلا آ رہا تھا۔ اس کے دل کے تمام گوشے جیسے چیخ رہے تھے۔ یہی ہے تمہارا محبوب' تمہارے خوابوں کا شہزادہ' تمہارا رنگین سپنا' تمہارا خواب۔

اس کا سینہ دھک سے ہو کر رہ گیا تھا اور اس کے دل کی دھڑکن بگڑنے لگی تھی۔ ہاتھ پیر جیسے سنسنا رہے تھے۔ اسے دیکھ کر شکیلہ کا جی بے اختیار چاہ رہا تھا کہ آگے بڑھ کر اپنے محبوب کے قدموں میں سر رکھ دے۔ سرِ راہ اس پر نچھاور ہو جائے۔ اس کی دلآویز شخصیت میں مقناطیس کا سا اثر تھا۔ کچھ ایسا سحر تھا کہ وہ اپنی ذات کو اس کی طرف کھنچتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ وہ خیالی دنیا میں دیکھ رہی تھی کہ آسمان پر چودھویں کا چاند مسکرا رہا ہے۔ چاروں طرف چاندنی کھلی ہوئی ہے۔ خوشبوؤں میں ڈوبی ہوئی اس کے وجود میں اتری جا رہی ہے۔ وہ اپنے محبوب کے بازوؤں میں بھری ہوئی ہے۔ وہ اپنے محبوب کے سینے میں جذب ہوتی ہوئی سرگوشیاں کر رہی ہے کہ میں تمہاری لیلیٰ ہوں' سوہنی ہوں' شیریں ہوں' مجھے اپنا بنا لو میرے محبوب! میں اپنی ساری زندگی تمہارے قدموں میں گزار دینا چاہتی ہوں۔

شکیلہ کا ذہن فوری طور پر ایسی کوئی تدبیر سوچ رہا تھا جو اس کے محبوب کو اس کی طرف کشاں کشاں لے آئے اور وہ اس کی محبت کا اسیر بن جائے۔ شکیلہ جانتی تھی کہ جب تک صنف نازک کی طرف سے کوئی پہل نہ ہو جنس مخالف راغب نہیں ہوتا۔ اس کی ابتدا ہمیشہ سے عورت کی جانب سے ہوتی ہے اور وہ بھی اپنے عشق کی ابتدا کرنا چاہتی تھی۔ آج اس کے لئے ایک ایسی مجبوری تھی کہ وہ اس دیوار کو پھلانگ لینا چاہتی تھی۔ دیوار کو پھلانگنے سے ہی اسے ارشد سے نجات مل سکتی تھی۔ وہ گھر والوں کو مجبور کر سکتی تھی کہ اس کی شادی اس شخص کے ساتھ کر دی جائے۔ گھر والے اس کو دیکھ کر انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے کہ ارشد تو اس کے قدموں کی دھول بھی نہیں تھا اور پھر اس کا محبوب اس کے والدین کے دل میں بھی جگہ بنا سکتا تھا۔

وہ کوئی تدبیر سوچ ہی رہی تھی کہ ایک آوارہ سا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ کہیں

یہ شخص شادی شدہ تو نہیں ہو گا۔ ایسے وجیہہ' خوبصورت اور اسمارٹ لوگ غیر شادی شدہ کہاں ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جلد ہی شادی کر لیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان پر حسین و جمیل لڑکیاں جو مرمٹتی ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی اس کا دل بجھ سا گیا تھا مگر دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ کسی برقی قمقے کی طرح جل اٹھا تھا جیسے کسی نے بٹن دبا کر قمقمہ روشن کر دیا ہو۔ اگر یہ شادی شدہ ہوتا تو اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تو فلم دیکھنے آتی اور یہ اکیلا نہ آتا۔ شاید اس کی کوئی محبوبہ بھی نہیں ہے۔ محبوبہ ہوتی تو وہ اسے ضرور اپنے ساتھ لے کر آتا۔

دفعتاً ایک تدبیر بجلی کی طرح اچانک ہی اس کے ذہن میں لپکی تھی۔ اس تدبیر کے ذہن میں آتے ہی اس کا چہرہ گلنار ہو گیا تھا۔ وہ بڑی سرعت کے ساتھ باتھ روم کی طرف بڑھی اور اندر داخل ہو کر اس نے اپنا برقع اتارا۔ باتھ روم میں اتفاق سے اس وقت کوئی نہیں تھا۔ اگر کوئی ہوتا بھی تو اسے اس کی کوئی پرواہ بھی نہیں تھی۔ اس نے جلدی سے برقع تہہ کیا اور کتابوں کے بیچ دبا لیا۔ اب وہ بغیر برقع کے تھی۔ اس نے آئینے میں اپنا چہرہ ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ سبک اور تیکھے تیکھے نقوش والے چہرے کی تھی۔ صبیحہ نے اس سے اکثر کہا تھا اور کہتی تھی کہ کاش میں مرد ہوتی تو تم سے شادی کر لیتی۔ تمہارا موہنی چہرہ اور اس کے دلکش نقش و نگار میرے دل میں اتر جاتے ہیں۔ تم پر کسی چینی کی گڑیا کا دھوکا ہوتا ہے۔ تمہارا سراپا بڑا پُرشکوہ ہے اور اس میں ریشم کا سا گداز محسوس ہوتا ہے۔ یہ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا حُسن میرے دل میں ایک حسرت سی پیدا کرتا رہتا ہے کہ کاش! میں مرد ہوتی اور تمہیں ساری زندگی اپنے دل' آنکھوں اور وجود میں جذب کر لیتی۔ اس میں پندارِ حُسن تھا اور وہ اپنی قدر و قیمت سے آگاہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ برقع میں تو اس کا حُسن چھپ جاتا ہے۔ جس طرح بادل چاند کو اپنی اوٹ میں چھپا لیتے ہیں۔ اگر اس شخص کو اپنا محبوب بنانا ہے تو اسے بادل کی اوٹ سے نکلنا ہو گا۔ یہ سوچ کر اس نے برقع کو تہہ کر لیا۔ اسے اپنی خوبصورتی اور دلکشی پر بڑا اعتماد تھا۔ وہ اپنے کالج میں لڑکیوں سے مسلسل چار سال سے حسینہ عالم کا خطاب پا رہی تھی۔ باتھ روم سے نکل کر آئی تو اس کی متلاشی نگاہیں اپنے محبوب کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے اس کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کا محبوب کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ کہاں گیا وہ؟ وہ بے قرار سی ہو کر ہر طرف دیکھنے لگی۔

چند لمحوں بعد وہ اسے نظر آ گیا تھا۔ وہ سینما کے باہر سے سگریٹ لے کر اندر داخل

ہو رہا تھا۔ وہ لڑکیوں اور عورتوں کے ہجوم سے ایک طرف ہٹ کر کھڑی ہو گئی تھی کہ اگر اس کی نظر پڑے تو وہ پوری طرح اس کی نظروں کی گرفت میں آ جائے۔ وہ دل میں گڑگڑا کر دعا مانگ رہی تھی کہ اس کی ہم جماعت سہیلیاں خدا کرے یہاں نہ پہنچیں۔ وہ کسی بھی طرح سینما ہال نہ آ سکیں۔ ان کے گھر والے انہیں اجازت نہ دیں۔

سجاد نے پانچ سو پچپن سگریٹ کا کش لے کر نظریں دوڑائیں تو اس کی نظریں ایک دم سے ٹھٹک کر رہ گئیں۔ اس کے دل پر بجلی سی گر پڑی تھی۔ اس نے آج تک ایسی فتنہ جگانے والی لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ وہ خواب آفریں سی لگ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ شکیلہ کا چہرہ اس کے دل کے نہاں خانوں میں جیسے نقش ہوا جا رہا تھا اور وہ اسے اپنے بے پناہ حسن کا اسیر بنا رہی تھی۔ وہ اس تراشے ہوئے مجسّمے کو نظروں کی گرفت میں لئے دیکھتا رہا تھا۔ حُسن کے اس تراشیدہ پیکر کی حشر سامانیوں نے اسے دیوانہ سا بنا دیا تھا۔ وہ دل میں اس پیکر کو سراہ رہا تھا جو جوانی کے خمار سے اور غضب ڈھا رہا تھا۔ سجاد کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے قوس و قزح کے جتنے بھی رنگ ہیں وہ اس کے آس پاس پھیلے ہیں اور رنگ برنگے غباروں کی طرح اڑتے جا رہے ہیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ یہ حسینہ رنگوں اور خوشبوؤں کی دنیا میں سانس لینے اور اس کی ذات کا جز بننے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ وہ جیسے اسے پکار رہی تھی اور اپنی چاند سی بانہیں فضا میں پھیلا کر اسے بلا رہی تھی۔ اس حسینہ کے دل سے نکلی ہوئی صدائیں اس کے دل کے تمام گوشوں میں جیسے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔

کہاں ہے میرے محبوب تُو! میرے محبوب میں تیرا صدیوں سے انتظار کر رہی ہوں۔ میں تجھے جانتی ہوں' میں تجھے پہچانتی ہوں پر تُو مجھے نہیں جانتا ہے۔ تیرا چہرہ میرے دل اور ذہن کے ہر گوشے میں نقش ہے۔ ہر لمحے تیرا چہرہ میری نظروں کے سامنے رہتا ہے۔ میں نے ہمیشہ خیالوں کے کورے کاغذ پر تیری ہی تصویریں بنائی ہیں اور بناتی رہتی ہوں۔ اب تُو آ گیا ہے تو مجھے چھوڑ کر نہیں جانا۔ میرے محبوب! اب مجھ میں تیرے انتظار کی سکت نہیں رہی ہے۔ میں اس جدائی کو برداشت نہیں کر سکوں گی۔ میرے محبوب میرے پاس تو آؤ۔

پھر وہ شکیلہ کی طرف بڑھا تو شکیلہ کی نظروں میں اس کی نظریں پیوست ہو گئی تھیں۔ وہ دونوں بے خود سے' دنیا و مافیہا سے بے نیاز سے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔ ان کے چہروں سے ان کے دل کی کیفیات ظاہر ہو رہی تھیں۔ وہ نظریں چرا

سکتے تھے اور نہ ہی جھکا سکتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی نظروں کے تیر سے گھائل ہو رہے تھے۔ ان کے دل ایک دوسرے کی صدائیں سن رہے تھے۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ ان کی آنکھوں کی راہ میں لڑکیوں کا ایک غول کسی دیوار کی طرح کھڑا ہو گیا تھا۔ پھر یہ طلسم بکھر گیا تھا۔ شکیلہ پھر کسی اور سمت دیکھنے لگی تھی۔ گو ان دونوں کے بیچ ایک خلیج سی بن گئی تھی اور اسے اپنا محبوب نظر نہیں آ رہا تھا مگر وہ اپنی حساس سماعت سے اپنے محبوب کے قدموں کی دھمک سن رہی تھی جیسے وہ اس کی طرف چلا آ رہا ہو اور پھر اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا محبوب اپنے دل کے دہکتے جذبات کے انگاروں پر لوٹ رہا ہے۔ اس کی طرف کشاں کشاں چلا آ رہا ہے۔ اس کے محبوب کو اپنے آپ پر کوئی اختیار نہیں رہا ہے۔

اس کے دل نے سچ ہی کہا تھا' ٹھیک ہی محسوس کیا تھا۔ سجاد اس غول کا ایک چکر کاٹ کر اس کی نظروں کے سامنے آ کر رُکا تو اس کے دل کی دھڑکن بگڑنے لگی اور اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اسے سجاد کو اپنے اس قدر قریب پا کر خواب کا سا گمان ہو رہا تھا۔ سجاد نے اس کے تپتے ہوئے سرخ چہرے پر اپنی سحرزدہ سی نظریں مرکوز کر دی تھیں اور وہ اپنی ساری دلکش مسکراہٹیں پھولوں کی پتیوں کی طرح اس کے وجود پر نچھاور کرنے لگا۔ شکیلہ نے دھڑکتے دل سے اپنی تھرتھراتی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ اپنے وجود کے ساتھ اس کی آنکھوں میں جذب ہوتا جا رہا ہے۔ آنکھوں کے دریچوں سے ہوتا ہوا دل کی دھڑکنوں میں سما رہا ہے۔ دل کی دھڑکنوں کا یہ سفر ابھی جاری تھا۔ ابھی اس کی کوئی منزل نہیں آئی تھی۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں اور آنکھوں میں سجاد تھا۔ اُسے سجاد کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سجاد کے سوا کچھ سجھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے ہر سمت سجاد ہی سجاد کا جلوہ تھا۔

سجاد اور اس کے درمیان ایک گہرا سکوت طاری رہا۔ وہ دل میں بڑی ششدر سی تھی کہ سجاد اس کے پاس دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر چلا آیا ہے۔ آخر کس حیلے بہانے سے۔ گو حیلے بہانوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ پھر بھی مردوں میں اتنی مجال نہیں ہوتی کہ وہ حسینوں کے آگے دم مار سکیں۔ سجاد ان مردوں میں تھا جو لڑکیوں اور عورتوں سے رابطہ بڑھانے کے معاملے میں بڑی جرأت اور صلاحیت رکھتے ہیں۔ ورنہ جن میں صلاحیت ہوتی ہے ان میں جرأت کی کمی ہوتی ہے۔ جن میں جرأت ہوتی ہے ان میں صلاحیت کا فقدان ہوتا ہے۔ سجاد نے اس کی غزالی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکتے ہوئے گہرے سکوت کو

توڑا تھا۔

"میرے پاس دو ٹکٹ ہیں' میں ان میں سے ایک ٹکٹ فروخت کرنا چاہتا ہوں۔"

سجاد کی آواز میں بلا کا رس تھا۔ اس کے لب و لہجے میں چاندی کی سلاخ کی سی سریلی جھنکار کھنک رہی تھی۔ اسے جیسے کچھ سدھ بدھ نہیں رہی تھی کہ اس کا محبوب اس سے خدا جانے کیا کچھ کہہ رہا ہے۔ وہ تو ایک ٹک اپنے محبوب کو دیکھ رہی تھی جو بڑا صاف ستھرا' شائستہ اور نفیس مزاج کا لگ رہا تھا۔ وہ چند ثانیوں تک مبہوت سی ہو کر اپنی ذات سمیت محبوب کی آنکھوں میں اتر گئی تھی جس میں سچے موتیوں جیسی آب و تاب کوند رہی تھی۔ وہ آنکھوں سے اتر کر دل کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ اگر آپ کو ٹکٹ کی ضرورت ہے تو' اسے پیش کر دوں۔

شکیلہ کہاں تو اپنے محبوب کو اس قدر نزدیک پا کر سحرزدہ سی ہو رہی تھی اور اس کے بدن اور چہرے پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں۔ کہاں اس میں فطری شوخی ابھر آئی تھی۔ وہ اس کے آخری جملے پر اس سحر سے نکل آئی۔ اس شوخی سے کہا۔

"اگر آپ کو بلیک ہی کرنا ہے تو ایک ٹکٹ کیوں کر رہے ہیں' دونوں ٹکٹ ہی بلیک کر دیں۔"

"بلیک؟" وہ بڑے زور سے چونکا۔ اس کے چہرے پر حیرت چھا گئی۔ "محترمہ! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے' میں ٹکٹ بلیک نہیں کر رہا ہوں۔"

"یہ بلیک نہیں تو اور کیا ہوا؟ دو ٹکٹ خرید لئے۔ جب دیکھا کہ رش ہے' ہاؤس فل جا رہا ہے تو سوچا کہ کیوں نہ ایک ٹکٹ بلیک کر دوں۔"

"اصل بات یہ نہیں ہے جی! جو آپ سمجھ رہی ہیں۔" سجاد کہنے لگا۔ "میں نے اور میرے دوست نے آج فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ عین وقت پر اسے ضروری کام آن پڑا اور وہ لائل پور چلا گیا۔ میں اکیلا ہی فلم دیکھنے آ گیا اور سوچا کہ کسی شریف آدمی کو ایک ٹکٹ بیچ دوں گا۔"

"مگر میں نے تو سنا ہے کہ شریف آدمی فلم نہیں دیکھتے بلکہ وہ اپنا فرصت کا وقت اپنے بیوی بچوں میں گزارتے ہیں۔"

"جی' جی۔" سجاد چونک پڑا اور دوسرے لمحے ہنس دیا۔ "اتفاق سے میں بھی شریف آدمی نہیں ہوں۔ اسی لئے فلم دیکھنے چلا آیا ہوں۔"

"اچھا!" اس نے محبت پاش نگاہوں سے سجاد کو دیکھا۔ "پھر آپ ایسا کریں کہ

دونوں ٹکٹ فروخت کر دیں۔ ایک ٹکٹ سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔"

"کیا آپ دونوں ٹکٹ خرید کر مجھے واک آؤٹ کرنے پر مجبور کرنا چاہتی ہیں۔ مگر آپ دو ٹکٹ لے کر کیا کریں گی؟ آپ تو اکیلی نظر آ رہی ہیں؟"

"یہ اکیلا پن کچھ دیر کا ہے۔ میری تین عدد سہیلیاں آنے والی ہیں۔ ان کے آنے کے بعد میرا اکیلا پن دور ہو جائے گا۔"

"تو کیا آپ دو ٹکٹ میں چار مزے کریں گی۔" سجاد کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ ابھر آئی۔ "میں یہ پہلی بار دیکھ رہا ہوں کہ دو ٹکٹ خرید کر چار.........."

"یہ دو ٹکٹ میں چار مزے والی بات میں پہلی بار سن رہی ہوں۔ میں نے تو سنا تھا کہ ایک ٹکٹ میں دو مزے ہوتے ہیں۔" شکیلہ نے درمیان میں بات کاٹی تھی۔

"آپ کل چار سہیلیاں ہیں اور چار سہیلیوں کے لئے دو ہی ٹکٹ خریدے جا رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ دو ٹکٹ میں چار آدمی کیسے فلم دیکھیں گے۔ اس لئے میں کہہ رہا تھا کہ دو ٹکٹ میں چار مزے۔"

"آپ سے دو ٹکٹ خرید لیں گے اور دو ٹکٹ کھڑکی سے خرید لیں گے۔ رش کی وجہ سے شاید چار ٹکٹ نہ مل سکیں۔ صرف دو ہی ٹکٹ مل سکیں۔"

سجاد نے سر کھجاتے ہوئے پوچھا۔ "اپنا بھی ٹکٹ آپ کی نذر کر کے میں کیا کروں؟"

"آپ شریف آدمی بن جائیے۔ بیوی بچے نہیں ہیں تو کیا ہوا گھر جا کر آرام کیجئے۔" شکیلہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی آپ کی تین عدد سہیلیوں کا انتظار کر لوں۔" سجاد نے اپنی پلکوں کی چھاؤں سے ہرن کی طرح تیز کمند پھینک کر اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

"آپ میری سہیلیوں کا انتظار کریں گے؟" شکیلہ گھبرا سی گئی۔ "وہ کس لئے؟ کیا آپ مجھے ان کی چھیڑ چھاڑ اور مذاق کا نشانہ بنانا چاہتے ہیں؟ وہ تینوں ایک نمبر کی چڑیلیں ہیں۔ انہوں نے اگر مجھے آپ کے ساتھ دیکھ لیا تو میرا جینا حرام کر دیں گی۔ بہتر ہے کہ آپ اپنے ٹکٹ اپنے پاس رکھیں۔"

"مجھے ان کے پہنچنے کی کوئی امید نہیں ہے۔" سجاد نے بڑی نرمی اور شائستگی سے جواب دیا۔ "میں آپ سے ہٹ کر دروازے کے پاس ہی کھڑا رہوں گا۔ فلم شروع ہونے تک اگر آپ کی سہیلیاں نہیں آئیں تو پھر آپ میرا ٹکٹ خرید کر مجھے اس نقصانِ عظیم

سے بچالیں گی اور پھر آپ بھی گھر جا کر کیا کریں گی۔ شوہر بچے تو ہیں نہیں جن کے لئے کھانا پکانا ہو۔ اپنے پروگرام کا ستیاناس کرنے سے تو بہتر ہے کہ آپ فلم ہی دیکھ لیں۔ پھر کہیں فلم کی حسرت ہی نہ رہ جائے۔"

سجاد اس سے اس طرح بے تکلفی اور اپنائیت سے باتیں کر رہا تھا جیسے وہ برسوں سے اس کا شناسا ہو۔ وہ چاہتی بھی تو یہی تھی کہ سجاد اس سے کھل کر باتیں کرے۔ اسی لئے تو وہ بھی اس سے اس طرح گھل مل کر باتیں کر رہی تھی جیسے وہ اس کی کوئی پرانی سہیلی ہو۔ لڑکوں اور مردوں سے باتیں کرنے کا اتفاق یہ پہلا نہیں تھا۔ اس کے خاندان اور صبیحہ کے خاندان کی تقریبات میں اس کا اکثر لڑکوں اور مردوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا جو اس سے باتیں کرنے اور اپنی آنکھیں سینکنے کے لئے بہانے تراشتے رہتے تھے اور وہ ان لوگوں کا بُرا بھی نہیں مانتی تھی۔ اسے ان مردوں سے باتیں کرنے میں عجیب سا مزا آتا تھا۔

سجاد ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کبھی گیٹ کی طرف دیکھتی تو کبھی سجاد کی طرف۔ گیٹ کی طرف دیکھ دیکھ کر دل میں دعائیں مانگتی کہ خدا کرے تم لوگ نہ پہنچو۔ تمہارا تانگہ الٹ جائے، بخار آ جائے، تمہارے مہمان آ جائیں، یا تمہیں دیکھنے کے لئے عورتیں آ جائیں۔ وہ سجاد کی طرف دیکھتی جو ایک شہزادے کی طرح گیٹ پر کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سکون و اطمینان ہلکورے لے رہا تھا۔ سوچتی آنکھوں میں آب و تاب جیسے ہر لحظہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ وہ نظر بھر کے کنکھیوں سے اپنے محبوب کو دیکھ بھی نہ پاتی تھی کہ کوئی نہ کوئی نظروں کی راہ میں کباب میں ہڈی بن جاتا تھا اور وہ غصے سے بل کھا کر رہ جاتی تھی۔

پندرہ منٹ، پندرہ صدیوں کی طرح اس کے وجود پر بھاری ہو کر گزر گئے تھے۔ اس کی دعا قبول ہو گئی تھی۔ فلم شروع ہونے سے پانچ منٹ پہلے ہی ہاؤس فل کا بورڈ آویزاں کر دیا گیا تھا اور ٹکٹ فروخت کرنے والی تمام کھڑکیاں بند کر دی گئی تھیں۔ اس کی تینوں سہیلیاں نہیں پہنچی تھیں۔ ہاؤس فل کا بورڈ لگتے ہی سجاد اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

"کیا خیال ہے، کیوں نہ ہم اندر چل کر بیٹھیں؟ اب تو آپ کی سہیلیاں بھی آنے سے رہیں۔ وہ کسی اور سینما میں گھس گئی ہوں گی۔"

"ایک منٹ۔" اس نے اپنا پرس کتابوں کے بیچ سے نکالا اور اس کی زپ کھولنے لگی۔ سجاد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟"

وہ پرس میں سے دس کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "آپ کے نقصان عظیم کی تلافی کر رہی ہوں۔ آپ ٹکٹ کے پیسے لے لیں۔"

"آپ بھی کمال کرتی ہیں۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "کوئی اپنے دوست کو فلم دکھانے کے پیسے بھی لیتا ہے؟ پلیز! آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔"

"میں آپ کی دوست نہیں ہوں۔" اس نے نوٹ بڑھاتے ہوئے اصرار کیا۔ "اگر میں یہ ٹکٹ نہ لیتی تو کوئی اور لے لیتا۔ آپ کو پیسے تو مل جاتے۔"

"آپ میری دوست نہیں ہیں تو ہو جائیں گی بلکہ ہو گئی ہیں سمجھئے۔" سجاد بولا۔ "اگر میرا دوست ساتھ ہوتا تو میں کیا اس سے پیسے لیتا۔ اچھا چلئے فلم شروع ہونے والی ہے۔"

ہال کے اندر پہنچے تو نشستیں سب سے پیچھے اور کارنر کی ملی تھیں۔ سجاد نے تین دن پہلے ہی نشستیں محفوظ کرائی ہوئی تھیں۔ ان ٹکٹوں کے اتفاق نے ان دونوں کو ملا دیا تھا۔ اچانک اور غیر متوقع ملاقات۔ وہ ششدر تھی، بہت خوش تھی۔ اس قدر خوش تھی کہ خوش قسمتی کے ساتوں در اس کے قدموں میں کھلے ہوئے تھے۔ سارا ہال تو فلم دیکھ رہا تھا اور وہ فلم اور تماش بینوں سے بے خبر سجاد کے پہلو میں بیٹھی دنیا سے قطعی بے نیاز مٹی کا تودہ بنی رہی تھی۔ ہال کے گھپ اندھیرے میں تماش بینوں پر بدستور سناٹا رہا تھا۔ مگر پردہ سیمیں پر مکالمے، گانے اور گیتوں کے ساتھ سنگیت کا سفر جاری تھا۔ جب کبھی محبت کا جذباتی منظر آ جاتا تو ہال میں ایسا سناٹا طاری ہو جاتا جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ مگر شکیلہ کے لئے تو لحہ لحہ آسودہ تھا۔ نس نس میں برقی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کے دل کے نہاں خانے میں کسی طوفان کے بعد والا گہرا سکوت طاری تھا۔ وہ اپنی کرسی پر سمٹ کر نہیں بیٹھی تھی۔ اسے سجاد سے پوری پوری توقع تھی کہ وہ ایسا شخص نہیں ہے جو ایک ٹکٹ میں کئی مزے لے لے۔ ورنہ جوان لڑکی اور لڑکوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ لڑکیوں اور عورتوں کے لمس کے لئے بازاروں اور سینماؤں میں ہی نہیں بسوں میں بھی لمس کی تلاش میں کسی کتے کی طرح دم ہلاتے نظر آتے ہیں۔ اگر سجاد اپنی ذرا سی مہربانی کا فائدہ کسی انداز سے اٹھانا چاہتا تو شاید وہ بُرا نہ مانتی۔ جیسے سجاد انجانے میں اپنا شانہ اس کے شانے سے ملا لے یا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لے۔ پہلو بدلتے ہوئے اپنا پیر اس کے پیر سے نادانستگی کے انداز میں ٹکرا لے۔ مگر سجاد اپنی نشست پر اسی طرح بیٹھا تھا جیسے اس کا وجود ہی نہ ہو۔ نہ تو سانسوں کی سنسناہٹ تھی اور نہ ہی کوئی جھنجھناہٹ سی تھی۔ جیسے وہ اپنی جگہ دم بخود ہو کر فلم دیکھ رہا ہو اور وہ کسی جہاں دیدہ عورت کی طرح ہوش و حواس

درست کئے بیٹھی تھی۔ یہ جانتے ہوئے کہ مرد اور ناگ کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ ایک بھرپور جوان لڑکی ہونے کے ناطے اسے بسوں' تانگوں اور بازاروں میں مردوں کی عامیانہ حرکتوں کا تجربہ تھا۔ اسے بڑی بے بسی سے ان تجربات سے گزرنا پڑتا تھا۔

انٹرویل ہوا تو ان دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ سجاد نے مسکرا کر پوچھا۔ "فلم کیسی لگ رہی ہے۔ آپ بور تو نہیں ہو رہی ہیں؟" وہ کیا جواب دیتی کہ فلم کیسی لگ رہی ہے۔ وہ اسے کیسی بتاتی کہ وہ فلم نہیں دیکھ رہی تھی۔ گو اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور اسکرین پر بے خیالی سے جمی ہوئی تھیں۔ اسے اب تک کچھ نہیں پتا تھا کہ فلم کی کہانی کیسی جا رہی ہے اور اس نے کہاں آ کر سانس لی ہے۔ وہ تو اپنے محبوب کی قربت میں بیٹھی خیالوں کی دنیا میں بھٹک رہی تھی۔ اس کے ساتھ بلندیوں میں پرواز کر رہی تھی۔ آسمان کی وسعتوں میں نغمے گا رہی تھی۔ دھنک کے رنگوں کی طرح آسمان پر بکھری ہوئی' نکھری ہوئی تھی۔ پھر اس نے اپنی نشست پر کسمسا کر اپنے دوپٹے کو بار بار درست کیا۔ وہ مسکراتی شوخ نگاہوں سے سجاد کی سحر کن آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔ "صبیحہ اور سنتوش تو میرے پسندیدہ فنکار ہیں۔ میں ان کی کوئی فلم نہیں چھوڑتی ہوں۔ ان کی ہر فلم مجھے اچھی نہیں بہت اچھی لگتی ہے۔" اس انداز سے یہ بات کہہ کر اس نے ایک طرح سے اپنا بھرم رکھ لیا تھا۔ بات بھی بن گئی تھی اور سجاد بھی کسی احمق کی طرح خاموش ہو گیا تھا۔

سجاد نے انٹرویل میں اس کے لئے نہ صرف ٹھنڈی بوتل بلکہ پستہ بادام اور چپس بھی خرید دیئے تھے۔ انٹرویل ختم ہونے تک ان دونوں کی آپس میں باتیں ہوتی رہی تھیں۔ سرگوشیوں کے انداز میں کیونکہ کتنی ہی کینہ توز نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اگلی نشستوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے کان بھی لگے ہوئے تھے اور کسی نہ کسی بہانے سے پلٹ کر بار بار دیکھ لیتے اور اپنی ندیدی آنکھوں کی پیاس بھی بجھا لیتے تھے۔ اس کے لئے یہ نگاہیں اور حرکتیں نئی نہیں تھیں۔ اس لئے کہ وہ ایک جوان لڑکی تھی' عورت تھی۔ اسے گھر سے باہر روز ہی نکلنا پڑتا تھا۔ ہوس کے ان تیروں کی بوچھاڑ سے اس طرح گزرنا پڑتا تھا جیسے پل صراط ہو۔ اس نے اتنا اثر نہیں لیا تھا مگر سجاد کو بڑا غصہ آ رہا تھا مگر وہ اپنے غصے کو خون کے گھونٹ کی طرح پی رہا تھا اور دعا مانگ رہا تھا کہ جلدی سے یہ انٹرویل ختم ہو اور اندھیرا ہو جائے تو ان نگاہوں سے نجات ملے۔ آج یہ انٹرویل اتنا لمبا اور اس قدر عذاب ناک کیوں ہو گیا ہے۔ وقت کی نبض کس طرح تھم گئی ہے؟

شکیلہ نے کھانے کے لوازمات کے پیسے دینے چاہے تو سجاد نے اسے دینے نہیں دیئے۔ وہ آدمی پیسے لے کر چلا گیا تو اس نے ہنس کر اور سجاد کے کان کے پاس اپنا منہ لے جا کر سرگوشی کی تھی۔ "آج کے مفت ٹکٹ کا جواب نہیں۔ اس ٹکٹ میں واقعی آج کئی مزے ہو رہے ہیں۔ کاش! میری سہیلیاں بھی ساتھ ہوتیں۔"

جبھی ایک دم سے ہال میں اندھیرا چھا گیا اور اشتہاری سلائیڈ دکھائے جانے لگے۔ کچھ دیر بعد فلم بھی شروع ہو گئی مگر اس کا ذہن کچھ اور سوچنے لگا تھا۔ اس کے دل کے کونے میں ایک نادیدہ سی آواز اس سے مخاطب تھی۔

"شکیلہ! واقعی یہ تم ہو جو ایک اجنبی مرد کے اتنے قریب ہو گئی۔ اس سے پل بھر میں دل کا اور اپنائیت کا رشتہ بھی جوڑ لیا۔ تمہیں کچھ خبر ہے کہ تم کس انجانے راستے پر چل رہی ہو۔ تم نے کبھی سوچا بھی ہے کہ یہ اندھا جنون تمہیں کہاں اور کس راستے پر لے جا رہا ہے؟ کہاں جا رہی ہو؟ تم نے ایک مرد پر اتنا اندھا بھروسہ کیسے کر لیا؟ پہلی ہی اور مختصر سی ملاقات میں تم کسی پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں گرنا چاہتی ہو؟ پھر اس کے کان میں اس کی امی کی باتیں گونجنے لگیں اور پھر اس کی نظروں میں ارشد کا نیگرو چہرہ ابھر آیا۔ پھر اس نے ان سب کو اپنے ذہن سے جھٹک کر پیچھا چھڑانا چاہا تو اسے ان سب سے پیچھا چھڑانا ناممکن سا نظر آ رہا تھا۔ ارشد کا چہرہ اور ماں کی تلخ و تند اور زہریلی باتیں اسے کسی سانپ کی طرح ڈستی ہوئی لگ رہی تھیں۔ اس عذاب سے نجات پانے کے لئے وہ نہایت سبک رفتاری سے اپنی نشست کے دوسرے سرے پر کھسک گئی۔ اتنا آہستہ اور غیر محسوس انداز سے کہ سجاد کو بھی احساس تک نہ ہو سکا تھا۔ پھر اس نے بغیر کسی جھجک اور تذبذب کے اپنا سر بڑی آہستگی سے سجاد کے کندھے پر رکھ دیا۔ پیچھے نشستوں کی قطار تو نہ تھی جو کوئی اس کی حرکات و سکنات کو دیکھتا۔

دوسرے لمحے سجاد نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ کی گرفت میں لیا تو اس کے ہاتھ کی نرمی' گرمی اور ملائمت سجاد کے مضبوط ہاتھ میں محبت کو جلا بخشنے لگی تھی۔ لمحات آتشیں بن گئے۔ نس نس میں جیسے محبت کی نئی روح دوڑ رہی تھی۔ ان کے تمام گوشوں میں پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ وہ محبت کے نشے میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ کھو رہی تھی' بھٹک رہی تھی۔

فلم کے اختتام پر وہ دونوں اس وقت تک ہال میں بیٹھے رہے تھے جب تک تماشائیوں کی ایک بڑی تعداد باہر نہیں نکل گئی تھی۔ جب خاصا ہال خالی ہو گیا تو اس نے

کتابوں کے بیچ سے برقع نکال کر پہنا اور نقاب سے نصف چہرہ چھپا کر سجاد کے ساتھ باہر آئی۔ سجاد نے اپنی کار کے پاس پہنچ کر دروازہ کھولا تو وہ بغیر کسی جھجک کے اپنا سراپا سمیٹ کر اندر جا بیٹھی۔ سجاد نے اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر اسے محبت پاش نگاہوں سے دیکھا تو اس نے کسی شرمائی ہوئی دلہن کی طرح سر جھکا لیا اور اس کے رخساروں پر شفق کی سی سرخی بکھر گئی۔ چند لمحوں تک اس کی نظریں جھکی رہیں۔

"کیا خیال ہے' کسی ریستوران میں چل کر چائے پی لی جائے۔ سر میں بڑا سخت درد ہو رہا ہے اور چائے کی طلب بھی شدت سے ہو رہی ہے۔ مال روڈ چل کر چائے پی لیتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟"

وہ انکار نہ کر سکی تھی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی۔ "میں چاہتی ہوں کہ اندھیرا ہونے سے پہلے گھر پہنچ جاؤں ورنہ امی بہت ناراض ہوں گی۔"

سجاد نے کار چلاتے ہوئے سڑک سے نظریں ہٹا کر شکیلہ کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ ابھی دن پوری طرح ڈوبا نہیں تھا۔ سورج کی سمٹتی ہوئی روشنی میں سنہرا پن آ گیا تھا۔ اس کی سنہری کرنیں عمارتوں کے بغل اور درختوں سے چھن رہی تھیں۔ جب بھی اس کی گاڑی ان کرنوں کی زد میں آ جاتی تو وہ شکیلہ کے چہرے پر منعکس ہو جاتی تھیں۔ شکیلہ کی نیزے جیسی لانبی پلکیں اسے جیسے سلام کر رہی تھیں۔ غزالی آنکھیں منجمد سی تھیں۔ وہ خود بھی کسی مورتی کی طرح اپنی جگہ بے حس و حرکت اور جامد سی بیٹھی تھی۔ سجاد نے شگفتہ لہجے میں پوچھا۔

"یہ آپ علامہ اقبال کی طرح کیا سوچ رہی ہیں؟"

"جی .... جی' کون میں؟" وہ چونک پڑی اور پھر اس کے ہونٹوں پر تبسم پھیل گیا۔ سجاد کو تبسم کی ادا بے حد پسند آئی تھی۔ اس نے شکیلہ کی غزالی آنکھوں میں جھانکا تو وہاں چاہت اور سپردگی جھانک رہی تھی۔ اگر اسے ایکسیڈنٹ کا خطرہ نہ ہوتا اور اس کی کار ٹریفک کے ہجوم میں نہ ہوتی تو وہ ان آنکھوں میں جھانکتا رہتا جس نے ایک نگاہ میں وہ سب کچھ دے ڈالا تھا جو بعض اوقات ایک مرد جبر و زیادتی اور اپنی پوری قوت صرف کر کے بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ خود بھی حیران تھا کہ یہ حسین سی اور شہزادیوں جیسی لڑکی پلک جھپکتے ہی کیسے اور کیوں کر اس کی الفت میں گرفتار ہو گئی۔ یہ کوئی گری پڑی بازاری عورت نہیں تھی۔

اس نے دنیا دیکھی تھی۔ لڑکیاں اور عورتیں اس کے لئے کوئی نئی نہیں تھیں۔

اسے آبرو باختہ لڑکیوں کا تجربہ تھا اور وہ کتنی ہی عورتوں کے تجربات سے گزر چکا تھا۔ ایسی کوئی لڑکی جو غلط راستوں کی مسافر ہو اور ایسی عورتیں جو عورت کے تقدس پر داغ دھبا ہوتی تھیں۔ کیسے ہی شرافت کے خول میں آ جائیں اور پاکیزگی کی چادر اوڑھ لیں وہ تو ایک ہی نظر دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ یہ لڑکی کون ہے۔ اب شکیلہ کے بارے میں لاکھ کوئی قسمیں کھائے کہ یہ مکار لڑکی ہے اور غلاظت کی گٹھری ہے جو شرافت کے خول میں بند ہو کر پاکیزگی کی اداکاری کر رہی ہے تو وہ کسی صورت میں ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس لئے کہ اس لڑکی کی ذات سات پردوں میں چھپی ہوئی نہیں ہے۔

اس نے شکیلہ کے بارے میں غلط نہیں سوچا تھا۔ اس کا رنگ روپ شہزادیوں ہی کی طرح تھا۔ اس کی کھلی پیشانی' آنکھوں' آواز کی کھنک اور لب و لہجے کی نفاست اور فصاحت سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کسی اعلیٰ گھرانے اور خاندان کی لڑکی ہے۔ لڑکیاں اور عورتیں جو اعلیٰ طبقے کے افراد' رؤسا اور معززین شہر کے بستروں کو میلا کرنے کے لئے ہوتی ہیں وہ ان میں سے نہیں ہوتی ہیں۔ وہ لڑکیاں بظاہر کسی بڑے خاندان کی لگتی تھیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہوتی تھیں۔ مگر وہ پھر بھی اپنی اصلیت نہیں چھپا سکتی تھیں اور پھر وہ کسی سینما پر آ کر مردوں پر جال نہیں پھینکتی تھیں اور نہ ہی انہیں اس کی ضرورت تھی۔ تاہم وہ ششدر تھا کہ آخر یہ لڑکی کس بات پر کس کمزوری کی بنا پر اس کی جانب مائل ہو گئی ہے۔ وجاہت پر مرمٹ کر اتنی جلدی برسوں کا فاصلہ طے کر لینا حیران کن تھا۔

شکیلہ بھی سوچ رہی تھی کہ وہ دونوں محبت آشنا ہو گئے ہیں۔ ایک دوسرے کے دلوں کے گوشوں میں محبت کا گداز پیدا ہو گیا ہے۔ وہ دونوں صرف دو گھڑی میں اتنے قریب آ چکے ہیں کہ جیسے دو صدیوں سے ان میں واقفیت ہے۔ پھر بھی ان دونوں کے درمیان اجنبیت کی ایک کمزور دیوار کھڑی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے نام سے ناواقف تھے اور آپس میں متعارف بھی ہوئے تھے۔ یہ بڑی عجیب و غریب اور انوکھی سی بات تھی۔ اس نے سوچا کہ ہوٹل پہنچنے سے پہلے ہی تعارفی رسم ادا کر جانا چاہئے۔ یہ سوچ کر اس نے سجاد کی طرف دیکھا اور بڑی شیفتگی سے بولی۔

"کیا میں اس شریف آدمی کا نام پوچھ سکتی ہوں جو ایک ٹکٹ میں کئی مزے کروا رہا ہے؟"

"آپ مجھے سجاد شریف کہہ سکتی ہیں۔" وہ اس کی بات سن کر ہنس پڑا۔ "میں ایک سپلائر ہوں' میری ایک چھوٹی سی کمپنی ہے جو سپلائی کا کام کرتی ہے۔ میرا ایک پیر بھی

کراچی میں ہوتا ہے تو دوسرا لاہور میں۔ لائل پور میں میرا گھر ہے۔ جہاں میری ماں' بھائی اور بہنیں رہتی ہیں۔ میرے دفاتر اور فلیٹس بھی دوسرے شہروں میں ہیں۔ میں کراچی میں بھی اپنا ایک بنگلہ بنا رہا ہوں جو ہزار گز پر بن رہا ہے۔ یہ بنگلہ کلفٹن کے علاقے میں واقع ہے۔ اس کی چھت اور بالائی منزل کے کمرے سے سمندر کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ اللہ نے اتنا کچھ دیا ہے کہ اسے خرچ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس لئے کوئی مل جاتا ہے تو ایک ٹکٹ میں کئی مزے کرا دیتا ہوں۔"

سجاد نے اسے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس نے سجاد کو اس کی نظروں میں بہت بلند مقام دے دیا تھا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ سجاد اتنا بڑا آدمی ہو گا۔ گو اس نے گاڑی اور وضع قطع اور چہرے مہرے سے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ اس کا محبوب بڑا آدمی ہے۔ اس قدر دولتمند شخص ہو گا' یہ بات اس کے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ اسے دولتمند سے زیادہ ایک وجیہہ' خوبصورت اور اسمارٹ شہزادے کی ضرورت تھی جو اسے مل گیا تھا۔ سونے پر سہاگا یہ تھا کہ وہ دولتمند بھی تھا۔ اس کے پاس کراچی میں ایک' لائل پور میں ایک اور لاہور میں ایک کار تھی۔ کل تین کاروں اور جائیداد کا بھی مالک تھا اور کاروبار بھی بڑا تھا۔ اس کے دفاتر ملک کے بڑے بڑے شہروں میں تھے۔ ان تفصیلات نے اسے عجیب سی خوشی سے سرشار کر دیا تھا۔

"آپ نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔" سجاد نے ایک موڑ کاٹتے ہوئے اس کے دمکتے چہرے پر نظریں مرکوز کر دیں۔

"میں بی اے کی طالبہ ہوں۔ یہ میرا آخری سال ہے۔ میرا نام شکیلہ چودھری ہے۔ میرے والد کی سینیٹری کی دکان ہے' برانڈرتھ روڈ پر۔"

سجاد نے شیزان کے سامنے کار لے جا کر روک دی اور اپنا ہاتھ اس کی طرف مصافحہ کے لئے بڑھایا تو وہ لمحہ بھر کے لئے جھجکی' پھر اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے شکیلہ سے مصافحہ کرتے ہوئے شوخی سے بولا۔

"آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ جب بھی ہم ملیں گے خوشی ہوتی رہے گی۔ کیوں؟"

زندگی میں پہلی بار اس نے اس اعلیٰ قسم کے ریستوران میں قدم رکھتا تھا جو خوابناک ماحول لئے ہوئے تھا۔ وہ کبھی ایسے شاندار قسم کے ریستوران میں نہیں داخل ہوئی تھی۔ اس ریستوران کے ہال کے اندر ملگجی سی روشنی تھی۔ شکیلہ کو اندر داخل ہو کر

ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ ایک دم سے اندھیرے کی وسعت میں لپٹ گئی ہے۔ جب اس کی آنکھیں اس ملگجی روشنی میں دیکھنے کی عادی ہوئیں تو اس نے دیکھا کہ ایک بڑا وسیع ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ لاہور کے تمام حسین جوڑے اور مرد یہاں آ گئے ہیں۔ بالکل قریب قریب چھوٹی چھوٹی میزیں پڑی تھیں جن کے گرد چار چار کرسیاں تھیں۔ سجاد ہال کے وسط میں کھڑا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ بھی حیرت سے کسی قدر مرعوب ہو کر دیکھ رہی تھی۔ ہال میں مردوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکیاں اور عورتیں اسے دیکھ رہی تھیں اور وہ انہیں دیکھ رہی تھی۔ اس نے سجاد کی درخواست پر برقع اتار کر کار میں کتابوں کے ساتھ رکھ دیا تھا۔ وہ بغیر برقع کے تھی اور کالج کے سفید یونیفارم میں لوگوں کو وہ کسی منجمد چاندنی کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ اس اندھیرے میں سفید مدھم چاندنی کی طرح کھل اٹھی تھی۔ سجاد ابھی جائزہ لے ہی رہا تھا کہ ایک ویٹران کے پاس آیا اور انہیں ایک گوشے میں لے گیا۔ جہاں پہنچ کر وہ کتنی ہی نگاہوں کی گرفت سے آزاد ہو گئی تھی مگر اپنے محبوب کی نگاہوں کی گرفت میں وہ جکڑی رہی تھی۔ وہ جتنی دیر تک ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوبے رہے تھے۔

سجاد نے اسے اس کے محلے کے باہر ایک ایسی جگہ اتار دیا جو سنسان سی تھی۔ اس وقت شام کے دھندلکے اندھیرے میں مدغم ہو چکے تھے۔ گھر پہنچی تو اس نے ماں کو بہت پریشان اور افسردہ پایا تھا۔ آج اس کے اس قدر دیر سے پہنچنے پر وہ جیسے انتظار کی سولی پر لٹک رہی تھیں۔ انہوں نے ممتا بھرے لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔

"شکیلہ بیٹی! آج تم اتنی دیر کہاں رہ گئی تھیں۔ میں نے نذیراں کو صبیحہ کے ہاں بھی بھیجا تھا کہ وہ تمہیں دیکھ آئے۔ خیریت تو ہے نا بیٹی؟"

"خیریت ہے۔" اس نے منہ پھلا کر جواب دیا تھا۔ "میں اپنی سہیلی کے ساتھ فلم دیکھنے چلی گئی تھی۔ واپسی میں اس کے گھر مزنگ سے ہو کر آ رہی ہوں۔"

شکیلہ دوسرے دن گلبرگ پہنچ گئی تھی۔ اس کوٹھی کے اس پورشن میں جہاں سجاد کرایہ پر تنہا رہتا تھا۔ اس نے اپنی ایک عالی شان کوٹھی جو کسی محل کی طرح تھی کرائے پر دے رکھی تھی اور خود دو کمروں کے ایک حصے میں کرایہ پر رہ رہا تھا۔ دو کمروں ایک لاؤنج اور نشست گاہ والا یہ حصہ کسی شاہی محل کے حرم سے کم نہیں تھا۔ اس کا ماحول بڑا سحر زدہ تھا' اثر انگیز تھا۔ وہ کتنی ہی دیر اس مکان کے طلسم میں کھوئی کھوئی سی رہی تھی اور آرائش و زیبائش' راحت و آسائش کے لوازمات کو دیکھتی رہی تھی۔ اسے اس طرح

حیرت سے ایک ایک چیز کو دیکھتا پا کر سجاد مسکرا دیا تھا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ تم کراچی کی کوٹھی اور میرا فلیٹ دیکھو گی تو غش کھا جاؤ گی۔"

شکیلہ کو یہاں آ کر اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اسے یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ وہ ایک نوجوان لڑکی ہے۔ کسی صاف و شفاف آئینے کی طرح ہے۔ اگر اس پر بال بھی آ گیا' خراش بھی پڑ گئی تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہے گی۔ پھر اسے سجاد تو کجا ارشد بھی قبول نہیں کرے گا۔

سجاد نے اسے سیر و تفریح کے لئے بلایا تھا۔ اس سے کہا تھا کہ وہ اس کے گھر آ جائے تو پھر وہاں سے کہیں گھومنے چلیں گے۔ لاہور میں محبت کرنے والوں کے لئے گھومنے کی جگہیں کم نہیں ہیں اور پھر یہ جگہیں تو حالِ دل سنانے کے لئے ہوتی ہیں۔ سننے کے لئے ہوتی ہیں۔ اس نے یہاں آ کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ غلطی پر غلطی ہو گئی تھی۔ وہی آج اس قدر سج دھج کر آئی تھی کہ ایک مرد پر بجلی بن کر گری تھی۔ پھر اس نے ایک مرد کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی اور اس نے سجاد کو جس زاویۂ نگاہ سے دیکھا وہ اس کی زندگی کی جیسے سب سے بڑی بھول تھی۔ ایک لڑکی کو ایک مرد کے بلاوے پر ایسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔ اسے پندارِ حُسن سے کام لینا چاہئے۔ اس کا اس قدر تیز بھاگنا ٹھیک نہیں ہے۔ اگر وہ دھیرے دھیرے اور کسی قدر محتاط ہو کر قدم بڑھاتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ دوریاں تو مرد میں ایک تڑپ پیدا کرتی ہیں۔ اس میں والہانہ اشتیاق اور بے حد کشش ہوتی ہے۔ دور دور رہنے میں جو بڑا لطیف سا رومان ہوتا ہے وہ بار بار ملنے سے کم ہوتا جاتا ہے۔ کسی کے خیالوں میں گم بیٹھے بیٹھے خیالوں کے رنگین دھاگوں سے جال بُننے میں کتنا مزا آتا ہے مگر اس آنکھ مچولی کی بھی ایک حد مقرر ہونا چاہئے ہمیشہ ہر چیز کی زیادتی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ اگر وہ اس طرح اس کے گھر آتی رہے گی تو یہ مرد اور تنہائی مل کر اسے ڈس لیں گے۔ پھر اس کے پاس کیا رہے گا۔ لوٹ کا مال کبھی واپس نہیں ملتا ہے۔

اور ہاں' اگر مرد کو انتظار کروا کر زیادہ تڑپایا گیا تو پھر کف افسوس ملنا پڑے گا۔ اس لئے کہ لڑکیوں اور عورتوں کی کمی نہیں ہے۔ پھر اس کا محبوب مایوس ہو کر کسی دوسری لڑکی کو اپنے دل میں جگہ دے دے گا تو اسے پھر رونے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔ ایسی صورت میں آنسوؤں کا خزانہ ہی باقی رہ جاتا ہے۔ اسے سب کچھ دے دینے میں کوئی

حرج نہیں ہے مگر ساتھ ہی اس سے بھی زیادہ اپنے پاس محفوظ رکھنا ہو گا۔ یہ تو بڑا سنگین مسئلہ ہے۔ اس کے لئے تو سب سے بہتر تھا کہ وہ یہاں آتی ہی نہیں بلکہ اسے کسی جگہ بلا لیتی۔ جب وہ آ ہی گئی ہے تو پچھتانے سے کیا حاصل۔ اب سجاد کو کسی طرح کسی بھی حالت میں' کسی بھی قیمت پر فوراً باہر چلنے پر راضی کرے۔ یہاں سے جس قدر جلدی نکلو گی اتنا ہی اچھا ہو گا' کہ بدن' سراپا اور چہرے نے کل اسے بہت متاثر کیا تھا' مگر آج تو بات ہی اور تھی۔ شکیلہ نے اسے ایک کڑے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ گہرے عنابی رنگ کے سوٹ میں وہ ایک قیامت برپا کر رہی تھی۔ وہ شکیلہ کو اس طرح دیکھتا رہا تھا جیسے دنیا کا کوئی نوادر عجوبہ دیکھ رہا ہو جس کی دریافت آج ہی ہوئی ہو۔ وہ ان چمکدار غزالی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکتا رہا تھا جو اس تنہائی میں اسے اپنے اندر جذب کر رہی تھیں۔ اس کے چہرے اور سراپا نے اس پر نشہ سا طاری کر دیا تھا۔ ایک مہربان سا نشہ جو اس پر کبھی طاری نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ شکیلہ کے قریب پہنچ کر رُکا۔ اس کے اس قدر قریب تھا کہ درمیان میں صرف چند انچ تھے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے شکیلہ کے شانے تھام لئے تو اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے خوابوں کی جگمگاتی ہوئی تعبیر اس کے ہاتھوں میں دھڑک رہی ہو۔ وہ اس ڈاکو کی طرح بے حس و حرکت اور ساکت و جامد کھڑا تھا جسے کسی خزانے کے پاس تنہا چھوڑ دیا گیا ہو۔

شکیلہ نے اسے اپنے سے اس قدر قریب اور پیاسی آنکھوں سے دیکھتا ہوا پایا تو اس نے سوچا کہ وہ کوئی بہانہ کر کے ابھی اور اسی وقت باہر چلنے کو کہے مگر الفاظ شکیلہ کے حلق میں کانٹے کی طرح چبھ گئے۔ یہ شخص تو اس کا محبوب تھا۔ اس محبوب نے ایک ہی دن میں اسے اپنی محبت کے جال میں اس طرح گرفتار کر لیا تھا کہ وہ نکل بھی نہیں سکتی تھی اور نکلنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ سجاد کی عقابی آنکھیں اسے جیسے ہپناٹائز کر رہی تھیں اور وہ جیسے ہپناٹائز ہو کر رہ گئی تھی۔ سجاد نے اس کے چہرے پر انجانے خوف کی پرچھائیاں دیکھ لی تھیں اور شکیلہ اسے سہمی ہوئی چڑیا کی طرح نظر آ رہی تھی جو طوفان سے کانپ رہی ہو۔ وہ جانتا تھا کہ ہر شریف لڑکی محبت کے جال میں پھنس جاتی ہے تو وہ محبت کے جذبات میں اندھی ہو کر تیزی سے پھر وہ قدم اٹھاتی ہے جس پر وہ بعد میں پچھتاتی ہے۔ شکیلہ بھی یہاں آ کر پچھتا رہی تھی اور خوفزدہ ہو رہی تھی۔ کہیں یہ مرد اس خزانے کو نہ لوٹ لے جو اس کا سب کچھ ہے اور وہ جو برسوں سے کسی محافظ کی طرح اس کی حفاظت کرتی چلی آ رہی ہے۔

سجاد مسکرایا۔ "شکیلہ! تمہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم مجھ پر اعتماد کر

کے آئی ہو تو میں تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں جو آزادی اور مجبوری سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔" سجاد نے توقف کر کے اس کے چہرے پر اپنے الفاظ کا ردعمل دیکھا۔ ابھی بھی شکیلہ کی منجمد آنکھوں میں وحشت تھی۔

اس نے بڑے پُرسکون انداز اور پُراعتماد لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "آج میں تم سے وہ چند باتیں کرنا چاہتا ہوں جو مجھے شاید اتنی جلدی نہیں کرنا تھیں مگر میں مجبور ہو گیا ہوں اب میرے اختیار اور میرے بس میں نہیں رہا کہ ان باتوں کو سینے میں مدفون رکھوں۔ جتنے دن میں ان باتوں کو سینے میں دفن رکھوں گا اتنے ہی دن میرے اندر ناقابلِ برداشت بے چینی رہے گی۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اپنے دل کی کوئی بات اور کمزوری تم سے نہیں چھپاؤں گا۔ تم تو کل میرے دل پر بجلی گرا کر چلی گئیں لیکن تم نے یہ نہیں دیکھا کہ میں کس طرح خاکستر ہو گیا۔ تم تو گھر جا کر بڑے سکون اور اطمینان سے سو گئی ہو گی۔ اپنی پلکوں کے نگر کے دریچے بند کئے اس رات کے وجود سے بے خبر ہو گئی ہو گی جو میرے اور تمہارے درمیان حائل تھی۔ میری زندگی کی یہ پہلی رات تھی جو میں نے کسی کے فراق میں کاٹ کر گزاری تھی۔ میں یادوں کے بھنور میں چکر کھاتا رہا تھا اور یہ رات تھی کہ کاٹی نہیں جا رہی تھی۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بولنا چاہتا شکیلہ!" وہ سانس لینے کے لئے رکا اور گہرا سانس لے کر اس نے اپنی بات جاری رکھی اور وہ سحرزدہ سی ہو کر اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کے پیر فرش کا حصہ بن گئے تھے۔ سجاد بول رہا تھا۔

"میں اس مریض کی طرح جاگ رہا تھا جو موت کا منتظر ہوتا ہے، یہ جانتے ہوئے کہ موت کا ایک دن معین ہے۔ مگر میں تمہاری محبت کا مریض تھا۔ محبت کے مریضوں کو کسی صورت قرار نہیں آتا ہے۔ اگر وہ موت کے لئے ترسے بھی تو اسے موت نصیب نہیں ہوتی ہے اور پھر اس مرض کا علاج تو دنیا میں ابھی دریافت نہیں ہوا ہے۔ کوئی دوا ایسی نہیں ہے جو تڑپتے دل کو قرار پہنچا سکے۔ میں رات بھر جاگتا رہا تھا۔ مجھے تمہارا یہ چہرہ سونے نہیں دے رہا تھا۔ میں ایک پل کے لئے بھی نہیں سو سکا تھا۔ میں تمہارے چہرے کے ان گنت روپ دیکھتا رہا تھا۔ ہر روپ اس قدر حسین تھا کہ میں ان کے سحر میں ڈوبتا رہا۔ میں یہ کہنے میں تم سے کوئی عار، سبکی، جھجک اور باک محسوس نہیں کر رہا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ محبت ہے، محبت ہے۔ اب میں تمہارے بغیر زندگی کا ایک دن تو کیا ایک لمحہ بھی نہیں کاٹ سکتا۔ اگر تم نے مجھ سے محبت نہیں کی، مجھے اور میری محبت کو ٹھکرا دیا تو پھر میں زہر کھا لوں گا۔ یا پھر اپنے آپ کو راوی کے سپرد کر دوں گا اور........." شکیلہ نے

فوراً ہی اس کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تو اس کے لب مٹھاس سے بند ہو گئے۔

سجاد کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ بالکل واضح اور صاف تھا۔ ٹکسال میں ڈھل کر نکلنے والے چاند کے نئے سکوں کی طرح۔ سات سُروں کی طرح، ان سُروں کی طرح جو محبت بھرے نغموں کے امین ہوتے ہیں۔ ہر سُر قوس و قزح کا ایک رنگ ہوتا ہے جو امرت بن کر دلوں کی گہرائیوں میں ٹپکتے رہتے ہیں۔

"شکیلہ .... شکیلہ!" وہ جذباتی ہونے لگا۔ "میں نے یہ ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے ہیں تو چاہتا ہوں کہ انہیں ساری زندگی کے لئے تھامے رہوں۔"

وہ خود بھی تو یہی چاہتی تھی کہ اس کا محبوب اس کا ہاتھ تھام لے۔ وہ ساری زندگی اس کی محبت کی گھنی چھاؤں میں گزار دے۔

سجاد کی آواز اور اس کی باتوں میں ایسا سحر تھا کہ شکیلہ کے دل کے کونوں سے وہ انجانا خوف نکل گیا تھا جس کے تصور سے وہ اندر ہی اندر لرزہ براندام ہو رہی تھی۔ اب اسے اپنے محبوب سے کوئی ڈر اور خوف نہیں رہا تھا۔ جو محبت کے مریض ہوتے ہیں، جو روح کے ملاپ پر یقین رکھتے ہیں وہ لٹیرے نہیں ہوتے ہیں۔ ان کا ایمان صرف محبت ہے۔ محبت ان کی زندگی ہے، محبت ان کی معراج ہے۔ محبت ہی ان کا سب کچھ ہے۔

"میں آج، ابھی اور اسی وقت تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔" اس نے شکیلہ کی آنکھ میں جھانکتے ہوئے اس کے شانے پھر سے تھام لئے۔ "میں کسی بات کو گھما پھرا کر کہنے کا قائل نہیں ہوں۔ اسی طرح میں تمہاری زبان سے واضح اور صاف الفاظ میں جواب سننا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ لڑکیاں اور عورتیں بات کو بلاوجہ گھما پھرا کر کہنے میں وقت ضائع کرتی ہیں۔ کل میری تم سے ملاقات ہوئی، ہم دونوں اتفاقی اور حادثاتی طور پر صرف ایک دن میں، پورے چوبیس گھنٹے میں ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے ہیں کہ شاید مہینوں میں بھی نہیں آتے۔ شاید اس لئے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور شاید دونوں خوابوں میں، حقیقی زندگی میں ایک دوسرے ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ آج تم میرے بلاوے پر کشاں کشاں جو چلی آئی ہو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تمہیں بھی مجھ سے اتنی ہی محبت ہو گئی ہے جتنی مجھے تم سے ہو گئی ہے۔ ہم دونوں اٹوٹ محبت کے بندھن میں بندھ گئے ہیں اور یہ محبت ہم دونوں کو اب کبھی جدا نہیں ہونے دے گی۔" کچھ توقف کے بعد وہ خوابناک لہجے میں بولا۔

"میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اگر میرا بس چلے اور تم تیار ہو تو ہم ابھی شادی

کر لیں۔ مگر میں اس انداز کی شادی کو بالکل پسند نہیں کرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ روایتی طور پر تم اپنے گھر سے رخصت ہو۔ ہم شادی کر کے اپنا ایک خوبصورت اور جنت جیسا گھر بنائیں گے۔ جس گھر کی فضا میں قوس و قزح کے رنگ ہوں گے۔ اس کے ماحول میں ہماری محبت پروان چڑھتی رہے گی۔" سجاد بڑے ہی نپے تلے مدھم اور خوابناک لہجے میں بولتا چلا گیا۔

شکیلہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دور بہت دور چلی گئی تھی۔ اس کے کانوں میں شادی کے گیت اور ڈھولک کی تھاپ گونج رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اس سہاگ رات کا تصور اس کے خیالوں میں لہرا رہا تھا جس کا خواب ہر لڑکی دیکھتی ہے۔ یہ خواب جو ہر لڑکی کی امانت ہوتا ہے۔ شادی کی بات سن کر وہ اس قدر خوش ہوئی تھی کہ اس کا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ شکیلہ نے اپنی آنکھیں کھول دیں تو وہ بولا۔

"شاید تم یہ کہنا چاہو گی کہ میں تمہارے بی اے کرنے تک انتظار کروں لیکن میں اتنے دنوں تک انتظار نہیں کا قائل نہیں ہوں۔ آخر تم یا تمہارے گھر والے اس چکر میں کیوں پڑنا چاہتے ہیں؟ جیسا کہ ہر والدین اس چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ آخر کس چیز کی میرے پاس کمی ہے۔ میرے پاس کوٹھی ہے' کار ہے اور اتنا بینک بیلنس ہے کہ تم ایک شاہانہ زندگی بڑے آرام اور پُرسکون انداز سے گزار سکتی ہو۔ مجھے تم سے کوئی نوکری تو کرانا نہیں ہے جو تم بی اے کرو گی۔"

شکیلہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ سجاد کی باتوں کا کیا جواب دے۔ اس کے لئے شادی کی پیشکش سجاد کی طرف سے اچانک اور اس قدر متوقع تھی کہ وہ بدحواس سی ہو گئی تھی۔ اسے شادی کے لئے ایک مہلت درکار تھی۔ بی اے کرنے کے لئے نہیں بلکہ ارشد کا پتھر راستے سے ہٹانے کے لئے۔ ارشد جو پتھر بن کر اس کی راہ میں آ گیا تھا اس کا ہٹانا اس قدر آسان نہ تھا۔ سجاد حیرت سے شکیلہ کو دیکھ رہا تھا جو شادی کی پیشکش پر خوش ہونے کی بجائے زرد سی ہو گئی تھی۔ اس کے بدن کی لرزش وہ صاف طور پر محسوس کر رہا تھا۔ اس نے شکیلہ کو سہارا دے کر بڑی آہستگی سے صوفے پر بٹھایا اور فریج سے ایک گلاس پانی لا کر دیا تو شکیلہ ایک ہی گھونٹ میں غٹاغٹ پی گئی۔

یہ ٹھنڈا پانی اسے بالکل آبِ حیات کی طرح محسوس ہوا تھا۔ جیسے ہی پانی حلق سے نیچے اترا اس کی رگ رگ میں فرحت دوڑ گئی تھی اور اس کا اعتماد بحال ہونے لگا تھا۔ وہ اپنے حواس اور آواز کی لرزش پر قابو پا کر مضبوط لہجے میں بولی۔

"جو کیفیت آپ کی ہے وہی میری بھی ہے۔ میں نے بھی آپ کی طرح جاگ کر رات کاٹی ہے اور یہ رات خود ہی کٹتی رہی ہے۔ جو آپ چاہتے ہیں وہی میں بھی چاہتی ہوں۔ ہم یہاں سے نکل کر کھلی فضا میں چلتے ہیں۔ میں آپ کو بتاتی ہوں کہ میرا مسئلہ کیا ہے۔ میں آپ کو اندھیرے میں رکھنا نہیں چاہتی ہوں۔"

☆------☆------☆

نذیراں اس کے پڑوس میں رہتی تھی۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کی بیوہ عورت تھی۔ اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ وہ اس بھری دنیا میں اکیلی تھی۔ وہ محلے والوں کی خدمت کر کے جی رہی تھی۔ وہ ایک مستعد اور محنت کش عورت تھی۔ ایماندار اور قابل بھروسہ بھی تھی۔ جب کوئی شادی بیاہ میں کہیں جاتا تو اپنا گھر اس کے سپرد کر جاتا۔ کیا مجال کہ کوئی چیز اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ وہ اس گھر میں بیٹھ کر عبادت الٰہی میں مشغول ہو جاتی تھی اور ان گھروں میں بھی رہ جاتی تھی جہاں جوان لڑکیوں کو گھر والے تنہا چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ اس کے عوض نذیراں کو مناسب معاوضہ اور کھانا وغیرہ اور عید خوشی کے موقع پر کپڑے لتے مل جاتے تھے۔ شکیلہ نے اسے اپنے ہاں بلایا۔ پانچ کا ایک نوٹ تھمایا اور ارشد کے نام ایک پرچہ دے کر کہا۔

"نذیراں خالہ! تم ابھی اور اسی وقت ارشد کی دکان پر جاؤ اور اس خط کا جواب لے کر فوراً آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

شکیلہ کی امی اپنی بڑی بہن کے ہاں صبح سے چلی گئی تھیں بڑی خالہ شاہدرہ میں رہتی تھیں۔ وہ اکثر صبح جاتی تھیں تو پھر رات ہی کو لوٹتی تھیں۔ دکان سے واپسی پر ان کے ابو انہیں لے آتے تھے۔ وہ نذیراں کو گھر پر چھوڑ گئی تھیں۔ مگر نذیراں کو کسی وجہ سے بلایا نہیں تھا۔ نذیراں کی بجائے شکیلہ خود گھر پر رہ گئی تھی۔ کچھ سوچ کر ہی وہ آج کالج نہیں گئی تھی۔ کچھ دیر بعد نذیراں آئی تو ارشد کا جواب لے کر آئی تھی۔ ارشد نے اس کے پرچے کی پشت پر لکھا تھا۔

"شکیلہ! تمہارا خط پا کر میں بہت حیران اور خوش ہوا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ ایسی کون سی خاص بات ہے جو تم مجھ سے کرنا چاہتی ہو۔ تمہارے اس خط اور فوراً بلاوے نے دوسری طرف مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا ہے۔ دکان پر بہت رش ہے اور دو سیلز مین آج بیماری کی وجہ سے نہیں آئے ہیں۔ ایک گھنٹے کے بعد رش کم ہو جائے گا۔ اپنی طرف سے

پوری پوری کوشش کروں گا کہ جتنا جلدی ہو سکے تمہارے ہاں پہنچ جاؤں۔"

ارشد شکیلہ کے گھر پہنچا تو نذیراں نے اسے نشست گاہ میں بٹھا دیا۔ وہ اس گھر میں آج سے نہیں برسوں سے آتا رہا تھا۔ یہ گھر اور اس کے افراد اس کے لئے نئے نہیں تھے۔ وہ بھی اس خاندان کا ایک فرد تھا۔ اس نے اس گھر کا ایک فرد بننے کے لئے اپنا رشتہ بھیجا تھا۔ شکیلہ بچپن ہی سے اس کی کمزوری بنی ہوئی تھی۔ بچپن سے جوانی اور نوجوانی سے شباب کی منزل میں قدم رکھنے تک بھی وہ اس کے خیالوں میں' سانسوں میں اور خوابوں میں بسی ہوئی تھی اور اب تو وہ اس کے لئے سب کچھ ہو کر رہ گئی تھی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک شکیلہ اس سے بے حد قریب تھی۔ اتنی قریب تھی کہ خاندان کے بہت سارے لڑکوں حتیٰ کہ مردوں تک کو یہ میل جول ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ شکیلہ کے گھر والوں کو اس کے آنے جانے پر کبھی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ اکثر وہ شکیلہ کو فلم دکھانے بھی لے جاتا تھا۔ وہ چھٹیوں کے دنوں میں تاریخی مقامات اور پارکوں میں سیر و تفریح کے لئے آتے جاتے رہتے تھے۔ جوانی کی دہلیز پار کر کے شباب کی حدود میں قدم رکھتے وقت شکیلہ کی ماں نے اسے غیر محسوس انداز سے یہ احساس دلایا تھا کہ اب شکیلہ سے اس طرح کا میل جول مناسب نہیں ہے۔ پھر اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر شکیلہ کو اپنانا ہے تو اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہو گا اور اپنی زندگی بنانی ہو گی۔ جب وہ کسی قابل ہو جائے گا تو شکیلہ اس کے حوالے کر دی جائے گی۔ بچپن ہی سے وہ جدوجہد کر رہا تھا۔ جوان ہوتے ہی اس نے اپنی روزی کمانا شروع کر دی تھی۔ مگر وہ اس سے خود مطمئن نہیں تھا۔ اس نے کوئی اچھا کاروبار کرنے کے لئے کچھ رقم پس انداز کر رکھی تھی۔ اس نے دو ایک جگہ بی سی ڈال کر ایک بڑی رقم حاصل کی اور دکانداری شروع کر دی۔ جب اس نے دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کی مالی حالت مستحکم ہو گئی ہے تو اس نے شکیلہ کے لئے اپنا رشتہ بھیج دیا۔ اس کا رشتہ رسمی طور پر شکیلہ کے والد نے منظور کر لیا تھا۔

ارشد نشست گاہ میں بیٹھا فلمی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا مگر اس کی نگاہیں بار بار سامنے والے کمرے کی دہلیز کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ وہ شکیلہ کے انتظار میں بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا کہ اس نے ایک ماہ سے شکیلہ کو نہیں دیکھا تھا۔ ماضی کے دریچوں سے کتنی ہی یادیں ایک ایک کر کے اس کے ذہن کے پردوں پر ابھر رہی تھیں۔ شکیلہ کا وہ چہرہ اس کی نظروں میں جگمگا رہا تھا جس کے ان گنت روپ تھے۔ اس کے چہرے کے یہ تمام

روپ اس کے دل کے نہاں خانوں میں نقش تھے۔

دہلیز کا پردہ لہرایا تو ارشد کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کے دل کی دھڑکن بھی بند ہو گئی ہے۔ پردہ ہٹا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ آسمان کا پورا چاند زمین پر اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ اس کمرے میں اتر آیا ہے۔ ارشد شکیلہ کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ صرف ایک مہینے میں شکیلہ کے چہرے پر بڑا فرق آ گیا ہے۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کے لباس میں تھی۔ شکیلہ کے وحشی حُسن نے اسے کچھ دیر کے لئے دم بخود سا کر دیا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ دوسرے لمحے ارشد جیسے کسی ڈراؤنے خواب کو دیکھ کر گھبرا کر بیدار ہو گیا تھا۔ شکیلہ کے چہرے پر ایک گہری سنجیدگی طاری تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور سفاک سی خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ تو یہ سمجھا تھا کہ شکیلہ لجاتی شرماتی اور حیا آلود ہو کر اس کے سامنے آئے گی۔ جبھی تو وہ فوراً ہی اس کے سامنے نہیں گئی تھی۔ اس میں رعونت سی نظر آ رہی تھی۔ اس نے بڑے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ارشد بھائی! بیٹھ جایئے۔ میں نے آپ کو ناوقت یہ تکلیف دی جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ اس کے لئے میں مجبور تھی۔"

"آپ" کے تخاطب نے ارشد کو چونکا دیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان جیسے اجنبیت کی دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ وہ ششدر سا ہو کر شکیلہ کو دیکھتا رہا جس کے سراپا میں ایک لہر سی اٹھ رہی تھی اور وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر پیر پر پیر رکھ کر رعونت کے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ بھی صوفے پر بیٹھ گیا۔ شکیلہ کا یہ روپ اور یہ چہرہ تو اس کے لئے بالکل نیا تھا۔ اس نے اٹھارہ بیس برسوں میں کبھی شکیلہ کا یہ بہروپ نہیں دیکھا تھا۔

آخر اس نے سکوت کو توڑا۔ "شکیلہ! تم نے مجھے کس لئے بلایا ہے؟" اسے اپنی آواز کھوکھلی سی محسوس ہو رہی تھی۔

شکیلہ نے اپنی وحشی نظریں اٹھا کر جھکا لیں۔ اس نے چند لمحوں بعد دھیمی آواز میں کہا۔ "میری عاجزانہ درخواست ہے کہ آپ اپنا رشتہ واپس لے لیں' انکار کر دیں۔"

"کیا؟" ارشد اس طرح سے اچھلا جیسے کسی نے اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا ہو۔

"کیا مطلب شکیلہ! میں .... میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میرا مطلب صاف اور واضح ہے ارشد بھائی!" وہ چہرہ اوپر اٹھا کر بولی۔ "میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ مجھے آپ کا رشتہ کسی قیمت پر منظور نہیں ہے۔"

"وہ کیوں؟" ارشد پر جیسے بجلی سی گر پڑی تھی۔ اس پر سکتہ سا چھا گیا تھا۔ وہ چند لمحوں کے بعد بولا۔ "آخر مجھ میں کیا خرابی ہے؟ میں.........."

"آپ میں کوئی خرابی یا برائی نہیں ہے۔" شکیلہ نے نظریں چرا کر دیوار کی طرف دیکھا۔ "میں کسی وجہ سے آپ کے ساتھ شادی کرنا نہیں چاہتی ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں.........."

ارشد نے درمیان میں کہا۔ "آخر وہ کون سی وجہ ہے شکیلہ! جس نے تمہارے اور میرے درمیان انکار کی دیوار کھڑی کر دی ہے۔ مجھے بھی تو بتاؤ؟"

"میں وجہ بتانا نہیں چاہتی ہوں اور پھر آپ انکار کی وجہ معلوم کر کے کریں گے بھی کیا؟ ارشد بھائی! میں نے جو فیصلہ کر لیا ہے اب اس فیصلے پر کوئی نظرثانی نہیں کروں گی۔ اس لئے کہ یہ فیصلہ میں نے خود کیا ہے۔ خوب سوچ سمجھ کر۔ مجھے یہ حق حاصل ہے اور اختیار ہے کہ میں اپنی زندگی اور مستقبل کے بارے میں فیصلہ کروں۔" شکیلہ نے سر جھکا کر آہستہ آہستہ کہا۔ "میرے والدین نے آپ سے شادی کے لئے جو ہامی بھری تھی وہ مجھ سے پوچھے بغیر تھی۔ اس رشتے کے سلسلے میں مجھ سے مشورہ تک نہیں کیا گیا ورنہ آپ اندھیرے میں نہیں رہتے۔"

"میں تم سے شادی سے انکار کی وجہ پوچھ رہا ہوں۔" ارشد کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ "مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم نے یہ فیصلہ کس لئے کیا ہے؟"

شکیلہ نے چند لمحوں کے تذبذب کے بعد کھنکار کر گلا صاف کیا اور مجرمانہ انداز میں بولی۔ "میں نے کسی اور کو اپنا ہم سفر بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے ہر قیمت پر اس شخص سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو مجھے پسند ہے۔ جس سے میں محبت کرتی ہوں۔ وہ بھی مجھے بہت چاہتا ہے۔"

"کیا کہا؟" ارشد جیسے سناٹے میں آ گیا۔ چند لمحے دونوں پر ایک ہیبت ناک سی خاموشی چھائی رہی اور پھر اس نے اسی انداز میں پوچھا۔ "تم کسی اور سے شادی کرو گی۔ وہ شخص کون ہے شکیلہ؟"

"تم اسے نہیں جانتے ہو ارشد بھائی!" وہ تم کے تخاطب پر آ گئی۔ "میں اس کے بارے میں پھر کسی وقت تمہیں بتاؤں گی۔ مگر ایک بات ذہن نشین کر لو کہ میں شادی کروں گی تو اسی شخص سے ورنہ نہیں کروں گی۔"

ارشد ایک دم سکتے میں آ گیا تھا۔ شکیلہ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر بڑے

مضبوط لہجے میں اور پُراعتماد انداز میں کہا تھا۔ ایک لمحہ، دو لمحے، کئی لمحے اور جیسے کئی صدیاں! خاموشی کی پتھریلی اور نوکیلی سلیں بے آواز سی ان دونوں کے سروں پر گر رہی تھیں اور پھر اذیت ناک سکوت ان دونوں کو کسی پھنکارتے ہوئے زہریلے ناگ کی طرح ڈس رہا تھا۔ شکیلہ تو ایسا محسوس کر رہی تھی کہ اس کے سر سے پہاڑ جیسا بوجھ اتر گیا ہے۔ اس کے اعصاب پھول کی طرح ہلکے پھلکے ہو گئے تھے۔ راستے کا بڑا پتھر جیسے آپ ہی آپ راستے سے ہٹ گیا ہے۔ وہ اندر ہی اندر بہت خوش ہو رہی تھی۔ پھر اس گہری خاموشی میں دھیرے دھیرے ایک قدم کی چاپ ابھری۔ ارشد کے بے جان جسم میں جیسے صدیوں کے بعد حرکت ہوئی تھی۔ وہ کسی موہوم احساس کے ساتھ کھڑکی کی طرف بڑھا۔ جیسے وہ اپنے آنکھوں کے کنائیوں میں دمکتے ہوئے موتیوں کو چھپانا چاہتا ہو۔ شکیلہ بھی کسی خاموش سائے کی طرح متحرک ہو گئی تھی۔

شکیلہ کی چاپ ابھری اور خاموشی میں جذب ہو گئی۔ پھر جیسے صدیوں کے بعد ارشد نے دوسرا قدم اٹھایا۔ اس کے بعد یہ صدیاں کم ہونے لگیں۔ ارشد جیسے خواب کی سی حالت سے چونکا۔ اس نے دیکھا شکیلہ ساتھ والے کمرے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس طرح جا رہی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ یہ کیسی بے رخی ہے؟ کیسی بے اعتنائی ہے؟ ایک آندھی آئی اور ہر چیز کو تہس نہس کر رہی ہے کرتی جا رہی ہے۔ شکیلہ انجان سی بن کر منہ پھیرے جا رہی ہے۔ پھر وہ ہذیانی میں چیخا۔

"شکیلہ! میری بات سنو، تم ایسا نہیں کر سکتیں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"

شکیلہ کے قدموں میں ارشد کی چیخ نے بیڑیاں ڈال دیں۔ وہ رک گئی اور اس کی طرف پلٹی تو اس کی نظروں میں جیسے صدیاں واپس گھومنے لگیں۔ اس نے بڑی حیرت سے ارشد کو دیکھا۔ ارشد اس کے قریب پہنچ کر رکا تو شکیلہ نے اس کے سفید سے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ دونوں کی آنکھوں میں بڑا فرق تھا۔ شکیلہ کی آنکھوں میں تو کچھ نہ تھا۔ ارشد کی آنکھوں سے اس کے دل کا کرب جھانک رہا تھا۔ آنکھیں منجمد اور پھٹی پھٹی سی تھیں۔ ان پھٹی پھٹی منجمد آنکھوں میں کرب بھی منجمد ہو گیا تھا۔

"ارشد بھائی!" شکیلہ بولی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ شکیلہ کی آواز ہزاروں میل دور سے سنائی دے رہی ہے۔ "میں تم سے صاف صاف اور واشگاف الفاظ میں کہنا چاہتی ہوں کہ میں کسی قیمت تمہاری نہیں ہو سکتی ہوں۔" شکیلہ کی آواز میں کوئی لرزش نہ تھی۔ کسی قسم کا خوف پوشیدہ نہ تھا اور اب اس میں احساسِ جرم بھی نہ تھا۔ اس نے ایک

فیصلہ کن قدم اٹھالیا تھا۔ اب وہ اتنی دور نکل گئی تھی کہ واپسی ممکن نہیں رہی تھی۔ وہ ایک مرد سے نہیں اپنے بچپن کے ایک دوست سے مخاطب تھی۔ "میں جو کچھ کہنا چاہ رہی ہوں اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا کہ میں کسی اور مرد سے شادی کرنا چاہتی ہوں اب اس لئے یہ باتیں کر رہی ہوں۔ یہ جھوٹ نہیں حقیقت ہے کہ میں نے تم سے کبھی شادی کرنے کا کسی لمحے سوچا نہیں۔ میں نے کبھی تمہارے خواب نہیں دیکھے۔ میں نے تمہیں ہمیشہ اپنا بچپن کا ایک دوست اور ساتھی سمجھا۔ تم میرے اچھے اور مخلص دوست رہے ہو۔ میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ اس لئے بھی کہ محبت اور خلوص کا رشتہ کبھی بھلایا نہیں جا سکتا ہے اور تم جانتے ہو کہ ہر رشتہ کسی نہ کسی صورت میں ایک دن ٹوٹ جاتا ہے' بکھر جاتا ہے۔ بعض مرتبہ موت رشتوں کو نگل لیتی ہے اور بعض اوقات زندگی کے بے رحم ہاتھوں بھی۔ کیا تمہیں میری خوشی منظور نہیں ہے؟"

ارشد کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں نظر آرہی تھیں۔

"میں ان رشتوں کو زندگی کے آخری سانسوں تک قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ کیا رشتے اتنے نازک ہوتے ہیں۔ وہ ایک دم سے ٹوٹ بھی سکتے ہیں؟"

شکیلہ اس کے سفید لاش جیسے چہرے کو محبت سے دیکھتی رہی۔ تھرکتے ہونٹوں اور کپکپاتی آنکھوں کو دیکھا پھر اس کے لہجے میں جہان بھر کا رس اچھلنے لگا تھا۔

"تم مرد ہو کر اتنے جذباتی ہو رہے ہو؟ کیا کوئی رشتہ آج تک قائم رہا ہے۔ تم نے خود اپنی ساری زندگی میں خون کے رشتوں کو بکھرتے دیکھا ہے۔ تمہاری کٹھن زندگی میں کون تمہارے کام آگیا تھا؟ کون سے رشتہ دار تمہیں بڑھ کر سہارا دینا چاہتے تھے؟ جس طرح کل ہم آج کو نہیں دیکھ سکتے اسی طرح آج ہم کل کو نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے اور ارشد بھائی! بعض اوقات جس طرح رشتے ٹوٹ جاتے ہیں اسی طرح جڑ بھی جاتے ہیں۔ اب تو دنیا بہت چھوٹی ہوتی اور سکڑتی جارہی ہے۔ ہم زندگی کے کسی موڑ پر دوستوں کی طرح چلتے رہیں گے۔ بدن کے رشتے عارضی ہوتے ہیں اور انہیں قائم کرنے سے وہ لطف اور سرور نہیں ہوتا جو دوستی کا رشتہ قائم رکھنے میں ہوتا ہے۔ ہمارا رشتہ دوستوں کا تھا اور رہے گا جو تمام رشتوں پر بھاری ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم ایک دوست کے جذبات اور احساسات کا خیال کرتے ہوئے حالات سے سمجھوتہ کرلو اور میرے والدین سے مجھ سے شادی سے انکاری ہو جاؤ۔"

ارشد بے جان بت بنا کھڑا رہا۔ شکیلہ اس کی دسترس سے نکل چکی تھی۔ اس نے

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پوچھا۔ "وہ شخص کون ہے شکیلہ! جس نے میرے رشتے کے پرخچے اڑا کر رکھ دیئے ہیں؟"

"وہ میرے خوابوں کا شہزادہ ہے۔ میں نوجوانی کے آغاز سے اس کا خواب دیکھتی آ رہی ہوں۔ آخر میرا خواب مجھ کو مل گیا ہے۔ میں بہت خوش ہوں ارشد بھائی اسے پا کر۔"

"مگر خواب تو بڑے دغا باز ہوتے ہیں۔" ارشد کا لہجہ ٹوٹا ہوا تھا۔ "تم نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی میں نے اسے دیکھا۔ کون ہے؟ اس کے بارے میں مجھے بھی تو بتاؤ۔"

"خواب دغا باز ہو سکتے ہیں مگر وہ نہیں ہے۔ وہ ایک دولت مند' اسمارٹ اور وجیہہ شخص ہے۔ اس کا کاروبار لاہور اور کراچی میں پھیلا ہوا ہے۔" شکیلہ نے بتایا۔

"تو گویا تم نے اپنے بے مثل حُسن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک دولت مند کو مجھ پر ترجیح دی ہے اور اب مجھ پر فلسفہ جھاڑ کر بے وقوف بنا رہی ہو کہ دوستی کا رشتہ سب سے عظیم ہوتا ہے' بدن کے رشتے سے کہیں بلند تر۔ مگر یاد رکھو شکیلہ! تم درحقیقت سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔ تم زندگی کی چمک دمک کو پانے کے لئے اندھا دھند اور بہت تیز بھاگ رہی ہو۔ جو اس تیزی سے دوڑتے ہیں وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑتے ہیں۔ تم لڑکی ذات ہو ایک بار گر پڑو گی تو پھر اٹھ نہ سکو گی۔ تم شاید یہ بات نہیں جانتی ہو کہ دنیا کا ہر مرد عورت کی خوبصورتی پر مرتا ہے۔ وہ بھی تمہاری خوبصورتی پر مرمٹا ہے۔ جو خوبصورتی پر مر مٹتے ہیں وہ بہت جلد اس خوبصورتی سے سیر ہو جاتے ہیں۔ جب سیر ہو جاتے ہیں تو پھر اس طرح اسے اپنی زندگی سے نکال باہر کرتے ہیں جیسے وہ پرانے ماڈل کی کوئی کار ہو اور تمہارے خوابوں کا شہزادہ بھی تمہارے ساتھ یہی سلوک کرے گا۔ پھر تم ایک کھٹارہ گاڑی کی طرح ہو کر رہ جاؤ گی۔"

ارشد کے ایک ایک لفظ نے اس کے تن بدن میں ایک آگ سی لگا دی تھی۔ اس کے دل میں نفرت اور غصے کی ایک لہر سی اٹھی۔ وہ برہمی سے کہنے لگی۔

"ارشد! یہ سب کچھ تم اس لئے کہہ رہے ہو کہ اس شخص سے نفرت کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔ تمہارے ان خیالات کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا ہے۔ ایک تو تم نے شاید آئینہ نہیں دیکھا۔ اگر تم آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ لیتے تو کبھی میرے لئے اپنا رشتہ نہیں بھیجتے۔ کبھی تم نے یہ سوچا کہ تم میرے قابل ہو بھی یا نہیں۔ ایک تم کیا' دنیا کا کوئی مرد بھی

اس انداز سے نہیں سوچتا ہے، بھلے قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہو، اس کی صورت لنگور جیسی ہو، منہ میں ایک دانت نہ ہو اسے بھی ایک نوجوان حسین لڑکی چاہئے اور پھر تمہاری آمدنی ہی کیا ہے چند ہزار روپے؟ ان چند ہزار روپوں میں تم گھر چلاؤ گے یا میرے میک اپ کے لوازمات اور کپڑے وغیرہ کی خریداری پر خرچ کرو گے۔ میں آج کی لڑکی ہوں۔ زمانے کے سنگ سنگ چلنے والی حقیقت پسند لڑکی۔ یہ چند ہزار روپے تو میرا جیب خرچ بھی پورا نہیں کر سکیں گے۔ اس کے علاوہ مجھے ایک وجیہہ اور خوبصورت ہم سفر کی تلاش تھی، ضرورت تھی۔ اس لئے کہ وہ میرا آئیڈیل تھا اور اب مجھے میرا آئیڈیل مل گیا ہے۔ میں خوبصورت ترین لڑکیوں میں سے ایک ہوں جس کو اس کا آئیڈیل مل گیا ہے، محبت مل گئی ہے۔ ہر لڑکی کو آئیڈیل کہاں ملتا ہے؟"

اس نے حیرت اور صدمے سے شکیلہ کو دیکھا۔ "اگر تم واقعی اپنے محبوب اور آئیڈیل سے شادی کرنے پر بضد ہو تو میں تمہاری راہ میں دیوار نہیں بنوں گا۔ تم نے اچھا کیا کہ مجھے بروقت بتا دیا۔ اگر میرے انکار سے تمہیں ایک نئی زندگی، مستقبل کی مسرت اور سکون قلب کی ضمانت مل سکتی ہے تو میں یہ زندگی تمہاری نذر کرتا ہوں جس کا مجھے اب کوئی مصرف نہیں نظر آتا۔ واقعی میں نے بڑی غلطی کی کہ آئینے میں اپنا چہرہ نہیں دیکھا۔ اب میں ایسی کوئی غلطی نہیں کروں گا۔ کسی حسین لڑکی کے لئے اپنا رشتہ نہیں بھیجوں گا۔ میں شادی ہی نہیں کروں گا۔"

"مگر ایک حسین لڑکی تم سے شادی کی خواہشمند ہے اگر تم اس کے لئے اپنا رشتہ بھیجو گے تو وہ انکار نہیں کرے گی اور میری بھی خواہش ہے کہ تم اس لڑکی سے شادی کر لو۔" شکیلہ نے توقف کر کے صبیحہ کا اور اس سے ہونے والی گفتگو کا مختصراً ذکر کیا۔ "بلاشبہ وہ بھی ایک حسین لڑکی ہے تم اسے پا کر یقیناً بہت خوش ہو گے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اس کے لئے اپنا رشتہ بھیج دو۔ صبیحہ اور اس کے گھر والے تم سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مجھے بڑی خوشی ہو گی اگر صبیحہ تمہاری بیوی بن جائے اور پھر یہ میری سب سے بڑی تمنا ہے۔"

شکیلہ اور سجاد کے پاس تخلیے اور وقت کی کوئی کمی نہ تھی۔ شکیلہ کی ماں اپنی عزیز از جان اور اکلوتی بیٹی کے تعلیمی مشاغل میں پہلے بھی غیر ضروری دخل دینے سے گریز کرتی تھیں۔ اس نے زیادہ جماعتیں نہیں پڑھی تھیں مگر علم کی قدر کرتی تھی۔ اب اکثر شکیلہ دیر سے آنے لگی تھی۔ وہ دیر سے آنے کی وجہ ماں کو ٹیوشن بتاتی تھی جو وہ دوسری سہیلیوں کے گھر جا کر کسی اور کالج کی لیکچرار سے پڑھ رہی تھی۔ ابھی تک ماں کو اس

"ٹیوشن" کی خبر نہیں ہوئی تھی۔ جب سے شکیلہ نے ارشد سے انکار کہلا کر بھیج دیا تھا تب سے وہ اپنی بیٹی سے کچھ نہیں کہتی تھی۔ ماں کے علم میں یہ راز نہیں آیا تھا کہ ارشد اس کے گھر آیا تھا اور شکیلہ نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ یہ رشتہ توڑ دے۔ اس راز کی امین صرف نذیراں خالہ تھی۔ گو نذیراں خالہ نے کبھی اسے بلیک میل نہیں کیا تھا مگر وہ عنایت و محبت سے پیش آنے لگی تھی۔ صرف ایک ہفتے میں وہ نذیراں خالہ کو دس روپے اور ایک کپڑے کا جوڑا دے چکی تھی تاکہ اس کا منہ بند رہے۔ ادھر ارشد نے انکار کرنے کی وجہ یہ بتائی تھی کہ اسے دکان میں زبردست نقصان ہو چکا ہے۔ نوکروں نے غیر محسوس انداز سے غبن شروع کر رکھا تھا۔ وہ بازار میں ہزاروں کا مقروض ہو چکا ہے۔ وہ اس وقت تک شادی نہیں کرے گا تا جب تک اپنا نقصان پورا نہ کرے۔ رشتہ توڑنے کا یہ معقول عذر اور وجہ نہ تھی۔ اس پر شکیلہ کے والد رشتہ توڑنے پر آمادہ نہ ہوئے تو اس نے غیبت اور کردار کشی کانوں تک پہنچائی کہ وہ کسی نوجوان طوائف کے پیچھے برباد ہو رہا ہے۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور رشتہ ٹوٹ گیا تھا۔

وہ ارشد کے جذبے سے بڑی متاثر ہوئی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ارشد اتنا بلند آدمی ہے۔ سجاد نے بھی ارشد کے اس گہرے جذبے کو سراہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ سجاد ایک مہینے کے بعد اپنی شادی کا پیغام اس کے ہاں بھیجے۔ فوری طور سے شادی کا پیغام آنے سے اس کے گھر والے شک و شبہ میں پڑ سکتے تھے۔ مگر سجاد کو ایک مہینہ ایک برس کی طرح بھاری محسوس ہو رہا تھا۔

آخر اس نے ایک شرط پر شکیلہ کی بات مان لی تھی کہ وہ بات پکی ہونے تک ہفتے میں دو تین بار اس سے ملتی رہے گی۔ روز روز کا ملنا، پارک، ہوٹلوں اور تاریخی مقامات میں باتیں کرنا اور اندھیرے میں گھر لوٹنا والدین کو شک میں مبتلا کر سکتا تھا۔ اس پر جو اعتماد اور بھروسہ ہے وہ اٹھ جائے گا۔ شکیلہ نے دل میں طے کیا تھا کہ وہ ہفتے میں صرف دو دفعہ سجاد سے ملے گی۔ دور رہ کر وہ سجاد کے اشتیاق کو ہوا دیتی رہے گی۔ اس طرح سجاد اس کے فراق میں تڑپتا رہے گا۔ وہ تیز بھاگ کر اپنی وقعت کم کرنا نہیں چاہتی تھی مگر وہ خود اس پر عمل پیرا نہ ہو سکی اور روز روز ملاقاتوں کا سلسلہ چل پڑا تھا۔ اکثر و بیشتر ملاقاتیں سجاد کے گھر پر ہوتی تھیں تب، کبھی کبھی اس تنہائی کی آزادی سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا مگر وہ آگے نہیں بڑھنے دیتی تھی۔ جب کبھی سجاد پر جنون سا سوار ہوتا تو وہ اسے مشورہ دیتی کہ وہ یہ جادو سر سے اتار پھینکنے کے لئے ہزار پانچ سو ڈنڈ لگائے۔ جب بھی نہ اترے تو آٹھ دس

بالٹیاں سر پر ڈال لے یا پھر شاور کے نیچے ایک آدھ گھنٹہ کھڑا رہے۔ سجاد کو اس کڑی آزمائش میں ثابت قدم رہنے کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑتا تھا۔ اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں رہتی تھی۔

ادھر صبیحہ کے علم میں ارشد کا رشتہ ٹوٹنے کی بات آچکی تھی۔ اسے یہ خبر شکیلہ ہی نے سنائی تھی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اب شکیلہ اس سے کھنچی کھنچی رہنے لگی ہے۔ بات کرتی بھی تھی تو رسمی انداز سے۔ وہ روز بہ روز جیسے اس سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ اب وہ شکیلہ کی رازداں نہیں رہی تھی صرف ہم جماعت ہو کر رہ گئی تھی۔ صبیحہ کو اس کے اس رویے اور طرز عمل سے بڑا دکھ پہنچا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس روز کی گفتگو کے بعد سے شکیلہ اس سے دور ہوتی جائے گی۔

صبیحہ ایک شام انارکلی بازار آئی تو اس کے ساتھ محلے کی ایک اور لڑکی بھی تھی۔ وہ اس لڑکی کے ساتھ آئی تھی۔ ان کو خریداری کرنی تھی۔ اسے جس چیز کی تلاش تھی وہ ایک غیر ملکی سینٹ تھا۔ وہ سینٹ انارکلی بازار کی کسی دکان میں نہیں ملا تو صبیحہ اسے لے کر گلبرگ پہنچ گئی جہاں غیر ملکی اشیاء آسانی سے مل جاتی تھیں۔ وہ سینٹ مل گیا۔ وہ دونوں رکشے کے لئے سڑک کی طرف جا رہی تھیں کہ صبیحہ ایک دم سے ٹھٹک کر رک گئی۔

ایک شخص جو خوش شکل' اسمارٹ' وجیہہ اور امریکی فلموں کے ہیرو کی طرح دراز قد' خوبصورت اور چاق و چوبند نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک بھرپور نوجوان لڑکی کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ اس بازار میں جتنے لڑکے اور مرد نظر آ رہے تھے وہ ان میں منفرد شخصیت کا مالک تھا۔ اس جیسا خوبصورت مرد اور کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بڑا نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ جو لڑکی سیاہ برقع میں اپنا سراپا اور نصف چہرہ نقاب میں چھپائے چل رہی تھی وہ بڑی پُرکشش تھی۔ ہر عورت کا سراپا ہی ہوتا ہے جو ایک مرد اور عورت کو اس کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس لڑکی کا سراپا برقع میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں نقاب میں چھپے نصف چہرے' بے حد خوبصورت مرمریں ہاتھوں اور سراپا سے اس لڑکی کو پہچان لیا تھا۔ وہ اس لڑکی کو نہ صرف سات پردوں میں بلکہ لاکھوں میں بھی اس کے سراپا سے پہچان سکتی تھی۔ اسے اپنے شبہے کی پوری تصدیق کے لئے اس لڑکی کے سامنے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ لڑکی شکیلہ تھی۔ اس کی اپنی عزیز ترین سہیلی جسے وہ آج اور اب بھی اپنی جان سے زیادہ چاہتی تھی۔ شکیلہ اور وہ مرد بڑی لگاوٹ کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے جا

رہے تھے۔ پھر وہ دونوں ایک بے حد قیمتی اور نئے ماڈل کی شیورلیٹ کار کے پاس جا کر رکے تھے۔ اس کار کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ابھی شو روم سے نکلی ہے۔ اس لئے کہ ابھی اس پر نمبر پلیٹ بھی نہیں تھی۔ اس پر گتے کا ایک چھوٹا سا بورڈ جو نمبر پلیٹ سائز تھا نمبر پلیٹ کی جگہ سُتلی سے بندھا ہوا تھا۔ اس پر انگریزی میں لکھا تھا۔ "رجسٹریشن کے لئے درخواست دی ہوئی ہے" وہ دونوں کار کے پاس پہنچے۔ جس وقت مرد کار کا دروازہ کھول رہا تھا شکیلہ چہک سی رہی تھی۔

وہ اپنی جگہ دم بخود ہو کر شکیلہ اور اس مرد کو دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد دونوں کار میں بیٹھ کر چلے گئے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ "تو یہ ہے شکیلہ کا خواب جس کے پیچھے اس نے ارشد کو ٹھکرا دیا۔" وہ حیران تھی کہ یہ کون شخص ہے جس سے شکیلہ کی ملاقات ہو گئی اور شکیلہ نے اسے اس شخص کے بارے میں کچھ بتایا بھی نہیں۔ آخر تک اسے چھپا رکھا۔ مگر شکیلہ کو یہ شخص کہاں سے ہاتھ لگا۔ پھر اسے خیال آیا کہ حسین لڑکیوں کے لئے کسی خوبصورت مرد کا حصول مشکل نہیں ہوتا۔ انہیں سرراہ ایسے مرد مل جاتے ہیں۔ پھر حسین لڑکیاں بھی مردوں کو سرراہ مل جاتی ہیں۔ مگر اس سرراہ عشق کا انجام بڑا عبرتناک ہوتا ہے۔ صبیحہ نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ وہ انجان رہے گی اور شکیلہ کے اس راز کو وہ اپنے سینے میں دفن رکھے گی۔ وہ دعا کرے گی کہ یہ شخص اس کی سہیلی کے لئے سراب نہ ثابت ہو۔ شکیلہ کا خواب اور آئیڈیل اس کو دھوکہ نہ دے۔

رات ہی ماں نے شکیلہ سے کہہ دیا تھا۔ "کل تم کالج نہیں جاؤ گی۔ کچھ عورتیں تمہیں دیکھنے آ رہی ہیں۔ تم کل گھر کی صفائی اور ناشتے کی تیاری میں میرا ہاتھ بٹاؤ گی۔"

وہ ماں کی بات پر سُن سی ہو کر رہ گئی۔ اس پر بجلی سی آ گری تھی۔ پھر بھی اس نے اپنے حواس مجتمع کر کے کہا تھا۔ "میں نتیجہ نکلنے تک ان چکروں میں پڑنا نہیں چاہتی ہوں۔"

"شادی بھی ایک سال بعد ہو گی۔ اس لئے کہ لڑکے کو دو تین ماہ ہوئے ہیں ایک بڑی فرم میں ملازم ہوئے۔ میں نے اس روز آپا کے ہاں جا کر اس لڑکے کو دیکھا تھا۔ لڑکا بہت خوبصورت ہے اور پھر اس کی تنخواہ سات سو روپے ہے اور کمپنی اسے ایک گھر بھی دے رہی ہے۔"

وہ ماں کی بات سن کر رات بھر کروٹیں بدلتی رہی تھی۔ اس نے ارشد کو ایک معقول وجہ سے رد کیا تھا۔ اس لڑکے کو کس بنیاد پر قبول نہیں کرے گی؟ اس میں کون سے

کپڑے نکالے گی اور پھر ان عورتوں کا جو اسے دیکھنے آ رہی ہیں' اسے دیکھ کر ناپسند کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے دن وہی ہوا جس کا اسے ڈر اور خوف تھا۔ عورتیں اسے پسند کرکے چھ ماہ بعد شادی کرنے کا فیصلہ کرکے چلی گئیں اور لڑکے کی ایک رنگین تصویر بھی دے گئی تھیں۔ ماں نے اسے لڑکے کی تصویر دکھائی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لڑکا واقعی خوبصورت تھا مگر اس کے دل کے فریم میں کسی اور کی تصویر جڑی ہوئی تھی۔ وہ اسے کیسے نکال سکتی تھی۔

وہ دوسرے دن دوپہر کے وقت کالج سے سیدھی سجاد کے گھر کی طرف نکل گئی۔ حالانکہ سجاد نے اسے کہا تھا کہ وہ تین چار دن کے لئے کراچی جا رہا ہے۔ اس کے واپس آنے کا ثبوت یہ ہوگا کہ اس کی کار گیراج میں نہیں بلکہ بنگلے کے احاطے میں کھڑی ہو گی۔ اس نے سوچا کہ وہ پرچہ لکھ کر سجاد کے گھر میں ڈال آئے گی کہ وہ واپس آتے ہی اپنی کار لے کر آئے تو کالج سے باہر ہی کھڑی رکھے۔ کیونکہ بے حد ضروری باتیں کرنی ہیں۔ اس کا رشتہ طے ہوگیا ہے اور پھر سجاد دوپہر کے وقت گھر پر نہیں ہوتا تھا۔

وہ ورکشاپ سے اتری تو گرمیوں کی دوپہر کی وجہ سے گلبرگ کی گلیاں خاص کر یہ گلی سنسان پڑی تھی۔ یہ دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی تھی کہ سجاد کی کار بنگلے کے احاطے میں کھڑی تھی۔ یہ وہ حصہ تھا جو الگ اور بغلی گلی میں تھا۔ سجاد کے ہاں جانے کے لئے زینہ یہیں تھا۔ زیریں حصے میں زینہ اور گیراج تھا اور ایک چھوٹا احاطہ سا بنا ہوا تھا۔ جس میں ایک لمبی سی کار بھی باآسانی کھڑی ہو سکتی تھی۔ سجاد کے ہاں آنے جانے سے مالک مکان کی نظروں میں آنے کا خوف نہیں ہوتا تھا۔

وہ رکشے سے اتر کر اپنی کتابیں رکشے کی سیٹ پر رکھ کر پرس سے رقم نکال رہی تھی کہ ایک رکشہ گیٹ کے عین سامنے آ کر رکا۔ اس رکشے سے ایک حسین عورت اتری جو اپنے لمبے قد کی وجہ سے بے حد پُرکشش لگ رہی تھی۔ اس نے بڑا خوبصورت لباس پہن رکھا تھا جو اس پر جچ بھی خوب رہا تھا۔ اس نے شاید پہلے ہی سے نوٹ اپنے پرس میں سے نکال لئے تھے جو اترنے سے پہلے ہی اپنا ہاتھ رکشے والے کی طرف بڑھا کر اسے دے دیئے اور رکشے سے اتر کر تیزی کے ساتھ بنگلے میں داخل ہوگئی اور زینے پر پہنچ کر اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

شکیلہ کو بجلی کا سا جھٹکا لگا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کی پیٹھ میں کسی نے چھرا گھونپ دیا ہے۔ اسے رکشے کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اسے یقین تھا کہ اگر اس

نے کھڑے رہنے کی کوشش کی تو ٹانگیں اس کا وزن نہ سہار سکیں گی۔ اس نے حیرت' نفرت اور صدمے سے سوچا۔ وہ تو ایک روگ سے چھٹکارہ پانے آئی تھی۔ اب یہ اسے دوسرا کیا روگ مل رہا ہے؟

شکیلہ کی رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ سارا بدن ہی منجمد ہو گیا تھا۔ سردی کا موسم تھا اور نہ ہی برفانی ہوائیں چل رہی تھیں جو اس کا خون منجمد ہو جاتا۔ بڑی سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ سورج بڑا غضب ناک ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اور جو کچھ محسوس کیا تھا وہ اسی کا اثر تھا۔ اسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ اس نے خود پر کیسے قابو پایا تھا اور رکشہ والے کو کتنے پیسے دیئے تھے۔ اس نے اپنی کتابیں کب اور کیسے رکشے کی نشست پر سے اٹھائی تھیں۔ رکشہ کے جانے کے بعد وہ لڑکھڑاتی ہوئی سی بنگلے کے جنگلے کی طرف بڑھی تھی۔ اس نے جنگلے کے پاس پہنچ کر اس کا سہارا لے لیا تھا۔ جنگلے کے پاس ہی نیم کا ایک گھنا درخت تھا جس کی گھنی چھاؤں تھی۔ وہ خاصی دیر تک جنگلے کے سہارے کھڑی رہی تھی۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ اسے ہر سمت اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ ہر راستہ مسدود نظر آ رہا تھا۔ وہ اس مسافر کی طرح تھی جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔

یہ سوچ کر اس نے اپنے آپ کو فریب دینا چاہا کہ شاید وہ عورت سجاد کی کوئی قریبی رشتہ دار وغیرہ ہو۔ شاید کسی ضروری کام سے آئی ہو۔ مگر اس کا یہ اپنا فریب زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکا۔ سجاد نے تو اس سے یہ کہا تھا کہ وہ ضروری کام سے کراچی جا رہا ہے۔ چار پانچ روز میں واپسی ہوگی۔ اسے کراچی گئے ہوئے دوسرا دن تھا۔ اگر وہ اس بات کو بھی تسلیم کرلے کہ سجاد جس ضروری کام سے کراچی گیا تھا وہ کسی وجہ سے نہیں ہو سکا اور وہ ایک دن میں لوٹ آیا ہے تو وہ پھر اسے لینے اور بتانے کالج کیوں نہیں آیا تھا۔ کیا وہ اپنی آمد کو اس سے چھپانا چاہتا تھا؟ شاید یہی بات تھی اور شاید وہ کراچی گیا ہی نہیں تھا۔ اس نے جھوٹ بولا تھا۔ یہ سب کچھ اس نے اس عورت کے لئے کیا تھا اور یہ عورت کون ہے جو دوپہر کے سناٹے میں اس کے فلیٹ میں گئی ہے۔ ایک جوان اور حسین عورت کو تنہا آنے اور تنہا مرد کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی؟ ایک عورت کا ایک مرد کے پاس جانے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہوا کہ سجاد نے کراچی جانے کا ڈرامہ اس لئے کیا کہ وہ اس عورت کے ساتھ دل بہلا سکے۔

وہ بدستور سوچوں کے سمندر میں چکرا رہی تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ

اوپر ساجد کے پاس جاتی اور دروازہ کھٹکھٹا کر اسے آئینہ دکھاتی اور نہ ہی اسے واپس جانے کا خیال آ رہا تھا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا تھا وہ اس قدر غیر متوقع ہوا تھا کہ اس نے اسے جیسے اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے گلی کے نکڑ پر ایک کار کو نمودار ہوتے ہوئے دیکھا تو وہ اندر داخل ہو کر زینے کی طرف بڑھ گئی۔ زینے کے پاس پہنچ کر وہ کھڑی ہو گئی۔ اس لئے کہ کار میں جو کوئی بھی ہوتا اسے گلی میں دیکھ کر مشکوک ہو جاتا اور شاید اس گلی کے سناٹے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔ وہ زینے کے پاس کھڑی ہو کر محفوظ ہو گئی تھی۔

ادھر گہرا سناٹا طاری تھا۔ سجاد کا فلیٹ پہلی ہی منزل پر تھا مگر وہاں سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی اور آ بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ سجاد کا فلیٹ خاصا کشادہ تھا۔ وہ کھڑی الم غلم سوچ رہی تھی کہ یہ عورت سجاد کے ساتھ فلیٹ کا دروازہ بند کر کے کوئی کتاب تو نہیں پڑھ رہی ہے۔ وہاں جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ اس کے ذہن پر ہتھوڑے کی ضربیں بن کر احساس دلا رہا تھا۔ فلیٹ اور زینے پر قبرستان کا گمان ہو رہا تھا۔ اب یہاں کھڑے رہنا بے کار تھا۔ اب اوپر جا کر وہ دروازے پر دستک دینا بھی نہیں چاہتی تھی اس لئے کہ اندر سجاد نہیں تھا۔ سجاد کی تعفن زدہ لاش تھی جو سڑ گل رہی تھی۔ جس کا زہر اس کے وجود میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ وہی فلیٹ تھا جہاں سجاد کی محبت بھری باتوں کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے اور ایسے کھوئے رہتے کہ دوپہر سے سہ پہر، سہ پہر سے شام ہو جاتی تھی۔ پھر بھی دل کے ارمان نہیں نکلتے تھے۔ آنکھوں کی پیاس بجھتی نہیں تھی بڑھ جاتی تھی۔ ان کے پاس محبت کی باتوں کی کمی نہیں ہوتی تھی۔ ان کی نشستیں طویل ہوتی تھیں۔ روز محبت ایک نئے انداز سے ان کے سامنے آتی تھی اور وہ اس میں کھو جاتے تھے۔ ان کے درمیان محبت کبھی دھیمی، کبھی تیز اور کبھی نشے میں ڈوب جاتی تھی۔ شام دبے پاؤں آ کر انہیں اپنی آمد کا احساس دلاتی تھی اور روشنیاں جگمگا اٹھتی تھیں تب انہیں وقت گزر جانے کا احساس ہوتا تھا۔ تب سجاد اس سے بڑی حسرت سے کہتا تھا۔

”کاش ہم وقت سے بے نیاز ہوتے؟“

جب وہ اٹھتی تھی تو اُسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تشنہ اور نا آسودہ اٹھ رہی ہو۔ اس کا دل جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنی خوش بختی پر ناز کرتی تھی کہ سجاد نے کبھی تنہائی میں حد سے تجاوز کرنے کی کوشش نہیں کی اور اس کے اعتماد کا بھرم رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی محبت ہر قسم کی آلودگی سے پاک تھی۔ سجاد کے مزاج میں شرافت کوٹ کوٹ کر

بھری ہوئی تھی۔ وہ ایک نیک اور فرشتہ خصلت آدمی تھا۔ اس کی ذات جیسے ایک زاہد کی طرح تھی۔

وہ رات کے وقت جب خلوت میں ہوتی تھی اور نیند نہیں آتی تھی تو وہ سجاد اور اپنی محبت کے بارے میں سوچتی تھی اور اس کے ذہن میں بہت ساری باتیں ابھرتی تھیں۔ وہ سوچتی تھی کہ کل جب اس کی سجاد سے ملاقات ہو گی تو وہ سجاد سے اس موضوع پر بات کرے گی مگر وہ سجاد کے سامنے پہنچ کر ان باتوں کو بھول جاتی تھی۔ کبھی کبھی سجاد اس کی نرمی اور ڈھیل سے تجاوز کرنا چاہتا تو وہ اُسے باہر چلنے کے لئے کہتی تھی اور سجاد کسی سعادت مند شاگرد کی طرح اس کی بات مان لیتا تھا۔ اس طرح وہ خطرہ ٹل جاتا تھا جو جذبات کا طوفان کھڑا کر دیتا تھا۔

آج سجاد نے اس محبت کو میلا کر دیا تھا۔ فلیٹ کو میلا کر دیا تھا۔ پھر اُسے اپنے مٹھاس سے بندھے ہونٹوں پر مٹھاس کی جگہ زہر کا احساس ہونے لگا تھا۔ وہ محبت جسے اس نے ہشت پہلو سمجھا تھا، وہ ہشت پہلو نہیں رہی تھی۔ اس کے تقدس پر داغ آ گیا تھا۔ وہ خواب و خیال میں بھی سوچ نہیں سکتی تھی کہ سجاد اسے ایسی سنگدلی سے دھوکہ دے گا۔ اس کے چہرے کے پیچھے ایک ایسا چہرہ چھپا ہوا ہے جو ایک انسان کا نہیں شیطان کا ہے۔

پھر اس نے اپنے آپ سے پوچھا، وہ یہاں کس لئے کھڑی ہے۔ اب اس کا یہاں سے چلا جانا ہی اس کے لئے بہتر ہے۔ اس لئے کہ کچھ دیر بعد دروازہ کھلے گا تو سجاد کی لاش نظر آئے گی۔ اب وہ اس کی تعفن زدہ لاش کو دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اگر اس نے دیکھا تو یہ لاش اس کے وجود پر آ گرے گی۔

وہ زینے سے ہٹ کر باہر آئی۔ اس نے دھونکنی کی طرح چلتے ہوئے سینے کو دیکھا اور اپنی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ باہر کڑی دھوپ تھی۔ دو دن پہلے ایسی ہی دھوپ میں یہاں آئی تھی تو ایسی تپش کا احساس نہیں ہوا تھا۔ محبت کی تپش نے کبھی اس تپش کا احساس ہی نہیں ہونے دیا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا کر اس گلی سے نکل جانا چاہتی تھی۔ مگر اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے پیروں میں زنجیریں پڑی ہوئی ہیں۔ اسے قدم اٹھانا دوبھر ہو رہا تھا مگر وہ پھر بھی کسی نہ کسی طرح خاموش اور سنسان گلی سے چلی جا رہی تھی۔ پھر دفعتاً بغلی سڑک پر چار پانچ لڑکوں کا ایک غول باتیں کرتا ہوا اس کی طرف چلا آ رہا تھا۔ لڑکے اسے دیکھ کر چہکنے لگے تھے۔ اس پر دور ہی سے فقرے چست کئے جا رہے تھے۔ شکیلہ نے ان ندیدے لڑکوں کو دیکھتا پا کر اپنی نظریں جھکا لیں اور ایک طرف

ہٹ کر چلنے لگی۔ مگر اس کی چال اور بھی سُست پڑ گئی تھی۔ وہ ان لڑکوں کے گندے فقروں کو برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ اس نے کبھی کسی لڑکے کی زبان سے ایسے گندے فقرے نہیں سنے تھے۔ لڑکوں کا لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنا' گندے فقرے کسنا اور پیچھا کرنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اکثر اس کے ساتھ بھی ایسا ہوتا تھا مگر یہ لڑکے تو ایسے اوباش گھرانوں میں پلنے والے لگ رہے تھے جن کے نزدیک عورت کسی احترام کے لائق ہی نہیں ہوتی۔ ان لڑکوں نے اس کے نزدیک پہنچ کر اسے اپنے نرغے میں لے لیا۔ جیسے وہ اسے اغوا کرنا چاہتے ہوں یا دست درازی کرنے پر تل گئے ہوں۔ اس نے ٹھٹک کر رک کر غصیلی نظروں سے لڑکوں کی طرف دیکھا تو اس نے ان ندیدے لڑکوں کی جلتی ہوئی نظریں اپنے بدن پر محسوس کیں۔ اس لمحے اس کا سر چکرا سا گیا اور آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی۔ اگر وہ اپنے آپ کو نہیں سنبھالتی تو شاید چکرا کر کسی لڑکے کی بانہوں میں جھول جاتی۔ اس نے اپنے حواس مجتمع کر کے ایک دھاڑ سی لگائی۔

"ہٹ جاؤ میرے راستے سے .... ورنہ میں.........."

شکیلہ کو بالکل بھی امید نہیں تھی کہ اس کی دھاڑ کا ان لڑکوں پر بجلی کا سا اثر ہو گا۔ ان پر ایسا اثر ہوا تھا کہ لڑکے دم دبا کر کسی گیدڑ کی طرح ہٹ گئے اور چل پڑے تھے۔ ان کے گندے فقروں نے دم توڑ دیا تھا اور انہیں چپ سی لگ گئی تھی۔ اسے جہاں خوشی ہوئی تھی وہاں حیرت بھی ہوئی تھی۔ یہ لڑکے کوئی نوعمر نہ تھے۔ بھرپور جوان تھے۔ ان کے جسموں میں ایک آگ سی بھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ان کی شوخی کسی برساتی نالے کی طرح چڑھی ہوئی تھی۔ وہ سب کے سب اس کی ڈانٹ پر اس طرح چپ ہو گئے تھے جیسے ان کے منہ میں گھنگنیاں ڈالی ہوئی ہیں۔ شاید وہ لڑکے اسے غصہ سے کھولتا دیکھ کر گھبرا گئے تھے۔ جب لڑکے تیز تیز قدموں سے کئی گز کے فاصلے پر چلے گئے تو ان لڑکوں کی ڈرپوکی پر بے اختیار اس کی ہنسی چھوٹ گئی تھی لیکن دوسری طرف یہ سوچ کر اس کا بدن کانپ اٹھا تھا کہ اگر وہ لڑکے اسے اغوا کر کے لے جاتے اور اس کے ساتھ دست درازی کرتے تو وہ کیا کر سکتی تھی۔ اس کی چیخ و پکار سن کر ان ائرکنڈیشن بنگلوں اور کوٹھیوں سے کوئی باہر نہیں آتا۔ اس لئے کہ اس کی آواز وہاں تک نہ پہنچ پاتی۔ اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا کہ لڑکے جا رہے ہیں یا رک کر اسے دیکھ رہے ہیں۔ وہ آگے جا کر دائیں ہاتھ کی بغلی گلی میں گھوم گئی۔ ابھی اس نے چند قدم ہی طے کئے تھے کہ ایک باریک سریلی آواز نے اس کے پیروں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ "شکیلہ .... شکیلہ!"

شکیلہ کو یہ آواز مانوس سی لگی۔ اس نے رک کر پلٹ کر دیکھا تو نیلی والی کوٹھی کے گیٹ پر اس کی ہم جماعت فرحانہ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ ابھی تک یونیفارم میں تھی۔ جیسے ابھی ابھی کالج سے آ رہی ہو۔ وہ مسکراتی ہوئی فرحانہ کی طرف بڑھی۔ فرحانہ کے قریب پہنچی تو اس نے حیرت سے پوچھا۔ "بھئی! تم یہاں کہاں؟"

"میں اپنی ایک کزن سے ملنے آئی تھی جو یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ وہ ابھی آئی نہیں ہے اس لئے میں واپس گھر جا رہی تھی۔" شکیلہ نے جواب دیا۔ "تم کہاں سے آ رہی ہو؟"

"اس دھوپ میں کہاں جا رہی ہو؟ دیکھو کیسے غضب کی گرمی پڑ رہی ہے۔" اس نے ایک طرف ہٹ کر شکیلہ کو اندر آنے کے لئے راستہ دیا۔ "میں کالج سے ابھی ابھی تو آئی ہوں۔ کار پارک کر کے گیٹ بند کر رہی تھی کہ تم پر نظر پڑ گئی۔ تمہیں دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس دھوپ میں تم چلی جا رہی ہو۔ چلو اندر آ جاؤ۔ کھانا کھا کر چلی جانا۔"

"نہیں شکریہ!" وہ اپنے چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولی۔ "کسی اور دن کالج سے سیدھے تمہارے ساتھ گھر آ کر کھانا کھا لوں گی۔ اب اجازت دو۔"

"تم مجھے ہی اپنی کزن سمجھ لو اور میرے گھر آ جاؤ۔ یہاں ایسی قسمت کہاں کہ شہزادیاں روز روز ادھر سے گزریں اور ہمارے گھر کو رونق بخشیں۔"

فرحانہ نے اپنی بات ختم کی اور اس کے ہاتھ سے اس کی کتابیں اچک لیں اور اس کی بانہہ پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا تو وہ انکار نہ کر سکی۔ جب فرحانہ اسے اپنی ائرکنڈیشنڈ نشست گاہ میں لے کر پہنچی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ جنت میں پہنچ گئی۔ اس کی گرمی' سارا پسینہ اور تھکن یک لخت دور ہو گئی تھی۔ اسے بیٹھے ہوئے چند لمحے بھی نہیں ہوئے تھے کہ کمرے میں ایک ادھیڑ عمر کی ملازمہ داخل ہوئی۔ فرحانہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "عابدہ جلدی سے کھانا لگا دو۔"

ملازمہ فرحانہ کی بات سنتے ہی اُلٹے قدموں چلی گئی۔ فرحانہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار بھرے لہجے میں بولی۔ "جانی ڈیئر! دھوپ میں تمہارا چہرہ جھلسا ہوا سا نظر آ رہا ہے اور یہ کیسی زردی سی چھا رہی ہے۔ ایسا کرو' تم چل کر جلدی سے نہا لو۔ تازہ دم ہو جاؤ گی' اتنی دیر میں مَیں بھی کپڑے بدل کر نہا کر آتی ہوں۔"

اس کا جی بھی نہانے کو چاہ رہا تھا مگر وہ اس پرائے گھر میں نہانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ پہلی بار اس گھر میں آئی تھی۔ اسے یہاں نہاتے ہوئے اچھا نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ اس

نے انکساری سے کام لیا تو فرحانہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے کمرے کی طرف لے چلی۔ اپنے کمرے میں لے جانے سے پہلے اسے اپنی امی اور بھابی سے بھی ملا دیا۔ تعارف ہونے کے بعد وہ شکیلہ کو اپنے کمرے میں لے آئی اور اسے ملحق غسل خانے میں دھکیل دیا۔

شکیلہ کو فرحانہ کا گھر اور اس کے گھر والے بے حد پسند آئے تھے۔ اسے فرحانہ کا گھر اندر اور باہر سے بڑا خوبصورت اور پیارا پیارا سا لگا تھا۔ گھر کے اندر کا ماحول بڑا خوابناک اور سحر زدہ سا تھا۔ آرائش و زیبائش سے آراستہ و پیراستہ گھر پر اسے کسی شاہی محل کا دھوکا ہو رہا تھا۔ فرحانہ کی امی اور بھابی بھی بڑی بااخلاق اور ملنسار تھیں۔ وہ بڑے تپاک اور محبت سے ملی تھیں۔ بلکہ فرحانہ کی امی نے تو اس کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیر کر بلائیں لی تھیں۔

غسل خانہ درمیانہ کمرے سے خاصا بڑا تھا اور وہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے غسل خانے سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ ایک کونے میں باتھ ٹب بھی تھا۔ شاور بھی لگے ہوئے تھے اور دیوار میں جہاں منہ ہاتھ دھونے کے لئے بیسن لگا ہوا تھا وہاں پر ایک بڑا سا آئینہ نصب تھا۔ اس آئینے میں پورا غسل خانہ نظر آ رہا تھا۔ کھونٹی پر صاف ستھرے اور دھلے ہوئے تولیئے بھی تھے اور صابن' شیمپو بھی تھے۔ پلاسٹک کی ایک ٹوپی بھی تھی۔

شکیلہ نے سوچا تھا کہ وہ صرف منہ ہاتھ دھو کر نکل آئے گی لیکن غسل خانے کو دیکھ کر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ گو اس کے اوپر ایک بوجھ تھا۔ سجاد نے جس طرح اس کی محبت کو ایک پھول سمجھ کر روند اور مسل دیا تھا' دھوکہ اور فریب دیا تھا وہ ابھی بھی اس کے دل میں کسی نیزے کی طرح چبھ رہا تھا۔ اسے اپنی دنیا بڑی ویران نظر آ رہی تھی۔ اس تہ و بالا ہوتی دنیا میں اس کے لئے کچھ بھی تو نہیں بچا تھا۔ اسے تو اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ زخموں سے رستے ہوئے لہو کو پی کر کس طرح بظاہر اس قدر پُرسکون نظر آ رہی ہے اور کس طرح اس نے اپنے آپ پر قابو پایا ہے۔

شکیلہ کمرے میں آئی تو وہ اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اس کے سارے بدن میں جیسے زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی تھی۔ فرحانہ پلنگ پر بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی اور اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے بولی۔

"اچھا کیا تم نے نہا لیا۔ میں تو نہائے بغیر کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگاتی ہوں۔ چاہے پیٹ میں چوہوں کی ریس ہی کیوں نہ ہو رہی ہو۔ چلو کھانے کی میز پر امی اور بھابی بھی تمہارا اور میرا انتظار کر رہی ہیں۔"

کھانے کی میز پر دونوں پہنچیں تو واقعی ان دونوں کا انتظار ہو رہا تھا۔ میز پر پُرتکلف قسم کا کھانا چنا ہوا تھا جیسے خاص طور پر یہ اہتمام اس کے لئے کیا گیا ہو۔ اسے فرحانہ کے والد اور بھائی کے بارے میں علم تھا کہ ان لوگوں کی دو ٹیکسٹائل ملیں لائل پور میں ہیں۔ کروڑ پتی لوگ ہیں۔ فرحانہ کالج اپنی گاڑی میں آتی جاتی تھی۔ وہ خود ہی اپنی کار ڈرائیو کر کے لاتی لے جاتی تھی۔ اس نے گھر کے احاطے میں تین شاندار قسم کی کاریں دیکھی تھیں جیسے اس گھر کے ہر فرد کی ایک کار تھی۔

کھانے کے دوران فرحانہ کی امی اور بھابی اس سے باتیں کرتی رہی تھیں۔ اس کے گھر' والدین اور بہن بھائیوں کے بارے میں پوچھتی رہی تھیں۔ باتیں بڑی محبت آمیز تھیں اور بار بار وہ دونوں اس کی طرف دیکھے جا رہی تھیں۔ کھانے کے بعد وہ اس کے ساتھ اس کے کمرے آ گئی۔ کوئی دس منٹ بعد ملازمہ ایک بڑے گلاس میں دونوں کے لئے آئس کریم فالودہ لے آئی تھی۔ وہ دونوں فالودے کے ساتھ انصاف کرتی ہوئی کالج کی سیاست کے بارے میں گفتگو کرتی رہیں۔

کوئی نصف گھنٹے بعد فرحانہ نے اپنی الماری میں سے البم نکال کر دکھائی۔ اس نے ایک وجیہہ مرد کی تصویر پر انگلی رکھ دی جو بڑا خوبصورت اور اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ بالکل سجاد کی طرح۔ اس تصویر کو دیکھتے ہی اس کے دل پر گھونسا سا لگا۔ اُسے بے وفا' مکار اور دغا باز سجاد کی یاد آ گئی تھی۔ گو فرحانہ کے پاس بیٹھ کر اور اس سے باتیں کرتے ہوئے وہ سجاد کے تازیانے کو کسی حد تک بھول گئی تھی مگر اس تصویر نے جیسے اس کا زخم پھر سے ہرا کر دیا تھا۔ اسے سجاد کی یاد آ گئی تھی۔

فرحانہ اسے اپنے اس بھائی کے بارے میں بتانے لگی جو جرمنی میں کوئی ڈپلومہ لینے گیا ہوا تھا مگر اس کے خیالوں میں تو سجاد آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ تصور میں سجاد اور اس عورت کو دیکھ رہی تھی۔ اس تصور سے اس کے بدن میں سنسنی بھر گئی تھی اور خون کی روانی تیز ہوئی جا رہی تھی اور پھر خوف کی ایک تیز لہر اس کے دماغ پر چڑھ گئی تھی۔ سجاد اور وہ عورت ساتھ ساتھ نظر آ رہے تھے۔ یہ سب تصور میں دیکھتے ہوئے اس کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ وہ فرحانہ کی طرف دیکھ رہی تھی تو ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ فرحانہ کا چہرہ دھندلا سا گیا ہے۔ اس نے پراگندہ خیالات کو جھٹکنے کی پوری کوشش کی لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ فرحانہ نے البم بند کر کے ایک طرف رکھ دیا اور اس سے پوچھا۔

"شکیلہ! میں نے سنا تھا کہ تمہاری شادی کی بات چیت چل رہی ہے۔ کیا ہوا اس

بات چیت کا؟"

وہ چونک کر سجاد کے خیال سے نکل آئی۔ "پہلے جو رشتہ آیا تھا وہ ٹھیک نہیں تھا۔ دوسرا رشتہ کل ہی آیا ہے ابھی اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل سکا۔"

"میری امی اور بھابی کو تم بے حد پسند آئی ہو۔ شاید میرے بھیا کو ان سے کہیں زیادہ پسند آؤ گی۔ ویسے تمہیں میرے بھیا پسند آئے؟" فرحانہ نے شوخی سے پوچھا۔

"مگر میں ابھی کسی کو پسند کرنا یا شادی کرنا نہیں چاہتی ہوں۔ میں بی اے کرنے کے بعد ایم اے کرنا چاہتی ہوں۔" شکیلہ نے جواب دیا۔ اس کا دل اندر سے ٹوٹ رہا تھا۔ لمحے کے لئے اس نے سوچا بھی تھا کہ سجاد سے انتقام لینے کے لئے وہ فرحانہ سے اس کے بھائی سے شادی کرنے کے لئے ہامی بھر لے مگر وہ کسی جلدبازی سے کام لینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سجاد کی محبت کو اب بھی دل کے کسی کونے میں چھپا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ "ابھی میں نے اس مسئلے پر سوچا نہیں ہے۔"

"تم میرے بھائی سے شادی کرو یا نہ کرو مگر میں تمہیں یہ مشورہ ضرور دوں گی کہ تم بی اے کرنے کے بعد شادی ضرور کر لینا۔ اعلیٰ تعلیم کے بکھیڑے میں نہیں پڑنا۔ اس لئے کہ ایک لڑکی کے لئے اعلیٰ تعلیم اتنی ضروری نہیں ہے جتنا سمجھی جاتی ہے۔ میں ضرورت سے زیادہ اعلیٰ تعلیم کے سخت خلاف ہوں۔" فرحانہ نے کہا۔

وہ فرحانہ کے ہاں سے نکلی تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ فرحانہ نے اسے ڈرائیور کے ہمراہ کار میں اس کو گھر تک چھوڑنے کی پیشکش کی تھی مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ اپنی کزن کے ہاں جا رہی ہے۔ وہ فرحانہ کے ہاں سے نکل کر نہ چاہتے ہوئے بھی سجاد کے گھر کی طرف چل پڑی تھی۔ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کس لئے اور کس امید پر اس کی طرف جا رہی ہے جہاں ملبے کا ڈھیر پڑا ہوا ہے۔ اس ملبے کے ڈھیر میں اسے کیا ملے گا۔ وہاں کیا ہو گا۔ وہاں تو صرف کرچیاں ہوں گی جو اس کے دل میں چبھ جائیں گی۔ کیا وہ ان کرچیوں کو نکال سکے گی؟ کہیں ایسا تو نہیں ہو گا کہ ان کرچیوں کو نکالتے نکالتے اس کی انگلیاں زخمی ہو جائیں۔

اس نے ایک بنگلے کے قریب پہنچ کر رک کر اسے دیکھا تو اسے سجاد کی کار احاطے میں نظر آئی۔ وہ زیادہ دور نہیں کھڑی تھی مگر جہاں کھڑی تھی وہاں سے وہ ہر چیز صاف دیکھ سکتی تھی۔ یہ جگہ چھپ کر کھڑے ہونے کے لئے موزوں تھی۔ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ سجاد کے فلیٹ پر جا کے دروازے پر دستک دے یا واپس چلی جائے، زینے پر آنچل

لہرایا۔ اس عورت کا سراپا ابھرا جو دوپہر کے وقت سجاد کے فلیٹ میں گئی تھی۔ پہلے عورت نمودار ہوئی تھی، اس کے پیچھے پیچھے سجاد تھا۔

اس عورت کا چہرہ تر و تازہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے کھلے کھلے بال بتا رہے تھے کہ وہ نہا کر نکلی ہے۔ اس کے بدن پر اب ساڑھی تھی گویا اس نے کپڑے بھی تبدیل کر لئے تھے۔

وہ دونوں بہت ہی خوش نظر آ رہے تھے۔ ان دونوں کے چہروں پر گزرے ہوئے لمحوں کا افسانہ لکھا ہوا تھا۔ ان کی باتوں کا شوخ انداز، ان کا والہانہ پن، ان کی سرشاری کی کیفیت کچھ دیر پہلے کی کہانی بتا رہی تھی اور یہ کہانی جیسے ان دونوں کے لئے نئی نہیں تھی۔ جانے کب سے دہرائی چلی آ رہی تھی۔ سجاد اس کے ساتھ بھی تو ایسی ہی کہانی دہرانا چاہتا تھا مگر اس نے کوئی موقع نہیں دیا تھا وہ اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھ رہی تھی جو ایک ماہر شکاری کی زد میں آ کر نکل گئی تھی۔

وہ دونوں کار کی اگلی نشست پر بیٹھ گئے۔ چند لمحوں کے بعد کار کسی البیلی حسینہ کی طرح لچکتی، بل کھاتی اور لہراتی ہوئی سی اس کے سامنے سے گزر گئی۔ اسے ایسا لگا کہ کار اس کے سینے پر سے دندناتی ہوئی گزر گئی ہو۔ وہ عورت اس جگہ بیٹھی تھی جہاں وہ بیٹھتی تھی۔ اس جگہ پر صرف اس کا اپنا حق تھا۔ اب اس جگہ اس کا کھڑا ہونا بیکار اور فضول تھا۔ اس کی زندگی کے آنگن میں جس پیار نے دبے پاؤں قدم رکھا تھا وہ اب کسی اور کی نذر ہو گیا تھا۔ کسی اور عورت نے اس کے محبوب کی زندگی میں قدم رکھ کر اس کی زندگی میں خزاں کی ویرانی بھری دی تھی اور اس کی محبت کو روند دیا تھا۔ اس عورت نے اس کے محبوب کو پانے کے لئے اپنے آپ کو میلا کر لیا تھا۔ جس پیار کے تقدس پر بدنما میل آ جائے وہ پیار، پیار کے قابل نہیں رہتا ہے اور روحوں کا پیار تو سمجھوتے نہیں کرتا ہے۔ ان میں صلح صفائی بھی نہیں ہوتی ہے۔ وہ پیار ہمیشہ کے لئے مر جاتا ہے۔ اس لئے کہ اس پیار کا زندہ رہنا روایات کے خلاف ہوتا ہے۔

رات شکیلہ کو بڑی دیر تک نیند نہیں آئی تھی۔ جب اس نے اپنی امی اور ابو کو سوتے ہوئے دیکھا تو وہ چھت پر چلی آئی۔ رات اندھیری تھی مگر اس کا اندھیرا زیادہ دیر تک چھایا نہ رہ سکا۔ جب آسمان کے مشرقی کنارے سے چاند طلوع ہوا تو ایک دم سرخ تھا جیسے وہ کوئی خون آلود خنجر تھا۔ اسے اپنا دل بھی اسی طرح لہو لہو لگ رہا تھا جیسے اس کا دل، دل نہ ہو لہو آلود خنجر ہو۔ اس خنجر نے جیسے محبت کو لہولہان کر دیا ہو۔ پھر چاند کی رنگت بھی بدلنے لگی تھی جس طرح ایک معشوق کا مزاج بدلتا ہے، جیسے خون آشام فطرت کو چھپا

کر اجلی چاندنی کی طرح مسکراتی ہے۔
شکیلہ سجاد کے بارے میں سوچتے سوچتے اور چاند کو دیکھتے دیکھتے غیر ارادی طور پر ایک جال میں الجھ گئی تھی اور جس جال میں وہ الجھی ہوئی تھی اس سے نکلنے کا اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سجاد کو پانے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ سجاد کو وہ اس صورت میں کسی قیمت پر پانا نہیں چاہتی تھی جس صورت میں اس عورت نے سجاد کو پالیا تھا۔ مگر سجاد کو پانے کے لئے اسے کوئی نہ کوئی صورت تو پیدا کرنی ہی ہو گی خواہ راستہ کتنا ہی کٹھن' کتنا ہی دشوار کیوں نہ ہو۔ سجاد کو بہرحال اپنانا ہی ہو گا۔ گو اس عورت نے تمام راستے مسدود کر دیئے تھے۔ امید نہیں تھی کہ اسے پھر سے اس کی کھوئی ہوئی منزل مل جائے گی۔ مگر وہ ہمت ہارنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اس کی محبت کی راہ میں حائل ہونے والی ہر شے کو ہٹا کر اپنی منزل پر پہنچ جائے گی۔

وہ تین دن سے برابر کالج جا رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کالج سے نکل کر اس جانب دیکھ لیتی تھی جہاں سجاد اپنی کار لئے انتظار کرتا تھا۔ تین دن ہو رہے تھے نہ تو سجاد کی صورت نظر آئی تھی اور نہ ہی اس کی کار نظر آئی تھی۔ گویا وہ تین چار دنوں سے اس عورت کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا پھر رہا تھا۔ ابھی شاید اس عورت سے اس کا جی نہیں بھرا تھا۔ وہ جب بھی اس عورت کے بارے میں سوچتی تھی اس عورت کا سراپا اس کے تصور میں ابھر آتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ عورت بے حد پُرکشش تھی۔ وہ تیس برس کی بہت دلکش اور دل فریب نشیب و فراز' ہیجان خیز متناسب اعضا کی مالک تھی۔ اس کے کسے کسے بدن اور بدن میں کسی پکے پھل جیسا رسیلا پن تھا۔ وہ اس عمر کی اور ایسی عورت تھی جو مردوں کی رگوں میں آگ دوڑا دیتی تھی اور مردوں کے ہوش و حواس گم کر دیتی تھی۔ تنہائی کی بہترین رفیقہ۔ شاید سجاد اس کی قربت کا عادی بن کر رہ گیا تھا۔ جبھی تو وہ ادھر نہیں آ رہا تھا۔

چوتھے دن اس نے سجاد کو دیکھا جو کار لئے اس مخصوص جگہ پر کھڑا تھا جہاں وہ اکثر کھڑا رہتا تھا۔ اس نے سجاد سے نظریں چار کی تھیں لیکن اس نے کوئی لفٹ نہیں دی تھی۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ انجان بن کر گزر گئی تھی۔ بس اسٹاپ پر پہنچ کر بس میں سوار ہوئی تو اس نے کار کو بس کے تعاقب میں دیکھا تھا۔ وہ اپنے گھر کے بس اسٹاپ پر نہیں اتری تھی۔ یہ حرکت اس نے دانستہ کی تھی۔ پھر ایک لڑکی کے ساتھ اگلے اسٹاپ پر اتر کر وہ کسی بہانے سے اس لڑکی کے گھر چلی گئی تھی۔ اس نے سجاد کو دیکھا تو وہ اس بس اسٹاپ

پر بھی اپنا کار لئے موجود تھا۔ وہ اس سہیلی کے گھر جا کر عقبی راستے سے نکل کر اپنے گھر چلی آئی تھی۔

وہ چار دنوں تک سجاد کو اسی طرح جُل دیتی' ستاتی' تنگ اور پریشان کرتی رہی تھی۔ سجاد کو دیکھتے ہی اس کے دل میں نفرت سی عود کر آئی تھی۔ جب وہ گھر پہنچی تو اسے پچھتاوا ہوا تھا کہ اس نے اچھا نہیں کیا تھا۔ پھر اس روز کا واقعہ اور وہ عورت نظروں میں گھوم جاتی تو اس کے دل کی وحشت بڑھ سی جاتی تھی۔

ساتویں دن سجاد نے اسے ایک گلی میں آ لیا تھا۔ سجاد کا چہرہ دیکھ کر اس کے دل پر چوٹ سی لگی تھی۔ سجاد کا چہرہ جیسے بدل کر رہ گیا تھا۔ وہ شکل سے برسوں کا مریض نظر آ رہا تھا۔ اس نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔

"یہ کیسا مذاق ہے شکیلہ! خدا کے لئے مجھے اتنی بڑی سزا اور ایسی اذیت تو نہ دو۔"

وہ سجاد کے ساتھ اس کے فلیٹ میں جا کر اس سے بات کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ فلیٹ میں پہنچ کر سجاد اس کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھی تھی۔ ان دونوں کے درمیان ایک گہرا سکوت قبرستان کے سکوت کی طرح حائل تھا۔ اس کے دل میں گڑی ہوئی پھانس آج اب بھی چبھ رہی تھی۔ اس کی نظریں خواب گاہ کی طرف بار بار اٹھ رہی تھیں۔ جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور پلنگ سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔ اس پلنگ پر سجاد اس عورت کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ اس پلنگ کے بستر کی چادر پر شکنیں نظر آ رہی تھیں۔ اس کی بات ابھی دل ہی میں تھی۔ وہ اس روز اس عورت کے بارے میں کہنے کے لئے الفاظ جمع کر رہی تھی۔ انہیں ترتیب دے رہی تھی اور پھر اپنا حوصلہ مجتمع کر رہی تھی۔ اس کا دوپٹہ بار بار شانے سے پھسل پھسل کر اس کی گود میں آ رہا تھا۔ سجاد اس کی اذیت ناک خاموشی سے اور اذیت میں مبتلا ہو رہا تھا۔ جب سے شکیلہ گاڑی میں بیٹھی تھی' گھر آئی تھی' اس کے سینکڑوں سوالوں کے جواب میں وہ اب تک خاموش تھی۔ اس نے ایک بار پھر گڑگڑا کر شکیلہ کے پیروں پر اپنا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ رگڑا۔ "خدا کے لئے شکیلہ! اذیت کا یہ خنجر میرے سینے سے تو نکالو۔"

"پندرہ دنوں سے میرے سینے میں خلش کا جو خنجر پیوست ہے اور میرے دل کے جو زخموں سے خون رس رہا ہے اس کا کیا بنے گا؟"

"کون سی خلش شکیلہ!" وہ شکیلہ کے پیروں سے سر اٹھا کر بولا۔ "میں نے تمہیں کون سی خلش دی ہے' کون سا زخم دیا ہے؟"

"وہ عورت کون تھی سجاد!" وہ یکایک پھٹ پڑی۔ اس نے اپنے پیر کھینچ لئے اور برہمی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ چند قدم پر جاکر رکی اور اس کی طرف گھومی تو سراپا میں ایک بے تابانہ سی لہرا اٹھی۔ "جو دوپہر کے سناٹے میں تمہارے فلیٹ پر آئی تھی۔ دوپہر سے سہ پہر تک تمہارے ساتھ فلیٹ میں رہی تھی۔ تم دونوں نے مل کر ہماری محبت کے وجود کو بھی میلا کیا۔ بولو یہ میں غلط کہہ رہی ہوں۔ یہ جھوٹ ہے۔ سراسر بہتان ہے، تہمت ہے۔" وہ سجاد کی منجمد اور پھٹی پھٹی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی ہذیانی انداز میں چیخی۔ "تم نے تو مجھ سے کہا تھا کہ میں ایک بے حد ضروری کام سے کچھ دنوں کے لئے کراچی جا رہا ہوں۔ کیا یہی ضروری کام تھا۔ مجھے دھوکا دینے اور میری محبت کا ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی؟ بولو سجاد..........!" شکیلہ کے سینے میں تنفس تیز ہو گیا۔

سجاد نے چونک کر شکیلہ کی طرف دیکھا جس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور پورا بدن لرز رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بدن کا سارا خون سمٹ آیا تھا۔ اس کی زبان شعلے اگل رہی تھی۔ وہ شعلے سجاد کا سارا وجود خاکستر کئے دے رہے تھے۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی زبان خشک ہونٹوں پر پھیری۔

"اچھا تو تم نے اس عورت کو دیکھ لیا تھا؟" سجاد نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"جبھی تم مجھ سے روٹھ گئی تھیں۔ مجھ سے ملنے سے کترا رہی تھیں۔ مجھے پورے سات دنوں تک نہیں سات صدیوں تک دق کیا تھا؟ صرف اس لئے کہ میں اس عورت کے ساتھ دیکھا گیا تھا اور اب اپنے دل کا بخار اتار رہی ہو اور.........."

شکیلہ نے درمیان میں فوراً ہی ہیجانی لہجے میں اس کے سر پر جیسے کسی ہتھوڑے کی ضرب لگائی۔ "میں اپنی نفرت، حقارت اور غصے کا اظہار کرنے کی بجائے کیا تمہیں اس بات پر دلی مبارک باد پیش کروں کہ تم نے ایک بدکار عورت کے ساتھ وقت گزارا۔" اس کے لہجے میں زہر اور تمسخر بھر گیا تھا۔ وہ خشونت کے انداز میں کہنے لگی۔

"کیا تم اس حقیقت سے انکاری ہو کہ اس ذلیل اور آوارہ عورت کو تم نے اپنے فلیٹ پر اپنی دل لگی کے لئے بلایا تھا؟ کیا یہ فلیٹ اور اس کا ماحول امانت نہیں تھا ہماری محبت کا؟ کیا پاکیزگی اور تقدس امین نہیں ہیں؟ کیا تم نے اور اس جسم فروش عورت نے مل کر امانت میں خیانت نہیں کی؟ بولو سجاد!" شکیلہ نے غصے میں آکر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

"تم اتنے بھی گر جاؤ گے؟ تم اس قدر گرے ہوئے ہو گے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

"شکیلہ پلیز!" سجاد نے ایک دم تڑپ کر اسے اشارے سے روکا۔ "تم نے بغیر سوچے سمجھے اور پوچھے اس عورت پر بہتان لگا دیا۔ وہ عورت جو بھی ہے ایک شریف عورت ہے۔ خدا کے لئے اس شریف عورت کو ان الفاظ سے نواز کر اپنی زبان خراب مت کرو۔ اس عورت نے یا میں نے کوئی برائی نہیں کی ہے۔ نہ ہی تقدس اور پاکیزگی کو پامال کیا ہے۔ نہ ہی محبت کی دھجیاں بکھیری ہیں۔ نہ ہی وہ عورت طوائف ہے جسے تم.........."

"تو تم ایک سیاہ کار عورت کو شرافت کا لبادہ پہنا رہے ہو۔ کیا اس طرح ایک عورت کے دامن کی سیاہی مٹ جائے گی؟ اگر وہ شریف عورت تھی تو وہ تمہارے پاس دوپہر کے سناٹے میں کس لئے آئی تھی؟ وہ تمہاری تنہائی میں مخل ہو کر کیا کرتی رہی تھی؟ کیا تم دونوں تین گھنٹے تک اس فلیٹ میں بند ہو کر کوئی کتاب پڑھ رہے تھے؟ کیا ایسی عورت کو شریف کہا جا سکتا ہے؟ جب تم دونوں تین گھنٹے کے بعد فلیٹ سے باہر نکلے تھے تو تب میں نے تم دونوں کے چہرے پر جو کچھ لکھا دیکھا تھا وہ صاف اور واضح طور پر پڑھا جا رہا تھا۔ تم دونوں کا والہانہ پن، باتوں کا انداز اور سرشاری صاف بتائے دے رہی تھی کہ یہ کہانی نئی نہیں ہے اور کئی بار دہرائی جا چکی ہے اور تم دونوں کا آپس میں برسوں سے گہرا تعلق ہے۔ کیا تم اب تک میری محبت کا سہارا لے کر میری آنکھوں میں دھول نہیں جھونکتے رہے تھے؟ آج تم راستے میں میری منتیں، سماجتیں اور خوشامدیں کر کے لے آئے ہو کہ میں تمہاری بات سن لوں۔ میں تمہاری بات سننے سے پہلے اپنے سوالوں کا جواب چاہتی ہوں۔ مجھے تمہاری، اپنی اور اس عورت کی پارسائی کے بارے میں تقریر نہیں سننا ہے۔"

"اب جبکہ راز راز ہی نہیں رہا ہے تو تمہیں بتانے میں کوئی حرج بھی نہیں رہا ہے۔" سجاد نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا تو اس نے سجاد کو جھڑک دیا۔

"اب تم مجھے اپنا ناپاک ہاتھ مت لگاؤ۔"

"نہیں شکیلہ! یہ ہاتھ ناپاک نہیں ہیں۔ یہ پاک ہیں اور ہمیشہ پاک ہی رہیں گے۔ اگر یہ ناپاک ہوتے تو پھر تم ان کی ناپاکی سے نہیں بچتیں۔"

"چلو جلدی سے اس راز پر سے پردہ ہٹاؤ کہ وہ عورت تمہاری داشتہ ہے۔ تم یہی مجھے بتانا چاہتے ہو نا؟" اس نے استہزائی انداز میں کہا۔

"جب تک تم میری پوری بات نہ سن لو اس وقت تک اس عورت کے بارے میں اپنی زبان سے ایک لفظ نہ نکالنا۔" سجاد نے اس کا ہاتھ پکڑ اسے کرسی پر بٹھا دیا مگر وہ فرش

پر خود دو زانو ہو کر بیٹھا رہا تھا۔

"تم میری بات کا یقین کرو یا نہ کرو۔ مگر میں نے تمہیں پہلے ہی دن جب تم سے ملاقات ہوئی تھی تو سوچ لیا تھا اور یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس عورت کے بارے میں بتا دوں گا جس کا نام نسرین ہے۔ مگر میں پہلے دن تمہیں نسرین کے بارے میں بتا کر اس سے اور اپنے آپ سے تمہیں بدظن نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نسرین کے بارے میں بتانے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا۔ اس لئے کہ میں چاہتا تھا کہ ہم دونوں میں گہری محبت ہو جائے۔ محبت کی جڑیں اتنی گہری ہو جائیں اور اتنی پھیل جائیں کہ انہیں دنیا کی کوئی طاقت' کوئی عورت اور شدید سے شدید نفرت بھی کاٹ نہ سکے۔ یہ محبت ہماری اس قدر اور اتنی بڑی کمزوری بن جائے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہ کر سکیں۔ میں کچھ دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ ہماری محبت کی جڑیں بڑی گہری ہو چکی ہیں اور اب دونوں ایک دوسرے کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتے ہیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی ذات کا جزو ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں۔ اس بے پایاں محبت کی اس سے بڑی مثال اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ تم اتنی شدید نفرت کے باوجود چلی آئیں۔ تمہاری اس نفرت کے پیچھے آج بھی میری محبت چھپی ہوئی ہے۔ اگر تمہیں واقعی مجھ سے نفرت ہوتی تو پھر تم میرے ساتھ نہیں آتیں۔ تم جس عورت پر اتنے گھناؤنے الزامات لگا رہی ہو وہ عورت کوئی سیاہ کار' جسم فروش اور فاحشہ نہیں ہے۔ وہ عورت میری بیوی ہے۔ میری بیوی نسرین۔"

"وہ تمہاری بیوی ہے؟" شکیلہ پر کوئی بجلی گر پڑی تھی۔ وہ سناٹے میں آ گئی تھی۔ کتنی ہی دیر تک اس عالم میں بیٹھی رہی۔ اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ وقت کی نبض جیسے رک گئی تھی۔ اس روز کی طرح آج بھی اس کے بدن میں سردی کی لہر اٹھی تھی۔ پھر ایک دم سے اسے ایسا محسوس ہوا کہ اسے چکر سا آ رہا ہے۔ سامنے کی ہر چیز دھندلا رہی ہے۔ اور پھر اس کمرے میں جیسے زبردست بھونچال آ گیا ہو۔ وہ کرسی کانپ رہی ہو جس پر وہ بیٹھی ہے۔ سجاد کانپ رہا ہو جو اس کے قدموں کے قریب بیٹھا ہوا ہے۔ اسے سارا کمرہ اور کمرے کی ہر چیز چکر کھاتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ پھر اسے ایسا لگا تھا کہ سچ مچ کا زلزلہ آ گیا ہو۔ اسے غش سا آ رہا تھا۔ اس نے گرتے گرتے خود کو سنبھال لیا اور دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر کرسی سے ٹیک لگا لی۔

"شکیلہ' شکیلہ!" اس نے پریشان ہو کر اسے شانوں سے تھام لیا۔ "کیا ہوا شکیلہ؟

خیریت تو ہے؟ کیا طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ چلو اٹھو' چل کر اندر لیٹ جاؤ۔"

شکیلہ نے خود کو سنبھال کر اس کے دونوں ہاتھ اپنے شانے پر سے جھٹک دیئے۔ اسے ایسا لگا تھا کہ یہ سجاد کے نہیں کسی درندے کے ہاتھ ہیں جو اسے دبوچ لینا چاہتے ہیں۔ وہ اپنا سراپا سمیٹ کر بہ دقت تمام اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کی طرف بڑھی تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ دل اچھل کر حلق میں آ جائے گا۔ اس نے زور سے اپنا سینہ پکڑ لیا۔ اس کے چہرے پر بلا کا کرب اور اذیت اُبھر آئی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے دروازے کی طرف بڑھی تو اس کی آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی دھند گھپ اندھیرے میں بدل گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ پھر بھی آگے بڑھی تو اس کے پاؤں تھرتھرانے لگے۔ اس نے گرتے گرتے اپنا بایاں ہاتھ پھیلا کر کسی چیز کا سہارا لینا چاہا۔ وہاں کچھ نہ تھا جو اسے سہارا دیتا اور وہ دوسرے لمحے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ پھر وہ گری تو اس نے محسوس کیا کہ وہ سجاد کے ہاتھوں میں جھول رہی ہے۔

سجاد نے اسے سہارا دے کر صوفے پر لٹا دیا۔ اس نے گھبرا کر شکیلہ کی نبض ٹٹول کر دیکھی۔ نبض ٹھیک تھی' چل رہی تھی۔ پھر اس نے مزید تسلی کے لئے شکیلہ کے سینے کی طرف دیکھا۔ اس کے زیر و بم سے پتا چل رہا تھا سانس ٹھیک چل رہی ہے۔ اس کے دل میں ایک انجانا سا خوف پیدا ہو گیا۔ خدا نخواستہ شکیلہ کو کچھ ہو گیا تو اسے لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ شکیلہ کو صدمہ کسی بجلی کی طرح لگا ہے۔ اس لئے وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔ وہ اچانک اور غیر متوقع شدید صدمہ برداشت نہیں کر پائی ہے۔ وہ سخت پریشان ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ ڈاکٹر کو لینے کے لئے اسے خود باہر جانا پڑتا تھا۔ اتفاق سے اس کے پاس ٹیلی فون بھی نہیں تھا ورنہ فون کر کے ہی وہ کسی ڈاکٹر کو بلا لیتا۔ وہ شکیلہ کو اس حالت میں چھوڑ کر ڈاکٹر کو لینے جانا نہیں چاہتا تھا۔ معلوم نہیں اس عرصے میں اس پر کیا کچھ بیت جائے۔ شکیلہ کے چہرے پر اذیت چھائی ہوئی تھی۔ اس کا حسین چہرہ کسی پھول کی طرح مرجھا سا گیا تھا۔ وہ شکیلہ پر جھک کر چند لمحوں تک اس کا حسین چہرہ غور سے دیکھتا رہا' سوچتا رہا۔ پھر اُس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے شکیلہ کو اٹھا لیا۔ پھر اس نے چونک کر اور یہ خیال کر کے کہ شکیلہ کو ہوش آ گیا تو وہ اس کی اس حرکت کو خدا معلوم کیا سمجھے۔ اس نے شکیلہ کو خواب گاہ میں لے جا کر بڑی آہستگی سے پلنگ پر لٹا دیا۔ خود وہ کرسی کھینچ کر پلنگ کے پاس بیٹھ گیا اور شکیلہ کا چہرہ دیکھنے لگا۔

وہ شکیلہ کا چہرہ بڑے غور اور آزادی سے دیکھ رہا تھا۔ اس تنہائی میں ایسا کوئی نہیں تھا جو اُسے اس طرح دیکھنے پر اسے باز رکھ سکے اور پھر شکیلہ خود بھی بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ وہ یہ چہرہ جی بھر کے دیکھنا چاہتا تھا جو اَن گنت روپ لئے ہوئے تھا۔ ہر روپ کسی خوبصورت غزل کی طرح تھا۔ پھر وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ وہ شکیلہ کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے آج تک اتنا حسین چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ یہ چہرہ سچ مچ چودھویں کے چاند کی طرح تھا۔ اس نے ایسی موہنی صورت تو سارے لاہور شہر میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ یہ گلاب سا چہرہ۔ "شکیلہ!" وہ بے خیالی میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

"شکیلہ! یقین مانو میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔ میرے دل میں تمہاری محبت کے کتنے ہی شگوفے کھل رہے ہیں تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔ نسرین میری بیوی ضرور ہے مگر میرا دل اس کی ملکیت میں نہیں ہے۔ میرے دل کے گوشوں میں تمہاری محبت کسی جھرنے کی طرح بہہ رہی ہے۔ تم کہو تو میں اپنا سینہ چیر کر دکھا سکتا ہوں۔ تم میری محبت ہو شکیلہ! میں تمہیں اپنے دل سے نہیں نکال سکتا ہوں۔ اگر تم مجھ سے روٹھ گئیں اور تم نے میری محبت کو ٹھکرا دیا تو پھر میں ایک لمحے کے لئے بھی زندہ نہیں رہوں گا۔ میں مر جاؤں گا۔ فنا ہو جاؤں گا شکیلہ!"

مگر شکیلہ تو دل کے دروازے بند کر کے بے ہوشی کی نیند سو رہی تھی۔ اس کے دل کی صدا جیسے پتھروں سے ٹکرا کر واپس آ رہی تھی۔ وہ جذباتی سا ہو کر شکیلہ کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کئے بیٹھا تھا۔

سجاد کے ذہن میں دفعتاً ایک خیال بجلی کی طرح آیا تو اس نے غسل خانے میں جا کر مگ میں پانی بھرا اور کمرے میں آ کر شکیلہ کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے۔ شکیلہ کے بدن میں جنبش سی ہوئی۔ چہرے نے حرکت کی۔ اس نے پانی کا مگ قریب والی تپائی پر رکھ دیا۔ پھر اس نے کھڑے کھڑے دیکھا۔ وہ دو زانو ہو کر پلنگ کے پاس بیٹھ گیا۔ شکیلہ جیسے گہری نیند سو رہی تھی۔ اب اس کے چہرے پر کرب و اذیت نہیں تھی۔ اس کا بدن ساکت تھا اور ہاتھ بھی ایک طرف بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر شکیلہ کی پیشانی چھو کر دیکھی اور گلے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ بخار تو نہیں تھا۔ پھر اس نے شکیلہ کا ہاتھ جو بے حس و حرکت تھا، اٹھا کر اپنے جلتے ہوئے ہونٹوں اور آنکھوں سے لگایا اور پھر اُسے اسی جگہ رکھ دیا۔

سجاد نے محسوس کیا کہ شکیلہ کو آہستہ آہستہ ہوش آ رہا ہے۔ شکیلہ نے چند لمحوں

بعد اپنی آنکھیں کھول دیں۔ چند لمحے تک وہ خلا میں گھورتی رہی پھر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ اس کے ذہن میں کچھ دیر پہلے کا واقعہ پھر سے تازہ ہو گیا تھا۔ اس کے دل میں درد جاگ اٹھا تھا۔ اس درد کی لہر نے اس کے وجود کو جیسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ اپنے بدن سے چادر ہٹا کر دوپٹہ سینے اور شانے پر درست کر کے پلنگ سے اترنے لگی تو سجاد نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔

"چھوڑو میرے ہاتھ۔" شکیلہ نے اپنی پوری قوت مجتمع کر کے اپنے ہاتھوں کو چھڑانے کی کوشش کی۔ "میں تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔"

"پلیز شکیلہ!" سجاد نے اس کی کلائیاں بڑی مضبوطی سے تھام رکھی تھیں۔ شکیلہ انہیں چھڑا نہ سکی۔ وہ چھڑا بھی نہیں سکتی تھی۔ اس بار سجاد نے اپنی پوری قوت صرف کر دی تھی۔ "میں یقیناً تمہارا مجرم ہوں شکیلہ! مگر مجرم کو اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا حق تو ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے میری پوری بات سن لو۔ اس کے بعد تم جو بھی فیصلہ کرو گی اور سزا دو گی مجھے منظور ہے۔"

"اب تمہارے پاس کہنے کے لئے رکھا ہی کیا ہے؟" اس نے تنک کر تیز و تند نظروں سے سجاد کو گھورا۔ "اب میں کوئی بکواس سننا نہیں چاہتی ہوں۔"

"سن لینے میں کیا حرج ہے؟" سجاد نے اس کی غصیلی اور نفرت بھری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میں صرف دس منٹ لوں گا.......... دس منٹ۔"

"اچھا۔" شکیلہ کے لہجے میں حقارت سی تھی۔ "میری کلائیاں تو چھوڑو۔ ان میں درد ہو رہا ہے اور ٹوٹی سی جا رہی ہیں۔"

سجاد نے اس کی کلائیاں آزاد کر دیں۔ شکیلہ کے سینے میں سانسوں کا زیر و بم اٹھ رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر نفرت اور غصے سے پیچ و تاب کھاتی اپنی کلائیوں کو دبانے اور مسلنے لگی جو درد کر رہی تھیں۔ اس نے سجاد کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"جو کچھ کہنا ہے جلدی کہو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"میں تمہیں خود بھی اس راز کے بارے میں جلدی سے جلدی بتانا چاہتا ہوں جو میرے سینے میں ناسور بنا ہوا ہے۔ شاید یہ راز بتانے سے میرے دل کے زخم بھر جائیں۔ میں نے تم سے محبت بھی اس لئے کی شکیلہ کہ تم میرے زخموں کا مرہم بن جاؤ گی۔" اس پر گہری سنجیدگی سی طاری ہو گئی۔ وہ بڑے جذباتی اور غمگین لہجے میں کہنے لگا۔

"میں شادی سے پہلے ایک مل میں خریداری کے شعبے میں ملازمت کرتا تھا۔ میری

آمدنی اس قدر معقول نہ تھی کہ گھر کا گزارہ ہو سکے۔ پھر میں دو ایک ٹیوشن کرنے لگا تھا۔ آٹھ دس گھنٹوں کی ملازمت کے بعد مجھے جگہ جگہ سائیکل پر جا کر لڑکے اور لڑکیوں کو پڑھانا پڑتا تھا۔ میری آدھی سے زیادہ تنخواہ گھر کے اخراجات اور آدھی تنخواہ باپ کی بیماری پر خرچ ہو جاتی تھی۔ اس طرح گھر کی گزر بسر ہو رہی تھی اور میں ایک اچھی زندگی کو ترس رہا تھا۔ مگر میں برابر جدوجہد کرتا رہا تھا کہ زندگی اور مستقبل بناؤں۔ نسرین نے مجھے پہلی بار اپنے ایک رشتہ دار کے ہاں دیکھا تھا۔ میں اس کی ایک رشتہ دار بہن کو روز ٹیوشن پڑھانے جایا کرتا تھا۔ نسرین نے مجھے ایک بہت ہی معقول رقم پر ٹیوشن پڑھانے کی پیشکش کی تو میں نے اسے قبول کر لیا۔ اس کی ٹیوشن فیس اوروں کے مقابلے میں دگنی تھی۔

یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ نسرین کو ٹیوشن سے نہیں مجھ سے دلچسپی ہے۔ مجھ پر وہ ریجھ گئی ہے اور اس کی رشتہ دار بہن خاور جسے میں ٹیوشن پڑھانے جاتا تھا وہ نوجوان اور بہت حسین تھی۔ وہ بھی مجھ میں دلچسپی لے رہی تھی مگر میں نے اس میں کبھی دلچسپی نہیں لی تھی اور نہ میں نے کبھی اسے اپنی کسی بات سے یہ ظاہر ہونے دیا تھا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ البتہ میں اسے بے حد پسند کرتا تھا۔ اس لئے کہ وہ پڑھنے میں بہت تیز تھی' سمجھدار تھی۔ مگر نسرین کو شک سا ہو گیا تھا کہ میں خاور سے محبت کرتا ہوں۔ وہ خواہ مخواہ رقابت کی آگ میں جلنے لگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کتنی ہی لڑکیاں میری وجاہت پر مرمٹی تھیں اور وہ میرے ایک اشارے کی منتظر ہوتی تھیں مگر مجھے ان لڑکیوں کی اداؤں نے متاثر نہیں کیا۔ میں بہکا نہیں۔ شاید اس لئے کہ میں زندگی کے گوناگوں مسئلوں میں الجھا ہوا تھا اور پھر میں ان گھروں میں لڑکیوں کو پڑھانے جاتا تھا' عشق کرنے کے لئے نہیں۔ میری یہی وہ شرافت تھی جس نے لڑکیوں کے والدین کو مجھ پر اعتماد اور بھروسہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے ان والدین کے اعتماد کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچائی تھی۔

نسرین پڑھائی میں نہیں' مجھ میں دلچسپی لینے لگی تھی۔ میں نسرین کو خاور کی مثال دیا کرتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ خاور کا نام جلتی پر تیل کا دھارا بن کر گرتا ہے۔ خاور کا ذکر سن کر نسرین کا چہرہ بجھ بجھ سا جاتا تھا۔ وہ اندر ہی اندر جیسے کڑھنے لگتی تھی۔ پھر ایک دن نسرین نے مجھے اپنی حشر سامانیوں کا کچھ ایسا شکار کیا کہ میں نے جذبات کی رو میں بہہ کر اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ دراصل میں اس کے حسن سے متاثر نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی امارت نے مجھے متاثر کیا تھا۔ مجھے ضرورت تھی اس کی دولت کی تاکہ میں اپنی زندگی بنا

سکوں اور اپنے بیمار باپ کا کسی اچھے ہسپتال میں علاج کرا سکوں اور گھر کے تمام مسائل کو الہ دین کے جادوئی چراغ سے دور کر سکوں جو کسی پکے پھل کی طرح میری جھولی میں آگرا تھا۔"

سجاد نے توقف کر کے شکیلہ کی طرف دیکھا جو اس کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی مگر اس کے ہاتھوں میں ایک اضطراری کیفیت تھی۔ اس کے سارے بدن میں بے چینی سی بھری ہوئی تھی۔ وہ پہلو بھی بدلتی جا رہی تھی۔ اس نے شکیلہ کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کیں تو شکیلہ نے اپنی نظریں نیچی کر لیں اور فرش کو دیکھنے لگی۔

سجاد اسے غمگین لہجے میں بتانے لگا۔ "میں نے نسرین سے شادی کر کے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی۔ اس سے شادی کرنے کے بعد گو میرے والد کا علاج ایک بڑے ہسپتال میں ہونے لگا۔ میرے گھر کے بہت سارے مسائل حل ہو گئے اور میں ایک حسین بیوی کا شوہر بن گیا تھا مگر اس کے لئے مجھے اپنے آپ کو بیچنا پڑ گیا تھا۔ میں اس کا شوہر نہیں ایک غلام بن کر رہ گیا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان جو محبت تھی وہ بڑی کھوکھلی تھی۔ اس سے کہیں دل کی گہرائیاں پُر ہو سکتی ہیں؟ میں تو دل کی تسلی اور زندگی گزارنے کے لئے اس کے ساتھ رہ رہا تھا۔ تم نے تو نسرین کو دیکھا ہے نا؟ وہ کس قدر حسین ہے۔ آج سے سات سال پہلے تو اس کا حسن اپنی مثال آپ تھا مگر معلوم نہیں کیوں میرا جی اس سے بہت جلد ہی بھر گیا تھا۔ محبت جسم سے نہیں کی جاتی ہے جسم سے جو محبت کرتے ہیں وہ بہت جلد اکتا جاتے ہیں۔ دلوں کی محبت کا سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ میرے نزدیک اس میں کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ اسے اپنی دولت کا اس قدر غرور ہو گیا تھا کہ وہ میرے ساتھ بڑی بے رحمی اور رعونت سے پیش آنے لگی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان نفرت کی غیر محسوس سی دیوار کھڑی ہو گئی تھی اور وہ اونچی ہوتی چلی جا رہی تھی۔ ہم دونوں اس نفرت کے باوجود ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ دنیا کو بتا رہی تھی کہ میرا شوہر دنیا کا سب سے خوبصورت اور زر خرید شوہر ہے۔

پھر ایک روز باتوں باتوں میں مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ نسرین نے مجھ سے شادی اس لئے بھی کی تھی کہ وہ خاور کو جلائے اور اس سے انتقام لے۔ اس لئے کہ ایک بار خاور نے اس کا کوئی محبوب چھین لیا تھا۔ وہ محبوب نہ نسرین کا ہو سکا اور نہ ہی خاور کا۔ مگر نسرین کے دل میں تو خاور سے نفرت اور انتقام لینے کا لاوا پک رہا تھا۔ میری نسرین سے شادی ہونے کے بعد خاور کے دل پر جیسے بجلی گر پڑی تھی۔ وہ اندر ہی اندر گھٹ کر جیتے جی ہی مر

گئی تھی۔ وہ سینی ٹوریم میں داخل کر دی گئی تھی۔ ایک روز میں اس کی خیر خبر لینے کیا گیا اس روز سے جیسے قیامت آ گئی۔ میں نے کئی بار سوچا کہ اس سے الگ ہو جاؤں مگر اس سے الگ ہونے کا خیال بھی سوہانِ روح تھا۔ اس لئے کہ میں نے اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کی زندگی کو اس کے پاس رہن جو رکھا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب میں اس وقت تک الگ نہیں ہو سکوں گا جب تک میرا باپ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو جاتا۔ میری جوان بہن کی شادی نہیں ہو جاتی۔ میں اس جہنم جیسی زندگی پر اندر ہی اندر کڑھتا رہا اور وہ غراتی رہی۔ میں اسے دکھاوے کا پیار کرنے اور اس کی خواہشات پوری کرنے اور اس کے اشاروں پر کسی کٹھ پتلی کی طرح چلنے پر مجبور ہوتا رہا۔

جب وہ بھی میری ذات سے بیزاری محسوس کرنے لگی تو اس نے مجھے طعنے دینے شروع کر دیئے تھے۔ ایک امیر و کبیر عورت جو شکی مزاج بھی واقع ہو۔ اس سے گزارا کرنا آسان نہیں ہوتا۔ روز بروز میرا اس سے نبھاہ مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اگر میں گھر دیر سے پہنچوں تو وہ مجھے طعنے دیتی تھی کہ میں خاور سے مل کر آ رہا ہوں۔ اگر میں اپنا بہترین سوٹ پہن کر جا رہا ہوں تو خاور سے ملنے۔ اگر میں کسی وجہ سے اس کی خواہش پر پوری توجہ نہ دوں اور رسمی انداز سے پیش آؤں تو اس کے خیال میں میرے دل و دماغ پر خاور چھائی ہوئی ہے۔ اگر میں اسے بانہوں میں بھرلوں تو بھی اسے شک سا ہوتا تھا کہ میں اپنے بازوؤں میں خاور کو محسوس کر رہا ہوں۔ خاور کا نام سنتے سنتے میرے کان پک گئے تھے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں کسی دن بھرا پستول لا کر اس کی تین گولیاں نسرین کے جسم میں اتار دوں۔ باقی تین گولیاں اپنے بدن میں۔

آخر ایک روز نسرین سے میں نے ایک سمجھوتا کر لیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے کراچی اور لاہور میں کوئی کاروبار کرنے دے۔ اس نے بادل نخواستہ اجازت دے دی۔ پھر میں نے اپنے آپ کو زیادہ تر کراچی اور لاہور میں مصروف رکھنا شروع کر دیا۔ اسے دولت کما کر دیتا رہا۔ وہ کئی دنوں تک میری نگرانی کرتی رہی تھی کہ کہیں میں نوجوان عورتوں اور لڑکیوں کے چکر میں تو نہیں پڑ گیا۔ کہیں کراچی اور لاہور کی رنگین تتلیاں مجھ پر منڈلا تو نہیں رہی ہیں۔ اس نے دو تین آدمی میرے پیچھے لگا رکھے تھے۔ دو برسوں تک اس نے مجھے خواب اچھی طرح پرکھا' جانچا اور تولا۔ جب اسے یہ یقین ہو گیا کہ میں اچھائی پر ثابت قدم ہوں اور کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ رہا ہوں۔ تب اس نے پُراعتماد ہو کر میری جان چھوڑی۔ میں نے کبھی کسی لڑکی یا عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر

نہیں دیکھا تھا مگر میرے دل میں ایک آرزو ضرور بسی ہوئی تھی کہ میری زندگی میں کوئی ایسی لڑکی یا عورت آئے جو مجھے پیار دے سکے۔ مجھ سے محبت کر سکے۔ سپنے کون نہیں دیکھتا ہے شکیلہ! سپنے میں نے بھی دیکھے۔ کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں ہے کہ میں سپنے دیکھوں۔ میں سپنے دیکھتا رہا۔

اس روز میں فلم دیکھنے سینما پر آیا تو تمہیں دیکھا۔ دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ اس لئے کہ تم میرے سپنوں کی شہزادی کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ ہو بہو وہی تصور جو میرے خیالوں میں ابھرتا رہا تھا۔ مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ چند لمحوں اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا سوچتا رہا کہ کیا یہ ممکن ہے کہ انسان جو سپنا دیکھتا ہے وہ حقیقت بن کر سامنے آ جائے۔

پھر میں نے تمہاری ان بڑی بڑی خوبصورت غزالی آنکھوں میں اپنے لئے محبت کے چراغ جلتے ہوئے دیکھے تھے۔ میرا سینہ دھڑک اٹھا تھا۔ پھر میں نے دل میں یہ عہد کر لیا کہ تمہیں ہر صورت سے اور ہر قیمت پر حاصل کر کے رہوں گا۔ میں تمہاری طرف بڑھا۔ مجھے اس بات کا ذرہ برابر بھی یقین نہیں تھا کہ ہم دونوں کے درمیان جو اجنبیت کی دیوار کھڑی ہے وہ اتنی جلدی گر جائے گی اور نہ ہی اس بات کا امکان نظر آتا تھا کہ فاصلے بھی سمٹ کر مٹ جائیں گے۔ تمہیں تنہا کھڑا دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ تم برسوں سے ادھر کھڑی ہوئی میرا انتظار کر رہی ہو۔ پھر تمہیں پا کر مجھے ایسا لگا کہ مجھے میری جنت مل گئی ہے۔ پھر ہم دونوں نے اس فلیٹ میں اپنی محبت کو پروان چڑھایا۔ اگر مجھے صرف جسم سے محبت ہوتی تو کیا تم اپنا دامن بچا کر لے جا سکتی تھیں۔ نہیں شکیلہ! نہیں۔ کبھی تم ایک مرد کی ہوس ناکی سے بچ کر نہیں جا سکتی تھیں۔ مگر میں ایک مرد ہونے کے ناطے اپنے جذبات کو قابو میں کئے ہوئے نہیں تھا بلکہ یہ محبت کی پاکیزگی محبت کا جذبہ اور محبت کی روح تھی جس نے پراگندہ خیالات کو کھرچ کر پھینک دیا تھا۔ کبھی کبھی پراگندہ احساسات سے میری نس نس میں چنگاریاں بھر جاتی تھیں اور میں من مانی کرتے ہوئے ایک حد سے آگے بڑھنے لگتا تھا تو تم مجھے باہر کی کھلی فضا میں لے آتی تھیں۔

اب تم ہی بتاؤ شکیلہ! کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ تم سے محبت کروں؟ اور کیا میں اس لائق ہوں تم مجھ سے نفرت کرو؟ کیا میں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ مجھ سے ہمدردی کی جا سکے؟"

سجاد نے اس سے جو سوال کیا تھا وہ سیدھا کسی برچھی کی طرح اس کے دل میں اتر

گیا تھا۔ سجاد کی کہانی واقعی بڑی درد بھری تھی۔ مگر یہ سوال' اس سوال میں کتنا کرب تھا' کتنی اذیت تھی' کتنا دکھ بھرا ہوا تھا؟ اس نے سجاد کی خاطر ہی تو اپنی زندگی داؤ پر لگا رکھی تھی۔ وہ اس کی خاطر تو دنیا سے ٹکر لینا چاہتی تھی۔ وہ اس کی خاطر تو جی رہی تھی۔

اس روز کے واقعہ سے دل میں نفرتوں کے جنم لینے کے باوجود اس نے اپنے دل کے کونے میں سجاد کے لئے محبت کی رمق پائی تھی۔ اس نے اپنی جھکی جھکی نظریں اٹھا کر سجاد کو دیکھا۔ پھر دونوں کی نظریں چار ہوئی تھیں۔ اس نے سجاد کی آنکھوں میں محبت کے چراغ جلتے ہوئے دیکھے۔ ان چراغوں کی روشنی اس کی آنکھوں سے دل میں اتر کر دل میں بجھے ہوئے محبت کے چراغ کو روشن کر رہی تھی۔ سجاد کی آنکھوں میں اس شکی مزاج بیوی کی پرچھائیاں کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں جس نے ایک مرد کو دولت سے خریدا تھا مگر اس کی محبت نہ خرید سکی تھی۔

پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔ پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور اس نے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی تو وہ آنسو رکے نہیں بلکہ گالوں پر بہتے رہے۔ گالوں پر سے ڈھلک ڈھلک کر گریبان میں جذب ہوتے رہے۔ پھر وہ کسی ٹوٹے ہوئے دروازے کی طرح سجاد کے سینے سے جا لگی تھی۔

شکیلہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح بیٹھی تھی جیسے اس کے پاس آخری داؤ کھیلنے کے لئے کچھ بھی نہ بچا ہو۔ وہ اس کے تندرست' توانا اور بے حد صحت مند گھٹنے پر اپنا سر رکھے سسک رہی تھی۔

جب شکیلہ کا جی ٹھہرا تو اس نے سجاد سے پوچھا۔ "تو کیا تم اب بھی اپنی بیوی سے محبت کرتے ہو؟"

"تم میری درد بھری کہانی سننے کے بعد بھی یہ پوچھ رہی ہو کہ میں اپنی بیوی سے محبت کرتا ہوں۔ کیا تم بیک وقت دو مردوں سے محبت کر سکتی ہو؟"

"نہیں۔" اس نے اپنا سر اور لانبی لانبی پلکیں اٹھا کر سجاد کی طرف دیکھا تھا۔ "عورت اپنی زندگی میں ایک مرد سے پیار کرتی ہے' اس کی زندگی میں وہ مرد پہلا اور آخری ہوتا ہے۔ پہلا آدمی ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ دوسرے آدمی سے محبت نہیں کرتی ہے بلکہ محبت کی رسم ادا کرتی ہے۔ ناخوشگوار فرض ادا کرتی ہے۔"

"جس طرح ایک عورت ایک مرد سے پیار کرتی ہے اسی طرح ایک مرد ایک ہی عورت سے پیار کرتا ہے۔ جو محبت پر ایمان رکھتے ہیں وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔"

"اب تم کیا کرو گے سجاد!" شکیلہ اس کے پہلو سے اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔"

"مگر میں کب ایک میان میں دو تلواریں رکھنا چاہتا ہوں۔ اب تم ہی میری تلوار ہو اور میں تمہاری میان ہوں شکیلہ!" اس نے جذباتی ہو کر جواب دیا۔

"اس روز میں نے تم دونوں کو دیکھا تھا۔ تم دونوں کس قدر خوش اور سرشار نظر آ رہے تھے۔ تم دونوں میں ایسا والہانہ پن' وارفتگی اور ایسی سرشاری تھی کہ میرا کلیجہ چھلنی ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے آج اب بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم نسرین کے ساتھ محبت کا ڈھونگ رچا رہے ہو اور نسرین نے تمہیں ایک زر خرید غلام کی طرح رکھا ہوا ہے۔ یہ سوچ کر اندر ہی اندر میرا دل ڈوب رہا ہے سجاد!"

"دراصل ہم دونوں ایک دوسرے کو دھوکہ دے رہے ہیں۔" سجاد نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "دھوکہ دینے کے لئے زبردستی مسکرانا پڑتا ہے۔ اداکاری کرنا پڑتی ہے۔ اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے فریب دینا پڑتا ہے۔ اس روز نسرین بہت دنوں کے بعد اچانک چلی آئی تھی۔ اپنے پروگرام کے مطابق اس روز میں اپنی فلائٹ کینسل ہونے کی وجہ نہیں جا سکا تھا۔ دوسرے دن مجھے رات کی فلائٹ سے کراچی جانا تھا۔ وہ دوسرے دن دوپہر کے وقت ٹپک پڑی تھی۔ وہ لائل پور سے کار میں آئی تھی۔ لاہور پہنچ کر اس کی کار خراب ہو گئی تھی۔ وہ تین دن تک رکی رہی تھی۔ اسے شک ہو گیا تھا کہ میں کسی کی زلفوں کا اسیر ہو گیا ہوں۔ اس نے کئی بار مجھ سے کہا تھا کہ تمہارے بدن سے مجھے کسی اور عورت کے بدن کی مہک محسوس ہو رہی ہے۔ میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنے کے لئے اسے تین دن تک روک لیا تھا۔ جبر و زیادتی سے اس کے سامنے مسکراتا رہا تھا کہ میں بہت خوش ہوں۔ میں تم ہی سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے ہزار دفعہ اس سے محبت کا اقرار کیا تو تب کہیں جا کر اسے میرے جھوٹ پر سچائی کا یقین آیا تھا۔"

"اب تمہیں ایک فیصلہ کرنا ہو گا سجاد!" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "وہ وقت اور وہ مرحلہ آ گیا ہے جہاں دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو گا۔ اس لئے کہ میرے لئے ایک رشتہ آیا ہے جو بہت اچھا ہے۔ لڑکا ایسا نہیں ہے کہ میں اس سے شادی سے انکار کر دوں۔ انکار کی گنجائش ہی نہیں رہی ہے۔ وہ لڑکا نہ صرف خوبصورت اور اسمارٹ ہے بلکہ ایک فرم میں کسی اچھے عہدے پر فائز ہے۔ اس روز میں تمہیں یہی بات بتانے کے لئے بے چین اور پریشان ہو رہی تھی۔ میرے پاس تمہارا کراچی

کا پتا نہیں تھا۔ میں نے سوچا چلو ایک کاغذ پر اپنی پریشانی لکھ کر تمہارے فلیٹ میں ڈال دوں تاکہ تم فوراً ہی مجھ سے رابطہ قائم کر سکو۔ مگر اس روز نسرین کو تمہارے ساتھ دیکھ کر میری جو حالت ہوئی وہ ناقابل بیان ہے۔ اگر اس روز میرے پاس پستول ہوتا تو میں تم دونوں کو فلیٹ میں آکر قتل کر دیتی اور خود پولیس اسٹیشن پہنچ جاتی۔ خیر' اب تم بتاؤ کہ کیا کرو گے؟ لڑکے والے نہ صرف مجھے پسند کر چکے ہیں بلکہ جلد سے جلد منگنی کے لئے اصرار کر رہے ہیں۔ معلوم نہیں کس روز میری منگنی ہو جائے اور تم.........."

"شکیلہ!" اس نے جھک کر شکیلہ کا ہاتھ پکڑا اور کھینچ کر پلنگ پر اپنے قریب بٹھالیا۔ "اتنی سی بات کے لئے تم اس قدر پریشان ہو رہی ہو؟"

"تمہارے نزدیک یہ اتنی سی بات ہے؟" شکیلہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور برہم ہو کر اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑالیا۔ "کیا تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو؟"

"مذاق نہیں سمجھ رہا ہوں۔ منگنی ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ منگنیاں ہوتی ہیں اور ٹوٹ جاتی ہیں۔ خدا نخواستہ یہ منگنی ہو بھی گئی تو ٹوٹ بھی سکتی ہے۔"

"منگنی ہونے کی نوبت کیوں آئے؟" شکیلہ بھڑک اٹھی۔ "تم صاف صاف کہہ کیوں نہیں دیتے کہ تم نسرین کو چھوڑ نہیں سکتے ہو۔"

"نہیں .... یہ بات نہیں ہے شکیلہ!" سجاد اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ "میں نسرین کو آج اور ابھی اسی وقت چھوڑ سکتا ہوں۔ مگر میں ایک پہلو کے بارے میں سوچنے کا عادی نہیں ہوں۔ میں تصویر کے دونوں رخ دیکھتا ہوں۔ زندگی کے دونوں پہلوؤں کے بارے میں سوچتا ہوں۔ میں تو کچھ اور سوچ رہا تھا۔ میں تمہارے سامنے دو صورتیں رکھتا ہوں۔ تم جو صورت کہو گی میں اس صورت پر عمل کرنے کے لئے تیار ہوں۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ میں نسرین کو طلاق دیئے بغیر تم سے شادی کر لوں اور تمہیں کراچی لے جا کر رہائش اختیار کر لوں۔ اس صورت سے فائدہ یہ ہو گا کہ ہماری زندگی شاہانہ طور پر بسر ہو گی۔ نسرین کے کاروبار سے جو آمدنی ہو رہی ہے جس میں سے مجھے بھی نصف حصہ ملتا ہے اور اسے خرچ کرنے کا میں پورا اختیار رکھتا ہوں۔ نسرین کو باز پُرس کرنے کا کوئی حق بھی نہیں ہے اور وہ نہ ہی مجھ سے باز پُرس کرتی ہے اور نہ آج تک کیا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نسرین کو طلاق اور حق مہر تیس ہزار روپے دے دوں۔ اسے طلاق دینے کے بعد اس کے کاروبار پر میرا حق نہیں رہے گا۔ کراچی اور لاہور کے دفاتر اور کاریں نسرین کے حوالے کرنے ہوں گے اس لئے کہ یہ سب کچھ اس کی ملکیت میں ہیں اور پھر

تیس ہزار کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ اس رقم کی ادائیگی کے بعد میرے پاس دس بارہ ہزار کی رقم رہ جاتی ہے۔ اس رقم سے مجھے کراچی جا کر از سر نو اپنا کاروبار شروع کرنا ہو گا۔ اس لئے کہ نسرین اپنی دولت اور امارت سے مجھے نقصان پہنچانے کی بھی کوشش کرے گی۔ کیونکہ وہ طلاق کو اپنی تذلیل اور توہین محسوس کرے گی۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے لئے مجھے بڑی جدوجہد کرنی پڑے گی۔ زندگی کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑے گا۔ کٹھن حالات سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ ایسی صورت میں تمہیں میں وہ خوابناک زندگی نہیں دے سکوں گا جس کا ہر عورت' ہر لڑکی' ہر بیوی خواب دیکھتی ہے۔ زندگی کے مصائب جھیلنا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ یوں بھی تم نے تو ایک خوشگوار زندگی گزاری ہے۔ تم نے کبھی یہ نہیں دیکھا ہو گا کہ فاقہ کیسا ہوتا ہے؟ تنگدستی کیا ہوتی ہے۔ حسرت و افلاس کیسی عفریت ہوتی ہے؟ جب بُرے دن آتے ہیں تو ساری محبتیں جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہیں۔ شوہر کو بیوی سے اور بیوی کو شوہر سے نفرت ہو جاتی ہے۔ بچے تک انہیں عذاب اور بوجھ محسوس ہوتے ہیں۔ غرض افلاس اور ناکامیاں انسان اور محبتوں کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہیں۔"

"تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ کوئی عورت مرد کا دکھ سکھ میں ساتھ نہیں دیتی ہے۔ میں تمہارا ہر دکھ میں ساتھ دوں گی۔ تم جیسا رکھو گے اور جو چاہو گے وہی ہو گا۔ میں ہر حال میں خوش رہوں گی۔ وہ عورتیں مردوں کا دکھ سکھ میں اور کڑے دنوں میں ساتھ نہیں دیتیں جو بازارِ حُسن کی ہوتی ہیں اور مرد کی جیب سے اپنی محبت اور مستقبل کو مشروط کر دیتی ہیں۔ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں' قسم کھاتی ہوں کہ تم سے جاہل عورتوں کی طرح کبھی نہیں لڑوں گی۔ یہ بات کبھی نہیں بھولوں گی کہ تم باہر رہ کر سکھی نہیں رہتے ہو۔ میرے سکون' آرام اور آسائش کے لئے دن بھر دوڑ دھوپ اور مسلسل کام کے پیچھے بھاگتے رہتے ہو۔ کھانے پینے اور سونے کے اوقات بھی مصروفیت کی نذر ہو جاتے ہیں۔ تم نے محض میرے لئے اپنا چین و سکون برباد کر رکھا ہے۔ آرام کی خواہش کسے نہیں ہوتی ہے۔ بیوی سے کسے پیار نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک مجبوری ہوتی ہے جو ایک آدمی کو رات و دن سرگرداں رکھتی ہے۔ تم کراچی لے جا کر جس حال میں رکھو گے میں ہنسی خوشی سے رہوں گی۔ میں تم سے سوائے تمہاری محبت کے کچھ نہیں مانگوں گی۔ نہ عالی شان گھر' نہ دولت' نہ کار اور نہ ہی زیورات۔ مجھے تو تمہاری محبت کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں کی ضرورت ہو گی۔ میں جانتی ہوں کہ وقت کبھی کسی کا نہیں ہوتا ہے۔ حالات کبھی ایک جیسے

نہیں رہتے ہیں۔ میں تمہاری محبت کو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ سمجھوں گی۔ اس لئے کہ تم میرے ہو اور مجھے میری محبت کے طفیل ملے ہو۔ اب تم پہلی فرصت میں نسرین کو طلاق دے دو اور پھر دو ایک دن میں اپنی ماں اور بہن کے ہاتھ میرے لئے رشتہ بھیج دینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ منگنی کی تاریخ مقرر کرنے آ جائیں۔"

☆======☆======☆

شکیلہ تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آئی تو ماں اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ ماں کا دمکتا چہرہ اور آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی چمک دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا اور نامعلوم خوف سے اس کا سینہ دھڑک اٹھا۔ ایک سرد سی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے جیسے ہی ہاتھ بڑھا کر دہی کا پیالہ اپنی طرف کھینچا ماں بڑے پیار بھرے لہجے میں بولی۔

"بیٹی! آج تم کالج نہ جاؤ تو بہتر ہے۔ چھٹی کر لو۔"

اس کا دھڑکتا ہوا سینہ اور زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اس نے متوحش نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ "وہ کس لئے' میں کالج کیوں نہ جاؤں؟"

"اس لئے کہ آج شام شجاعت علی چودھری کی والدہ اور بہنیں تمہاری منگنی کی تاریخ مقرر کرنے آ رہی ہیں۔ تمہارا گھر پر ہونا ضروری ہے۔" ماں نے جواب دیا۔

"میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں ابھی شادی نہیں کروں گی۔ نتیجہ نکلنے کے بعد ہی بتاؤں گی کہ میں کیا کروں گی۔ ویسے میں ابھی مزید پڑھنا چاہتا ہوں اور پھر بی اے کے امتحان میں چند ماہ رہ گئے ہیں۔ ابھی سے کیا جلدی ہے؟ آپ میری بات سمجھتی کیوں نہیں ہیں؟"

"میں سمجھتی ہوں پر لڑکے والوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ لڑکا بھی جلدی کر رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے بی اے پڑھا کرنا بھی کیا ہے۔ نوکری تو کرانا نہیں ہے اور پھر بی اے کی ڈگری کسی کام کی نہیں ہوتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر لڑکی کو بی اے کرنے کی شدید خواہش ہے تو شادی کے بعد بھی بی اے کر سکتی ہے۔"

ماں ایک ہی سانس میں کہہ گئی تھی مگر اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔

آخر وہی ہوا جس کا اسے خوف اور اندیشہ تھا۔ ماں نے اس کی ایک تصویر بغیر اس سے پوچھے البم سے نکال کر لڑکے والوں کو دے دی تھی۔ وہ اس کی سب سے اچھی تصویر تھی۔ یہ تصویر اس نے آج سے کوئی چھ ماہ پہلے صبیحہ کے ساتھ جا کر کھنچوائی تھی اور وہ اس تصویر میں اتنی حسین دکھائی دے رہی تھی کہ صبیحہ نے اس کی ایک کاپی لے کر اپنے

پاس رکھ لی تھی۔

لڑکے کا ارادہ جلدی شادی کرنے کا نہیں تھا۔ وہ تصویر دیکھ کر شاید ریشہ خطمی ہو گیا تھا۔ اسے اس روز اپنی ماں پر اتنا غصہ نہیں آیا تھا جس روز اس کی تصویر ماں نے لڑکے والوں کے حوالے کی تھی مگر آج اب اسے ماں پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ یہ سارا فساد اس تصویر کی وجہ سے ہو رہا ہے۔"

وہ آج شام منگنی کی تاریخ مقرر کرنے آ رہے ہیں۔ منگنی کے ایک ہفتہ بعد یا زیادہ سے زیادہ ایک مہینے بعد اس کی شادی کی تاریخ بھی مقرر ہونے والی تھی۔ اس کی ماں نے ایک سال پہلے ہی اس کی شادی کی تیاری شروع کر دی تھی۔ ایسا شاندار جہیز تیار تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں پھٹ جاتیں۔ اسی تیاری کی وجہ سے وہ ایک ہفتے کے نوٹس پر بھی اس کی شادی دھوم دھام سے کر سکتی تھیں۔

ظاہر تھا لڑکے کے دل میں حرارت کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ اف یہ مرد بھی کیسے وحشی درندے ہوتے ہیں۔ خوبصورت لڑکیوں کو دیکھ کر ان کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ اس شجاعت علی چودھری کی بھی رال ٹپک گئی تھی شاید جبھی تو یہ سب کارروائی اتنی جلدی ہو رہی تھی۔

"کیا سوچنے لگی ہو؟" ماں نے اس کے چہرے پر شدید اذیت دیکھی تو پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا بات ہے بیٹی! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"میں بی اے کا امتحان ختم ہونے اور نتیجہ نکلنے سے پہلے نہ منگنی کروں گی اور نہ شادی۔ آپ لڑکے والوں کو بتا دیں۔" اس نے تنک کر کہا۔

"پاگل ہو گئی ہو کیا؟" ماں نے ششدر ہو کر اس کی شکل دیکھی۔ "یہ کیا تم نے امتحان اور نتیجے کی رٹ لگا رکھی ہے۔ ایسے رشتے بار بار تھوڑی آتے ہیں۔ لڑکا لاکھوں میں ایک ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بڑا سیدھا اور شریف ہے۔ تمہارے ابو اُسے دیکھ کر اور اس سے مل کر آئے ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ لڑکا' لڑکا نہیں ہے ہیرا ہے ہیرا۔ تم بڑی خوش نصیب ہو شکیلہ! جو ایسا شریف اور نیک لڑکا ملا ہے اور آج خوبصورت اور بڑے گھروں کے لڑکے تو خیر بہت مل جاتے ہیں مگر شریف النفس اور نوجوان نہیں ملتے ہیں۔ سمجھیں!"

"تو کیا آپ لوگ چاہتے ہیں کہ میں برسوں کی پڑھائی ادھوری چھوڑ کر اسے غارت کر دوں؟ کیا آپ نے مجھے اسی لئے پڑھایا تھا؟" وہ برہمی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "کیا

ضرورت تھی مجھے پڑھانے' میرا وقت اور اپنے پیسے برباد کرنے کی؟"

"تم شادی کے بعد بھی اپنی تعلیم مکمل کر سکتی ہو۔" ماں کو غصہ آ گیا۔ "میں کچھ دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ تم حد سے زیادہ تجاوز کرتی جا رہی ہو۔ مجھے تمہارے تیور اچھے نظر نہیں آ رہے ہیں۔ ایک شریف اور گھریلو لڑکی کو زیب نہیں دیتا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی سے پیش آئے۔ اب وہی ہو گا جو ہم چاہیں گے۔ ہم کسی قیمت پر اس رشتے کو چھوڑنا نہیں چاہتے ہیں۔"

"میں نہ تو آپ کی بے ادبی کر رہی ہوں اور نہ ہی آپ کی شان میں گستاخی کر رہی ہوں۔" وہ میز کا کونا پکڑ کر نظریں جھکا کر بولی۔ "میں جو کچھ کہہ رہی ہوں آپ اسے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ آخر مجھے پڑھا کر فائدہ کیا ہوا۔ اب جبکہ میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے قریب پہنچ چکی ہوں تو میری تعلیم اچانک اور شادی کی وجہ سے ختم کر دینا چاہتی ہیں آپ! صرف چند مہینوں کی تو بات ہے۔ میں کم از کم اپنا خواب تو پورا کر لوں گی۔"

"اچھا!" ماں ایک دم نرم پڑ گئیں۔ ان کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ "میں اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کروں گی کہ لڑکے کی ماں اور بہنوں کو سمجھاؤں۔ میرا خیال ہے کہ وہ میری بات مان جائیں گی۔ تم فکر نہ کرو' چلو ناشتہ کر لو۔ ذرا ذرا سی بات پر دل خراب نہیں کرتے۔"

وہ بیٹھی نہیں' کھڑی رہی اور اپنی شہادت کی انگلی سے میز پر دائرہ بناتی ہوئی دبی زبان سے بولی۔ "کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ منگنی امتحان کے بعد ہو؟"

"منگنی کبھی بھی ہو' اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" ماں نے کہا۔ "منگنی کی تاریخ اگلے ہفتے رکھی جا رہی ہے۔ کچھ رشتہ داروں کو مطلع کر دیا گیا ہے کہ وہ آج کی اس تقریب میں شرکت کریں۔ صبیحہ اور اس کے گھر والے بھی آ رہے ہیں۔ یہ کوئی مذاق نہیں ہے کہ میں تماشے کرتی پھروں۔"

وہ فرش پر اپنا پیر پٹختی کمرے میں آ گئی اور دھڑ سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ غصے سے اس کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ اس کا دماغ سنسنا رہا تھا اور سینے میں سانسیں اس طرح پھول رہی تھیں جیسے وہ بہت دور سے دوڑتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ اس کے سنسناتے ہوئے دماغ میں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اب بڑا مشکل تھا اور پانی سر سے گزرنے والا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب سجاد کا اس کے لئے رشتہ بھیجنا فضول ہے۔ اس کے گھر والے کسی قیمت پر بھی سجاد کے رشتے کو قبول نہیں کریں گے۔ بات اتنی آگے بڑھ

چکی ہے کہ اب واپسی بہت مشکل ہے۔

وہ فکر اور سوچ میں غلطاں تھی کہ کمرے کے دروازے پر ہلکی سی اور مخصوص انداز میں دستک ہوئی۔ وہ چونک کر سوچوں سے نکل آئی۔ کون ہو سکتا ہے؟ پھر اسے خیال آیا کہ ماں ہو گی جو اس کے لئے ناشتہ لے کر آئی ہو گی۔ وہ جب کبھی بھی کسی بات پر روٹھ کر ناشتے یا کھانے کی میز سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ جاتی تھی تب اس کی ماں اس کے لئے کمرے میں کھانا لے کر آتی تھی۔ پھر اسے منا کر کھانے پر مجبور کرتی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی نہیں بیٹھی رہی۔ دروازہ مقفل نہیں تھا اور نہ ہی اس نے اندر سے چٹخنی لگائی تھی۔

پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ تب بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دروازے کا ہینڈل گھوما۔ پھر پورا دروازہ بڑی آہستگی سے کھل گیا مگر وہ فرش پر نگاہیں جمائے بیٹھی رہی۔ اسے ماں کا چہرہ بھی دیکھنا گوارہ نہیں تھا۔ اس کے اندر نفرت کی لہر سی اٹھ رہی تھی۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ ماں اس کے بالکل قریب آ کر خاموشی سے کھڑی ہو گئی ہے۔ چند لمحے گزر گئے۔ خاموشی چھائی رہی۔ دونوں کے بیچ گہرا سناٹا رہا۔ معاً اس کی نظر ماں کے پاؤں پر اور شلوار پر پڑی۔ پاؤں بے حد خوبصورت سڈول اور گورے گورے تھے۔ شلوار گہرے عنابی رنگ کی تھی۔ وہ چونکی۔ اس کی ماں کے پاؤں اتنے خوبصورت اور گورے نہ تھے اور نہ ہی ان میں اتنی جاذبیت تھی۔ ابھی ماں نے سفید رنگ کی شلوار پہنی ہوئی تھی۔ اس رنگ کی شلوار ماں کے پاس تھی ہی نہیں۔ اس نے چونک کر اپنا سر اٹھایا تو اس کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ اس کی نظروں کے روبرو صبیحہ کھڑی تھی۔ مہتاب سا چہرہ مسکرا رہا تھا۔ اس کے کنول جیسے رخساروں پر مسکراہٹ شفق کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ اس کے بھید سے واقف ہو چکی ہے۔ اس کے ارادوں کو چہرے پر پڑھ چکی ہے۔

"تم.........!" شکیلہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے امید نہیں تھی کہ صبیحہ سویرے سویرے آ جائے گی۔ صبیحہ کو سامنے دیکھ کر اس سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اس روز سے صبیحہ سے کھنچی کھنچی رہنے لگی تھی۔ کالج میں بھی اس سے ملتی تھی تو رسمی طور پر۔ پہلے کی طرح نہ تو گرمجوشی سے ملتی تھی اور نہ ہی بات کرتی تھی۔ ایک وقت تھا کہ صبیحہ اس کی کمزوری تھی اور وہ صبیحہ کی قربت کی بے حد عادی ہو چکی تھی۔ مگر اب وہ صبیحہ سے دور ہو چکی تھی۔ اس نے صبیحہ کو اپنا رازداں تک نہیں بنایا

تھا۔ آج اب یکایک اسے صبیحہ کی اہمیت کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ صبیحہ ہی ایک ہستی تھی جو اسے اور اس کے دکھ کو سمجھ سکتی تھی۔

صبیحہ کو اچانک نظروں کے سامنے دیکھ کر اس کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ وہ ساکت سی ہو گئی تھی اور وہ پاگلوں کی طرح ٹکٹکی باندھ کر صبیحہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس عالم میں لمحوں پر لمحے گزر گئے مگر اس کی اس کیفیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ صبیحہ کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ آج اُسے اس بات کا دکھ ہو رہا تھا کہ اس نے صبیحہ کی باتوں کا بُرا کیوں منایا تھا۔ اس میں صبیحہ کا کیا قصور تھا۔ اس نے صبیحہ کو دلی اذیت پہنچا کر اچھا نہیں کیا تھا۔ اتنی بڑی دنیا میں وہی ایک تو اس کی دوست، مونس، ہمدرد اور رازداں تھی۔

"شکیلہ!" صبیحہ نے اس کے قریب ہو کر اس کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ اس کی منجمد آنکھوں میں جھانکتی ہوئی مسکرائی۔ "شکیلہ! کہاں کھو گئی ہو؟ کیا بات ہے؟ کیا آج اب بھی مجھ سے ناراض ہو؟ مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتی ہو میری جان!؟"

شکیلہ کے بدن میں ارتعاش پیدا ہوا۔ اس نے تیزی سے اپنی پلکیں جھپکائیں مگر وہ اسی طرح ساکت اور منجمد سی رہی۔ صبیحہ نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ "اتنی ناراض تو نہ ہو شکیلہ! تم میری اتنی سی بات کا بُرا مان گئی تھیں۔ تم تو کہتی تھیں کہ میں تمہاری کسی بات کا کبھی بُرا نہیں مناؤں گی۔"

شکیلہ ایک دم سے صبیحہ کے سینے سے جا لگی۔ صبیحہ نے جیسے اُسے اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ صبیحہ کی آغوش میں پہنچ کر اسے صبیحہ کی محبت کی گرم جوشی کا احساس ہوا۔ صبیحہ نے جیسے اسے اپنے وجود میں جذب کر لیا تھا۔ "کوئی بات ہو شکیلہ! کوئی بھی تمہارے خلاف میرے کان بھرے، تم جو بھی میرے ساتھ رویہ رکھو۔ کبھی میرے دل میں تمہارے خلاف ذرہ برابر میل نہیں آ سکتا۔ میں نے اس روز تم سے جو باتیں کی تھیں وہ تمہاری امی کے ایما پر، مگر وہ باتیں میرے نزدیک بہت اچھی تھیں۔ ان میں کوئی برائی نہ تھی۔ مگر میں تمہیں باوجود کوشش کے سمجھا نہیں سکی تھی۔ یا پھر تم سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ تم نے اس روز سے خفا سی ہو کر مجھے ایک امتحان میں ڈال دیا۔ تمہیں میری دوست اور میری محبت تھیں .... ہو .... میں نے تمہیں پا کر ساری زندگی کسی کو اپنا دوست نہیں بنایا۔ کوئی لڑکی دوستی کے لائق نظر نہیں آئی۔ تمہیں کیا معلوم کہ تمہاری اس بے رخی سے میرے دل پر کیا گزری؟"

شکیلہ نے اپنا سر اس کے سینے سے اٹھا کر اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے صبیحہ کی طرف دیکھا۔ صبیحہ کی آنکھوں اور چہرے پر محبت کے شگوفوں کو کھلتے دیکھ کر اس کے چہرے پر ندامت سی چھا گئی۔ اس نے صبیحہ کے سانسوں کے زیر و بم سے دھڑکتے ہوئے سینے پر اپنا سر رکھ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کیا کہتی۔ اس کی قوتِ گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر اس کا دل بے اختیار بھر آیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور صبیحہ کے گریبان میں جذب ہونے لگے تو اس نے دونوں ہاتھوں میں شکیلہ کا چہرہ تھام لیا۔

"پاگل! تم رو رہی ہو۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ آج تو تمہاری زندگی میں خوشی کا دن ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے میری جان' میری دوست!"

شکیلہ نے اپنے رخساروں پر صبیحہ کے ہونٹ محسوس کئے جو اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو جذب کر رہے تھے۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول کر صبیحہ کا چہرہ دیکھا۔ اس کی آنکھیں دیکھیں۔ ان آنکھوں میں صبیحہ نے اس کے لئے محبت کے چراغ روشن کر رکھے تھے۔ اس نے صبیحہ کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ پھر وہ سسک کر بولی۔

"تم آج کے دن کو میری خوشی کا دن کہہ رہی ہو؟ یہ میری زندگی کا سب سے بدترین دن ہے صبیحہ!"

"وہ کیسے؟" صبیحہ نے چونک کر اس کی بھیگی بھیگی آنکھوں میں جھانکا۔ آنسوؤں کے قطرے اس کی پلکوں پر تاروں کی طرح جھلملا رہے تھے۔

شکیلہ نے بڑی آہستگی سے اس کے ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹائے اور جا کر دروازہ بند کر آئی۔ پھر وہ صبیحہ کو لے کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں تک دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔ اس نے دوپٹے سے آنسوؤں کو پونچھا اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "میں اس جگہ ہرگز شادی کرنا نہیں چاہتی ہوں۔"

صبیحہ چونکی تو نہیں البتہ اس نے حیرت سے شکیلہ کی طرف دیکھا۔ "تم کیوں اس جگہ شادی کرنا نہیں چاہتی ہو؟ لڑکے میں کیا برائی ہے؟"

وہ ایک لمحے کے لئے گڑبڑا سی گئی' پھر سنبھل کر بولی۔ "لڑکے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ مگر مجھے یہ رشتہ پسند نہیں آیا۔ میرے دل کو نہیں لگا۔"

"کہیں تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو شکیلہ؟" صبیحہ کے لہجے میں غصہ اور حیرت تھی۔

"پہلے تم نے ارشد سے اس لئے شادی کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ کالے رنگ کا ہے۔ کم

تعلیم یافتہ ہے' جنرل اسٹور چلا رہا ہے۔ آئیڈیل نہیں ہے۔ مگر یہ شجاعت علی چودھری تو کسی شہزادے سے کم نہیں ہے۔ لڑکیوں کے خوابوں کے شہزادوں کی طرح ہے۔ لڑکیوں کے آئیڈیل کی طرح اور پھر وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہے۔ ایک معقول عہدے پر فائز ہے اور کیا چاہئے تمہیں شکیلہ!"

"میں نے جس لڑکے کو دیکھا نہیں اسے کیسے پسند کر لوں؟ سُنی سنائی باتوں کا کیا اعتبار؟ ماں باپ کو تو ہر لڑکا اچھا اور خوبصورت نظر آتا ہے۔"

"اصل بات کیا ہے؟ مجھے بتاؤ شکیلہ!" صبیحہ نے بڑی نرمی اور ملائمت کے لہجے میں پوچھا۔ "بات گھما پھرا کر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔"

"اصل بات کیا ہو سکتی ہے؟" شکیلہ بوکھلا سی گئی۔ صبیحہ سے نگاہیں چار ہوتے ہی نظریں نیچی کر لیں۔ اس میں صبیحہ سے نظریں ملانے کی تاب نہیں رہی تھی۔ "ان لوگوں کو میری شادی کی فکر ہے' میری تعلیم کی کوئی فکر نہیں ہے۔ میں ابھی پڑھنا چاہتی ہوں۔ چار پانچ برس تک شادی نہیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"اصل بات کیا ہے؟ وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔" صبیحہ کا یہ جملہ کسی ڈنک کی طرح اسے لگا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر صبیحہ کو دیکھا تو وہ بولی۔ "تم نے مجھ سے اصل بات چھپائی لیکن میں اس بات کو جانتی ہوں۔ تم اس شخص سے شادی کرنا چاہتی ہو جس کے ساتھ کار میں گھومتی رہتی ہو!"

"تو تم نے مجھے اس کے ساتھ کار میں جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا؟" شکیلہ نے ششدر ہو کر پوچھا۔ "کب' کہاں اور کس دن دیکھا تھا؟"

"پہلی بار تو میں نے تم دونوں کو گلبرگ کے بازار میں دیکھا تھا۔ اس کے بعد دو ایک بار کالج سے باہر دیکھا تھا۔ وہ اس جگہ پر کار لئے تمہارا منتظر رہتا تھا۔"

"او.........!" شکیلہ ایک لمبی سانس لے کر بستر پر ڈھیر ہو گئی تھی۔ جیسے ہاتھ پاؤں اور سارے بدن سے اس کا اختیار صبیحہ کے الفاظ نے چھین لیا ہو۔ صبیحہ بستر پر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ شکیلہ تو کہیں گم ہو گئی تھی۔ وہ خلا میں گھور رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب بکھرا ہوا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس کے ہونٹ چند لمحوں تک بڑبڑاتے رہے جیسے وہ برف ہو گئی ہو۔ اس کی زبان سے لفظ نہیں نکل رہے ہوں۔ چند لمحوں کے بعد وہ آنکھیں کھول کر بولی۔

"اصل بات یہ ہے کہ میں اس شخص کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہوں۔ وہ میرا

محبوب ہے' میرا آئیڈیل ہے۔ میرا خواب ہے۔ میرے نصیب نے میری خواہش پوری کر دی ہے۔ میں کسی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہتی ہوں۔"

"تم اس مکار' دھوکے باز اور ذلیل شخص سے شادی کرنا چاہتی ہو جو دوسری لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ بھی گلچھرے اڑاتا پھرتا ہے۔ میں نے خود اسے ایک دوسری عورت کے ساتھ کار میں گھومتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ عورت بھی کم حسین نہیں ہے۔ بڑی غضب کی اور فتنہ خیز ہے اور تم ہو کہ اس کی محبت میں پاگل ہو کر اس سے شادی کے خواب دیکھ رہی ہو۔ وہ شخص بھنورا ہے' بھنورا شکیلہ! وہ تمہیں شادی کا جھانسہ دے کر کسی دن منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گا۔"

"جس عورت کو تم نے اس کے ساتھ دیکھا تھا وہ اس کی محبوبہ یا آوارہ عورت نہیں ہے۔ وہ اس کی بیوی نسرین ہے۔" شکیلہ نے بتایا۔

"کیا کہا! وہ عورت اس شخص کی بیوی ہے.........!" صبیحہ اچھل پڑی۔ وہ سن ہو کر رہ گئی اور حیرت سے پھٹی پھٹی نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ "تم یہ جانتے ہوئے بھی اس شادی شدہ مرد سے عشق لڑا رہی ہو۔ اس سے دوسری شادی کرنا چاہتی ہو؟ تم ہوش میں ہو' تمہاری عقل ٹھکانے نہیں ہے؟"

"میں اس کے عشق میں پاگل ہو گئی ہوں صبیحہ!" شکیلہ نے بے بسی کے انداز میں کہا۔ "اس کے عشق میں میرا دماغ واقعی ٹھکانے نہیں رہا ہے۔ تم میری محبت کو دیوانگی کا نام دے رہی ہو؟ نہیں' نہیں۔ یہ دیوانگی نہیں ہے۔" وہ اٹھ بیٹھی۔ دونوں ہاتھوں سے شانے پر بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹتے ہوئے کہنے لگی۔ "سجاد تو میرا سب کچھ ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے میرے دل میں' میرے خوابوں میں' میرے تصورات میں پناہ لے رکھی ہے۔ تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ہو' تمہیں کچھ خبر نہیں ہے۔ وہ کیسا بلند اور عظیم شخص ہے۔ میں تمہیں بتاتی ہوں وہ میری خاطر کیا کچھ کرنا چاہتا ہے۔ وہ میرے لئے کتنی بڑی قربانی دے رہا ہے۔"

پھر شکیلہ نے توقف کر کے صبیحہ کو اپنی محبت بھری کہانی سنائی۔ صبیحہ پورے دھیان اور توجہ سے اس کی کہانی کا ایک ایک لفظ سنتی رہی۔ جب وہ کہانی سنا چکی تو صبیحہ حیرت سے بولی۔ "اور تم نے اس کی باتوں پر یقین کر لیا۔ تمہیں اس شخص پر اتنا اعتماد ہے؟"

"اعتماد کیوں نہ ہو؟" اس نے جواب دیا۔ "اگر وہ بھنورا ہوتا تو کیا میں اس فلیٹ کی تنہائی میں اس کے ہاتھوں سے بچ گئی ہوتی۔"

"تم ایک مرد کی فطرت سے واقف نہیں ہو اور نہ تمہیں کوئی تجربہ ہے۔ شادی شدہ مرد کبھی جلد بازی سے کام نہیں لیتا۔ وہ عورت کے معاملے میں ایک گھاگ شکاری کی طرح اپنا جال پھیلاتا ہے۔ جب شکار بے بس ہو جاتا ہے تو وہ اس کی بے بسی سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ بالفرض محال یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ وہ ایک شریف النفس آدمی ہے' تم سے واقعی محبت کرتا ہے اور تمہارے لئے ایثار و قربانی پیش کر رہا ہے مگر شکیلہ! یہ بھی تو سوچو کہ تیر کمان سے نکل چکا ہے۔ تمہاری بات چیت پکی ہو چکی ہے۔ آج تمہاری منگنی کی تاریخ طے ہونے والی ہے۔ لڑکے والے چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کرنا چاہتے ہیں۔ اب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ کاش تم نے مجھے پہلے ہی بتا دیا ہوتا تو شاید میں اس بات کو آگے بڑھنے نہیں دیتی۔ میں سجاد سے تمہاری شادی طے کرا دیتی۔"

"اب کیوں نہیں ہو سکتا؟ اب بھی موقع ہے کہ اس بات چیت کو ختم کر دیا جائے اور اس تقریب کو منسوخ کر دیا جائے۔" شکیلہ نے اسے سمجھایا۔

"اب یوں نہیں ہو سکتا کہ یہ عزت کا معاملہ ہے۔ تمہاری ہی نہیں' اس گھر کی اور خاندان کی عزت و وقار کا مسئلہ ہے اور پھر تمہارے ابو تو کیا دنیا کا کوئی شخص بھی یہ پسند نہیں کرے گا کہ اس کی اپنی بدنامی ہو۔ اس رشتے کو توڑنے سے لڑکے کا کچھ نہیں بگڑے گا بلکہ اس میں تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی بدنامی ہو گی۔ ایسی بدنامی ہو گی کہ تمہارے ماں باپ کسی کو اپنی شکل دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔"

"اتنی سی بات کو آن کا مسئلہ بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا منگنیاں ٹوٹ نہیں جاتی ہیں؟ کیا باراتیں گھر کی دہلیز پر آ کر لوٹ نہیں جاتیں؟ اگر میری شادی کی بات چیت منگنی ہونے سے پہلے ٹوٹ گئی تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟ کون سی قیامت آ جائے گی؟"

"جن کے نزدیک قول و قرار کی اہمیت ہوتی ہے ان کے نزدیک عزت پر بال برابر خراش آنا بھی ذلت کی بات ہوتی ہے۔ میں تمہاری امی ابو کو جانتی ہوں۔ وہ بے عزتی کی زندگی پر موت کو ترجیح دے دیں گے مگر کسی قسم کی ذلت برداشت نہیں کریں گے۔ اب تم ایسا کرو کہ منگنی طے ہونے کی تقریب ہونے دو۔ تم بھی پوری خوشی اور دلچسپی سے حصہ لو۔ بعد میں کوئی تدبیر سوچتے ہیں۔"

☆======☆======☆

"سجاد!" شکیلہ بولی۔ "آخر وہی ہوا جس کا مجھے خوف و خدشہ پریشان کر رہا تھا۔ کوئی پندرہ دن بعد میری منگنی ہو رہی ہے۔ منگنی کے ٹھیک ایک ہفتے بعد میری شادی شجاعت

علی چودھری کے ساتھ ہو رہی ہے۔ اکیس دن بعد میں کسی اور کی ہو جاؤں گی۔"

شکیلہ کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ سجاد کا چہرہ ایک دم سے متغیر ہو گیا تھا۔ اس کے گلے کی رگیں کھنچ گئیں اور پھر اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا تھا۔ اس میں لہو کی ایک بوند بھی نہیں رہی تھی۔ جیسے شکیلہ کے جملے نے اس کے سارے بدن کا خون نچوڑ لیا ہو۔ اس پر سکتہ سا چھا گیا تھا۔ وہ کئی لمحوں تک ساکت اور منجمد سا کھڑا رہا تھا۔ اس کے سینے میں سانسوں کا تموج نہ ہوتا تو شکیلہ سمجھتی کہ اس کے جسم میں جان ہی نہیں رہی ہے۔ چند لمحوں کے بعد وہ بولا تو اس کی آواز مرتعش ہو رہی تھی۔

"کیا کہا شکیلہ!" شکیلہ کو اس کی آواز کسی گہرے کنوئیں کی تہہ سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ "تمہاری شادی کی تاریخ طے ہو گئی ہے۔ تمہاری چٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو رہا ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تمہاری شادی کو اب اکیس دن نہیں اکیس لمحے باقی ہیں۔ بس اب تمہیں کوئی مجھ سے چھین کر لے جانے والا ہے۔ بلکہ چھین کر لے جا رہا ہے۔ بھاگا جا رہا ہے"۔ شکیلہ نے اس کے بالکل قریب جا کر اپنی نمناک آنکھوں سے اُسے دیکھا اور پھر وہ تڑپ کر اس کے سینے سے جا لگی۔ اس کے چوڑے چکلے سینے پر سر رکھ کر سسک پڑی۔ "اب کیا ہو گا سجاد! .... اب ہم کیا کریں سجاد! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ مجھے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دے رہا ہے۔ امید کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی ہے۔"

"امید تو آخری سانس تک انسان کو اپنے سہارے پر رکھتی ہے۔ امید کے دامن کو ہاتھ سے مت جانے دو۔ کوئی نہ کوئی تو صورت نکل آئے گی۔"

"میں امید کا دامن تھامے رہوں اور شجاعت علی چودھری مجھے ڈولی میں بٹھا کر لے جائے۔ کیا میری شادی کے بعد کوئی صورت نکلے گی؟"

"کیا تم مجھ پر اور میری محبت پر تہمت لگا رہی ہو؟" سجاد نے اس کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے ہونٹوں میں جذب کرتے ہوئے زخم خوردہ لہجے میں بولا۔

"تم ان باتوں سے میرا جگر چھلنی مت کرو شکیلہ! کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہیں اتنے بڑے امتحان میں تنہا چھوڑ دوں گا؟ کیا میں نے اسی دن کے لئے اپنا دل نکال کر تمہارے قدموں میں رکھ دیا تھا؟ آج تو میرے امتحان کا دن ہے شکیلہ! اس امتحان میں' میں پورا اُتروں گا۔ بس تم میرے لئے حوصلہ بننا۔ میں تمہیں اس کڑی آزمائش سے نکال کر لے

جاؤں گا۔ میں تمہیں کسی اور کی بانہوں میں نہیں دیکھ سکتا ہوں۔ کم از کم اپنی زندگی میں تو نہیں۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تماشا دیکھتا رہوں گا اور تمہاری شادی ہو جائے گی اور کوئی تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ نہیں شکیلہ نہیں۔"

کچھ دیر بعد سجاد نے اس کے آنسوؤں کو اپنے رومال میں جذب کرتے ہوئے پوچھا۔ "کیا تم کراچی چل کر میرے ساتھ جھونپڑی میں رہنا پسند کرو گی؟"

"تم جھونپڑی کی بات کر رہے ہو۔ میں تو فٹ پاتھ پر بھی رہنے کے لئے تیار ہوں۔ یقین نہیں آ رہا ہے تو میری آزمائش کر لو۔ میں ہر آزمائش کے لئے تیار ہوں۔"

"اب کڑی آزمائش کا وقت آ پہنچا ہے شکیلہ!" اس نے شکیلہ کو اپنے سینے سے جدا کر کے اسے صوفے پر بٹھا دیا۔ "میں ہر قیمت پر تمہیں کسی محل میں نہیں تو کسی بنگلے یا کوٹھی میں رکھوں گا۔ تم ایک شہزادی کی طرح رہو گی۔ بس اب میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ کتنی دور تک چل سکتی ہو۔ میرے اور میری محبت کے لئے کس قدر عظیم قربانی دے سکتی ہو۔ آج تمہاری ہی نہیں تمہاری محبت کی بھی کڑی آزمائش ہے۔ محبت نے ہمیشہ قربانیاں مانگی ہیں۔ اُنہیں ایثار و جذبے کی ضرورت ہے۔ بتاؤ! تم میرے ساتھ پرسوں کراچی چل رہی ہو؟ جہاں پہنچ کر ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے؟"

"تم جہاں کہو' جب کہو' جس دن کہو میں چلنے کے لئے تیار ہوں۔ میں آج ابھی اور اسی وقت تمہارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوں۔" وہ بڑے عزم سے بولی۔

"آج اور ابھی نہیں۔" شکیلہ نے اس کے شانے پر سر رکھا تو وہ اس کے بالوں کو سہلاتا ہوا بولا۔ "مجھے بہت سارے کام نمٹانے ہیں۔ میں شام کو لائل پور روانہ ہو جاؤں گا۔ نسرین کے پاس جا کر اسے آزاد نہیں کروں گا بلکہ میں خود آزاد ہو جاؤں گا۔ اس کے مہر کی رقم' دفاتر اور کاروں کی چابیاں اور ذمہ داریاں اس کے حوالے کر کے آ جاؤں گا۔ پھر میں اپنی رقم بینک سے نکلوا کر ہوائی جہاز کی سیٹیں بک کرا لوں گا۔ ہم دونوں پرسوں دن سہ پہر کی فلائٹ سے کراچی کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ کراچی سے حیدر آباد جائیں گے جہاں ہم دونوں شادی کریں گے اور وہیں ہنی مون منائیں گے۔ پھر ایک مہینے بعد کراچی پہنچیں گے تو تمہارے والدین اور پولیس کی تلاش ختم ہو چکی ہو گی اور پھر تم پر قانون ہاتھ بھی نہیں ڈال سکتا ہے۔ تمہیں تمہارے والدین تمہاری مرضی کے خلاف لے جا بھی نہیں سکیں گے۔ اس لئے کہ تم بالغ اور اپنی مرضی کی مالک ہو۔"

☆======☆======☆

کراچی سے حیدر آباد پہنچنے کے بعد شکیلہ کو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ واقعی نئی زندگی میں قدم رکھ چکی ہے۔ اسے اس انداز سے ماں باپ سے بچھڑنے کا بے حد دکھ اور غم ضرور تھا۔ اس کے دل میں پھانس سی گڑ گئی تھی۔ مگر یہ پھانس جلد ہی اس کے سینے سے نکل گئی تھی۔ حیدر آباد پہنچتے ہی سجاد نے اسے ایک ہوٹل میں ٹھہرایا تھا۔ پھر اس کی شادی دوسرے ہی دن سجاد کے ایک دوست کے ہاں انجام پائی تھی۔ آج ہی اس کی شادی بڑی سادگی سے ہوئی تھی۔ وہ حجلۂ عروسی میں بیٹھی سجاد کا انتظار کر رہی تھی۔ سوچوں میں گم تھی' گھر میں سناٹا طاری ہو چکا تھا۔ مگر طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن پر یلغار کر رہے تھے۔ اس کی خوشی میں انجانے دکھ کی آمیزش تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے جو کچھ کیا وہ اچھا کیا' یا بُرا کیا؟ کیا اسے یہ قدم اٹھانا تھا؟

سجاد کی زندگی میں آج جو سہاگ رات آئی تھی' وہ اس کی زندگی میں پہلی بار تو نہیں آئی تھی۔ اس کے لئے عورت اور اس کے شاداب بدن کا لمس نیا نہیں تھا۔ ایک عورت کی طرح مرد کے نزدیک بھی سہاگ رات سے زیادہ حسین اور کوئی رات نہیں ہوتی ہے۔ وہ کئی سہاگ راتیں منا چکا تھا۔ مگر اس کی پیاس نہیں بجھی تھی۔ دل آج بھی نہیں بھرا تھا۔ ان سہاگ راتوں کی یادیں اس کے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی تھیں۔ اس کا کیف و سرور آج بھی اسے اپنی نس نس میں لہو کی طرح ابلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ سرشاری کا نشہ آج بھی اس پر چھایا ہوا تھا۔ والہانہ پن اسے ہر لمحے یاد آتا رہتا تھا۔ اس رات کی بات ہی اور ہوتی تھی۔ وہ ایسا طلسم ہوا تھا جو ساری زندگی نہیں ٹوٹتا تھا۔

یہ گھر اس نے ایک دوست سے کچھ دنوں کے لئے لیا ہوا تھا۔ شادی کی تقریب چند دوستوں کی موجودگی میں بڑی سادگی سے ہوئی تھی۔ مگر اس نے حجلۂ عروسی کو خوب اچھی طرح سجایا ہوا تھا تاکہ شکیلہ کو احساس محرومی نہ ہو۔ اس نے کمرے میں بھی خوب آرائش و زیبائش کروائی تھی اور راحت و آسائش کا سامان بھی بھر دیا تھا۔ حجلۂ عروسی پر ہزاروں روپے خرچ ہو گئے تھے مگر حجلۂ عروسی اس قدر خوبصورت ہو گئی تھی جیسے وہ خود بھی نئی نویلی دلہن ہو۔ نکاح کے بعد کھانے کی تقریب ہوئی تھی۔ اس کی بھابی نے نکاح کے فوراً بعد دلہن کو کمرے میں بند کر دیا تھا۔ اسے اندر جانے نہیں دیا تھا اور نہ ہی دلہن کا چہرہ کسی لمحے دیکھنے دیا تھا۔ اس کا دل اندر ہی اندر بڑا تڑپ رہا تھا کہ وہ شکیلہ کو دیکھے۔ وہ دلہن کے روپ میں کیسی لگ رہی ہو گی۔ اس نے کئی بار سوچا تھا اور انتظار کے لمحات اس پر صدیوں کی طرح بھاری ہو گئے تھے۔ رات گیارہ بجے اس کا دوست اور اس کے دوست کی

بیوی' بھابی جو اس کی منہ بولی بہن بن گئی تھی' سہرہ اتارنے کے ایک ہزار روپے لے کر رخصت ہو گئی تھی۔ ان دونوں کے جانے کے بعد اس نے بیرونی دروازے کو بند کیا تھا۔ اب وہ اور شکیلہ اس کمرے میں تنہا تھے۔ اب اس گھر کے ایک ایک گوشے میں صرف سناٹے کا راج تھا۔

وہ حجلۂ عروسی کی طرف اس طرح بڑھ رہا تھا جیسے ایک پیاسا لق و دق صحرا میں چشمے کو دیکھ کر بڑھتا ہے۔ اسے اپنی زندگی کی سب سے پہلی سہاگ رات یاد آ رہی تھی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تھا تو اس نے مسہری کے کنارے دلہن کو گٹھری بنے بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ مسہری پر دلہن کے سامنے اور قریب بیٹھ گیا تھا۔ پہلے تو اس نے ایک شاعر کے انداز میں اپنی دلہن کو سلام کیا تھا۔ جواب نہ پا کر پھر اس نے آداب عرض کیا تھا۔ کئی بار سلام کرنے کے بعد باریک اور لرزتی آواز میں جواب ملا تھا۔ جواب ملنے کے بعد اس نے گھونگٹ اٹھایا تھا۔ گھونگٹ اٹھاتے ہی اسے ایسا لگا تھا کہ بجلی کا کوندا سا لپکا ہو۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ تھام کر مندی آنکھیں کھولنے پر اصرار کیا تھا۔ بڑی منتوں اور سماجتوں کے بعد اس نے آنکھیں کھولی تھیں' باتیں کی تھیں۔ ان باتوں میں بڑی شیرینی تھی۔ پھر منہ زور جوانی نے زیادہ باتیں کرنے نہیں دیا تھا۔ پھر اس دلہن نے اپنا سب کچھ اس کے حوالے اس طرح کر دیا تھا۔ جیسے یہ امانت حوالے کرنے کے بعد اس کے چہرے پر ایک ایسا سکون ہلکورے لیتا ہوا نظر آ رہا تھا جو اس نے پھر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سجاد ان خیالوں سے نکلا تو اس نے اپنے آپ کو حجلۂ عروسی میں پایا۔ شکیلہ پلنگ پر سر جھکائے سرخ گٹھری بنی بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا لمبا سا گھونگٹ نکالا ہوا تھا۔ کمرہ پھولوں کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ ہاتھ تو ساڑھی کی سلوٹوں میں گم تھے۔ البتہ مہندی لگے پاؤں باہر تھے۔ پاؤں اتنے خوبصورت نظر آ رہے تھے کہ چہرہ دیکھنے کی بے قراری اس کے دل میں بڑھ گئی۔ سجاد نے پلنگ پر بیٹھ کر ساڑھی کی سلوٹوں سے ہاتھ نکالا' اس کے ہاتھ میں انگوٹھی پہنائی اور پھر آہستہ آہستہ گھونگٹ کو الٹ دیا تھا۔

سجاد سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شکیلہ دلہن کے روپ میں اتنی حسین اور غضب کی لگے گی اور پھر سرخ لباس میں تو شباب کسی آتش فشاں کے لاوے کی طرح ابلتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اس روز سے جس روز اس کی شکیلہ سے پہلی ملاقات ہوئی تھی' تب سے وہ اس شباب کو اپنی ملکیت بنانے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ وہ کتنا بے قرار تھا۔ آج اس کی بے قراری کے لمحات ختم ہو رہے تھے۔ آج اب شکیلہ سراسر اس کی ملکیت میں تھی۔ وہ اس

کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ حسن و شباب تو پوری کراچی کو پاگل بنا کر رکھ دے گا۔ مگر اب وہ خود پاگل ہو رہا تھا۔ اب اسے سب سے پہلے اپنے پاگل پن کا علاج کرنا تھا۔

وہ پورے بیس دن حیدر آباد میں ہی اس گھر میں شکیلہ کے ساتھ رہا تھا۔ ان دنوں اس نے اخبارات میں شکیلہ کے والدین کے بارے میں کوئی خبر نہیں پڑھی اور نہ ہی شکیلہ کی اغوا یا گمشدگی کی کوئی خبر چھپی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ شریف والدین نے غم کا تلخ گھونٹ پی لیا ہے۔ اس گھونٹ کے پینے پر ان پر کیا بیتی ہو گی اسے اس کا احساس تو تھا مگر اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اس عرصے میں شکیلہ کئی بار اپنے ماں باپ کو یاد کر کے روئی تھی۔ اس کے خیال میں رونا بہتر تھا۔ بہتے آنسو دل کے غم کا بہترین علاج تھے۔ رونے سے دل کی بھڑاس نکل جاتی تھی' غم اور دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا تھا۔

سجاد ایک ہفتے کے لئے شکیلہ کو اپنے دوست اور اس کی بیوی کے پاس چھوڑ کر کراچی گیا ہوا تھا۔ شکیلہ کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ ایک صدی کے لئے گیا ہوا ہے۔ سجاد جاتے جاتے اس سے کہہ گیا تھا کہ وہ کراچی میں فلیٹ اور کاروبار کے سلسلے میں جا رہا ہے۔ ادھر شکیلہ کو ایک ایک دن بھاری لگ رہا تھا۔ مجبوری تھی۔ انتظار کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

وہ پورے سات دن تک تنہائی کے جہنم میں جلتی رہی تھی۔ آج اسے معلوم ہوا تھا کہ تنہائی کا عذاب کس قدر دردناک ہوتا ہے۔ انتظار کے اضطراب اور بے چینی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس انتظار میں ایک عجیب سے اور انجانے سے مزے نے پناہ لے رکھی تھی۔ مگر وہ اس انتظار کے لئے مجبور تھی' بے بس تھی۔ نہ تو اسے پتا تھا کہ سجاد کراچی میں کہاں گیا ہے' کہاں ٹھہرا ہے اور اس کے دفتر یا گھر کا کیا پتا ہے۔ نہ ہی اس کے دوست اور اس کی بیوی کو کچھ خبر تھی۔ اگر ان میں سے کسی کو پتا ہوتا تو وہ انہیں ساتھ لے کر کراچی پہنچ جاتی۔ سجاد اس سے کہہ گیا تھا کہ وہ کراچی کاروبار اور رہائش کے انتظام کرنے کے سلسلے میں جا رہا ہے۔ سات آٹھ دن میں وہ واپس آ جائے گا۔

رات کو نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور چلی جاتی تھی۔ وہ بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے اس کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ سوچتے سوچتے اس کی ذہنی رو بھٹک جاتی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سجاد اپنی غرض پوری کر کے اسے پوری طرح لوٹنے کے بعد بیزار ہو کر چھوڑ کر چلا گیا ہو۔ اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔ مرد کا کیا بھروسہ

اور پھر سجاد تو خوبوں کے شہزادوں کی طرح ہے۔ اس کے ایک اشارے پر کتنی ہی لڑکیاں اور عورتیں نثار ہو سکتی ہیں۔ پھر اسے وہ راتیں' وہ باتیں' وہ والہانہ پن اور محبت کے دل گداز لمحے یاد آ جایا کرتے تھے۔ اگر سجاد کو اس کے جسم سے غرض ہوتی' شباب سے دلچسپی ہوتی اور حُسن سے محبت ہوتی تو پھر اتنی دور آنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ کب کی محبت کے نشے میں بہہ کر اپنے آپ کو سجاد کے حوالے کر سکتی تھی۔ وہ اسے جبر و زیادتی سے بھی حاصل کر سکتا تھا مگر سجاد نے ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ اس کی محبت میں مخلص تھا۔ سجاد کی محبت بڑی حیران کن اور حیات آفریں تھی۔ اس نے کتنے ہی دن تک سجاد کے وجود میں سما کر اس حیات آفریں محبت کو دیکھا تھا۔ اُسے ان دنوں ایسا محسوس ہوتا رہا تھا کہ اس میں ایک کائنات سما گئی ہے۔ ایسا شخص جو اس کی محبت میں پاگل ہو گیا ہو۔ جس نے ایک امیر و کبیر عورت اور اس کی شاہانہ زندگی کو ٹھوکر مار دی ہو۔ کس طرح دغا باز ہو سکتا ہے۔ ایسی ہی باتوں سے وہ اپنے آپ کو' اپنے دل کو اور اپنے وجود کو تسلی دیتی رہتی تھی۔

وہ کسی مریض کی طرح ہو کر رہ گئی تھی۔ گو اسے کوئی بیماری نہیں تھی مگر اس جدائی اور انتظار کی کیفیت نے اسے کسی قریب المرگ مریض سے بدتر بنا دیا تھا۔ جب سے سجاد گیا تھا بس اسے ایک کرب' اذیت اور بے اطمینانی محسوس ہوتی تھی۔ دل پر ایک پہاڑ سا بوجھ محسوس ہوتا تھا جسے سہارنا اس کے بس کی بات نہیں لگتی تھی۔ اس کے اعصاب کھنچے کھنچے رہنے لگے تھے۔ سجاد کے دوست کی بیوی کی رفاقت' اس کی پُرلطف باتیں اور فلمی رسالے بھی یہ کھنچاؤ اور بوجھ کم نہ کر سکے تھے۔ سجاد تو جاتے جاتے اسے ایک ذہنی ابتلا میں مبتلا کر گیا تھا جس سے وہ دوچار ہو گئی تھی۔ سجاد کی یاد ایک متعدی مرض کی طرح اس کے دماغ سے چمٹ گئی تھی۔ صبح کا سورج طلوع ہوتا تو اختیاری طور پر اس کی نگاہ دروازے پر چلی جاتی تھی اور غیر اختیاری طور پر کھڑکی کے پاس آ کر گلی میں جھانکتی تھی۔ سجاد اس کے اعصاب پر مسلط ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر وہ دن میں کتنی ہی بار دل میں خدا سے گڑگڑا کر دعا کرتی تھی کہ وہ اس کے سجاد کو خیر و عافیت کے ساتھ اس کے پاس پہنچا دے۔

ایک شام وہ بستر پر گم صم لیٹی تھی۔ سہاگ راتوں کی سہانی یادوں کے تصور میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک اسے اپنے کمرے کے دروازے پر مانوس سی دستک سنائی دی۔ اسے پہلی دستک پر کوئی احساس نہیں ہوا تھا۔ اس لئے کہ وہ تصور میں بہت دور نکل گئی تھی۔ اس کی نس نس میں لطیف سی چنگاریاں سی بھڑک رہی تھیں۔ پھر دروازے پر

دستک ہوئی۔ ایک لرزیدہ سی دستک جو وقفے وقفے سے ہو رہی تھی۔ اس نے چونک کر سوچا کہ یہ اس کی سماعت کا فتور ہے۔ دوسرے لمحے اس نے اپنے آپ کو دروازے پر پایا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ وہ کب اور کیسے بستر سے اٹھ کر دروازے تک آئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو سجاد کھڑا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ یہ خواب نہیں تھا۔ اس پر حیرت اور خوشی اس قدر غالب آگئی تھی کہ وہ منجمد و ساکت سی ہو کر کھڑی رہ گئی تھی۔ سجاد کی آنکھوں میں محبت کے وہی چراغ روشن تھے جو اس روز سے جل رہے تھے۔ پھر ایک بہت زور کا طوفان آیا۔ وہ اس طوفان کے آگے ٹھہر نہ سکی۔ یہ طوفان اپنے اندر ہر چیز کو سمیٹ کر اسے بہا کر لے گیا تھا۔ وہ طوفان کے رحم و کرم پر کسی تنکے کی طرح لہراتی ڈولتی اور بکھرتی رہی تھی۔

وہ کراچی میں کلفٹن والے لگژری فلیٹ میں حیدر آباد کے مکان سے منتقل ہوئی تو اسے ایسا لگا کہ وہ جنت کے کسی مکان میں آگئی ہو۔ جب وہ لاہور سے کراچی پہنچی تھی تو اسے کراچی شہر اور اس کی زندگی کا کچھ اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ اس لئے کہ لاہور سے کراچی آتے وقت وہ ایک خوف و دہشت میں مبتلا تھی۔ اس کے دل و دماغ پر ایک دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ اس دھند میں اسے اپنے ماں باپ کے زرد اور غم سے ستے ہوئے چہرے لپٹے ہوئے نظر آتے رہے تھے۔ وہ چہرے ماں باپ کے نہ تھے بلکہ بے گور و کفن لاشوں کے تھے۔ وہ کتنی بے رحمی، سنگدلی اور وحشیانہ درندگی سے ان کی آنکھوں سے نور بھی چھین کر لے آئی تھی۔ ان کی عزت و ناموس اور وقار کے چیتھڑے کر کے چلی آئی تھی۔ اس کے کانوں میں ماں باپ کے زخم خوردہ لہجے کی دل خراش چیخیں گونج رہی تھیں۔ وہ پوچھ رہے تھے۔ "شکیلہ بیٹی! یہ تم ہمیں کن گناہوں کی سزا دے کر جا رہی ہو۔ ہمارا قصور کیا تھا؟ ہم نے کیا کیا تھا بیٹا؟ تم ہماری اس عزت کو بھی ساتھ لے جا رہی ہو جس کی آن کے لئے ہم جی رہے تھے۔ جو ہمارے لئے سب سے بڑی دولت تھی۔ کیا کوئی بیٹی اپنے ماں باپ کو سرِ راہ یوں بے آبرو کر کے جاتی ہے؟ کیا بیٹیاں اسی دن کے لئے جنم لیتی ہیں؟"

سجاد ائرپورٹ سے سیدھا حیدر آباد شہر لے آیا تھا۔ وہ سارا راستہ سوچوں میں غلطاں تھی۔ خوف زدہ اور متوحش رہی تھی۔ بار بار آنکھیں بند کر لیتی تھی۔ ہزاروں آنکھیں اسے گھورتی، طعنے دیتی اور سانپوں کی طرح لپکتی اور پھنکارتی نظر آتی رہی تھیں۔ سجاد کے ساتھ وہ جس مکان میں ٹھہری تھی۔ وہ دو کمروں کا ایک چھوٹا سا اور عام سا مکان تھا۔ کراچی کے اس خوشنما اور جنت جیسے [illegible] میں آ کر اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ کسی

زنداں سے چھوٹ کر اپنے خوابوں میں آگئی ہو۔ اس کا غم کسی حد تک دور ہو گیا تھا اور وہ اپنے ماں باپ اور گھر کو بھی بھول گئی تھی۔ وہ اس قدر خوش ہو گئی تھی کہ سجاد کو یقین ہی نہیں آتا تھا۔ اس کی یہ سرشاری دیکھ کر وہ بھی سرشاری کے موڈ میں آجاتا تھا۔ پھر دونوں اپنی خواب گاہ کی بالکنی میں آ بیٹھتے تھے جہاں سے سمندر نظر آتا تھا۔ سمندر کی پُرجوش لہریں بالکل اسی طرح مچلتی دکھائی دیتی تھیں جس طرح ان دونوں کے جذبات مچلتے تھے۔ ان تیز و تند لہروں میں سجاد کو ایسی ہی سرکشی محسوس ہوتی تھی جیسے اس کے شباب میں تھی۔

سجاد اس کی طرف مخمور نگاہوں سے دیکھتا تھا وہ شرما کر اور لجا کر اس کے سینے میں اپنا سر چھپا لیتی تھی۔ سجاد کہتا۔

"شکیلہ! تم ایک مہکتا پھول ہو جس کی مثال اس کرۂ ارض پر موجود نہیں ہے۔ تم ایک ہی پھول تھیں جو میں چرا کے لے آیا ہوں۔" پھر اس پھول کی خوشبو سجاد کی سانسوں میں بس جاتی تو وہ دنیا و مافیہا کو بھول جاتا۔ کھو سا جاتا۔ پھر اسے کچھ یاد نہیں رہتا کہ وہ کہاں ہے؟ کس دنیا میں ہے۔ اس کے بازوؤں میں کون ہے؟

کراچی شہر اور کراچی کی زندگی دیکھ کر شکیلہ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ کسی اور ہی دنیا میں آگئی ہے۔ سجاد اسے روز ہی باہر لے جاتا تھا۔ سجاد نے ایک کار لی ہوئی تھی جس میں وہ دونوں نکل جاتے تھے۔ کبھی تو ساحل سمندر پر چلے جاتے تھے تو کبھی کسی ہوٹل میں، کبھی کوئی ایسی انگریزی فلم دیکھ کر آتے تھے جو محبت اور جذبات کو ہوا دیتی تھی۔ پھر ایسی تقریبات میں وہ شرکت کرنے لگی تھی جس کا سحر کئی دنوں تک اس پر چھایا رہتا تھا۔ پھر اس پر جیسے رات اور دن کی تقسیم کا راز منکشف ہو گیا تھا۔ اب اسے معلوم ہو رہا تھا کہ سورج کیا پیغام لے کر طلوع ہوتا ہے اور چاند کی دودھیا چاندنی کی روشنی کیا دعوت لے کر آتی ہے۔ کراچی پہنچ کر رات، سہاگ کی طرح حسین اور خواب ناک ہو گئی تھی۔ دن سونے کے لئے بن گیا تھا۔ پھر ایک روز سجاد نے محسوس کیا کہ شکیلہ کے دل و دماغ اور رگ رگ میں خوابناک راتوں کا زہر سرایت کر چکا ہے۔ اب وہ ایک نئی شکیلہ ہے۔ لاہور والی شکیلہ کا گلا تو خوابناک ماحول اور کراچی کی فضا نے گھونٹ کر رکھ دیا تھا۔

اس طرح ایک مہینہ گزر گیا تھا۔ سجاد نے اب اپنے کاروبار کی طرف توجہ دینا شروع کر دیا تھا۔ وہ صبح جاتا تو شام کو لوٹتا تھا۔ شکیلہ دن چڑھے تک سوتی رہتی تھی۔ سجاد اپنا ناشتہ خود ہی بنا کر کھا پی کر چلا جاتا تھا اور دوپہر کا کھانا کسی ہوٹل میں کھا لیتا تھا۔ وہ شام کو

گھر آتا تو شکیلہ اس کے انتظار میں سج دھج کر بیٹھی رہتی تھی۔ سجاد بہت ٹوٹا ہوا گھر پہنچتا۔ شام کی چائے گھر پر پینے کے بعد' دن ڈوبنے اور اندھیرا پھیلنے کے بعد وہ دونوں گھر سے نکلتے۔ رات کا کھانا ہوٹل میں کھاتے اور جب وہ گھر لوٹتے تو رات شباب کی آخری منزل پر ہوتی تھی۔

شکیلہ کچھ دنوں سے یہ بات خاص طور پر محسوس کر رہی تھی کہ سجاد بے چین و مضطرب سا نظر آ رہا ہے۔ اس نے کئی بار اس بے چینی کا سبب پوچھا تھا۔ سجاد نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ کاروباری الجھنیں ہوتی ہیں جو کبھی کبھی ذہن پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ پھر اس نے دیکھا کہ سجاد کی راتیں بہت بے چین گزرنے لگی ہیں۔ اس کی محبت کی گرمجوشی میں کمی سی محسوس ہونے لگی تھی اور وہ پوری طرح توجہ بھی نہیں دیتا تھا۔ وہ اکثر لیٹے لیٹے چونک کر اٹھ بیٹھتا تھا اور بستر سے نکل کر کمرے میں ٹہلنے لگتا تھا یا پھر اس کے سراپا پر ایک اداس سی نظر ڈال دیتا تھا۔ وہ اپنی مندی مندی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھتی رہتی تھی۔ پھر وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا ہوا بالکنی میں چلا جاتا تھا۔ اسے سجاد کی بے قراری اور پریشانی کے پیچھے انجانا سا خطرہ ہچکولے کھاتا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کے دل پر گھونسا لگتا تھا۔ وہ بے چین سی ہو جاتی تھی۔

پھر ایک رات جب وہ دونوں باہر سے لوٹے تو اس نے محسوس کیا کہ آج سجاد ضرورت سے زیادہ پریشان اور مضطرب نظر آ رہا ہے۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے' بدن پر چند مگ پانی کے ڈال کر اور سیاہ ریشمی نائٹی پہن کر آئی تو اس نے دیکھا کہ کمرے میں ملگجی اندھیرا ہے۔ سجاد کپڑے تبدیل کئے بالکنی میں کھڑا ہے اور سگریٹ پی رہا ہے اور آسمان پر چودھویں کا چاند چمک رہا ہے۔ اس کی روشنی بالکنی میں پڑ رہی ہے۔ اس نے کمرے کے گھپ اندھیرے کا دم توڑ دیا ہے۔ وہ سجاد کی طرف بڑھی۔ سجاد کو اس کے قدموں کی چاپ بالکل سنائی نہیں دی۔ اس لئے کہ کمرے کا فرش بیش قیمت قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس نے سجاد کے پاس پہنچ کر سجاد کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو سجاد نے چونک کر اداس نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "سجاد" اس نے بڑے پیار بھرے لہجے میں اُسے مخاطب کیا تو سجاد نے اسے شانوں سے تھام لیا۔ "سجاد میں آج تمہاری پریشانی کے بارے میں پوچھ کر ہی رہوں گی۔ آج تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔"

"اچھا!" سجاد کی نگاہیں اس کے چہرے اور جسم پر سے ہوتی ہوئی اوپر اٹھیں۔ وہ اسے کمرے میں لے کر آیا اور اسے پلنگ پر بٹھا دیا۔ پھر وہ سگریٹ جلا کر اس کے لمبے لمبے

کش لے کر کمرے میں بے چینی سے ٹہلتا رہا اور بڑے کربناک لہجے میں بولا۔

"میں بات کو گھما پھرا کر کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ میں یہ بات تمہیں بتانا نہیں چاہتا تھا مگر اس لئے بتانے پر مجبور ہوں کہ تم میرا وجود اور میری ذات ہو۔ دکھ سکھ کی ساتھی ہو۔ تمہیں نہیں بتاؤں گا تو پھر کسے بتاؤں گا؟ بات یہ ہے شکیلہ! کہ اس خوابناک زندگی کا طلسم جلد بکھر جانے والا ہے۔ شاید ہمیں کسی جھونپڑی میں جا کر رہنا پڑے۔"

"کیا مطلب؟" شکیلہ کی آنکھوں میں شدید حیرانی بھر گئی۔ اس کا خیال بجلی کی سی تیزی سے نسرین کی طرف گیا۔ "کیا نسرین کراچی آ گئی ہے؟ کیا وہ تمہارے کاروبار میں روڑے اٹکا رہی ہے؟"

"اس کا تعلق نسرین سے نہیں ہے مگر افضال احمد سے ہے۔"

"افضال احمد سے؟" شکیلہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ افضال احمد کون ہے؟"

"افضال احمد ایک بہت بڑی فرم کا ڈائریکٹر ہے۔ اس فرم کا ڈائریکٹر ہے جس سے میرا کام ہوتا ہے۔ اس فرم سے مجھے لاکھوں روپے کا آرڈر ملتا ہے۔ اس بار لاکھوں روپے کی سپلائی کا آرڈر کسی اور کو ملنے والا ہے۔ اگر یہ آرڈر ہاتھ سے نکل گیا تو پھر ہمیں بڑی تیزی سے نیچے کی طرف آنا ہو گا۔ شاید اس مکان سے بھی بدتر مکان میں رہنا ہو گا جو حیدر آباد میں تھا۔ یہ کار' یہ فلیٹ اور یہ شاہانہ زندگی کسی بلبلے کی طرح ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔"

شکیلہ کو اپنے کانوں میں جیسے گرم گرم سیسہ پگھلتا ہوا سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اس پُر آسائش زندگی کی اس قدر عادی ہو چکی تھی کہ وہ پستی کی طرف دیکھنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "یہ آرڈر کسی اور کو کیوں ملنے والا ہے؟"

سجاد ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ چند لمحوں تک وہ شکیلہ کا منجمد اور استعجاب زدہ چہرہ دیکھتا رہا۔ پھر پلنگ پر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ سرد ہو رہا تھا۔ وہ شکیلہ کے ہاتھ کی پشت تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "اس لئے کہ میرے روایتی حریف ناظم راجہ کی نوجوان اور حسین و جمیل بہن اس آرڈر کے سلسلے میں سفارش بن کر جا رہی ہے۔ افضال احمد کی کمزوری حسین لڑکیاں ہیں۔"

"کیا حسین اور نوجوان لڑکی کی سفارش پر ناظم راجہ کو لاکھوں روپے کا آرڈر مل

جائے گا؟" شکیلہ پر سکتہ سا چھا گیا۔ "وہ اس سے عشق لڑانے جا رہی ہے یا آرڈر لینے؟ کیا ایسا ممکن ہے؟ ایسا ممکن ہے تو کس طرح؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔"

"اگر ناظم راجہ کی بہن پہلے پہنچ گئی تو اسے آرڈر پہلے مل جائے گا۔" سجاد نے کہا۔

"یہ کراچی ہے' یہاں سپلائی کے کاروبار میں ایسے نشیب و فراز آتے ہیں۔ ناظم راجہ کی بہن افضال احمد پر ڈورے نہیں ڈالے گی بلکہ اس کے ساتھ دو ایک گھنٹے سیر و تفریح میں گزارے گی۔ فلم دیکھے گی اور کسی ہوٹل میں اس کے ساتھ کھانا کھائے گی۔ رات دس گیارہ بجے افضال احمد اسے اس کے گھر پر اتارے گا اس کے ہاتھ میں لاکھوں روپے کا آرڈر ہو گا۔"

"ایں! صرف اتنی سی بات پر لاکھوں روپے کا آرڈر مل جائے گا؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ "یقین نہیں آ رہا ہے۔"

"بڑے لوگ صرف حسین لڑکیوں کی دوستی اور رفاقت کے بھوکے ہوتے ہیں' جسموں کے نہیں۔ اس لئے کہ وہ اپنے معیار سے گرنا پسند نہیں کرتے ہیں۔"

"کیا تم نے ناظم راجہ کی بہن کو دیکھا ہے؟ کیا وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے؟"

"حسین تو ہے لیکن تم سے زیادہ حسین نہیں ہے۔ کراچی میں تم سے حسین اور خوبصورت کوئی لڑکی اور عورت نہیں ہے۔ مگر تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"اگر اتنی سی بات ہے تو میں تمہاری سفارش بن کر چلی جاؤں؟"

"تم.........." سجاد اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ "تم جاؤ گی شکیلہ! نہیں نہیں۔"

"کیوں؟ کیا حرج ہے سجاد! صرف اتنی سی بات ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ افضال احمد کو خوش ہی تو کرنا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ یہ آرڈر ہاتھ سے نکل جائے۔ ہماری زندگی اور ہمارا مستقبل تباہ ہو کر رہ جائے۔"

وہ چند لمحوں کی گہری خاموشی کے بعد بولا۔ "میرے دل میں تمہارا خیال آیا تھا مگر میں نے یہ سوچ کر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا تھا کہ تم شاید برا مان جاؤ گی۔ جبکہ اس میں ایسی کوئی برائی نہیں ہے۔ یہاں کی سوسائٹی میں یہ بات معیوب نہیں سمجھی جاتی ہے۔ یہاں منزل پر پہنچنے کے لئے اپنی حسین بہنوں اور بیویوں کو بڑے لوگ ترقی کا زینہ بناتے ہیں۔ اسی زینے کی بدولت ان کے پاس کار' کوٹھی اور آسائش کی زندگی قدموں تلے رہتی ہے۔ اس طرح وہ بڑے آدمی بنے ہوئے ہیں۔ میں کل شام ہی تمہیں افضال احمد سے لے جا کر متعارف کراؤں گا۔ بیوی کی حیثیت سے نہیں' بہن کی حیثیت سے۔"

"بہن کی حیثیت سے.........." شکیلہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی تھی۔ اس کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں دکھ اور شدید حیرانی بھر گئی تھی۔ وہ بولی تو اسے اپنی آواز حلق میں اٹکی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ "سجاد! .... تم مجھے اپنی بہن بنا کر افضال احمد کے سامنے پیش کرو گے.........."

"کیوں..........؟ اس میں حرج ہی کیا ہے ڈیئر!" سجاد نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ "اگر میں تمہیں اپنی بہن کی حیثیت سے اس سے متعارف متعارف کراؤں گا تو تم میری سگی بہن تو نہیں بن جاؤ گی؟ تم میری بیوی ہی رہو گی' میں تمہارا شوہر.........."

"مگر سجاد!" اس کے سراپا میں اضطراب کی لہر سی اٹھی۔ "معلوم نہیں کیوں یہ سب مجھے بہت برا' بے حد عجیب اور بہت ہی معیوب سی بات محسوس ہو رہی ہے۔ جیسے.........." وہ متذبذب سی ہونے لگی جیسے اسے دل کی بات زبان کی نوک پر لاتے ہوئے ہچکچاہٹ سی ہو رہی ہو۔ یا وہ دانستہ گریز کر رہی ہو۔ سجاد اس کے چہرے پر اذیت ناک کرب دیکھ رہا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ شکیلہ پر کس قسم کا ردعمل ہو رہا ہے۔ چند لمحوں کی گہری خاموشی اور توقف کے بعد شکیلہ نے اپنی نگاہیں نیچی کر کے اپنے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے رگڑتے ہوئے کرب ناک لہجے میں کہا۔ "ہم جیسے بہت بڑا گناہ کر رہے ہیں۔ ایک ایسا جرم کرنے والے ہیں جو ناقابلِ معافی ہو گا.........."

سجاد پر تو جیسے سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ شکیلہ اس انداز سے اس بات کو دل پر لے گی۔ یہ کوئی ایسی نازک سی اور اتنی اہم بات نہ تھی۔ وہ بڑا جہاندیدہ تھا۔ اس نے خود کو جلدی سے سنبھال کر کنکھیوں سے اپنی بیوی کا چہرہ بھانپا اور اپنے لہجے میں مٹھاس بھرتے ہوئے کہنے لگا۔

"شکیلہ! تم اتنی سی بات کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی ہو؟ یہ دنیا تو ایک اسٹیج ہے۔ اس اسٹیج پر ہر شخص کو اپنا کردار ادا کرنا پڑتا ہے۔ کیا تم نے کبھی فلموں میں کسی ہیروئن کو کسی ہیرو کی بہن کے روپ میں نہیں دیکھا جو بعد میں حقیقی زندگی میں اس ہیرو کی بیوی بن گئی۔ زبان سے بہن کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔ جس طرح پردہ سیمیں اور اسٹیج پر ہوتا ہے۔ اس طرح دنیا کے اسٹیج پر بھی ہوتا رہتا ہے اور پھر یہاں کیا کچھ نہیں ہوتا شکیلہ! بعض اوقات بہنیں بیویاں بن کر ملتی ہیں؟ وہ کچھ وقت کے لئے بیویاں بن جاتی ہیں۔"

مگر شکیلہ کو سجاد کی یہ ساری باتیں بے معنی سی معلوم ہو رہی تھیں۔ ان باتوں میں کوئی وزن نہیں تھا اور اس کا دل ان باتوں کو تسلیم کرنے کے لئے قطعی طور پر تیار نہیں تھا۔ وہ بدستور اپنی نگاہیں نیچی کئے ہوئے کہنے لگی۔ "اسٹیج اور حقیقی زندگی میں بڑا فرق ہے۔ اسٹیج جھوٹ ہوتا ہے۔ حقیقی زندگی سچ ہوتی ہے۔ کیا تمہیں مجھے ایک بہن کی حیثیت سے متعارف کراتے ہوئے کوئی ندامت محسوس نہیں ہو گی؟ کیا اس طرح ہم دونوں ایک دوسرے کی نظروں میں نہیں گر جائیں گے؟ کیا یہ بات دنیا اور دین کی نظروں میں معیوب نہیں ہو گی؟"

"میں صرف تمہارا شوہر نہیں بلکہ تمہارا محبوب بھی ہوں۔" سجاد نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ "تم اپنا سب کچھ ٹھکرا کے، چھوڑ کے میرے ساتھ آ گئی ہو۔ اب میرا فرض ہے کہ میں تمہیں ہر وقت اور ہر قیمت پر زندہ رکھوں۔ خوش رکھوں۔ تمہاری ہر خوشی میری اپنی خوشی ہے۔ تم نے میری خاطر اتنی بڑی قربانی دی کہ شاید ہی دنیا کی کوئی لڑکی اور عورت دے سکے۔ کیا اس صورت میں میرا یہ حق نہیں ہے کہ میں تمہیں ایک آسائش سے پُر زندگی دوں۔ خوابوں کو تمہارے قدموں پر ڈال دوں۔ خواب ناک زندگی محنت مزدوری سے نہیں ملتی ہے۔ محنت مزدوری کی کمائی اونٹ کی دم کی طرح ہوتی ہے۔ جو کبھی نہیں بڑھتی ہے۔ میرا دل، میرا ضمیر یہ کس طرح گوارا کرے گا کہ تم عسرت و افلاس کی زندگی گزارو۔ تم محل سے جھونپڑی میں آ جاؤ۔ مفلسی ایک ایسی دیمک ہے جو سب سے پہلے محبت کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے اور اسے چاٹ لیتی ہے۔ مجھے تمہاری نفرت گوارا ہے لیکن میں یہ تہمت کبھی برداشت نہیں کروں گا کہ میں نے تمہیں کبھی خوش نہیں رکھا اور تمہارے ایثار و قربانی کا کوئی صلہ نہیں دیا۔"

"میں جانتی ہوں اور مجھے بھی اس بات کا شدید طور پر احساس ہے کہ تمہاری سانسوں میں بسی ہوئی ہوں۔ یہ زندگی محبت کی سانسوں پر زندہ ہے۔ ہر سانس پر یہ محبت سلامت ہے۔ مگر میں اس بات سے ڈر رہی ہوں کہ اس رشتے کی پاکیزگی پر کوئی بدنما داغ نہ آ جائے۔"

سجاد نے اس کے دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے۔ "رشتے کی پاکیزگی پر داغ کیسے آ سکتا ہے؟ اب تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ تم اور میں الگ الگ نہیں ہیں۔ الگ الگ ذات اور وجود نہیں ہیں۔ اب صرف ایک ذات کے جزو ہیں ہم دونوں نے اپنے اپنے خوابوں کے پیکر تراشے ہیں۔ اس لئے ہمیں ایک دوسرے کا سب کچھ ہونا چاہئے۔

اگر غور کرو تو اب تم سے میرا ہر رشتہ ہے اور بظاہر کوئی رشتہ بھی نہیں ہے۔ یہ رشتہ صرف تین الفاظ پر ٹوٹ سکتا ہے، مگر رشتے تو بہن بھائی، ماں باپ، میاں بیوی، دوست، شوہر سے بنتے ہیں جو گہرے اور پاکیزہ ہوتے ہیں۔ ان گہرے رشتوں پر کسی ذرا سی بات سے کوئی حرف نہیں آتا ہے۔ رشتے دراصل مختلف پردوں اور دیواروں کے نام ہیں۔ مگر میرے اور تمہارے درمیان کوئی پردہ، کوئی دیوار نہیں ہے۔ میں اپنے، تمہارے اور افضال کے درمیان بہن کے رشتے کی دیوار محض اس لئے کھڑی کرنا چاہتا ہوں کہ وہ تم پر کوئی بُری نظر نہ ڈالے۔ جو مرد اپنے فائدے کے لئے اپنی بیویوں کو پیش کرتے ہیں پھر ان بیویوں کو اپنے شوہروں کی کامیابی کے لئے مجبور ہونا پڑتا ہے یا پھر اس رشتے سے فائدہ اٹھا کر انہیں مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ بستروں کو میلا کریں۔ اسی لئے میں نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ تمہیں بہن کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ مجھے اس پر کوئی ندامت بھی نہیں ہے۔" سجاد نے توقف کر کے گہری سانس لی۔ "مجھے اپنے کسی عمل پر ندامت بھی کیوں ہو شکیلہ! اس لئے کہ میں افضال احمد کو دھوکا تو نہیں دے رہا ہوں۔ اس کی جیب نہیں کاٹ رہا ہوں اور نہ تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم اس کے بستر کی زینت بن جاؤ۔ تمہیں اس کے ہاتھوں بیچ تو نہیں رہا ہوں۔ صرف اس بات پر مجبور کر رہا ہوں کہ اس سے کچھ دیر کے لئے مل لو۔ ہنس بول لو۔ صرف کچھ دیر کی ملاقات میں ہماری خواب ناک زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ناظم راجہ کی حسین بہن جو اس سے پہلے بھی کسی اور سے اپنے بھائی کو آرڈر دلا کر دیتی رہی ہے، وہ بازی لے جائے۔ اگر ایک بار اس نے بازی جیت لی تو پھر ہم کہیں بھی کوئی بازی جیت نہ سکیں گے۔ کیونکہ وہ اس بازی کو حاصل کرنے کے لئے بہت دور بھی جا سکتی ہے۔ اس کے نزدیک عزت کوئی چیز نہیں ہے۔ بدن کی پامالی کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔ اگر اس کے نزدیک کوئی چیز اہم ہے تو وہ ہے دولت کا حصول۔"

شکیلہ سجاد کی باتیں بڑے غور سے اور دھڑکتے دل کے ساتھ سن رہی تھی۔ یہ دنیا ویسی نہیں تھی جیسی وہ سمجھ رہی تھی مگر اب سمجھتی آ رہی تھی۔ وہ سوچوں کے بھنور میں چند لمحوں تک پھنسی رہی تھی۔ اس کی پلکیں ساکت اور آنکھیں منجمد تھیں۔ "سجاد!" شکیلہ کو اپنی آواز کنوئیں کی تہہ سے آتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ "تم نے اگلا مرحلہ بھی سوچا ہے کہ افضال احمد کو وقتی طور پر ہم خود کو بہن بھائی باور کروا بھی دیں تو آخر چند مہینے بعد کیا ہو گا۔ کبھی نہ کبھی تو اس پر یہ راز آشکار ہو جائے گا۔ کوئی بھی شناسا افضال احمد کو ہم

دونوں کے بارے میں بتا بھی سکتا ہے۔ تب کیا ہو گا سجاد؟"

"یہ لاہور نہیں ہے کراچی ہے۔" سجاد بولا۔ "کراچی بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں کی دنیا لاہور سے مختلف بھی ہے اور عجیب بھی۔ میں نے یہاں آ کر لوگوں سے کبھی ذاتی طور پر راہ و رسم نہیں بڑھائی۔ یہاں کی آب و ہوا کچھ ایسی ہے کہ یہاں کوئی شخص بغیر کسی غرض کے کسی سے دوستی نہیں کرتا ہے۔ میں نے بھی نہیں کی۔ میرا دائرہ احباب مختصر اور کاروباری لوگوں تک محدود ہے۔ میں تمہیں ایسی تقریبات میں لے جاتا رہا جہاں ہمیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم کسی پر بھی ہمارے تعلق اور رشتے کو ظاہر نہ ہونے دو۔ جب ہم لکھ پتی بن جائیں گے تب یہ شہر چھوڑ دیں گے۔"

سجاد نے اپنی بات ختم کر کے شکیلہ کا چہرہ دیکھنے کے بہانے سے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ اب اسے شکیلہ کا چہرہ بھانپنے کے لئے کسی حیلے بہانے اور کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ شکیلہ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئی ہے۔ وہ ذہنی طور پر اپنے آپ کو بہن کے وقتی رشتے کے لئے تیار کر رہی ہے۔ اس نے سونے چاندی جیسی چمک چھوڑتی آنکھوں سے چہرے پر غور کیا اور محسوس کیا کہ شکیلہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر آمادہ نہیں کر پا رہی ہے اس نے پینترا بدلا۔ "یہ پورے پانچ لاکھ روپے کا آرڈر ہے جس میں سے تین لاکھ کا فائدہ ہے' ایسا فائدہ تو کسی اور کاروبار میں نہیں ہے۔ اگر تم بہن بن کر جانے کے لئے تیار نہیں ہو تو پھر رہنے دو۔ ہماری قسمت میں نہیں ہے نہ سہی۔ ویسے یہ آرڈر سال میں تین بار ملتے ہیں۔ اس طرح ایک سال میں نو لاکھ کی رقم ہاتھ لگتی ہے۔ نو لاکھ مل جائیں تو ہم ساری دنیا کی سیر و سیاحت کر کے بھی آ سکتے ہیں اور ہمارے پاس پھر بھی اتنی بڑی رقم بچ جائے گی کہ ہم تین برس تک شاہانہ زندگی گزار سکتے ہیں۔ چلو جانے دو۔ زندگی کے یہ مزے ناظم راجہ اور اس کی بہن کو لوٹنے دو۔"

"نو لاکھ کا منافع؟" اس جملے سے شکیلہ کے ذہن کے گوشوں میں چاندنی چٹک گئی۔ اس کی نظروں کے سامنے پیرس اور امریکہ' جرمنی' سوئٹزرلینڈ اور جاپان کے بڑے بڑے اور خوبصورت شہر گھومنے لگے۔ وہ ہوائی جہاز کی نرم و گداز سیٹ پر بیٹھی آسمان کی وسعتوں میں پرواز کر رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے رنگین سپنوں کی وادیوں میں گھوم رہی تھی کہ سجاد نے اسے سپنوں کی دنیا سے نکال کر حقیقی دنیا میں لا کھڑا کیا تھا۔ "کیا سوچ رہی ہو شکیلہ! کیا ساری رات سوچوں میں گزار دو گی۔ کیا آج کی رات صرف سوچنے کے لئے ہے.........."

پھر سجاد کو مزید سمجھانے کے لئے پیار بھرے الفاظ سے کام لینا پڑا تھا۔ وہ حسین زندگی کو نچوڑ نچوڑ کر اس کا رس آہستہ آہستہ شکیلہ کے کانوں میں ٹپکا رہا تھا۔ شکیلہ کی سوچ بدل رہی تھی۔ "دولت کے بغیر آسائش کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا ہے؟ اگر یہ زندگی نہ رہی تو پھر میرا وجود تمہارے وجود میں کسی کانٹے کی طرح چبھتا رہے گا اور اب میں اس دوڑ میں اتنا آگے نکل آیا ہوں کہ ناظم راجہ کو جیتنے دینا نہیں چاہتا ہوں۔ تمہی بتاؤ کہ کیا میں اس کی بہن کو افضال احمد کے پاس چلا جانے دوں؟"

شکیلہ نے جھٹ سے اپنے ہاتھ سجاد کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ "مجھے اپنے لئے تمہاری آسائش اور خوشیوں کے لئے تمہاری ہر بات منظور ہے۔ اگر تم کہو کہ میں کسی بلند و بالا عمارت سے اس لئے چھلانگ لگا دوں کہ اس میں تمہاری کوئی خوشی مضمر ہے تو مجھے یہ اعزاز بھی قبول ہو گا کہ میں تمہارے لئے اپنی جان تک قربان کر دوں مگر میں تمہیں مایوس اور ناکام دیکھنا نہیں چاہتی ہوں۔ مگر سجاد! میرے اندر ایک خوف اور ڈر جنم لے رہا ہے کہ کہیں کسی دن افضال احمد تمہارے اور میرے درمیان دیوار بن کر نہ کھڑا ہو جائے۔ میں تمہیں کھو دوں۔" شکیلہ نے اپنا سر اس کے سینے میں چھپا لیا۔

"جب تک تم سوچنا ترک نہیں کرو گی' یہ اندیشے اور وسوسے تمہیں ڈستے رہیں گے۔" سجاد نے اس کے ریشمی بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

شکیلہ آج زندگی کی خواب ناک راحتوں کے لمس' اس کی مٹھاس اور اس آسائش بھری زندگی کے تمام گوشوں سے آشنا ہو چکی تھی۔ آسائش تو اس کے اپنے گھر میں بھی تھی مگر یہ بات کہاں تھی۔ یہ زندگی اس زندگی سے قدرے مختلف تھی۔ یکسر مختلف تھی۔ اس زندگی پر جنت کی زندگی کا گمان ہوتا تھا اور پھر ہر طرف رنگین سپنے بکھرے ہوئے تھے۔ رات تو جاگنے کے لئے ہوتی تھی۔ سجاد اسے سونے نہیں دیتا تھا۔ وہ سو جاتی تھی تو اسے جگا کر کہتا تھا۔ "پہلے تم نہ سویا کرو؟"

ایسی ہی شوخ و شنگ باتوں اور شرارتوں میں رات کٹ جاتی تھی۔ وہ دونوں کہیں رات کے پچھلے پہر جا کر سوتے تھے۔ دن بھر وہ سوتی ہی رہتی تھی۔ سجاد صبح اٹھ کر' شیو کر کے نہا کر' کپڑے تبدیل کر کے' اپنا ناشتہ جو انڈوں کے آملیٹ ڈبل روٹی اور چائے پر مشتمل ہوتا تھا خود ہی تیار کر کے کھا لیتا تھا۔ وہ ہر رات سوچتی تھی کہ صبح اٹھ کر اپنے ہاتھوں سے سجاد کو ناشتہ تیار کر کے دے گی مگر صبح وہ اٹھ ہی نہیں پاتی تھی۔ اس لئے کہ وہ اس قابل نہیں ہوتی تھی کہ بستر سے نکل سکے۔ ایک تو نیند کا غلبہ اس قدر شدید ہوتا تھا

کہ پلکیں بھاری ہو جاتی تھیں اور کھل ہی نہیں پاتی تھیں اگر نیند کا زور ٹوٹ بھی جاتا تھا اور خمار بھی کم ہو جاتا تو اس کا دِل بستر چھوڑنے کو نہیں چاہتا تھا۔ انگ انگ ٹوٹ رہا ہوتا۔ شب بیداری اور تھکن بستر کی آغوش میں پناہ ڈھونڈتی تھی۔ بستر کے گداز کی ساری نرمی اس کے وجود میں اتر جاتی تو وہ نیند میں ڈوب جاتی اور اس پر رات کا نشہ اور گہرا ہو جاتا تھا۔ رات جو بیاضِ عشق کھلتی تھی تو وہ تصور میں لہرانے لگتی تھی۔ آج حال پر اس کی بھرپور گرفت تھی۔ مستقبل کے سنہری امیدوں کے خزانے کی کنجی اس کے ہاتھ میں تھی۔ افضال احمد سے اس کی صرف ایک ملاقات ساتوں در کھولنے والی تھی۔ اب اس کا ہر قدم مستقبل پر مہر ضمانت ثبت کر سکتا تھا اور پھر یہ حسین زندگی آخری سانس تک اس طرح رواں دواں رہتی۔

شکیلہ چند لمحوں کے بعد بستر پر لیٹ گئی۔ اسے نیند آ رہی تھی۔ بستر پر بکھر سی گئی تو سجاد کمرے کی بتی بند کر کے بالکنی میں آ گیا۔ اس کے ذہن میں کتنے ہی خیال رینگ رہے تھے۔ طرح طرح کے خیالات کی یورش ہو رہی تھی اور وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔ کل کیا ہو گا؟ کل کیا شکیلہ' افضال احمد کو خوش کر کے پانچ لاکھ روپے کا آرڈر لے آئے گی؟ کیا افضال احمد پر شکیلہ کے حسن و شباب کا جادو چل جائے گا۔

بہت دیر کے بعد اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اسے ایش ٹرے میں مسل دیا جو بالکنی میں رکھی تپائی پر رکھی تھی۔ چاند اب عین بالکنی کے رُخ پر آ گیا تھا۔ چاندنی نہ صرف بالکنی میں چٹک رہی تھی بلکہ کمرے کے دروازے میں سے کمرے کے اندر جھانک رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا تو پورے کمرے میں چاندنی آبشار کی طرح پھوٹ پڑی تھی اور آسمان پر چاند' چاندنی کی بھٹی کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ پلنگ کی طرف بڑھا تو اس کی نظر شکیلہ پر پڑی جو بستر پر بے ترتیبی سے بکھری ہوئی سو رہی تھی۔ اس کا انگ انگ ڈھلی ہوئی چاندنی میں نہا رہا تھا اس کے سراپا میں جیسے چاندنی برس رہی تھی۔

شکیلہ شام پانچ بجے نہا کر عام سا جوڑا پہن کر سجاد کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ سجاد نے اس سے کہا تھا کہ وہ شام کے وقت اس کے لئے کچھ نئے جوڑے لے کر آ رہا ہے۔ جس میں سے ایک نیا جوڑا پہن کر اس کے ساتھ افضال احمد سے ملنے چلے گی۔ چھ بج رہے تھے۔ سجاد نہیں پہنچا تھا۔ وہ کئی بار بالکنی میں جا کر کھڑے ہو کر سجاد کی راہ تک کر کمرے میں آ چکی تھی۔ طرح طرح کے خیالات اس کو گھیر رہے تھے۔ سات بجے سجاد آیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ مگر وہ روٹھی رہی اور اس سے بات نہ کی تو سجاد نے کہا کہ کیا دیر سے

پہنچنے پر ناراض ہو گئی ہو؟

"یہ جو میں تمہارے لئے ملبوسات خریدنے گیا تو اس کے انتخاب میں بڑی تاخیر ہو گئی تھی۔" سجاد نے توقف کر کے ان ڈبوں کی طرف اشارہ کیا جو درجن بھر سے زیادہ تھے اور کھانے کی میز پر رکھے ہوئے تھے۔ اس نے غصے کے سبب نہ تو ان ڈبوں کے بارے میں پوچھا تھا اور نہ ہی انہیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ "مجھ سے دوسری بڑی غلطی یہ ہو گئی کہ میں نے تمہیں ساتھ نہیں لیا۔ اگر ساتھ لے لیتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ میری جان تو چھوٹ جاتی۔ بہرکیف اب کبھی ایسی سنگین غلطی نہیں کروں گا۔ کبھی عورتوں کے کپڑوں کی خریداری نہیں کروں گا۔ میں نے کان پکڑے اور تمہارے سامنے بھی اپنے کان پکڑتا ہوں۔" سجاد نے اپنے کان پکڑے تو بے اختیار شکیلہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

سجاد اس کے روبہ رو جا کر کھڑا ہوا۔ شکیلہ کے لئے فرار کی راہ نہ رہی تھی۔ وہ ایک ٹک شکیلہ کا چہرہ اس طرح دیکھنے لگا جیسے اسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ اس کی نظروں کی گرفت میں شکیلہ کا حسین چہرہ لہرا رہا تھا۔ یہ حسین چہرہ اس کے سوئے ہوئے ارمان کو جگا رہا تھا اور اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے آئینے کو آئینہ دکھا رہا ہے چہرہ' یہ صبیح اور حسین چہرہ فضا میں گیت کی طرح چمک رہا تھا اور صبح نشاط کی طرح مسکرا رہا تھا۔ وہ اسی چہرے کو تو افضال احمد کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔ یہ چہرہ ہی تو تھا جس پر خواب ناک زندگی کا سارا دار و مدار تھا۔ یہ چہرہ نہ ہوتا تو شاید وہ آج کفِ افسوس مل رہا ہوتا۔ سجاد اسے لے کر میز کی طرف بڑھا۔ میز کے قریب پہنچ کر اس نے بندھے ہوئے اور میز پر رکھے ہوئے گتوں کے خوبصورت ڈبوں میں سے ایک ڈبا کھینچ کر نکالا اور اس کی طرف بڑھایا تو شکیلہ نے اس کی اور پھر ڈبوں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "ان تمام ڈبوں میں تمہارے لئے ساڑھیاں ہیں۔" سجاد نے جواب دیا۔ "مگر ابھی ان ملبوسات کو دیکھنے کا وقت نہیں ہے۔ واپسی میں آ کر دیکھ لینا۔ ویسے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب تم ایسا کرو' یہ لباس تم جلدی سے پہن کر تیار ہو جاؤ۔ میں اتنی دیر میں نہا کر آتا ہوں۔ ہمیں ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے افضال احمد سے ملنے ہوٹل پہنچنا ہے۔"

سجاد اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے میں جا کر ملحق غسل خانے میں گھس گیا۔ وہ ڈبا لے کر خواب گاہ میں آئی اور بستر پر بیٹھ کر اسے کھولا تو اس کے اندر بے حد گہرے سیاہ رنگ کا لباس بڑی نفاست سے اور اس طرح تہہ کر کے رکھا ہوا تھا کہ اس پر شکن نہ پڑ جائے۔ یہ لباس جیسے ماتمی تھا۔ یہ ساڑھی تھی۔ اس ساڑھی کے ساتھ پہننے والی ہر چیز

ساڑھی کے رنگ ہی کی تھی۔ اس نے کھڑے ہو کر غسل خانے کی طرف دیکھا۔ پانی گرنے کا شور سنائی دے رہا تھا۔ سجاد پندرہ بیس منٹ سے پہلے نہیں آ سکتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بالکنی کا دروازہ بند کیا' پردے کھینچے۔ پھر سنگھار میز کے قد آدم آئینے کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

وہ ساڑھی اور بلاؤز پہن کر بڑی بے حجابی سی محسوس کر رہی تھی۔ وہ کراچی آ کر تقریباً روز ساڑھی پہن رہی تھی۔ اسے ساڑھی باندھنا حیدر آباد میں بھابی نے سکھایا تھا۔ مگر اس ساڑھی کے ساتھ کا جو بلاؤز تھا اس نے اپنی زندگی میں شاید ہی کسی کو پہنے دیکھا ہو۔ اگر دیکھا بھی تھا تو اسے خیال نہیں رہا تھا۔ بلاؤز بغیر آستین کا تھا۔ پشت کا حصہ بے حد کھلا ہوا جو چھپانا تھا وہی بے پردہ ہو رہا تھا۔ اس کی نظروں میں ارشد کا چہرہ ابھر آیا جو لباس کی طرح سیاہ تھا اور اس کے کانوں میں صبیحہ کے الفاظ گرم گرم سیسہ کی طرح پگھل رہے تھے۔ "دنیا میں ہر کالی چیز کی سفید چیز کے مقابلے میں بہت زیادہ قدر کی جاتی ہے۔ کالی سیاہی' کالا قلم' کالے بال' کالا فرنیچر اور کالے رنگ کی گاڑی اور کالے رنگ کا برقع اور پھر یہ کالی کالی آنکھیں جن پر دنیا کا ہر مرد مرتا ہے۔ یہ کالا رنگ ہی ہوتا ہے جو عورت کے حسن کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ کالے بادل ہی ہوتے ہیں جن کی اوٹ میں چاند کا حُسن نکھر جاتا ہے۔ تو پھر شکیلہ! ایک کالا مرد تمہاری زندگی کو خوبصورت کیوں نہیں بنا سکتا ہے؟ آخر تم میری بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہی ہو؟" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کانوں کو بند کر لیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ ساڑھی کا پلو کسی مرد کے پیر کی طرح پھسلتا فرش پر لہرا گیا۔

اسی وقت سجاد غسل خانے سے نکل کر آیا تھا۔ وہ دہلیز پر ٹھٹک کے رک گیا۔ اس نے سیاہ رنگ کے لباس میں شکیلہ کو ملبوس دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ یہ جسم تو سراسر اس کی ملکیت تھا۔ اس کی سرفرازی کی گواہی تھا۔ مگر اس نے ایسا جلوہ' ایسا روپ اور حُسن میں اس قدر وحشیانہ پن ان دو مہینوں میں نہیں دیکھا تھا۔ یہ جسم تو آج اس کے رگ و پے میں ایک طوفان سا اٹھا رہا تھا۔ خاموش اشاروں سے پکارتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ شکیلہ آئینے کے سامنے جس انداز سے کھڑی تھی وہ ہوشربا تھا۔

سجاد اپنے سینے میں اپنی سانسوں کو روکے دبے پاؤں اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب پہنچ کر اور کان کے قریب منہ لے جا کر بولا۔ "سبحان اللہ!"

شکیلہ بڑے زور سے اچھلی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور کانوں پر سے ہاتھ اٹھا کر

آئینے میں دیکھا تو اسے اپنی پشت پر سجاد کھڑا نظر آیا جو شوخ نظروں سے اس طرف دیکھ رہا تھا اور وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ شکیلہ نے اسے اس قدر خوش آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شادی کی پہلی رات بھی نہیں اور پھر اسے سجاد کی اس خوشی کی وجہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ کہیں وہ اس وجہ سے خوش تو نہیں ہو رہا ہے کہ وہ اس لباس میں بڑے غضب کی لگ رہی ہے۔ مگر اس میں اس قدر خوش ہونے کی کیا بات ہے۔ یہ کوئی نئی اور اچانک ظہور میں آنے والی بات تو نہیں ہے۔

شکیلہ نے اپنی ساڑھی کا پلو اٹھا کر سینے اور شانے پر درست کیا۔ وہ سجاد کی طرف گھوم کر بولی۔ "میں یہ لباس پہن کر افضال احمد سے ملنے نہیں جاؤں گی۔"

"کیا کہا..........؟" سجاد کے چہرے پر حیرت ابھر آئی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے شکیلہ کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا یہ لباس اس لائق ہے کہ اسے پہن کر میں افضال احمد سے ملنے جاؤں۔ یہ لباس مجھے پسند نہیں آیا ہے۔ میں یہ لباس اتار کر دوسرا لباس پہن رہی ہوں۔"

"کیا تم اس لباس کو معمولی لباس سمجھ رہی ہو؟" سجاد اب بھی ششدر ہو رہا تھا۔ "یہ ریشمی لباس دو ہزار روپے کا ہے جو میں نے اس شہر کی سب سے بڑی دکان سے خریدا ہے۔"

"میں اس قیمتی لباس کے واہیات پن کی بات کر رہی ہوں۔ کس قدر واہیات لباس ہے یہ؟"

"یہ لباس واہیات ہے؟" سجاد دنگ رہ گیا۔ "اس لباس میں کیا واہیات پن ہے؟ آخر لباس میں کبھی واہیات پن ہوتا ہے شکیلہ!" اس نے شکیلہ کا سر تا پا جائزہ لیا۔ "تم اس لباس میں کس قدر حسین لگ رہی ہو شاید تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہو رہا ہے۔ اس سیاہ رنگ کے لباس نے تو تمہیں دو آتشہ بنا دیا ہے۔ تمہارا حسن قیامت برپا کر رہا ہے۔ فتنے جگا رہا ہے۔ پھر بھی تم اس لباس کو واہیات کہہ رہی ہو؟ کیا تمہیں یہ رنگ پسند نہیں ہے؟ اگر یہ رنگ پسند نہیں ہے تو پھر اس لباس کو اتار دو ان ڈبوں میں مختلف رنگوں کے لباس ہیں ان میں سے اپنے لئے کوئی اور لباس نکال لو۔ مگر یہ بھی گہرے رنگ کے لباس ہیں۔ گہرا نیلا' عنابی' اور اور..........."

شکیلہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ "کالا رنگ تو مجھے پسند ہے اور یہ دوسرے رنگ بھی پسند ہیں۔ کیا یہ دوسرے تمام لباس ساڑھیاں ہیں؟"

"ساری کی ساری ساڑھیاں ہیں۔" سجاد نے جواب دیا۔ ایک عورت کی شان اور آن ساڑھی جیسا لباس پہننے میں ہے۔ تقریبات میں ساڑھیاں پہن کر جانا زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ اس لباس میں جو وقار ہے وہ کسی اور لباس میں نہیں ہے۔ اس لئے میں صرف ساڑھیاں لے کر آیا ہوں۔ یہ سارے پارٹی ڈریس ہیں۔"

"ان ساڑھیوں کے ساتھ جو بلاؤز ہیں کیا وہ بھی اس بلاؤز کی طرح بغیر آستین اور نیچی تراش کے ہیں؟" شکیلہ نے نظریں نیچی کر کے پوچھا۔

"ہاں!" سجاد نے جواب دیا۔ "ان ساڑھیوں کے ساتھ جو بلاؤز ہیں وہ سب ایک ہی ناپ اور سائز کے ہیں۔ کیوں کیا ہوا؟"

"میرا جی چاہ رہا ہے کہ یہ لباس جسم سے نوچ کر سڑک پر پھینک دوں۔ اس لباس اور بلاؤز نے مجھے چھپانے کی بجائے بے لباس کر کے رکھ دیا ہے۔"

"اوہ!" سجاد اس کی بات کی تہہ میں پہنچ کر مسکرایا۔ "تو تم اس بلاؤز کی وجہ سے نروس ہو رہی ہو۔ مگر جانی!" سجاد نے اسے شانوں سے تھام لیا۔ "تم نے چوں کہ پہلی بار بغیر آستین کا بلاؤز پہنا ہے اس لئے ایسا محسوس کر رہی ہو۔ ویسے تم ہو بڑی عجیب سی چیز دنیا کی ہر عورت اور ہر جوان لڑکی اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتی ہے اور کر رہی ہے۔ وہ لباس کی تراش خراش پر سب سے زیادہ زور صرف اس لئے دیتی ہے کہ اس کے حسن اور جسم کی زیادہ سے زیادہ نمائش ہو۔"

شکیلہ ذہنی طور پر اس لباس کو پہن کر جانے کے لئے تیار نہ تھی۔ مگر سجاد نے اسے کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد سجاد کے ساتھ باہر نکلی تو بڑی نروس سی ہو رہی تھی۔ راستے میں سجاد اس کے ذہن کو دوسری طرف متوجہ کرنے کے لئے اسے افضال احمد کے بارے میں بتا رہا تھا کہ وہ شخص دولت' رتبے اور حیثیت کے لحاظ سے کتنا بڑا آدمی ہے۔ اسے افضال سے کس طرح پیش آنا چاہئے۔ بات کرنا چاہئے۔ ڈنر کے بعد شاید ڈانس کا پروگرام دیکھنے بھی جائیں۔ وہاں ایک دو گھنٹے بیٹھ کر ترکی کی حسین رقاصاؤں کا رقص بھی دیکھیں۔ افضال احمد شاید شراب کی پیشکش کرے۔ تم یہ کہہ کر ٹال دینا کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

"کیا افضال احمد شراب بھی پیتے ہیں؟" وہ اچھل سی پڑی۔ "تم مجھے ایک شرابی سے ملوانے لے جا رہے ہو؟" وہ ہونق ہو رہی تھی۔

شکیلہ نے اس کی بات سن کر کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ شکیلہ گم صم سی بیٹھی رہی تھی

جیسے اس کی بہت ہی قیمتی شے کہیں کھو گئی یا کسی انجانے خیالوں میں گم ہو گئی ہو اور اب سب کچھ بھول گئی ہو۔ اس کی نظریں سڑک پر جمی تھیں۔ تاہم سجاد کی نظروں سے شکیلہ کے بدن کا ارتعاش چھپا نہ رہ سکا تھا۔ یہ ارتعاش تو اس کے دھڑکتے سینے کا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ شکیلہ کا دل یہ سوچ سوچ کر خوف سے کانپ رہا ہو گا کہ وہ ایک شرابی شخص سے کس طرح ملے۔ کس طرح بات کرے۔ شرابی لوگ اچھے نہیں ہوتے ہیں۔ اس کے حواس بھی منتشر ہو رہے تھے۔ جیسے وہ کسی آزمائش میں اپنے آپ کو محفوظ نہ پا رہی ہو۔

ان دونوں کے درمیان ایک سناٹا دیوار بن گیا تھا۔ سجاد نے کچھ کہا اور نہ ہی شکیلہ کے بھرے بھرے سرخ و گداز ہونٹوں میں جنبش ہوئی تھی۔ البتہ اس کی نظروں کو قرار نہ تھا۔ کبھی سامنے کی طرف اٹھ جاتی تھیں اور کبھی بائیں طرف اور پھر جیسے چاروں طرف منڈلانے لگتی تھیں۔ اسے جیسے لحہ بہ لحہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ انجانے راستہ پر بھٹک کر کہیں جا رہی ہے۔ کہاں جا رہی ہے اسے خود نہیں معلوم ہو۔

کیا یہی میری منزل ہے؟ شکیلہ نے گہری سانس لی۔ منزل کہاں ہوتی ہے؟ منزل کہاں نہیں ہے؟ منزل تو شاید موت ہوتی ہے۔ منزل تو کبھی نہیں ملتی ہے۔ بس منزل کے لئے چلتے رہنا پڑتا ہے۔ زندگی کیا ہے؟ ایک لمبے سفر کا نام ہے اور اس میں تو بہت کچھ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک پڑاؤ آتا ہے۔ پھر دوسرا پڑاؤ آتا ہے۔ پچھلا سب کچھ چھوٹ جاتا ہے۔ پھر ایک نیا پڑاؤ ملتا ہے۔ پچھلے کو یاد رکھنا بے وقوفی ہے اور نئے کے بارے میں فکر مند ہونا زندگی کی سب سے بڑی بھول ہے۔ بس چلنا اور چلنا ہے۔ اگر یہ چلنا رک گیا تو کتنی تکلیف ہو گی۔ زندگی کی یکسوئی سے بڑھ کر مصیبت اور کیا ہو سکتی ہے۔ اگر سجاد اسے نئے لوگوں اور نئے ماحول سے متعارف کرا رہا ہے تو اس میں ایسی پریشانی' خوف اور بدگمانی کی کیا بات ہے۔ زندگی کے سفر میں تو ہر قسم کے مسافروں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ مگر اس نے تو سوچا تھا کہ وہ ایک مرد کی تصوراتی بیوی' محبوبہ اور عورت بنے گی۔ عورت اپنی زندگی اور شوہر کے بارے میں بچپن اور جوانی سے لے کر اور ازدواجی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے جتنا سوچتی ہے مرد شاید اس کا عشر عشیر بھی اپنی محبوبہ اور بیوی کے بارے میں نہیں سوچتا ہے۔ مگر ہر مرد یہ ضرور سوچتا ہے کہ اس کی بیوی ایثار و قربانی کا مجسمہ ہو۔ کیا عورت کا حقیقی روپ یہی ہے۔ کیا وہ اس لئے سجاد کی بات پر عمل کر رہی ہے؟ کیا وہ سجاد کے لئے اپنی خواب ناک زندگی کے لئے زینہ بن رہی ہے؟

سجاد تنقیدی نظروں سے ایک بار پھر شکیلہ کا جائزہ لے رہا تھا۔ کنکھیوں سے اس کی

طرف دیکھ لیتا تھا۔ اس لئے کہ اب ہوٹل قریب آ گیا تھا۔ وہ ایسا ظاہر کر رہا تھا کہ جیسے وہ سڑک پر نظریں رکھے گاڑی چلا رہا ہو۔ کھڑکی کا شیشہ اترا ہوا تھا۔ شکیلہ کا چہرہ بلب کی طرح ایک لمحے کے لئے روشن ہوتا تھا اور دوسرے لمحے بجھ جاتا تھا۔ اس کے چہرے پر فکرمندی کی لکیر بدلیوں کی طرح چھا جاتی تھی جیسے بدلیاں جو کبھی چاند پر چھا جاتی ہیں اور کبھی چاند ان پر‘ شکیلہ کی آنکھیں بھٹکی ہوئی تھیں اور چہرے پر خوابیدگی طاری تھی‘ شہابی رنگت پر ایک دھند سی غالب آ جاتی تھی پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہی تھی۔ وہ کہاں جا رہی ہے؟ کیوں جا رہی ہے؟ کہیں یہ افضال احمد کوئی بھیڑیا تو نہیں ہے۔ وہ کسی شکاری کے پنجے میں تو نہیں جکڑ جائے گی۔ کہیں اس کا سبھی کچھ تو لٹ نہیں جائے گا؟

چوڑی سڑک پر شیورلیٹ بڑی تیزی سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ کھڑکی سے اندر آتی ہوئی سبک خرام ہوا بار بار شکیلہ کے ریشمی آنچل کو گرا رہی تھی۔ ساڑھی کا پلو بار بار سجاد کی گود میں آ کر گرتا تھا۔ سجاد اس کی طرف دیکھتا تو اسے بجلیاں سی کوندتی نظر آتی تھیں۔ قیمتی پرفیوم کی خوشبو اس کے دل و دماغ پر چھا رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کامیابی اس کے قدم چوم رہی ہے۔ وہ تصور میں دیکھ رہا تھا کہ افضال احمد‘ شکیلہ کے ساتھ مل کر اپنے ہوش میں نہیں رہا ہے۔ شکیلہ کی آنکھیں افضال احمد پر کتنے مہ و جام لٹا رہی ہیں۔ وہ ہر نظر میں ان نشیلی آنکھوں کا دیوانہ بنتا جا رہا ہے۔ افضال احمد شکیلہ کی پلکوں کی گھنی چھاؤں میں پہنچ کر جیسے کسی سکون کے ڈیرے پر پہنچ گیا ہے اور بڑی بڑی بے حد پُرکشش آنکھیں افضال احمد کو لبھا رہی ہیں‘ تڑپا رہی ہیں۔

ہوٹل کے پارکنگ لاٹ پر پہنچ کر شکیلہ نے دیکھا کہ اس جگہ پر کاروں کا قافلہ سا ہے۔ ایک سے ایک خوبصورت اور قیمتی کاریں نظر آ رہی تھی۔ سجاد نے کار کا دروازہ مقفل کر کے ایک کار کی طرف اشارہ کیا۔ ان کاروں میں وہ سب سے خوبصورت اور سب سے قیمتی اور سب سے لمبی کار تھی۔ "جانتی ہو کہ یہ کس کی کار ہے؟" سجاد نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ بولا۔ "افضال احمد کی۔"

شکیلہ کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ ایک عجیب سی کیفیت اس کے بدن میں بجلی کی لہر کی طرح پھیل گئی تھی۔ خون کی روانی دماغ پر چڑھ آئی تھی‘ نس نس میں خون برف کی طرح سرد ہو رہا تھا۔ ہوٹل کی پُرشکوہ عمارت اس کی نظروں کے سامنے دھندلا رہی تھی۔ اس نے ساڑھی کے پلو کو سینے اور شانے پر اس طرح سے لپیٹ لیا کہ اب بے حجابی

نہیں رہی تھی۔ سجاد نے یہ دیکھا تو چونک کر تند لہجے میں بولا۔ "شکیلہ یہ کیا ہے‘ یہ تم نے کیا کیا؟"

وہ سجاد کی بات کچھ نہیں سمجھی تھی۔ اس نے حیرانی سے اس کی شکل دیکھی۔ "میں نے کیا کیا ڈیئر!" اس کی آواز مرتعش ہو رہی تھی۔

"یہ تم نے بڑی بوڑھیوں کی طرح ساڑھی کا پلو لپیٹ کیوں لیا ہے۔ آج کی عمر رسیدہ عورتیں بھی اس طرح پلو نہیں اوڑھتی ہیں۔"

وہ کسی کند ذہن شاگرد کی طرح اس کی صورت تکتی رہی۔ چند لمحے بعد اس کی سمجھ میں آیا تو وہ حیرت سے بولی۔ "کیا میں بے حجاب ہو کر چلی آؤں؟"

"اس میں بے حجابی کی کوئی بات نہیں ہے شکیلہ!" سجاد نے اسے بڑے پیار‘ نرمی اور ملائمت سے سمجھایا۔ "یہ فیشن ہے اور پھر تم کسی محفل میلاد میں نہیں جا رہی ہو جو تم نے ایک ملانی کا بہروپ اختیار کر لیا ہے۔ تم ایک اعلیٰ قسم کے بزنس مین کی حیثیت سے جا رہی ہو۔"

"کیا کوئی بھائی اپنی بہن کو‘ کیا ایک شوہر اپنی بیوی کو نیم عریاں حالت میں کسی دوسرے کے سامنے پیش کرتا ہے؟" شکیلہ نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"تم کوئی نیم عریاں حالت میں تو نہیں ہو۔" سجاد نے اپنے آپ پر جبر کر کے اپنے غصے کو سرد کیا۔ "اس طرح فیشن کا لباس پہننے کا مقصد ہی فوت ہو کر رہ جائے گا۔ اگر حسین چہرہ ہی سفارش ہوتا تو پھر میں تمہیں یہاں کیوں لاتا؟ میں تمہاری کوئی رنگین تصویر لا کر افضال احمد کی میز پر رکھ دیتا۔ تمہیں افضال احمد کو اپنی باتوں ہی سے نہیں اپنی ذات سے اپنے سراپا سے اور اپنے حُسن سے متاثر اور مسحور کرنا ہے۔ تمہارا متاثر کرنا ہی کامیابی کی نشانی ہے۔"

پارکنگ لاٹ پر ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ شکیلہ نے کچھ سوچ کر ساڑھی کا پلو شانے اور سینے پر سے اس طرح گزارا کہ اس نے جو کچھ چھپایا تھا وہ بے پردہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بے لباس سا محسوس کر رہی تھی۔ جبھی سجاد نے خوش ہوتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے اپنی جیب سے ہیروں والا بروچ نکالا۔

"یہ بروچ میں تمہیں دینا بھول گیا تھا۔ چلو‘ اب اس بروچ کو لگا لو۔ اس طرح ساڑھی کا پلو بار بار نہیں پھیلے گا۔ چلو‘ لاؤ‘ میں ہی لگا دیتا ہوں۔"

سجاد نے اس کے شانے پر جڑاؤ بروچ لگا دیا۔

پارکنگ پلاٹ سے نکل کر اس نے ہوٹل کے بیرونی دروازے کی طرف قدم بڑھائے تو اس کے دماغ میں بھن سے اجالے پھیل گئے تھے۔ پھر اس نے کتنی ہی لڑکیوں اور عورتوں کو دیکھا جن کے جسموں پر لباس تکلف کا کام دے رہا تھا۔ اگر ان کا بس چلتا تو شاید وہ اپنے جسموں پر لباس کے بجائے صرف دھجی ہی رہنے دیتیں۔ اسے ایسا لگا کہ اس حمام میں سبھی ایک جیسے ہیں۔ ایک طرح کے ہیں۔ پھر اسے شرمانا' لجانا اور جھجکنا کیا؟

نو بجنے میں چند منٹ باقی تھے افضال احمد سجاد اور اس کی اس بہن کے انتظار میں پیاز کی طرح سوکھ رہے تھے جس کی تعریف میں سجاد نے زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے تھے۔

وہ پانچ ستاروں والے ہوٹل کے وسیع و عریض اور بہت ہی حسین ہال میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہال میں مدھم سپید سی چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ جس طرح سجاد وجیہہ خوبصورت اور اسمارٹ ہے اس طرح اس کی بہن بھی حسین ہو گی۔ ایک ہی سانچے میں ڈھلی ہوئی چیز ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ وہ یہ خیال دل کے نہاں خانے سے نکال لائے تھے اس خیال نے ان کی اضطرابی کیفیت میں اور شدت پیدا کر دی تھی۔ انتظار بڑا جان لیوا ثابت ہو رہا تھا۔ ابھی اس اندیشے کا کوئی جواز نہیں تھا کہ سجاد اور اس کی حسین و جمیل بہن شکیلہ نہ آئے۔ انتظار کے بے رحم لمحات ان کے اعصاب پر سوار تھے۔ ان کے لئے عورت کوئی نئی چیز نہیں تھی وہ اس میدان کے پرانے اور شاطر کھلاڑی تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے رتبے' حیثیت اور دولت سے فائدہ اٹھایا تھا اور پھر مہکتی ہوئی کلیاں ان کی کمزوری تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ تصوراتی عورت کا اس زمین پر وجود نہیں ہے وہ عورت تو شاعری' کہانیوں اور فلموں میں نظر آتی ہے۔ ساری دنیا کا یہی حال ہے۔ کوئی دولت پر مرتی ہے' کوئی حیثیت پر اور کوئی بینک بیلنس پر۔ عورت کی سب سے بڑی کمزوری دولت ہوتی ہے۔

ہال میں رونق شباب پر تھی۔ لڑکیوں اور عورتوں سے ہال بھرا ہوا تھا۔ میزیں بھری ہوئی تھیں۔ لڑکیاں اور عورتیں آ جا رہی تھیں۔ حسن و شباب کا دریا جیسے بہہ رہا تھا۔ فضا میں ان کے قہقہوں کے سُر گونج رہے تھے۔ آواز کا رس گھل رہا تھا۔ آنچل لہراتے تو بجلیاں کوند جاتی تھیں۔ تھرکتے جسموں کا لوچ افضال احمد کی آتشِ شوق اور بھڑکا رہا تھا۔ ہال میں خوابوں کی پریاں گھومتی پھرتی نظر آ رہی تھیں۔

معاً ان کی بے قرار نگاہیں ہال کے دروازے کی طرف اٹھیں تو ان پر سکتہ سا چھا گیا تھا۔ سجاد نے ان سے غلط نہیں کہا تھا مبالغہ سے کام نہیں لیا تھا اور پھر ان کا تصور بھی خود

فریبی نہ تھا۔ واقعی سجاد کی بہن' سجاد کی طرح حسین تھی۔ وہ چاند چہرہ تھی۔ آسمان کا چاند اس ہوٹل کے ہال میں جیسے جگمگا رہا تھا۔ چند لمحوں کے لئے ہال پر سناٹا سا چھا گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ ہر کوئی شکیلہ کی طرف ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔

ایک عورت کا سراپا کسی دہکتے ہوئے آتش فشاں کی طرح ہوتا ہے۔ سراپا ہی عورت کو مرد کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ افضال احمد اس کا سراپا دیکھ رہے تھے۔ شکیلہ کے سراپا میں نغموں کی روانی سی محسوس ہو رہی تھی۔ شاعر کا تخیل بھی شاید اس جوبن کی اٹھان تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

سجاد شکیلہ کو ساتھ لے کر ان کی میز پر پہنچا تو افضال احمد رعب حسن سے کھڑے ہو گئے۔ وہ آج تک کسی حسین سے حسین لڑکی کے لئے اس طرح مرعوب اور متاثر ہو کر اس کے استقبال کے لئے کھڑے نہیں ہوئے تھے۔ "آداب" تعارفی رسم سے پہلے ہی شکیلہ کی آواز میں جو بلا کا رس تھا اُن کے کان میں ٹپک پڑا تھا۔

"میری بہن مس شکیلہ خانم ہیں!" سجاد نے بڑی آہستگی سے تعارف کی رسم ادا کی تھی۔ "یہ میرے کرم فرما' میرے دوست اور میرے محسن مسٹر افضال احمد ہیں۔ جن کا ذکر میں تم سے اکثر و بیشتر کرتا رہا ہوں اور تم بھی اکثر ان سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتی رہی تھیں۔ چلئے' آخر ملاقات ہو ہی گئی۔"

شکیلہ کو سجاد کی زبان سے پہلا جملہ سن کر ایسا لگا کہ کسی مہتر نے اپنی ٹوکری کی ساری غلاظت اس کے وجود پر انڈیل دی ہو۔ رشتے کی ساری پاکیزگی اس گندگی کی تہہ میں ڈوبتی جا رہی ہو۔ افضال احمد نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے اس کی طرف بڑھایا تھا۔ "مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔" وہ بڑی سنجیدگی سے مسکرایا تھا۔

شکیلہ نے بڑی بے دلی اور جبر کر کے اپنا ہاتھ افضال احمد کی طرف بڑھایا تھا۔ افضال احمد سے ہاتھ ملاتے وقت اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے ہاتھ میں کسی سانپ کا منہ آ گیا ہو۔ ادھر افضال احمد کو ایسا محسوس ہوا کہ ان کا ہاتھ کسی جلتے ہوئے توے پر پڑ گیا ہو۔

"تشریف رکھئے۔" افضال احمد نے بڑی شائستگی سے کہا۔

شکیلہ نے پہلی ہی نظر میں افضال احمد کا جائزہ لے لیا تھا۔ اس کے تصور خانے میں ایک شخص دبکا بیٹھا تھا جس کی عمر پچاس برس کی ہو گی۔ اس کے چہرے کی رنگت اور جھریاں اس کی عمر کی گواہی دے رہی ہوں گی۔ کچھ عجیب سی اکھڑ اور خشک مزاج سی شخصیت ہو گی۔ اس کی آواز میں' باتوں میں گرمی نہیں ہو گی۔ بہت ہی ٹھنڈے مزاج کا

اور شاید بارعب بھی ہو گا۔ ایسا آدمی تو حسین اور جوان لڑکیوں اور پُرشباب عورتوں کو دیکھ کر آنکھیں ہی سینک سکتا ہے۔ مگر افضال احمد تو نہاں خانے کی اس تصویر سے یکسر مختلف تھا۔ عمر چالیس برس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ صحتمند بدن کا تھا۔ نکلتا ہوا قد تھا۔ بارعب شخصیت تھی۔ وجاہت بھی تھی۔ سب سے بڑھ کر وہ دولتمند اور ایک اعلیٰ فرم کا مالک تھا اور چرب زبان بھی لگ رہا تھا۔

افضال احمد نے ویٹر کو پُرتکلف کھانے کا آرڈر دیا۔ جب ویٹر چلا گیا تو وہ بولے۔ "خدا کی شان ہے۔ دونوں بہن بھائیوں کو اس نے کس فیاضی سے حسن و جمال کی دولت سے نوازا ہے۔ مَیں نے ہزاروں اور لاکھوں بہن بھائیوں کو دیکھا ہے مگر آپ جیسے خوبصورت بہن بھائی نہیں دیکھے۔"

شکیلہ کو ایسا لگا تھا کہ افضال احمد نے اس کے منہ پر جوتا کھینچ کر دے مارا ہو۔ اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ کان سائیں سائیں کرنے لگے۔

"ویسے ہم دونوں میں بہن بھائیوں جیسی مشابہت بالکل نہیں ہے۔ اکثر لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں کہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔" سجاد مسکرایا۔

یہ دوسرا جوتا تھا جو اس کے وجود پر آ کر لگا تھا۔ مگر وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی تھی۔ اس نے رات ہی سجاد سے کہہ دیا تھا کہ کسی طرح سے بھی گفتگو میں بہن بھائی کا لفظ نہ آنے پائے۔ بہن بھائی کے موضوع پر سرے سے گفتگو ہی نہ کی جائے۔ مگر سجاد کو کوئی خیال ہی نہ رہا تھا۔ مگر یہ لفظ آ رہا تھا اور جوتا بن کر اس کے وجود پر لگ رہا تھا اور اس کے اندر خون کھول رہا تھا۔

افضال احمد کو تو ہر لمحے پر کسی رنگین خواب کا دھوکا ہو رہا تھا۔ وہ ہال میں بکھری ہوئی ملگجی سبز روشنی میں شکیلہ کو اس طرح بے نیاز سا ہو کر دیکھ رہا تھا جیسے یہ مورتی اس نے خرید لی ہو۔ وہ کسی حسین مورتی سے کم نہ تھی۔

شکیلہ کو افضال احمد کی ندیدی نظروں کی کوئی پرواہ نہیں تھی جو اس کے بدن پر زہریلی سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنے آپ کو جیسے سمجھایا تھا کہ وہ یہ سب اپنے محبوب شوہر اور اس کی خوشنودی کی خاطر کر رہی ہے۔ وہ آج جو اذیت سہہ رہی ہے وہ اپنی محبت' آسائش اور خواب ناک زندگی کے لئے' اس زندگی کے لئے جس کے خواب وہ بچپن ہی سے دیکھتی چلی آ رہی تھی۔ اس زندگی کے لئے جس کی اسے اور اس کے سجاد کو ضرورت تھی۔ کسی چیز کا پانا آسان بھی تو نہیں ہوتا ہے۔ اس نے

اپنے آئیڈیل کو پانے کے لئے اپنے گھر والوں کو کھو دیا۔ اگر خواب ناک زندگی پانے کے لئے کچھ وقت افضال احمد کے ساتھ گزر رہا ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔

شکیلہ کے لئے یہ لمحات بڑے بے رحم اور کرب ناک تھے۔ افضال احمد کی قربت اس کے لئے سوہانِ روح بن گئی تھی۔

کھانے کی میز پر بہت ساری ڈشیں سجی ہوئی تھیں۔ افضال احمد نے اتنا سارا پُرتکلف کھانا آرڈر دے کر منگوا لیا تھا جو چھ سات دنوں اور کئی آدمیوں کے لئے بھی بہت تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو وہ ان انواع و اقسام کے کھانوں کو بڑی رغبت سے کھاتی۔ مگر اب کوئی خواہش اور رغبت ہی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ان کھانوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ اکھڑی سی ہو گئی تھی۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ افضال احمد کی نظروں سے دور ہو جائے۔ گھر چلی جائے۔ اسے افضال احمد کی بڑی بڑی لال آنکھوں سے بڑا خوف آ رہا تھا۔ وہ ایک عورت ہونے کے ناتے ان نظروں کو خوب سمجھتی تھی۔ مگر وہ مجبور تھی۔ اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ان آنکھوں کو پھوڑنا تو درکنار اسے ان حرکتوں سے باز بھی تو نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ افضال احمد تو اس سے ضرورت سے زیادہ متاثر اور مسحور ہو گیا ہے۔ اس کے شوہر کا منشا پورا ہو گیا ہے۔ اب تو سجاد کو لاکھوں روپے کا آرڈر مل جائے گا۔ وہ آرڈر جس کے حصول کے لئے تلوار کو نیام سے باہر آنا پڑتا تھا۔

محفل کے آداب کے طور پر اسے کھانے میں شریک ہونا پڑا تھا اور ساتھ دینا پڑا تھا۔ افضال احمد میزبانی کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ وہ اسے زبردستی کھلا رہا تھا۔ بڑے اصرار سے' محبت کے والہانہ انداز سے' افضال احمد نے تو سجاد کی موجودگی کو یکسر نظرانداز کر دیا تھا۔ جیسے کھانے کی میز پر اس کا وجود ہی نہ ہو۔ بس وہ دونوں ہی موجود ہوں اور دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوں۔ شکیلہ اسے بار بار روکتی تو دونوں کے ہاتھ ٹکرا جاتے تھے۔ افضال احمد کو ایسا لگتا تھا کہ ان کا ہاتھ بجلی کی ننگی تار سے ٹکرا رہا ہے۔ ان کے ہاتھ کو جھٹکا سا لگتا تو اس جھٹکے کا اثر ان کی رگ رگ میں اتر جاتا تھا۔ انہوں نے خود کیا کھایا کچھ یاد نہیں تھا۔ انہیں کھانے کی ضرورت نہ تھی اور نہ ہی وہ کھانے کے لئے بیٹھے تھے۔ وہ تو شکیلہ کو کھلانے کے لئے بیٹھے تھے۔

کھانے سے فراغت پانے کے بعد کوئی ایک گھنٹے کے بعد افضال احمد ان دونوں کو ساتھ لے کر ہوٹل کی چھت پر آ گئے تھے۔ وہاں روف گارڈن تھا۔ رقص کا پروگرام

ہونے والا تھا۔ ترکی کی حسین و جمیل رقاصائیں اپنے فن کا کمال پیش کرنے والی تھیں۔
ہال کی تمام میزیں لڑکیوں' عورتوں اور مردوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ شراب اور مشروبات کے دور چل رہے تھے۔ شکیلہ کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ لڑکیاں اور عورتیں نہ صرف جسمانی طور پر آزاد ہو گئی تھیں بلکہ شراب کی رسیا بھی نظر آ رہی تھیں۔ اس نے کبھی کسی لڑکی یا عورت کو شراب پیتے نہیں دیکھا تھا۔ مگر آج دیکھ رہی تھی۔ حیرت کے دریا میں غرق ہو رہی تھی۔ اس سے صبیحہ نے سچ ہی کہا تھا۔ یہ دنیا ایسی نہیں ہے جیسے نظر آتی ہے۔

افضال احمد نے پہلے ہی سے اپنی میز اسٹیج کے قریب اور بہت ہی اچھی جگہ پر بک کرائی ہوئی تھی۔ میز کے قریب پہنچ کر تینوں رک گئے تھے۔ کیونکہ ویٹر میز پر سے ریزرو کی تختی اٹھا رہا تھا۔ میز کے قریب پہنچ کر افضال احمد ایک لمحے کے لئے کہیں اور پہنچ گئے تھے۔ شکیلہ ان کے اس قدر نزدیک کھڑی تھی کہ چند انچ ہی حائل تھے۔ وہ حیرت اور محویت سے ہال کے ماحول کا جائزہ لے رہی تھی اور وہ اس کے شگفتہ چہرے کو دیکھ رہے تھے جس کی تازگی عجب بہار دے رہی تھی۔ ہال کی ملگجی روشنی میں وہ رنگین شعلے کی مانند دہک رہی تھی اور تصور سے بھی زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھی۔ انگاروں کی طرح دہکتے ہونٹ شگفتہ تر تھے۔ سیاہ ساڑھی میں قیامت کی پھبن تھی۔ اس قدر قریب کھڑی شکیلہ انہیں کچھ اور ہی نظر آ رہی تھی۔ لفٹ خراب ہونے کی وجہ سے انہیں سیڑھیاں چڑھ کر آنا پڑا تھا۔ اس کی وجہ سے شکیلہ کا دم پھولا ہوا تھا۔ اس کے سپی جیسے باریک نتھنے بار بار پھڑک رہے تھے۔ ویٹر نے کرسی کھینچ کر شکیلہ کو بیٹھنے کے لئے کہا تو شکیلہ کو خبر ہی نہ ہو سکی وہ تو ہال کے طلسم کی اسیر ہو کر رہ گئی تھی۔ لڑکیوں اور عورتوں کو دیکھنے میں محو تھی۔

رقص شروع ہونے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی۔ شکیلہ اس دنیا کو دیکھ رہی تھی جو اس کے لئے بالکل نئی تھی۔ سارے ہال میں خواب کا سا منظر تھا۔ جیسے یہ راجہ اندر کی کوئی سبھا ہو۔ یہاں ہر شخص خوش نظر آ رہا تھا۔ بہت ہی خوش تھا جیسے اسے جہان بھر کی دولت مل گئی ہو۔ ان کے چہروں سے اسے ایسا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لوگ ہر لمحہ خوش رہنا چاہتے ہیں ان کے نزدیک اداس اور مغموم ہونا بہت بڑا گناہ ہے۔ انہیں نہ ماضی کا خیال ہے اور نہ مستقبل کی بھیانک فکر اور پریشانی لاحق رہتی ہے۔ وہ حال کی مرمریں' گداز اور کیف آور بانہوں میں بانہیں ڈال کر سرشار ہو جاتے ہیں۔ ہر لمحے کا مزہ لوٹنے کے لئے ان کے دل و دماغ میں کوئی الجھن نہیں ہے۔ کوئی خوف نہیں ہے اور یہ اس معاشرے میں

انہیں کسی مذہبی اصولوں' احکام اور سماجی بندھنوں سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ یہاں سماج کی پرچھائیں تک نہیں ہیں۔ وہ صرف خوشیوں کو پانے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ صرف خوشیوں کے لئے جی رہے ہیں۔ ہال میں بکھرا ہوا اندھیرا شکیلہ کو بڑا پُرسکون اور بڑا ہی دلفریب محسوس ہو رہا تھا۔ دبی دبی روشنی کسی شریر بچے کی طرح ہنستی اور مسکراتی نظر آ رہی تھی۔ پہاڑی جھرنوں کے انداز میں بجنے والی موسیقی بہت ہی ہلکی ہلکی سی سنائی دے رہی تھی۔ موسیقی کی دھنوں نے ماحول کو اور خواب ناک بنا دیا تھا اور پھر ان لڑکیوں اور عورتوں کے ترنم خیز قہقہے اور ریشمی آواز میں ڈوبی سرگوشیاں' ہال جو جنت کا گوشہ لگ رہا تھا۔ یہ ماحول تو برسات کی نمی کی طرح اس کی نس نس میں سما رہا تھا اور وہ اپنے آپ کو ماحول میں جذب ہوتا محسوس کر رہی تھی۔

افضال احمد نے محسوس کر لیا تھا کہ شکیلہ ان لڑکیوں میں سے نہیں ہے جو دولت اور رتبے کو دیکھ کر فوراً ہی کسی برف کے تودے کی طرح پگھل جاتی ہیں' اس میں پندار حسن ہے۔ عورت جانتی ہے کہ اسے مرد کو تڑپانے کے لئے کون سے حربے آزمانے چاہئیں۔ وہ اپنے آپ کو فوراً ہی نیچے نہیں گراتی ہے۔ کسی پکے پھل کی طرح مرد کی جھولی میں نہیں گرتی ہے۔ اپنے آپ کو آسانی سے نہیں بلکہ بڑے حیلے بہانے' ترسانے اور تڑپانے کے بعد' اپنے آپ کو بے حد مجبور و بے بس پانے کے بعد حوالے کرتی ہے۔ شکیلہ ان کے پہلو میں بیٹھی تھی مگر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ان سے بہت دور ہے۔ ان کے ہاتھ میں شکیلہ کے بدن کے لمس کے سرور کی لہر اب بھی دوڑ رہی تھی ہاتھوں کی زبان سے اس کی لذت بندھی ہوئی تھی۔ ان کا وجود گو ماحول میں ڈوبا ہوا تھا اور اسے یہ تاثر دے رہے تھے کہ وہ کہیں کھوئے ہوئے سے ہیں مگر ان کا یہ انداز پھر بھی ایک بے جان بت کا سا نہ تھا۔ اور پھر انہیں شکیلہ کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ مگر وہ آنکھوں سے دیکھنے کے بجائے جسم سے محسوس کر رہے تھے۔ ان کا ہر مسام آنکھ بن گیا تھا۔ حواس جیسے سو گئے تھے۔ مگر حسیات تو جاگ رہی تھیں۔ وہ چند لمحے پہلے تو اس لمس سے نا آشنا رہے تھے۔ مگر اب وہ اس لمس میں اپنے وجود سمیت ڈوب چکے تھے۔ اب وہ اس پھول کی طرح تھے جو اپنی نرم و نازک پتیاں بانہوں کی طرح پھیلا پھیلا کر ہوا کی ہر لہر کا سرور اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔

اسٹیج کا پردہ گرا تو تالیوں کے شور نے ہال کو سر پر اٹھا لیا تھا۔ ہال میں پھر وہی ملگجی روشنی کا جال پھیل گیا۔ افضال احمد نے محسوس کیا کہ شکیلہ رقص کو دیکھ کر بور ہو رہی

ہے اور اکھڑی اکھڑی سی نظر آ رہی ہے۔ اس نے پوچھا۔ "کیا آپ کو رقص پسند آیا؟ دونوں نامور رقاصائیں ہیں۔"

"آپ اسی اچھل کود اور جسموں کی نمائش.........." بولتے بولتے شکیلہ کو یک لخت احساس ہوا کہ وہ بھی ایک نمائش کی طرح اس کے سامنے بیٹھی ہے۔ اس کی بانہیں اور جسم کا کسی قدر زرخیز حصہ بے پردہ سا ہے۔ وہ آئینے کو آئینہ کیا دکھا رہی ہے۔ اب تیر کڑی کمان سے نکل چکا تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور معاً اسے احساس ہوا کہ اس طرح کی گہری سانس ایک مرد کے سامنے لینا بھی کسی قدر بے شرمی کی بات محسوس ہوتی ہے۔ آخر سجاد نے اسے کس جہنم میں جھونک دیا۔ اسے ایک مرد کے سامنے نہیں بلکہ ساری دنیا کے سامنے کیسی گھناؤنی جگہ میں بٹھا دیا ہے۔ جیسے وہ عورت نہ ہو بلکہ موم کا مجسمہ ہو۔ کوئی بازاری عورت ہو۔ مرد کی ہر نگاہ اسے اپنی گرفت میں جکڑے دیکھ رہی ہے۔ سارے حجاب اٹھ کر رہ گئے ہیں۔ اس نے ارادی طور پر ہاتھ بڑھایا کہ ساڑھی کے پلو کو اس طرح کھینچ لے کہ مردوں کی آنکھوں کے سامنے پردہ آ جائے۔ مگر شانے میں تو جڑاؤ بروچ تھا اس کی کوشش ناکام سی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی بات پوری کی۔ "اسے تو رقص کا نام نہ دیں۔ مجھے ان کے رقص میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ البتہ.........." اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"البتہ کیا؟" افضال احمد نے پُرخیال نظروں سے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ چہرے کو دیکھتے ہوئے اس نے شکیلہ کو اپنی آنکھوں میں جذب کر لیا۔ "شاید آپ کو موسیقی بہت پسند آئی؟ اور آپ کو ان رقاصاؤں کا حُسن بھی بھایا ہو گا۔"

"اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں رقاصائیں بہت حسین ہیں۔ حسن کا نادر نمونہ ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں کوئی اور خاص بات نہیں ہے۔"

سجاد تو ان دونوں کے درمیان ایک خاموش تماشائی کی طرح بیٹھا تھا۔ افضال احمد کو زیادہ سے زیادہ موقع دے رہا تھا کہ وہ شکیلہ سے باتیں کرتا رہے۔ ان دونوں کے درمیان جو اجنبیت کی دیوار ہے' جو دوری ہے' وہ گر جائے' ختم ہو جائے' دوستی اور بے تکلفی پیدا ہو جائے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ شکیلہ افضال احمد کے ہوش و حواس پر بدلی بن کر چھا گئی ہے۔ اس کی کمزوری بن گئی ہے۔ افضال احمد شکیلہ کی قربت سے پاگل ہوا جا رہا ہے۔ اس کی رگوں میں دوڑتا ہوا خون چہرے پر سمٹ گیا ہے۔ اس نے چری چری نظروں سے کتنی ہی بار افضال احمد کا چہرہ بھانپا تھا۔ اب اسے اپنی جیب میں مال کے اس آرڈر سپلائی کا پروانہ

محسوس ہو رہا تھا جس سے وہ لاکھوں کا منافع پانے والا تھا۔

کچھ دیر کے بعد ایک اور قیامت اسٹیج پر تیز روشنی کے ہالے میں لہراتی ہوئی نمودار ہوئی تھی۔ مصری رقص کے نام پر اس کے بدن پر دھجیاں تھیں۔ مصری رقص شروع ہوا جو بے حد ہیجان خیز تھا۔ انگ انگ میں بھری بجلیاں کوند رہی تھیں۔ عضو عضو میں تھرکن ہو رہی تھی۔ اس فضا میں شکیلہ کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ کیا واقعی عورت ہے۔ شکیلہ نے اپنی آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا تھا۔ عورت کے تقدس پر اتنا بڑا داغ..........؟

عورت اتنی بے شرم اور بے حجاب ہوتی ہے۔ دوسرے لمحے اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس عورت اور خود اس میں ذرّہ برابر بھی فرق نہیں ہے۔ وہ دونوں ایک ہی عالم' ایک ہی حیثیت اور ایک ہی ضرورت کے لئے اتنی گر گئی ہیں۔ وہ اپنی نمائش بھی آسائش کے لئے کر رہی ہے اور وہ بھی اس آسائش کے لئے اس تیزی سے بھاگ رہی ہے۔ وہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہی تھی کہ آخر وہ کس طرح یہ لباس پہن کر سجاد کے ساتھ آنے اور افضال احمد کے سامنے جانے کے لئے تیار ہو گئی تھی.......... اب اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

جب مصری رقص ختم ہو گیا تو شکیلہ نے گھر چلنے کی تجویز پیش کی تھی۔ ہوٹل سے باہر آنے کے بعد افضال احمد نے دل کے نہاں خانے سے ایک خیال نکال کر پیش کیا۔ "کیوں نہ ہم ساحل سمندر پر چلیں۔ آج تو چاندنی رات بھی ہے۔" افضال احمد نے آسمان پر جگمگاتے ہوئے چاند کو دیکھا پھر زمین کے اس چاند کو دیکھا۔ وہ دونوں چاندوں کا ایک دوسرے سے موازنہ کر رہے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ شکیلہ کی زیادہ سے زیادہ رفاقت میسر ہو۔ ابھی ان کے دل اور آنکھوں کی پیاس نہیں بجھی تھی۔

"نیک خیال ہے۔" سجاد نے اس کے کہنے سے پہلے ہی ساحل سمندر پر چلنے کی ہامی بھر لی تھی۔ شکیلہ نے تو سوچا تھا کہ وہ امتحانات کا بہانہ کر کے ٹال دے گی کہ کل صبح جلدی اٹھ کر اسے امتحانات کے لئے تیاری کرنا ہے۔ وہ افضال احمد کے ساتھ ساحل سمندر پر جانا نہیں چاہتی تھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ اسے سجاد پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ سجاد نے افضال احمد کے قریب جا کر کہا۔ "موسم بھی بڑا خوشگوار ہے۔ چاندنی رات میں ساحل سمندر پر جانے سے لطف دوبالا ہو جائے گا۔"

شکیلہ کو ساتھ چلنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ تینوں پارکنگ لاٹ پر آ کر افضال احمد کی کار کے پاس رُکے تو سجاد نے شکیلہ سے کہا۔ "تم مسٹر افضال احمد کے ساتھ

کار میں بیٹھ جاؤ۔ میں اپنی کار پیچھے پیچھے لئے آتا ہوں۔"

شکیلہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ اس کی رگوں میں جیسے لہو ابل پڑا تھا۔ وہ غصے کو ضبط کر کے رہ گئی۔ وہ افضال احمد کے چہرے کو دیکھ رہی تھی جو دمک اٹھا تھا اور اسے افضال احمد کی آنکھوں میں جو کچھ نظر آ رہا تھا اس نے دل کے گوشوں میں نفرت بھر دی تھی۔ وہ کار کی اگلی نشست پر اپنا سراپا سمیٹ کر بیٹھی تو اس کے سینے میں سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔ جیسے وہ بہت دور سے بھاگتی ہوئی چلی آ رہی ہو۔

کار بڑی تیزی سے اپنا سفر طے کر رہی تھی۔ کراچی کی سڑکوں پر ٹریفک رات کے ایک بجے بھی رواں تھا۔ اس بڑے شہر میں ہزاروں سجاد تھے۔ ہزاروں افضال تھے۔ ان گنت شکیلہ جیسی عورتیں تھیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو راتوں کو جاگتے ہیں اور دن کو سوتے ہیں۔ روشنیوں کے شہر کی آغوش میں رات مچلتی، کسمساتی اور تڑپتی رہتی ہے۔ وہ سڑک پر نظریں رکھے ہوئے جذباتی انداز سے سوچ رہی تھی اور ادھر افضال احمد اس چاند چہرہ کو دیکھ کر سوچ رہے تھے کہ سمندر نے اس سرکش حسن کو دیکھ لیا تو اس کی لہروں کا کیا عالم ہو گا۔

چاند کی پندرھویں شب تھی۔ شکیلہ کو چاندنی رات اور ساحل سمندر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اس وقت کسی بھی صورت گھر جانا چاہتی تھی۔ اس کا فلیٹ تو قریب تھا۔ وہ اپنی بالکنی ہی سے چاندنی راتوں اور سمندر کے دل کش نظاروں کا لطف اٹھاتی رہتی تھی۔ رات کے وقت نیلا سمندر کسی صحرا کی طرح پھیلا نظر آتا تھا۔ لہریں چھوٹے بڑے اور ننھے منے ابھاروں کی شکل میں نظر آتی تھیں۔ جیسے استری کرنے سے پیشتر تازہ کلف لگا ہوا کپڑا ہو۔ یہ نیلے ابھار، سفید جھاگ کی لہر کو دھکیلتے ہوئے خود ہی تحلیل ہو جاتے تھے گویا اپنے شور شرابے کو بے معنی پا کر خود ہی شرمندگی سے ڈوب گئے ہوں۔ جھاگ کی لکیریں بے یار و مددگار بوندیں بن کر اِدھر اُدھر بکھر جاتی تھیں اور پھر ہر بوند کسی بڑی سفید لکیر کے سینے میں پناہ ڈھونڈ کر اس میں جذب ہو جاتی تھی۔ وہ اس سلسلے کو روز ہی دیکھتی تھی۔ اب اس منظر میں اس کے لئے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ ویسے وہ خوب سمجھ رہی تھی کہ افضال احمد کی نیت کیا ہے۔

کلفٹن پہنچ کر وہ لوگ ایک اونچے ریتلے ٹیلے پر بیٹھ گئے تھے۔ شکیلہ نے دیکھا کہ اور بھی بہت سے نوجوان جوڑے چاندنی رات کا حُسن دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ سمندر کی سرکش موجیں چاندنی کو دیکھ دیکھ کر اس طرح سے بپھر رہی تھیں جیسے وہ اپنے چندا کا منہ

چوم لینا چاہتی ہوں۔ چاندنی کھل کر برس رہی تھی اور اِدھر اُدھر بکھرے، چاندنی اور سمندر کے نظاروں میں کھوئے ہوئے جوڑوں کی آنکھوں اور وجود میں جیسے جذب ہو رہی تھی۔

سجاد تو سگریٹ لینے کے بہانے کھسک گیا تھا جیسے وہ ان دونوں کے بیچ دیوار بننا نہیں چاہتا ہو۔ افضال احمد تو جیسے اس موقع کی تاک میں تھے۔ وہ غیر محسوس انداز سے شکیلہ کے اور قریب ہو گئے۔ شکیلہ کو محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ تو کسی اور سمت دیکھ رہی تھی۔ ریت کے اس ٹیلے پر وہ شکیلہ کے ساتھ اکیلے بیٹھے تھے۔ اس اکیلے پن میں انہیں جیسے ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ شکیلہ کی قربت سے ان کی رگوں میں آگ دوڑ رہی تھی۔ شکیلہ انہیں اٹھارہ برس کی دوشیزہ نظر آ رہی تھی۔ انہوں نے بغیر کسی خوف اور جھجک کے اور اس خیال سے اپنا ہاتھ اس خوبصورت سے ہاتھ پر رکھ دیا کہ وہ اس ہاتھ والی کے بھائی کو آخر لاکھوں روپے کا آرڈر جو دینے والے ہیں۔ اگر شکیلہ نے ان کی حرکت کا بُرا منایا، کسی ناراضگی، برہمی اور حقارت کا اظہار کیا تو آرڈر کا جو لفافہ ان کی جیب میں رکھا ہے وہ اس کی نظروں کے سامنے پُرزے پُرزے کر کے پھینک دیں گے۔ شکیلہ کی تلافی ناظم راجہ کی حسین بہن کر دے گی۔ وہ تو دو ایک بار ان کے فلیٹ میں بھی آ چکی ہے۔ شکیلہ کے نرم و نازک اور خوبصورت ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر دبایا تو انہیں ایسا محسوس ہوا تھا کہ ان کا ہاتھ کسی انگارے پر پڑ گیا ہے۔

سجاد جس وقت سگریٹ لینے کے بہانے گیا تھا اُسی وقت شکیلہ سمجھ گئی تھی کہ سجاد دانستہ وہاں سے کھسک گیا ہے تاکہ افضال احمد کو تنہائی اور پوری پوری قربت کا موقع دے۔ افضال احمد اس قربت سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ یعنی کم سے کم وقت میں افضال احمد زیادہ سے زیادہ بے تکلف ہو جائے۔ ظاہر تھا اِس کھلی فضا اور لوگوں کی موجودگی میں زیادہ بے تکلف ہونے اور کھل کر باتیں کرنے کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا ہے۔ شکیلہ کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور کچھ کچھ سمجھ میں بھی آ رہا تھا۔ افضال احمد نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ چونکی نہیں تھی۔ اس لئے کہ عورت کی دو نہیں ہزاروں آنکھیں ہوتی ہیں۔ اس کے بدن پر جیسے ہزاروں آنکھیں تھیں۔ اس کی یہ آنکھیں ہر سمت دیکھ رہی تھیں۔ اس نے بڑی آہستگی سے گردن گھما کر افضال احمد کی طرف دیکھا دونوں کی نظریں ملیں۔ شکیلہ کی آنکھوں میں ایسی سپردگی تھی کہ وہ سیدھے ان کے کلیجے میں کسی تیر کی طرح اتر گئی تھی۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کہیں ملیں۔" افضال احمد نے اس کے ہاتھ پر سے اپنا ہاتھ اٹھالیا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔

"آپ جہاں کہیں میں سجاد صاحب کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔" وہ ڈپلومیسی کے انداز میں بولی۔ آپ حکم تو فرمائیں۔"

"یہ آپ اپنے بھائی جان کو سجاد صاحب کیوں کہتی ہیں؟ اس سے پہلے بھی آپ ہوٹل میں سجاد کو سجاد صاحب کہہ کر مخاطب کر چکی ہیں۔"

"کچھ عادت سی پڑ گئی ہے۔ اس لئے کہ جسے دیکھو انہیں سجاد صاحب کہتا پھرتا ہے۔ لہٰذا میں بھی سجاد صاحب غیر اختیار طور پر کہہ جاتی ہوں۔"

"میں چاہتا ہوں کہ ہم اپنی ملاقاتوں میں سجاد کو درمیان میں نہ لائیں۔ وہ بے حد مصروف ترین شخص ہے اور پھر میں جو آرڈر دے رہا ہوں اور اس کے بعد وہ بے حد مصروف ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ انہیں پانچ لاکھ روپے کا مال تین چار دن میں سپلائی کرنا ہو گا۔"

"اور میں بھی تو کل سے بے حد مصروف ہو جاؤں گی۔ دو تین مہینے تک شاید ہی سیر و تفریح کے لئے وقت نکال سکوں۔" وہ دل فریب انداز سے مسکرائی۔

"آپ کس سلسلے میں کل سے بے حد مصروف ہو جائیں گی؟" افضال احمد کو ایسا محسوس ہوا کہ دوسرا تیر ان کے سینے سے آر پار ہو گیا۔ "دو تین مہینے تک آپ کیا کریں گی؟"

"میں اپنے فائنل امتحان کی تیاری کروں گی۔" وہ کسی نازک سی شاخ کی طرح جھکی اور اپنے پیر سے سینڈل نکالنے لگی۔ جس میں ریت بھر گئی تھی۔ اسے اپنی ساڑھی کو پنڈلی تک لانا پڑا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ افضال احمد کی جلتی ہوئی نظریں نازک خطوط کے ہیجان خیز نظارے میں کھو گئی ہیں۔ وہ اپنے سینڈل سے ریت جھاڑ کر سیدھی ہوئی تو افضال احمد کے دل پر قیامت گزر گئی۔ "امتحان شروع ہونے میں چار مہینے باقی ہیں۔"

"چار مہینے باقی ہیں اور آپ ابھی سے امتحان کی فکر میں ہلکان ہوئی جا رہی ہیں۔" افضال احمد نے اس کے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

شکیلہ نے محسوس کیا کہ وہ غیر محسوس انداز سے پھیل رہے ہیں تو وہ ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "آخر ہلکان کیوں نہ ہوں فائنل ایئر جو ہے۔"

"آپ ایسا کیوں نہ کریں۔ آپ دونوں بہن بھائی میرے ساتھ یورپ کے ٹور پر

چلیں۔ ایک مہینے تک خوب سیر و تفریح کر کے آئیں گے۔"

"مگر یورپ کے ٹور پر بہت زیادہ خرچ آئے گا۔ ویسے بھی ہم آپ پر بار بننا نہیں چاہتے ہیں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔" وہ خوش اخلاقی سے بولی۔

"میرے پاس آخر کس چیز کی کمی ہے۔" افضال احمد کہنے لگے۔ "آپ تو جانتی ہیں آج کل ایوب خان کا دورِ حکومت ہے۔ اسلام آباد کی تعمیر کا کام کس زور و شور سے ہو رہا ہے۔ میری کمپنی کو کروڑوں روپے کا ٹھیکہ ملا ہوا ہے۔ میں نے صرف ایک سال میں اتنا کچھ کما لیا ہے کہ میری سات پشتیں بیٹھ کر کھا سکتی ہیں۔ اگر میں آپ کو ہر مہینے یورپ کے ٹور پر لے جاؤں تو میری ابلتی ہوئی دولت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

"میں معذرت چاہوں گی۔ کسی اور وقت آپ کے یورپ کے ٹور کی دعوت قبول کر لوں گی۔ اس وقت تو معاف رکھیں۔" شکیلہ نے جواب دیا۔

"اچھا ایسا کرتے ہیں۔" افضال احمد سوچتے ہوئے بولے۔ "آٹھ دس دنوں کے لئے مری، نتھیا گلی، ایوبیہ اور ایبٹ آباد چلتے ہیں۔ آٹھ دس دن کی سیر و تفریح سے آپ کا دماغ بھی تر و تازہ ہو جائے گا۔ پھر آپ جم کر امتحان کی تیاریاں کریں۔ اس طرح آپ کا دل پڑھائی میں لگ جائے گا۔"

سجاد سگریٹ لے کر آ رہا تھا۔ شکیلہ نے معنی خیز لہجے میں پوچھا۔ "آپ ہمیں اپنے ساتھ سیر و تفریح کے لئے مری لے جانے کے لئے اصرار کیوں کر رہے ہیں؟"

"اس لئے کہ حسین لوگوں کا ساتھ رہے گا۔ حسین لوگ ساتھ ہوں گے تو سیر و تفریح کا لطف دوبارہ ہو جائے گا۔ ہم لوگ خوب انجوائے کریں گے۔"

سجاد قریب آ کر رکا تو افضال احمد نے اپنی مری کی سیر و تفریح کی تجویز پیش کی تو سجاد بولا۔ "نیکی اور پوچھ پوچھ۔"

افضال احمد نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ "اب آپ کے بھائی جان بھی رضامند ہو گئے، مری چلنے کے لئے۔ آج ہفتہ ہے۔ ہم لوگ آئندہ ہفتہ کی صبح بارہ بجے کی فلائٹ سے مری کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔" انہوں نے توقف کر کے جیب سے لفافہ نکالا اور سجاد کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔ "اس میں پانچ لاکھ روپے کا آرڈر اور ڈھائی لاکھ کی رقم کا پے آرڈر ہے جو نصف پیشگی رقم ہے۔ تین چار دن میں مال سپلائی کر دینا۔ باقی رقم مال کی وصولیابی اور مری سے واپسی کے بعد ملے گی پھر دو مہینے بعد مزید پانچ لاکھ روپے کا آرڈر دوں گا۔ او کے۔"

"تھینک یو سر' تھینک یو ویری مچ!" لفافہ لیتے وقت اس کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ "میں آپ کو اپنی ذات سے مایوس نہیں کروں گا۔ پہلے کی طرح خدمت کرتا رہوں گا۔ میری آپ سے اتنی سی درخواست ہے کہ آپ صرف مجھے ہی خدمت کا موقع دیتے رہیں۔"

"کیوں نہیں' کیوں نہیں۔" افضال احمد نے معنی خیز نظروں سے شکیلہ کی طرف دیکھا۔ "آؤ چلیں۔ رات کے دو بج رہے ہیں۔"

سجاد اور افضال احمد آگے آگے باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ وہ دو تین گز پر تھی اور ان کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ ریت میں دھنستے ہوئے پیر کی وجہ سے شکیلہ کو چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ وہ ان سے ہر قدم پر کچھ اور پیچھے ہوتی جا رہی تھی۔ افضال نے چلتے چلتے اور سجاد کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہماری بھابی کئی دنوں سے نظر نہیں آ رہی ہیں۔ کیا وہ میکے جا کر بیٹھ گئی ہیں۔ جو واپس آنے کا نام نہیں لے رہی ہیں؟"

"میں نے شاید آپ کو اس سے پہلے بھی بتایا تھا کہ آپ کی بھابی کا پاؤں بھاری ہے۔ نہیں نہیں آپ کو نہیں بتایا تھا۔"

"پاؤں بھاری ہے۔" افضال احمد چلتے چلتے جیسے اچھل پڑے تھے۔ "بھئی اتنی جلدی باپ بننے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ بچے ہونے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ تم لوگوں نے ابھی زندگی کا پوری طرح لطف بھی کہاں اٹھایا ہے۔ ویسے ہماری بھابی کا جواب نہیں ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی حسین اور پُرشباب عورتیں بہت کم دیکھی ہیں۔ ایسی شوخ' خوش مزاج' ملنسار' بااخلاق اور نرم طبیعت عورت سے کبھی میرا واسطہ نہیں پڑا۔ وہ بے انتہا معاون قسم کی عورت ہے۔ تم عورت کے معاملے میں بڑے خوش نصیب واقع ہوئے۔ بہرکیف مبارک ہو کہ تم عنقریب باپ بننے والے ہو۔"

"شکریہ سر!" سجاد نے موضوع بدلا۔ "آپ بُرا نہ منائیں تو میں ہوائی جہاز کی سیٹیں بک کرا لوں۔"

"آج کل بہت رش ہے۔ دو تین ہفتے بعد کا ایک ٹکٹ ملنا بھی دشوار ہو رہا ہے۔ نہ اکانومی کلاس کے ٹکٹ مل رہے ہیں اور نہ ہی فرسٹ کلاس کے' ایک ٹکٹ کا مسئلہ تو کسی نہ کسی صورت سے حل ہو سکتا ہے۔ تین ٹکٹ بہت مشکل ہے۔ بہرکیف میں تین ٹکٹوں کا انتظام کر لوں گا۔"

افضال احمد کلفٹن ہی سے رخصت ہو گئے تھے۔ مگر رخصت ہوتے وقت وہ شکیلہ

سے ہاتھ ملانا نہیں بھولے تھے۔ وہ اس حنائی ہاتھ کے انوکھے لمس سے آشنا ہو چکے تھے جس نے ان کے بدن میں لطیف سی چنگاریاں بھر دی تھیں۔ وہ اس ہاتھ کے لمس کا سرور اپنی نس نس میں لئے رخصت ہو گئے۔

☆======☆======☆

گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ قریب ہی تو تھا گھر جاتے وقت سجاد بہت خوش تھا۔ وہ اپنی خوشی میں اس قدر مگن تھا کہ اس نے چند لمحوں تک تو شکیلہ کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا۔ اسے پہلی بار اتنا اچھا اور اس قدر بڑا آرڈر ملا تھا۔ اس آرڈر کے لئے صرف دو امیدواروں کے درمیان مقابلہ تھا۔ اس کا روایتی حریف ناظم راجہ اس کے مقابلے میں خم ٹھونک کر پوری طرح میدان میں آ رہا تھا اور بھی سات امیدوار تھے۔ مگر ان کی کامیابی مشکوک تھی۔ اصل مقابلہ تو ناظم راجہ سے تھا۔ اس نے سنا تھا کہ ناظم راجہ اس آرڈر کے حصول کے لئے اپنی نوجوان اور بے حد حسین بہن کو چارہ بنا رہا ہے۔ اس کی بہن افضال احمد سے کلب میں روابط بڑھا رہی ہے اور مری چل کر سیر و تفریح کرنے کی دعوت دے رہی ہے۔ اس نے ناظم راجہ کی بہن کو دیکھا تھا۔ وہ واقعی بے حد حسین' پُرکشش اور شوخ مزاج نوجوان لڑکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ مرد کو کس طرح اور کیسے عشوؤں سے اپنا اسیر بنایا جا سکتا ہے۔ اس نے آج سے پہلے اور لڑکیوں اور عورتوں کے سہارے آرڈر لئے تھے۔ افضال احمد سے بھی اور فرموں سے بھی۔ مگر آج اسے ایک ایسا چیلنج درپیش تھا جس کی وجہ سے اسے کسی بے حد حسین لڑکی کی ضرورت تھی جو افضال احمد کو اپنے جال میں پھانس سکے اور اس کی بیوی سے حسین اور قیامت خیز لڑکی پورے شہر کراچی میں نہیں تھی۔ جس کی جوانی کی زرخیزی افضال احمد کو پاگل بنا سکتی تھی اور آج شکیلہ نے واقعی افضال احمد کو پاگل بنا دیا تھا۔ یہ اس کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اس لئے کہ افضال احمد ایسی حسین لڑکیوں اور عورتوں کو گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ اس کامیابی کا اصل سہرا شکیلہ کے سر تھا۔ اس نے سڑک سے نظریں ہٹا کر پُرخیال نظروں سے شکیلہ کی طرف دیکھا جو اس کے لئے الہ دین کے جادوئی چراغ سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ وہ اس چراغ کو گھس گھس کر ایک دن اس شہر کا اس ملک کا بہت بڑا آدمی بن سکتا تھا گو وہ آج کسی جاپانی گڑیا کی طرح لگ رہی تھی اس کے وجود میں ریشم کا گداز سا تھا اور اس کی باتوں میں شہد کی سی مٹھاس تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا۔ آسائش و راحت اور خواب ناک زندگی کا زہر شکیلہ کی نس نس میں سوتا جائے گا۔ خون میں گھلتا جائے گا۔

ویسے ویسے اس کی نوخیزی کی ترشی پکے پن میں بدل جائے گی۔

سجاد نے یک بارگی محسوس کیا کہ شکیلہ کا منہ پھولا ہوا ہے۔ وہ اس آرڈر کے ملنے پر خوش نہیں ہے۔ کوئی ایسی بات ہوئی ہے جو شکیلہ کو ناگوار لگی ہے۔ اس نے بہت سوچا۔ بہت غور کیا۔ شکیلہ کی ناراضگی کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ حالانکہ اس نے افضال احمد کو بڑی گرم جوشی سے رخصت کیا تھا۔ یہ پل سے پل میں کیا ہو گیا ہے؟ وہ ششدر ہو رہا تھا۔ "کیا بات ہے ڈارلنگ!" سجاد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ شکیلہ نے پھر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ جھانکتی رہی تھی۔

نم آنکھوں سے اس چاندنی کو دیکھ رہی تھی جو سڑک پر کسی لٹی ہوئی عورت کی طرح دل گرفتہ بے حد مغموم نظر آ رہی تھی۔ جو اداسی بن کر پھیلی ہوئی تھی۔ اب اس کا حُسن پھیکا پڑ گیا تھا۔ وہ دل گرفتہ ہو کر سوچ رہی تھی کہ اس سے جیسے بہت بڑی بھول ہو گئی ہے۔ کتنی بڑی غلطی ہو گئی ہے۔ اسے بہروپ نہیں بھرنا تھا۔ کیا اس شہر کا ہر آدمی اس طرح کماتا ہے۔ یہ لوگ جو گاڑیوں میں آتے جاتے ہیں' کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہتے ہیں کیا وہ اپنی بیویوں کو بہنوں کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ بہنوں کو بیویاں بنا کر سفارش کرواتے ہیں۔ کیا ہر دفتر' فرم اور کارخانے میں ایک ایک افضال احمد بیٹھا ہوا ہے؟

گھر پہنچ کر وہ ایک دم سے پھٹ پڑی تھی۔ "تم نے کہا تھا کہ مجھے بہن بن کر افضال احمد سے صرف ملنا' ہنس کر باتیں کرنا اور اپنی شخصیت سے متاثر کرنا ہے؟ اس کے لئے تم مجھے نیم عریاں حالت میں لے گئے۔ جیسے میں کوئی عورت نہیں' بیوی نہیں' بہن نہیں' تمہاری عزت نہیں محض ایک اداکارہ ہوں۔ کھلونا ہوں۔ اپنی غرض اور فائدے کے لئے تم یہ کھلونا افضال احمد کے ہاتھ میں دے دینا چاہتے ہو تا کہ وہ اس کھلونے سے کھیل سکے۔"

"شکیلہ .... شکیلہ!" سجاد نے حیران ہو کر اس کی شکل دیکھی۔ "یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تم اتنی جذباتی کیوں ہو رہی ہو؟ تم نے ہوٹل میں لڑکیوں اور عورتوں کو نہیں دیکھا جو تم سے کہیں زیادہ سنور کر اور سج دھج کر آئی تھیں؟ یہ تو فیشن ہے۔ آج کل شکیلہ! ہمیں تو وقت کے ساتھ ساتھ چلنا چاہئے۔ جو وقت کے ساتھ چلتا ہے وہی کامیاب اور سرفراز رہتا ہے۔ افضال احمد نے تمہارے ساتھ کیا کیا جو تم اتنی برہم ہو رہی ہو؟"

پھر اس نے توقف کر کے شکیلہ کی طرف دیکھا جو اپنی ساڑھی سے جڑاؤ بروچ کو نوچنے کے انداز میں نکال رہی تھی۔ شکیلہ نے نہ صرف بروچ بلکہ ساڑھی بھی اتار کر پلنگ

پر پھینک دی تھی۔ وہ صرف پیٹی کوٹ اور بلاؤز میں ملبوس الماری کی طرف نائٹی نکالنے کے لئے بڑھ رہی تھی کہ سجاد نے لپک کر اس کی بانہہ پکڑلی۔ "کیا میں نے تمہیں افضال احمد کے ساتھ کمرے میں بند کر دیا تھا جو تم مجھ پر اتنی بڑی تہمت لگا رہی ہو؟ کیا تم مجھے اتنا گرا انسان سمجھتی ہو؟"

"یہ تم مجھے افضال احمد کے پاس اکیلا چھوڑ کر سگریٹ لینے کیوں چلے گئے تھے؟ کیا تم نے دانستہ یہ حرکت نہیں کی تھی کہ افضال احمد کو میری قربت کا زیادہ سے زیادہ موقع دیا جائے؟ افضال احمد اس تنہائی میں مجھ سے زیادہ سے زیادہ بے تکلف ہو سکے۔" اس نے مزاحمتی انداز میں اپنی بانہہ چھڑانے کی کوشش کی۔

"یہ تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو شکیلہ! کیا میں یہ چاہوں گا کہ تم پر آنچ آ پائے۔ اگر تم جل گئیں تو کیا میں بھی نہیں جل جاؤں گا۔"

"تم پر دولت کا نشہ چھا گیا ہے سجاد!" شکیلہ نے دیکھا کہ سجاد کے ہاتھ کی گرفت بازو پر بڑی سخت ہے تو اس نے اپنی مزاحمت ترک کر دی۔ "اگر یہ نشہ تم پر طاری نہ ہوا ہوتا تو تم مجھے اس طرح ایک رنگین تتلی بنا کر نہیں لے جاتے اور ہاں۔" اس نے گہری سانس لی۔ اس کے چہرے پر پر ناگواری کی لہر اُبھر آئی۔ "تم شراب بھی پیتے ہو؟"

"صرف ساتھ دینے کی حد تک۔" اس نے شکیلہ کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ "جس سوسائٹی میں اٹھتے بیٹھتے ہیں اس کے آداب کا ہر حال میں ساتھ دینا پڑتا ہے۔ اگر ہم اس کے مخالف چلیں تو پھر ہمارے لئے اس سوسائٹی میں کوئی جگہ نہیں رہتی ہے۔ ہمیں وہ لوگ نکال باہر کرتے ہیں۔"

"کیا اس سوسائٹی میں کسی کی بہن یا بیوی افضال احمد جیسے لوگوں کے بستروں اور اپنے وجود کو میلا کر کے آتی ہے۔ اپنے شوہر اور بھائی کی ترقی' کامیابی اور دولت کے حصول کے لئے۔ شاید یہ بات بھی ان لوگوں کے اور تمہارے نزدیک معیوب نہیں ہو گی۔"

"تم مجھے اور ان لوگوں کو غلط انداز سے دیکھ رہی ہو۔ تمہارے سامنے جو تصویر ہے وہ تمہاری سوچ کے مطابق ہے۔ افضال احمد ان لوگوں میں سے نہیں ہیں۔ وہ ایک نفیس مزاج اور دولت مند شخص ہیں۔ انہیں جذبات کی حرارت کم کرنے کے لئے لڑکیوں اور پُرشباب عورتوں کی کیا کمی ہو سکتی ہے۔ ان کے ایک اشارے پر تم جیسی کتنی ہی لڑکیاں ایک قطار میں کھڑی ہو جائیں۔ وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ ہر خوبصورت

چیز ہر ایک کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ تم نے بھی انہیں نہ صرف متاثر' مرعوب کر لیا تھا بلکہ مسحور بھی کر دیا تھا۔ آخر کیوں نہ ہو۔ تم جیسی حسین لڑکی اس دنیا میں شاید ہی موجود ہو۔ تمہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے تمہیں اپنے ہاتھوں سے خاص طور پر بنایا ہے۔ تم شیشہ بدن ہو۔ تم کسی مہکتی کلی کی طرح ہو۔ تمہارا سراپا اور خال و خد آنکھوں میں جذب کرنے کے باوجود بھی دل کی پیاس نہیں بجھتی ہے۔ اب تم مجھے ہی دیکھ لو شکیلہ! اب جبکہ تم کتنے ہی دنوں سے سراسر میری ملکیت میں ہو' کتنے ہی دنوں سے شراب پی رہا ہوں مگر پیاس ہے کہ بجھتی ہی نہیں ہے بلکہ اور بڑھ جاتی ہے۔ جی ہے کہ بھرتا ہی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں ذرا ٹھنڈے دل سے سوچ کر دیکھو۔ اس افضال احمد غریب پر کیا گزری ہو گی۔ کیا آگ پر تیل کی دھار گرتی نہیں رہی ہو گی۔ اگر اس نے جی بھر کے دیکھ لیا تو اسے الزام نہ دو اور ہاں اگر وہ شخص عیاش مزاج کا ہوتا تو وہ تمہیں دیکھتے ہی صاف صاف کہہ دیتا کہ اگر تم اپنی بہن کو میرے ہمراہ رات بھر کے لئے بھیج دو۔ اس صورت میں مَیں پانچ لاکھ روپے کا آرڈر دے سکتا ہوں۔ مگر اس نے یہ بات نہیں کہی' اس نے کسی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ مگر اس شہر کراچی میں ایسا ہوتا ہے۔" سجاد نے توقف کر کے شکیلہ کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں۔ جن بوتل میں اُتر گیا تھا۔ شکیلہ آنکھیں بند کر کے اپنی تعریفیں سن سن کر پھولی نہیں سما رہی تھی۔ اس کے رخساروں پر تصورات کی شفق اُتر آئی تھی۔ وہ رنگین خوابوں میں کھوئی جا رہی تھی۔ سجاد نے سوچا کہ یہی موقع ہے کہ بوتل کا منہ بند کر دینا چاہئے۔ اگر جن پھر بوتل سے باہر آ گیا تو اسے دوبارہ قابو کرنا مشکل ہو گا۔ "تم دیکھ لینا شکیلہ! تمہارے پرستاروں کی تعداد روز بہ روز کس تیزی سے بڑھتی ہے۔ سارے شہر میں تمہارے حُسن کا چرچا پھیل جائے گا۔"

"کیا افضال احمد تمہاری پہلی بیوی کا ذکر کر رہے تھے؟ کیا نسرین ان سے کبھی ملی تھی۔ وہ بھی اس فلیٹ میں رہتی تھی کیا؟"

"نسرین کبھی کبھی میری نگرانی کرنے اور اپنے کاروبار کا جائزہ لینے کے لئے کراچی آ جاتی تھی۔ افضال احمد سے اس کی کئی بار ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ میں نے دانستہ نسرین کو طلاق دینے کے بارے میں نہیں بتایا ہے۔ آخر یہ سب کچھ انہیں بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟"

"مگر میں افضال احمد کے ساتھ مری نہیں جاؤں گی۔ ہم دونوں کبھی مری چلیں گے۔ سوات جائیں گے۔ پندرہ بیس دن گزار کے چلے آئیں گے۔"

"تم افضال احمد کے ساتھ مری کیوں نہیں جاؤ گی؟ تم اکیلی تو ان کے ساتھ نہیں جا رہی ہو۔ آخر میں بھی تو ساتھ چل رہا ہوں............!"

"معلوم نہیں کیوں مجھے یہ شخص بالکل پسند نہیں آیا ہے۔ ایک دم ندیدہ سا لگ رہا تھا۔" وہ اس کے بازوؤں میں کسمساتی ہوئی بولی۔ "تم نے کہا تھا کہ صرف ایک دن اور دو گھنٹے کی بات ہے۔ مگر وہ پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گیا ہے۔ پہلے تو اس نے یورپ کی سیاحت کی پیشکش کی تھی۔ میرے انکار پر مری چلنے کے لئے کہہ رہا ہے۔ اگر میں مری چلی گئی تو وہ اور پھیلتا چلا جائے گا اور تم ایک دن منہ دیکھتے رہ جاؤ گے۔"

"ایسا غضب نہیں کرنا جانِ من!" سجاد نے چونک کر کہا۔ "سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ نہ صرف آرڈر کینسل ہو جائے گا بلکہ رقم بھی پھنس جائے گی۔"

"مٹی ڈالو افضال احمد اور اس کے آرڈر پر۔ کیا اتنے بڑے اور عظیم شہر کراچی میں صرف ایک افضال احمد ہی رہ گیا ہے؟"

"اور بھی ہیں لیکن ان تک پہنچنے کے لئے ہمیں بڑے پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ برسوں انتظار کرنا ہو گا اور میں ان بے غیرتوں کی طرح نہیں ہوں جو اپنی عورتوں کو ان کے بیڈ روم............"

اس نے توقف کر کے شکیلہ کی پھیلواں آنکھوں میں جھانکا۔ "کیا تم جھونپڑی میں رہنا پسند کرو گی؟ فاقے کرو گی؟ عسرت و افلاس سہہ لو گی؟ اگر اس کے لئے تیار ہو تو آج ابھی اور اسی وقت میں اس زندگی کو لات مارنے کے لئے تیار ہوں۔" اس نے شکیلہ کو اپنے بازوؤں سے الگ کر کے جیب سے لفافہ نکالا۔ لفافے میں سے آرڈر اور پے آرڈر نکال کر اس کی نظروں کے سامنے لہرایا۔ "یہ لو' اسے تمہی اپنے ہاتھوں سے پھاڑ کر گلی کے باہر پھینک دو۔"

شکیلہ نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے لفافہ اور دونوں چیزیں لے لیں۔ وہ ساکت دل سے شکیلہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ سینے میں اس کی سانسیں رک گئی تھیں۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ شکیلہ کیا کرتی ہے۔ کتنے ہی خیالات اس کے ذہن میں آندھی کی طرح اُٹھ رہے تھے۔ کیا شکیلہ کی نسوں میں خواب ناک راحتوں کا زہر ابھی تک سرایت نہیں کر سکا ہے؟ کیا وہ واقعی اس زندگی کو ٹھوکر مار کر ایک تصوراتی عورت بن جائے گی۔

شکیلہ ایک ٹک پانچ لاکھ روپے کے آرڈر والے کاغذ کو' جس پر ان اشیاء کی فہرست ٹائپ کی ہوئی تھی جسے سپلائی کرنا سجاد کا کام تھا اور ڈھائی لاکھ کی رقم کے پے آرڈر کو دیکھ

رہی تھی جو پیشگی کے طور پر ملے تھے۔ اس میں سے خواب ناک زندگی جھلک رہی تھی۔
اس نے پل بھر کے لئے سوچا تھا کہ کیا وہ جھونپڑی میں رہ کر اپنی زندگی گزار سکے گی؟ اگر اسے ایسی ہی عام زندگی گزارنا تھی تو اسے کیا ضرورت تھی ارشد کو اور شجاعت علی چودھری کو ٹھکرانے کی۔ وہ ارشد کے ساتھ بھی زندگی گزار سکتی تھی۔ مگر اس نے ایک خواب ناک زندگی اور آئیڈیل شوہر کی خاطر سب کچھ تیاگ دیا تھا۔ آخر اسے کیا ضرورت تھی اتنی دور اس قدر تیز رفتاری سے جانے کی اور یہ بھی ممکن ہے کہ سجاد ایک عام زندگی گزارنا پسند نہیں کرے اور شاید اسے بیچ منجدھار میں چھوڑ کر کسی ایسی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے جو اس کی خواہش پر چلے۔ بالکل اسے بھی چھوڑ سکتا ہے۔ جس طرح اس نے نسرین کو چھوڑا۔ آخر نسرین بھی تو بے حد حسین' بے حد پرُکشش اور بے حد شاداب بدن کی عورت تھی۔ اس نے آرڈر والا کاغذ اور پے آرڈر سلپ لفافے میں رکھ کر لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ "میں مری چلوں گی ڈیئر! اگر تم جہنم میں جانے کے لئے کہو گے تو میں جہنم میں بھی جانے کے لئے تیار ہوں۔ اگر تم کہو گے کہ سمندر میں چھلانگ لگا دو تو میں سمندر میں چھلانگ لگانے کے لئے تیار ہوں۔ مگر تمہیں ناراض کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

سجاد کی جان میں جان آ گئی۔ اس نے لفافہ لیتے وقت شکیلہ کو پکڑ لیا۔ لفافہ میز پر ڈال دیا۔

تیسرے دن شام کے وقت شکیلہ سجاد کے ساتھ باہر جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ سجاد غسل خانے میں تھا۔ اطلاعی گھنٹی بجی۔ شکیلہ چونکی اور حیران سی ہو گئی کہ کون آیا ہو گا؟ اس شہر میں کوئی دوست احباب نہیں تھا اور پھر اس نے پڑوسیوں سے اس لئے بھی تعلقات نہیں بڑھائے تھے کہ وہ لوگ ان دونوں کی تنہائی میں مخل ہوں۔ سجاد نے خود اسے منع کیا تھا کہ وہ کسی سے تعلقات نہ قائم کرے۔
شکیلہ کان میں ٹاپس لگاتی ہوئی دروازے کے پاس پہنچی۔ اس نے ساڑھی کا پلو سینے اور شانے پر درست کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔ دوسرے لمحے وہ ہڑبڑا کے پیچھے ہٹ گئی تھی۔ مگر اس میں حیرت کی بات نہ تھی۔ یہ کوئی خواب نہیں تھا۔ اس بات کا قوی امکان تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے دلکش چہرے' دل فریب جوانی اور بجلی بھرے بدن کی مقناطیسی کشش اسے ایک دن دروازے تک کھینچ لائے گی۔ آخر جلد ہی کھینچ لائی۔
اسی کے دروازے پر اس کے التفات کی خیرات لینے کے لئے افضال کھڑے تھے۔

"آپ.........!" شکیلہ کے انگاروں کی طرح دہکتے لب پھڑپھڑائے۔ اس نے شانے سے پھسل کر بازو پر جھولتے ہوئے ساڑھی کے پلو کو اٹھا کر سینے اور شانے پر درست کیا اور ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ "آیئے! تشریف لایئے۔" وہ بڑے پرُتپاک لہجے میں بولی۔
افضال احمد نے اندر داخل ہو کر اس کی طرف اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھایا تو اس نے کسی قدر پس و پیش کے بعد اپنا ہاتھ بھی بڑھا دیا۔ افضال احمد نے بڑی گرمجوشی کا اظہار کیا تھا۔ اس نے بڑھ کر دروازہ بند کیا اور گھومی تو افضال احمد نے پوچھا۔ "آپ کے بھائی جان کہاں ہیں؟"
"نہا رہے ہیں۔" شکیلہ نے نشست گاہ کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔ اسے صوفے پر بٹھا کے بولی۔ "آپ تشریف رکھیں' میں انہیں اطلاع دے کر ابھی آتی ہوں۔"
"پلیز! ایک منٹ۔" افضال احمد نے اس کا بازو پکڑ کے اسے روک لیا۔ اس نے رُک کر حیرت سے افضال احمد کی شکل دیکھی تو افضال احمد نے مسکراتے ہوئے جیب سے ایک جڑاؤ نیکلس نکالا۔ "میں یہ حقیر سا تحفہ آپ کی نذر کرنا چاہتا ہوں۔ گر قبول اُفتد.........."

وہ اس جڑاؤ نیکلس کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ اس میں ہیرے جڑے تھے اور یہ نیکلس بے حد قیمتی لگ رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی خاص زیورات نہ تھے۔ کراچی پہنچ کر سجاد نے اسے زیورات کا ایک سیٹ خرید کر دیا تھا اور زیورات بعد میں خرید کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ "آپ نے خواہ مخواہ زحمت کی۔ کیا ضرورت تھی اس تکلف کی؟"
"اس میں زحمت اور تکلف کی کیا بات ہے؟" افضال احمد نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو اسے میں آپ کے گلے کی زینت بنا دوں۔"
وہ معمولی سے تذبذب کے ساتھ تیار ہو گئی۔ وہ گھوم کر کھڑی ہو گئی تو افضال احمد کی انگلیوں نے اس کے گلے میں نیکلس پہناتے وقت اس کی صراحی دار گردن کو چھو لیا تھا اور کئی بار چھوتی رہی تھیں۔ وہ ہار پہننے کے بعد ان کی طرف گھوم گئی۔ "کتنا خوبصورت نیکلس ہے یہ.........؟"
"مگر آپ سے زیادہ خوبصورت نہیں ہے۔" افضال احمد نے بڑی بے تکلفی سے اس کے شانے تھام لئے تھے۔ "یقین نہ آئے تو آپ جا کر آئینے میں دیکھ آئیں۔"
دوسرے ہی لمحے شکیلہ نے اپنے شانے ان کے ہاتھوں چھڑا لئے۔ انہیں صوفے پر

بٹھا کر وہ اپنی خوابگاہ کی طرف بڑھ گئی۔ سنگھار میز کے قدِ آدم آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس نیکلس نے اس کے حُسن میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ اس کا حُسن اور فتنہ خیز ہو گیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہ تینوں نشست گاہ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ افضال احمد کو اچانک کچھ یاد سا آیا۔ انہوں نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ "بڑی مشکل سے تین ٹکٹ مل تو گئے مگر الگ الگ فلائٹ کے .... دو ٹکٹ تو پہلی فلائٹ کے ہیں۔ بکنگ کلرک نے غلطی سے پہلی فلائٹ کے دو ٹکٹ جو بنائے ہیں وہ میرا اور مس شکیلہ کا ہے۔ دوسری فلائٹ جو دو گھنٹے بعد روانہ ہو رہی ہے اس میں مسٹر سجاد کی سیٹ ہے۔ وزرا اور اراکین اسمبلی کی آمدورفت کی وجہ سے ٹکٹ کے ملنے میں بڑی مشکل ہو گئی ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" سجاد نے تائیدی لہجے میں کہا۔ "آپ اور شکیلہ پہلی فلائٹ سے چلے جائیں اور میں دوسری فلائٹ سے پہنچ جاؤں گا۔ دو گھنٹے کی تو بات ہے۔ دو دن کی نہیں ہے۔ اگر دو دن کی بات ہوتی تو پھر سوچا جاتا۔"

"میں نے واپسی کے ٹکٹ بھی لے لئے ہیں۔ ایک ہفتے بعد واپسی ہو گی۔ اس لفافے میں ٹکٹ رکھے ہیں۔"

"ویسے مجھے سوات دیکھنے کی بڑی خواہش ہے۔ مری تو میں کئی بار کالج کی سہیلیوں کے ساتھ جا چکی ہوں۔ سوات ایک بار بھی نہیں گئی۔"

"راولپنڈی پہنچ کر مری کے بجائے سوات چلے جائیں گے۔ میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ میں اکثر وہاں جاتا رہتا ہوں۔"

"نہیں .... نہیں۔ اس بار مری جائیں گے۔ دو ایک مہینے بعد سوات جائیں گے۔ سوات کی ٹرپ میرے ذمے ہو گی۔" سجاد بولا۔

"چلئے یہی سہی۔" افضال احمد نے شکیلہ کی طرف مسکرا کے دیکھا۔ "سوات کے بعد یورپ کی سیاحت میرے ذمے۔"

"اور میرے ذمے کیا ہو گا؟" شکیلہ نے افضال احمد کو تیکھی نظروں سے دیکھا تو افضال احمد کے سینے میں آنکھیں دو نیزے بن کر اتر گئیں۔ انہوں نے اندر سے پھڑپھڑاتا دل تھام لیا۔

"آپ کے ذمے میزبانی کے فرائض .... عورتیں بہترین میزبان ثابت ہوئی ہیں۔" افضال احمد نے قہقہہ لگایا۔

پہلی فلائٹ صبح گیارہ بجے تھی۔ صبح دس بجے سے کچھ دیر پہلے ہی افضال احمد اسے لینے پہنچ گئے تھے۔ شکیلہ اور سجاد ان کے انتظار میں تیار بیٹھے تھے۔ شکیلہ آج شلوار قمیض میں ملبوس تھی۔ اس ہلکے گلابی رنگ کے سوٹ میں اس کا چھریرا، متناسب بدن اور سراپا عجب بہار دے رہا تھا۔ اس سوٹ کے گلابی رنگ نے اس کے رخساروں کی گلابی رنگت اور زیادہ پُرکشش بنا دی تھی اور پھر وہ میک اَپ میں بھی نہیں تھی۔ میک اپ سے مبرا حسین چہرہ چودھویں کے چاند کی سی تابانی لئے ہوئے تھا۔ اس سادگی نے تو افضال احمد کو بے حد متاثر کیا تھا۔ وہ اس سادگی پر بھی اس طرح مرمٹے تھے جس طرح اس روز بجلیوں کو دیکھ کر فنا ہو گئے تھے۔

وہ شکیلہ کو اپنی کار میں ساتھ لے کر ایئرپورٹ روانہ ہو گئے۔ سجاد کو تو دوسری فلائٹ سے روانہ ہونا تھا جو ان کی فلائٹ کے دو گھنٹے بعد تھی۔ سجاد کو بینک میں کام تھا وہ چیک کیش کرانے کے لئے بینک چلا گیا۔ کل ہی ان تینوں کے درمیان آج کا پروگرام طے پا گیا تھا۔ لہٰذا شکیلہ افضال احمد کے ساتھ سکون و اطمینان اور بغیر کسی جھجک کے چلی گئی تھی۔

اسلام آباد کی سیر کے بعد وہ افضال احمد کے ساتھ چکلالہ ایئرپورٹ پر سجاد کو لینے پہنچ گئی۔ ان دونوں نے لنچ بھی کر لیا تھا۔ وہ دونوں انتظار گاہ کے صوفے پر دھنسے ہوئے تھے۔ ابھی فلائٹ آنے میں دیر تھی۔ شکیلہ تصورات کی دنیا میں کھوئی بہت دور چلی گئی تھی۔ وہ کئی بار صبیحہ اور کالج کی سہیلیوں کے ساتھ مری آئی تھی مگر آج وہ اپنے محبوب کے ساتھ مری پہنچنے والی تھی۔ محبوب کے ساتھ مری کی وادی میں سیر و تفریح اور ہی بات تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ وہ سجاد کی بانہوں میں بھری دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گئی ہے۔ بے سدھ ہو رہی ہے۔ پھر اس کے تاریک ذہن کے گوشوں میں اجالا ہوتا گیا۔ وہ راتیں اور باتیں اسے یاد آ رہی تھیں جو ناقابلِ فراموش تھیں۔ ان کا تصور ان کی رگوں میں کسی شراب کی طرح اترتا جا رہا تھا اور اس پر نشہ چھا رہا تھا۔

افضال احمد شکیلہ کو ایک ٹک دیکھے جا رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ شکیلہ کے چہرے پر سہانی یادوں کا عکس تیر رہا ہے۔ سکون ہلکورے لے رہا ہے۔ اس کے حسین چہرے پر والہانہ محبت چاندنی کی طرح چٹک رہی ہے۔ وہ اپنے آپ میں ایسی کھوئی ہوئی، ایسی بیگانہ بنی اور اپنی سرمستی میں ایسی سرشار تھی جیسے اس نے اپنے دل کے تمام دروازے بند کر لئے ہوں تاکہ کوئی اور جھانک نہ سکے۔ وہ شکیلہ میں کھو سے گئے تھے۔

ان کا ذہن بڑی تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا اور ایک معنی خیز مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر ابھر آئی تھی۔

فلائٹ کی آمد کا اعلان ہوا تو انہوں نے شکیلہ کا بازو ہلایا۔ "چلیے اٹھئے! آپ کے بھائی جان کی فلائٹ آ رہی ہے۔"

فلائٹ تو آ گئی تھی۔ مگر سجاد نہیں آیا تھا۔ پھر سجاد کا ٹیلی فون آ گیا تھا۔ وہ شکیلہ سے کہہ رہا تھا۔ "ایئرپورٹ جاتے ہوئے میری ٹیکسی کو حادثہ پیش آ گیا تھا۔ میں خیریت سے ہوں۔ مجھے معمولی سی چوٹیں آئی ہیں۔ پریشانی اور گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس حادثے کی وجہ سے اور پولیس کی کارروائی کے سبب میں ایئرپورٹ پر بروقت نہیں پہنچ سکا۔ اسی لئے فلائٹ مس ہو گئی۔ اب میں کل ٹرین سے روانہ ہو رہا ہوں۔ اس لئے کہ کسی فلائٹ میں سیٹ ہی نہیں مل رہی ہے۔ اب تم ایسا کرو۔ افضال احمد کے ساتھ مری چلی جاؤ۔ میں تیسرے دن مری پہنچ جاؤں گا۔"

پھر سجاد نے افضال احمد سے بھی بات کی اور ٹیلی فون رکھ دیا۔

وہ دونوں مری پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ افضال احمد نے مری کے سب سے بڑے اور اچھے ہوٹل میں سوٹ بک کر لیا تھا۔ جب وہ دونوں سوٹ میں پہنچے۔ ملازم سامان رکھ کر چلا گیا تو شکیلہ نے افضال احمد سے پوچھا۔ "میرا کمرہ کون سا ہے؟ کیا آپ نے میرے لئے کمرہ بک نہیں کرایا؟"

"نہیں۔" افضال احمد کے چہرے پر اور ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ کھِل اٹھی۔

"آپ نے کمرہ بک کیوں نہیں کرایا؟" وہ حد درجہ خائف اور سراسیمہ سی ہو گئی۔

"اس لئے کہ آپ میرے ساتھ اس کمرے میں رہیں گی۔ اور پھر آپ الگ کمرے میں رہ کر کیا کریں گی۔" افضال احمد اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔ "کیا مری کی خواب ناک فضاؤں میں کوئی تنہا رہ سکتا ہے؟"

شکیلہ نے چونک کر افضال احمد کی طرف دیکھا۔ اسے افضال احمد کسی کالے ناگ کی طرح نظر آ رہا تھا جو اسے ڈسنے کے لئے اس کی طرف بڑھ رہا ہو۔ وہ دہشت زدہ سی ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹی۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ "نہیں۔" وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔

"میں ایک لمحے کے لئے بھی اس کمرے میں آپ کے ساتھ نہیں رہوں گی۔ میں اپنے لئے دوسرا کمرہ لوں گی۔"

"اس لئے کہ ہوٹل میں ہم دونوں کا مذاق اڑے اور چہ میگوئیاں ہوں۔"

"کیوں .... کیوں .... مذاق کیوں اڑے گا۔ چہ میگوئیاں کیوں ہوں گی؟"

اس کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔

"اس لئے کہ میں نے رجسٹر میں ہم دونوں کا نام میاں بیوی کی حیثیت سے درج کرایا ہے۔ اب ہم دنیا والوں اور ہوٹل والوں کی نظروں میں میاں بیوی ہیں۔ آپ کے بھائی جان مسٹر سجاد کے آنے تک اس ہوٹل میں ہم دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے رہیں گے۔ پھر دوسرے ہوٹل میں منتقل ہو جائیں گے۔"

"میں ہرگز ایسا ہونے نہیں دوں گی۔ اگر آپ نے مجھے ہاتھ لگایا تو میں نہ صرف ہوٹل والوں کو چیخ چیخ کر بتا دوں گی بلکہ سجاد کو کراچی ٹیلی فون کر کے صاف صاف بتا دوں گی۔"

ہوٹل والوں کو بتا کر آپ نہ صرف اپنے پیروں پر کلہاڑی ماریں گی بلکہ ان کی نظروں میں ذلیل و رسوا بھی ہو جائیں گی۔ میرا نہیں آپ ہی کا بگڑے گا۔ لوگ کہیں گے ایک حسین ذہین اور پڑھی لکھی لڑکی کراچی سے مری تک چپ چاپ چلی آئی اور یہاں آ کر ایک شخص پر تہمت لگا کر اسے بلیک میل کرنا چاہتی ہے اور پھر آپ اپنے بھائی جان کی ناراضگی بھی مول لیں گی۔ اس لئے انہوں نے ایک معاہدے اور منصوبے کے مطابق آپ کو میرے ساتھ بھیجا ہے۔ اس منصوبے کے تحت وہ آج دوسری فلائٹ سے یہاں نہیں پہنچے اور آپ کو میرے ساتھ مری چلے جانے کا مشورہ دیا اور پھر وہ بذریعہ ٹرین اس لئے آ رہے ہیں کہ..........."

شکیلہ کو اس لمحے ایسا محسوس ہوا تھا کہ افضال احمد نے نہیں بلکہ سجاد نے اس کے سینے میں زہر میں بجھی ہوئی چھری اتار دی ہے جو اس کے دل میں اترتی جا رہی ہو اور اس کی آنکھوں کی روشنی ماند پڑ گئی ہو۔ اس کے دل کی دھڑکن بگڑ گئی جیسے دل اچھل کر باہر آ جانا چاہتا ہو۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ سے اپنا سینہ زور سے دبایا۔ اگر وہ جلدی سے سہارا نہ لیتی تو چکرا کر افضال احمد کی بانہوں میں جھول جاتی۔ وہ دیوار سے لگی ہانپتی رہی۔ اس کی سانسیں سینے میں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں اور اس کے قابو میں نہیں آ رہی تھیں۔ اس کے سینے میں جیسے آگ سی بھڑک گئی تھی۔

افضال احمد نے اسے جیسے کسی دہکتے ہوئے آتش فشاں میں جھونک دیا تھا اور اس کے جلنے کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ ششدر سی تھی اور چند لمحوں تک افضال احمد کو دہشت

سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ اس کی رگ رگ میں لہو ابل رہا تھا۔ دماغ سنسنا رہا تھا۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس خوابناک ماحول کے کمرے کی روشنی میں افضال احمد کی شیطانی آنکھیں اسے اسی طرح گھور رہی تھیں۔ جیسے وہ ان کے لئے ایک ایسا انمول خزانہ ہو جو برسوں کی جدوجہد اور دشواریوں کے بعد ہاتھ لگا ہو اور وہ اسی خزانے کے لوٹنے کے لئے کسی درندہ صفت اور انسانیت پر یقین نہ رکھنے والے ڈاکو کی طرح بے چین ہو رہے ہوں۔

شکیلہ اپنے آپ کو بڑا بے بس سا پا رہی تھی۔ وہ پوری طرح ایک شکاری کے نرغے میں آ چکی تھی' وہ جال میں پھنس چکی تھی مگر پھر بھی اس نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ رحم طلب نگاہوں سے شکاری کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک عورت ہونے کے ناطے یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ شکاری کبھی اپنے شکار پر رحم نہیں کھاتا ہے۔ وہ افضال سے کوئی بھیک نہیں مانگنا چاہتی تھی۔

افضال احمد نے جس خوبصورتی سے اپنا جال پھیلا کر اسے اپنے جال میں پھانس لیا تھا اس پر اتنی حیرت اور رنج کی بات نہ تھی' جتنی اسے افضال احمد کی زبانی سجاد کے بارے میں سُن کر ہوئی تھی۔ نفرت' حیرت اور صدمے سے اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ وہ کبھی خواب و خیال میں بھی سوچ نہیں سکتی تھی کہ سجاد اسے کسی بھیڑیے کے آگے بھی ڈال سکتا ہے۔ افضال احمد نے اس سے جو کچھ بھی کہا تھا وہ غلط تھا۔ بدگمانی پیدا کرنے' اس آزادی اور تنہائی سے فائدہ اٹھانے کے لئے کہا تھا۔

پھر وہ ہذیانی انداز میں چیخ پڑی تھی۔ "آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ آپ سراسر بہتان.........." اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

"جھوٹ!" افضال احمد کے ہونٹوں پر استہزائی مسکراہٹ پھیل گئی۔ لال لال آنکھوں میں چمک کسی کوندے کی طرح لپک گئی۔ "کیا اب بھی اس جھوٹ میں کسی قسم کی گنجائش رہ گئی ہے؟"

"سجاد.........." لفظ بھائی جان اس کی زبان پر آ کر دم توڑ گیا۔ وہ سجاد کو اپنی زبان سے بھائی جان کہنے کا یارا نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے رشتے پر کسی اور رشتے کی تہہ چڑھا کر اس رشتے کی تذلیل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر دوسری طرف اسے بھرم بھی تو رکھنا تھا۔ وہ ایک ایسے دلدل میں پھنس چکی تھی کہ نکل بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے الفاظ موزوں کرتے ہوئے کہا۔ "وہ ایسے نہیں ہو سکتے۔ کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ کسی نے اپنے رشتے کی

پاکیزگی پر بدنما داغ لگایا ہو؟"

"رشتے کیا ہوتے ہیں' مس شکیلہ خانم!" افضال کے لہجے میں زہر بھرا ہوا تھا۔ "آپ کس رشتے کی بات کر رہی ہیں؟"

"رشتے تو بہت سارے ہوتے ہیں۔" وہ کہنے لگی۔ "بہن کے' میاں بیوی' ماں باپ' دوست اور خلوص کے درمیان جو رشتے ہوتے ہیں وہی رشتے تو پاکیزگی لئے ہوتے ہیں۔ کوئی ان پر سیاہی نہیں ملتا ہے۔"

"رشتے..........!" افضال احمد نے ایک بڑا سا قہقہہ لگایا۔ "رشتے کوئی چیز نہیں ہوتے' رشتے محض فریب ہوتے ہیں۔ رشتہ تو دولت سے ہوتا ہے مس شکیلہ! دولت سے بڑا رشتہ کوئی نہیں ہوتا۔ پھر اس سے رشتہ ناطہ جوڑنے کے لئے بہت کچھ کرتے ہیں۔ کسی کو قتل کرتے ہیں۔ ڈاکہ ڈالتے ہیں' اپنے آپ کو بیچ دیتے ہیں' اپنی عزت و ناموس کا نیلام کرتے ہیں۔ ایک بیوی غیر کا بستر میلا کرتی ہے۔ یہاں اپنی بہنوں کو سنوارا اور سجایا جاتا ہے۔ باپ بیٹیوں کا سودا کرتے ہیں۔"

"یہ جھوٹ ہے۔ بکواس ہے۔" وہ تڑختے لہجے میں بولی۔ "آپ کی اپنی گھناؤنی سوچ ہے۔ اس معاشرے میں ایسا نہیں ہوتا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا ہے۔"

"اس دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا؟ کیا کچھ نہیں ہوا ہے؟ کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے؟" افضال احمد کا لہجہ استہزائی تھا۔ "دولت کے لئے تو یہاں سب کچھ ہوتا ہے۔ بہت کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا ایک شخص کو ہر بات کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ کیا آپ اخبار نہیں دیکھتی ہیں؟ آئے دن اخبارات میں ایسے واقعات چھپتے رہتے ہیں۔ دولت کے حصول کے لئے انسانوں کی خرید و فروخت کا ذکر جلی حرفوں میں ہوتا رہتا ہے اور پھر یہ تو کوئی نئی بات نہیں ہے اور پھر میں آپ کو جبر و زیادتی سے تو یہاں نہیں لایا ہوں۔ آپ خود اپنی خوشی سے آئی ہیں۔ کیا آپ کو سجاد نے نہیں بتایا کہ کس طرح پلیز کرنا ہے؟ میری دل جوئی کرنا ہے۔ میرے اشارے پر چلنا ہے۔" افضال کے لہجے میں حیرت بھر گئی۔ "سجاد نے مجھ سے کہا تھا آپ مجھ سے مکمل تعاون کریں گی۔"

"شٹ اَپ!" شکیلہ دھاڑی۔ "آپ نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ آپ سجاد کو کیا سمجھتے ہیں۔ کیا وہ..........؟"

"دیکھئے مس شکیلہ!" افضال احمد نے تیوریوں پر بل ڈال کر تیز و تند لہجے میں کہا۔ "میں آپ کو یہاں زبردستی یا اغوا کر کے نہیں لایا ہوں۔ کوئی غنڈہ اور بدمعاش آدمی

نہیں ہوں۔ میں ایک باعزت شہری ہوں۔ بڑا آدمی ہوں۔ مجھ سے تمیز سے اور ادب سے بات کریں' آپ کو مکرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے سجاد سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ میں اس سیر و تفریح میں کسی قسم کی بدمزگی' تلخی اور ناگواری پسند نہیں کروں گا۔ آپ اپنی بہن کو اچھی طرح سمجھا دیں کہ وہ مجھ سے بے تکلف دوستوں کی طرح پیش آئے۔ مری کی پُرفضا وادی میں مجھ سے اس طرح گھل مل جائے کہ کوئی شکایت نہ رہے۔ سجاد نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ ایسا ہی ہو گا۔

پھر آپ کے بھائی جان نے منصوبہ پیش کیا۔ میں آپ کو اُسی منصوبے کے مطابق تو یہاں لایا ہوں۔ ورنہ مجھے کیا ضرورت تھی۔ آپ کے ساتھ یہاں آنے کی۔ اگر ایسا کوئی منصوبہ نہیں ہوتا تو کیا میں آپ کو آپ کے بھائی جان کے ساتھ نہیں بھیج دیتا۔ یہ تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ٹکٹ بدلی بھی جا سکتی تھیں۔ سجاد میرے ٹکٹ پر بھی سفر کر سکتے تھے اور سجاد.........."

افضال احمد واضح الفاظ میں اسے سجاد کی اصلیت کے بارے میں بتا رہا تھا اور اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اس نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ واقعی سجاد خواب ناک زندگی پر اس کی عزت و آبرو قربان کرنے کے درپے ہو گیا تھا۔ کیا افضال احمد سچ کہہ رہے ہیں؟ یہ شخص سچ بن کر کھڑا ہے اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ کیا ہے؟ مگر اس کا اپنا سجاد ایسا تو نہیں ہے۔ سجاد نے کبھی کسی روز کسی موقع پر اس سے یہ تو نہیں کہا تھا کہ وہ کسی پکے ہوئے پھل کی طرح افضال احمد کی جھولی میں گر جائے۔ اس نے ایسا کوئی اشارہ نہیں کیا تھا۔ سجاد کہہ بھی کیسے سکتا تھا۔ وہ کوئی پاگل تو نہیں تھا۔ کیا دولت کی ایسی کوئی دیوانگی تھی جو وہ اتنی دور جانا چاہتا تھا۔ جذبوں اور محبتوں کو نیلام کر دے۔ اسے سجاد کی اس روز کی بات یاد آئی تھی۔ سجاد خود چاہتا تھا کہ وہ ایک عام سی زندگی بسر کرے عسرت و افلاس کے عفریت کے ڈر سے وہ ایسی تلخ و بھیانک زندگی گزارنے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ خود بھی تو تیار نہ تھی۔ اس خوابناک زندگی کے لئے اس نے سجاد کی بہن کا روپ بھرا تھا اور افضال احمد سے ملی تھی۔ اس کا سہارا تھا۔ وہ عورت تھی' عورت جو آخری سانس آخری لمحے تک اپنا دفاع کرتی ہے اور کر سکتی ہے۔

"سجاد نے مجھ سے کوئی ایسی بات نہ کی تھی۔" اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ "کیا کوئی مرد اتنا بے شرم اور بے غیرت ہوتا ہے' وہ گھر کی عورت کو کسی کے سامنے حلوے کی پلیٹ کی طرح پیش کر سکتا ہے؟"

"اس میں بے شرمی اور بے غیرتی کی کیا بات ہے؟ یہ تو خوشیوں کا سودا ہوتا ہے؟ اس میں خواہشوں کا دخل ہوتا ہے۔"

"میں کوئی بکاؤ مال نہیں ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے' سجاد نے اپنی غیرت کا سودا کیا ہو گا' میرا نہیں۔"

"انجان بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" افضال احمد نے شکیلہ کی طرف دیکھا جو پتھر کی کسی مورتی کی طرح کھڑی اسے پھٹی پھٹی اور منجمد نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

"ہر خوبصورت چیز بکاؤ مال ہوتی ہے۔ خوبصورت چیزوں ہی کے خریدار ہوتے ہیں۔ منہ مانگے دام بھی اسی کے ہی ملتے ہیں کھرے مال کے کھرے دام' میں نے اور سجاد نے آپس میں ایک سودا طے کیا تھا۔ میں اسے ایک سال میں پورے پچیس لاکھ کا آرڈر دوں گا۔ جس میں اس کے دس لاکھ روپے منافع کے ہوں گے جو کہیں نہیں جائیں گے۔ اس سودے کے عوض اس نے مجھے ایک ایسے تراشیدہ ہیرے کی پیشکش کا وعدہ کیا تھا جس کی تابانی آنکھوں کو خیرہ کر دے گی۔ وہ اس روز ہوٹل میں آپ کو اسی لئے ساتھ لے کر آئے تھے۔"

شکیلہ نے افضال احمد کو اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھا تو اس کے دل نے دھڑکنا بند کر دیا۔ وہ ذرا سی دیر کے لئے بُری طرح دہل کر رہ گئی۔ اس نے اپنے ٹوٹے پھوٹے اور بکھرے ہوئے حواس کو مجتمع کیا اور اپنی پوری قوت سے چیخی۔ "میں کہتی ہوں' آپ رک جائیں۔ اگر آپ نے ایک قدم بھی میری طرف بڑھایا تو میں آپ کی آنکھیں پھوڑ دوں گی۔ منہ نوچ لوں گی اور .... اور آپ کے منہ پر تھوک دوں گی۔"

شکیلہ کی یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ اس دھمکی میں بجلی کا سا اثر تھا جس نے افضال احمد کے قدموں میں زنجیریں ڈال دی تھیں۔ افضال احمد ٹھٹک کر رُک گئے۔ اس نے جو ہمت مجتمع کی تھی وہ کام آ گئی۔ مگر وہ جانتی تھی کہ اس سے کیا ہو گا؟ یہ تو ایک عارضی اور بے حد معمولی فتح ہے اور پھر وہ جال سے کہاں نکلی ہے؟ وہ حصار کہاں ٹوٹا ہے؟ وہ اب بھی تو پوری طرح دشمن ہی کے نرغے میں تھی۔ بدقسمتی کے نرغے میں' اس بدقسمتی کا آغاز اسی روز اور اسی لمحے سے ہو گیا تھا جب وہ پہلی بار اس ناگ سے ملی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ افضال احمد نہیں ایک ناگ ہے۔ اس کے چہرے کے پیچھے ایک اور چہرہ چھپا ہوا ہے۔ انتہائی گھناؤنا' بدنما اور بھیانک چہرہ جسے دیکھ کر بدن پر جھرجھری آ

جاتی ہے۔

افضال احمد کو محاذ فتح کرنے کی کوئی ایسی جلدی بھی نہ تھی۔ وہ تو مسکرا کے اپنے شکار کی طرف دیکھ رہے تھے جس کا چہرہ لاش کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔ دہشت نے شکیلہ کے بدن سے جیسے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا۔ وہ بڑے سکون سے پُراعتماد ہو کر ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولے۔

"آخر آپ جھوٹ کس لئے بول رہی ہیں۔ یہ ناممکن بات ہے کہ سجاد نے آپ کو غیر محسوس انداز سے یہ باور نہ کرایا ہو کہ جس فلیٹ میں آپ رہ رہی ہیں' جو خواب ناک زندگی آپ گزار رہی ہیں' شاندار قسم کی کار اور دولت کی ریل پیل کس کے طفیل ہو رہی ہے۔ یہ زندگی کس کی محتاج ہے؟ یہ سب کچھ کس کا ہے؟ اگر زندگی اس شاہانہ انداز سے گزارنا ہے تو پھر کیا قربانی دینا ہو گی؟ کوئی چیز قربانی کے بغیر نہیں ملتی ہے۔ منزل پر پہنچنے کے لئے دشوار گزار راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ سجاد نے مجھ سے کہا تھا کہ لاہور میں میری ایک چھوٹی بہن رہتی ہے میں اسے عنقریب کراچی لا رہا ہوں۔ میری بہن بڑی سوشل ہے۔ وہ جس قدر حسین ہے اس سے کہیں زیادہ پُرکشش ہے' نوجوان' ذہین' روشن خیال اور عمدہ جامہ زیب .... اس کی جامہ زیبی کا مقابلہ شاید ہی شہر کی کوئی لڑکی یا عورت کر سکے۔ اس کے علاوہ اسے مطالعہ کا بھی شوق ہے۔ اپنی پسند کی کتاب خرید کر پڑھتی ہے کالج اور یونیورسٹی کے ماحول نے اسے بذلہ سنج بنا دیا ہے۔ اسے لاہور کی فلم انڈسٹری سے متعدد بار ہیروئن کی پیشکش ہو چکی ہے۔ جسے وہ خود ہر بار بڑی بے رحمی سے ٹھکرا چکی ہے۔ وہ حالات سے سمجھوتہ کرنے والی لڑکی ہے۔ میری بہن آپ کی بہترین دوست ثابت ہو سکتی ہے۔ پھر میں نے جو بات کی اسے سجاد نے معمولی سے تذبذب کے ساتھ قبول کر لیا۔ بڑی صاف اور واضح بات تھی۔ ترقی کے زینے کے لئے اس نے ان تمام باتوں کی ہامی بھر لی جو میں چاہتا تھا۔"

"یہ سب کچھ جھوٹ ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا بھائی نہیں ہے جو اپنی.........." الفاظ شکیلہ کے حلق میں پھنس گئے۔

"دنیا میں ایسے بھائی بھی ہیں' شوہر بھی ہیں اور باپ بھی ہیں' میں ان باتوں کو دہرانا نہیں چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سچائی سے اعتراف کر لیں کہ آپ ایک شاہانہ اور حسین زندگی کو پانے کے لئے اپنے بھائی کے ساتھ شامل ہیں اور قدم قدم ملا کر چل رہی ہیں۔"

"ایسے لوگ ہوں گے مگر میں نہیں ہوں' ہم نہیں ہیں .... سجاد کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر میرے بدن پر قابض ہونے کے لئے آپ مہمل' لغو اور شرمناک باتیں لے بیٹھے ہیں۔ کیا آپ نے ان ملاقاتوں میں محسوس نہیں کیا کہ میں کیسی لڑکی ہوں۔ میری شرم و حیا سے آپ کو کچھ اندازہ نہیں ہوا کہ میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جو آپ کی خواہشات کی بھینٹ چڑھ چکی ہیں۔ آپ دنیا کی ہر لڑکی اور ہر عورت کو ایک آنکھ سے دیکھنے کے کیوں عادی ہیں۔ میں اس طبقے کی لڑکی نہیں ہوں۔ جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔" اس کے لہجے میں بڑی گرمی تھی۔

"بہت خوب' بہت خوب۔" افضال نے تالیاں بجائیں۔ "تقریر واقعی بہت اچھی کر لیتی ہیں۔ آپ میری بات کا جواب دیں۔ ایک ایسی لڑکی جو شرم و حیا کی پتلی ہو' جو ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتی ہو' جو شریف اور متوسط ہے' کیا وہ نیم عریاں سی ہو کر اپنے جوان بھائی کے ساتھ ایک غیر مرد سے ملنے ہوٹل جا سکتی ہے؟ ایسا لباس پہن کر جو اسے پورا بے حجاب کر رہا ہو' ایک ماڈل فلمی ہیروئن اور کال گرل کے انداز میں آنے والی لڑکی کے بارے میں کیا میں یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب نہیں ہوں کہ اپنے بھائی اور اپنے مستقبل کے لئے بہت دور جانا چاہتی ہیں۔ چارہ بننا چاہتی ہیں۔ اپنی ذات سے اپنے بھائی کو فائدہ پہنچانا چاہتی ہیں۔ اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ .... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

شکیلہ لاجواب سی ہو کر رہ گئی۔ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ سجاد نے اس قدر مجبور کیا تھا' کچھ اس طرح سے سمجھایا تھا کہ وہ انکار نہ کر سکی۔ اسے وہ لباس پہن کر جانا پڑا تھا اور اس لباس نے افضال احمد کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ دوسری باتیں جو اس کے متعلق تھیں' وہ ایک دم لغو اور بے سر و پا تھیں۔ وہ سمجھ گئی کہ افضال احمد آج اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔

اب وہ افضال احمد کی زبان سے ایک لفظ بھی سننے کی روادار نہیں تھی۔ وہ خشونت سے بولی۔ "آپ میرے راستے سے ہٹ جائیے' مجھے جانے دیجئے۔"

"میں آپ کے راستے کا پتھر نہیں بنوں گا۔ مگر جاتے جاتے آپ کو میری ایک بات ضرور سننا ہو گی۔" افضال احمد کا لہجہ بڑا نرم اور دھمکی آمیز تھا۔

اس نے دیوار سے ہٹ کر ساڑھی کا پلو سینے اور شانے پر درست کیا۔ اس نے اپنے اعصاب پر کسی حد تک قابو پا لیا تھا۔ پھر بھی متوحش سی ہو رہی تھی۔ ناگ کا کوئی بھروسہ

نہیں تھا' وہ کسی بھی لمحے کسی بھی کمزوری کا فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اس نے افضال احمد کا چہرہ بھانپا' چوری چوری اور سہمی سہمی نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ بظاہر بڑی بے نیازی سے تنک کر بولی۔ "جو کچھ کہنا ہے جلدی سے کہیں۔ اتنا کچھ کہنے کے بعد کیا اب بھی کچھ اور کہنے کے لئے رہ گیا ہے؟" اس نے اپنی بات پوری کر کے ساڑھی کے پلو سے چہرے سے پسینہ پونچھا۔

"آپ جو یہاں سے جا رہی ہیں وہ آپ کے اور سجاد کے حق میں کسی صورت میں بہتر نہ ہو گا۔ کل آپ اپنے بھائی جان کے ساتھ واپس آئیں گی تو آپ کو میرے قدموں میں بھی جگہ نہیں ملے گی۔ جو مجھے ٹھکراتا ہے' میری توہین کرتا ہے میں اس سے بڑا بھیانک انتقام لیتا ہوں۔"

"میں نے نہ تو آپ کی توہین کی ہے اور نہ ہی بے عزتی۔ میں یہاں سے صرف اپنی عزت و ناموس بچا کر لے جا رہی ہوں۔"

"آپ یہاں سے وہ سب کچھ چھوڑ کر جا رہی ہیں جو ابھی اور اسی لمحے تک آپ کا تھا۔ آپ اور سجاد کل سے فٹ پاتھ پر آ جائیں گے۔ آپ دونوں کے پاس سوائے عسرت و افلاس کے اور کچھ نہ ہو گا۔ سر چھپانے کے لئے جگہ نہ ہو گی۔ اس لئے کہ سجاد کے پاس جو کچھ ہے وہ میرا دیا ہے۔ کل میں سب کچھ آپ سے چھین لوں گا۔" افضال نے جیسے چڑ کر کہا۔ "تم اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہی ہو۔"

"آپ کا مطلب یہ ہے کہ مجھے کسی پکے پھل کی طرح آپ کی جھولی میں گر جانا چاہئے؟" شکیلہ برہمی سے بولی۔

"میں چاہتا ہوں کہ تم جذبات کی رو میں بہنے کی حماقت مت کرو۔" افضال احمد کے تخاطب کا انداز بدل گیا۔ وہ آپ سے تم پر آ گئے تھے اور ان کے لہجے میں نرمی تھی جیسے وہ اس نرم لہجے کو کسی حربے کے طور پر استعمال کر رہے ہوں۔

"ذرا یہ تو سوچو اس حسین زندگی کو تم پھر سے کبھی پا سکو گی؟ زندگی کا سب سے خوبصورت دور وہ ہوتا ہے جو گزر جاتا ہے اور گزر رہا ہے۔ اگر تم نے اس وقت کو لات مار دی تو تمہارا انجام بے حد بھیانک اور انتہائی عبرت ناک ہو گا۔ تمہیں ذرا سی نادانی سے ان خوابوں کو کھونا نہیں چاہئے جو کل تمہاری کوتاہیوں کا پچھتاوا بن جائے۔

"تم صرف تم شکیلہ!" افضال احمد نے گہری سانس لی اور اس طرف ایک قدم اور آگے بڑھ گئے اور وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ وہ ایک دم سے رک کر بولے۔

"تم اپنا اور اپنے بھائی کا مستقبل بنا سکتی ہو۔ بشرطیکہ تم ایک تصوراتی عورت کے چکر میں نہ پڑو۔ زندگی کے ٹھوس حقائق کو تسلیم کرو۔ یہ دیکھو کہ زندگی کا سارا حسن کس چیز میں پوشیدہ ہے۔ حسین زندگی کیا ہوتی ہے۔"

"میں اس زندگی سے تو مر جانا بہتر سمجھتی ہوں۔ جس میں ایک عورت صرف بستر کی شکن بن کر رہ جائے۔ میں عورت ہوں اور عورت ہی رہنا چاہتی ہوں۔"

"تو کیا تمہارے خیال میں ایک عورت' ایک بیوی جب بستر کی شکن بنتی ہے تو کیا اسے اس کی قیمت نہیں ملتی ہے؟" افضال احمد نے پوچھا۔

"جسم کی قیمت ایک طوائف وصول کرتی ہے۔ ایک عورت نہیں' ایک بیوی نہیں۔ ایک ماں نہیں مسٹر افضال احمد!"

"تم ایک عورت ہو کے اپنے آپ کو دھوکہ دے رہی ہو۔ تم نے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ تم سوچ کر دیکھو تو تمہیں اندازہ ہو گا کہ آج کے زمانے میں شادی کا مطلب خرید و فروخت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ پرانے زمانے میں اس کی کیا شکل تھی۔ اچھی تھی یا بری' ہمیں اس سے کیا سروکار؟ آج تو حالت یہ ہے کہ عورت شادی کر کے جسم بیچتی ہے اور اس کے بدلے اسے روٹی کپڑا سر چھپانے کی جگہ ملتی ہے۔ مال جتنا اچھا ہوتا ہے' خریدار اتنی ہی اچھی قیمت لگاتا ہے۔ سننے میں یہ بات تمہیں انتہائی گھناؤنی لگے گی لیکن یہ حقیقت ہے۔ آج ہر عورت مجبور ہے' ایسا کرنے کے لئے' چاہے وہ کتنے اونچے طبقے کی کیوں نہ ہو' وہ اپنا جسم بیچ کر ہی شوہر سے سب کچھ پا سکتی ہے۔ پھر اب وہ اس چیز کی اس قدر عادی ہو گئی ہے کہ شرم و حیا کیا آئے گی۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہوتی رہتی اور پھر دن رات اپنے آپ کو سنوارنے سجانے اور ہر رات اپنے آپ کو بیچنے کے علاوہ اس کی زندگی میں کچھ رہتا ہی نہیں ہے۔ جب اس کی پونجی اس کا مال دھیرے دھیرے کم ہوتا جاتا ہے تب وہ بے چاری بہت گھبراتی ہے کہ اب اس کے خریدار کا دل اس سے اُچٹ گیا ہے۔ اگر وہ کسی نئی دکان پر جا کھڑا ہوا تو وہ کیا کرے گی؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"جی ہاں! آپ بالکل غلط کہہ رہے ہیں۔" وہ بھنا کر بولی۔ "ان فرسودہ خیالات کو اپنے ذہن تک ہی محدود رکھئے اور اب مجھے جانے دیجئے۔ آپ جو چاہتے ہیں وہ کسی قیمت پر ممکن نہیں۔ آپ کا تعلق شاید ایسی ہی.........." اس نے کچھ سوچ کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ افضال احمد نے ہٹ کر اسے دروازے کی جانب جانے کے لئے راستہ دیا۔ وہ

تمہیں جس قدر فائدہ پہنچ سکتا ہے تم اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتی ہو۔ تمہیں اس بنیادی حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے کہ بالآخر جیت میری ہی ہو گی۔ اپنی بے جا ضد اور ہٹ دھرمی سے سوائے پریشانی کے تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا۔" افضال احمد اسی نپے تلے مدھم اور متاثر کن لہجے میں مسلسل بولتے چلے گئے اور ان کی نگاہیں شکیلہ کی صورت اور اس کے زرد رنگت پر جمی رہیں جسے خوف نے جنم دیا تھا۔

"تم نے کبھی باہر کی دنیا نہیں دیکھی ہے۔ مگر تم نے اخبارات میں ضرور پڑھا ہو گا کہ کس طرح وحشی درندے ایک لڑکی کو اغوا کر کے اپنی بھوک مٹا کے اور اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے جھاڑیوں میں یا میدان میں پھینک دیتے ہیں۔ کیا تم بھی اخبارات کی ایسی سرخی بننا چاہتی ہو؟ آخر تم نیکی و بدی کے فضول چکر میں پڑ کر اپنا حسین مستقبل تباہ کیوں کرنا چاہتی ہو؟" وہ اچانک خاموش ہو گئے تھے اور شکیلہ کو دیکھتے رہے کہ ان کے الفاظ نے اس پر کیا جادو کیا ہے۔ وہ اطمینان سے بیٹھے رہے۔ شکیلہ دروازے کے پاس کھڑی کانپ رہی تھی۔ جیسے اسے بڑے زور کی سردی لگ رہی ہو۔ دوسرے لمحے اس نے اپنے ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ پھر وہ سسک پڑی۔

افضال احمد اپنی جگہ سے اٹھے اور سگریٹ کا ایک کش لے کر اسے ایش ٹرے میں بڑی بے رحمی سے مسل دیا اور چند لمحوں تک مسلتے رہے اور دل میں فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہتے رہے۔

"گڑ سے مرنے والے کو زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔"

چند لمحوں بعد وہ شکیلہ کی طرف بڑھے اور اس کے قریب پہنچ کر رُکے، شکیلہ بلک رہی تھی۔ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ انہوں نے ایک اچٹتی سی نظر شکیلہ پر ڈالی۔ ان کا ہاتھ فضا میں لہرایا اور دروازے کے پاس لگے ہوئے سوئچ بورڈ کی طرف بڑھ گیا۔

☆======☆======☆

تھکن اور صدمے کے باوجود شکیلہ نے محسوس کیا کہ سونا اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ افضال احمد گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کے مکروہ چہرے پر فتح مندی کی لکیر مسکراہٹ کی شکل میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے کتنی بار افضال احمد کا چہرہ دیکھا تھا۔ نفرت اور حقارت سے، اس خبیث انسان نے اس کی فراغت و آسودگی کی زندگی پر جیسے بم گرا دیا تھا۔ اس کے وجود کی اور اس کی خوشیوں کی جیسے دھجیاں اڑا کے رکھ دی تھیں۔ یہ درحقیقت ایک

انسان نہیں بھیڑیا تھا۔

اسے ایسا لگا کہ افضال احمد نے اس جیسی کتنی ہی لڑکیوں کی زندگیاں تباہ و برباد کی تھیں۔ اپنی دولت کے بل بوتے پر اور معصوم اور حسین لڑکیوں اور عورتوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر انہیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔

وہ نت نئے طریقے آزما کر لڑکیوں کو بے بس کرنے والا مجرم ہے۔ جو اپنی حیثیت، امارت اور رتبے سے فائدہ اٹھا کر دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکتا ہے، قانون اور دنیا والوں کے ہاتھوں سے بھی بچ جاتا ہے۔ کوئی اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔

اس ذہنی صدمے نے شکیلہ کو پاگل سا کر دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کیا اب سب کچھ کھو دینے کے بعد اسے مر جانا چاہئے؟ اس کی عزت و ناموس کسی گہرائی میں دفن ہو چکی ہے۔ اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ وہ اپنی بے نام و نشان قبر سے نکل کر سجاد کو ٹھوکر مار دے اور افضال کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قبول کر لے۔

وہ اندر ہی اندر کسی آتش فشاں کی طرح دہک رہی تھی۔ اب افضال احمد سے انتقام لینے کی آرزو اسے جنون میں مبتلا کر رہی تھی۔ اگر اسے افضال احمد سے واقعی انتقام لینا ہوتا تو وہ اس چھری سے شاید اپنی خواہش پوری کرتی جو پھلوں کے ساتھ رکھی ہوئی تھی۔ اسے انتقام صرف افضال احمد اور سجاد ہی سے نہیں لینا تھا بلکہ دنیا کے ہر مرد سے لینا تھا۔

انتقام .... شکیلہ نے نفرت، غم اور غصے اور شدید صدمے کے عالم میں سوچا۔ افضال احمد نے اس کے ساتھ بے بسی کا جو تماشا کیا ہے وہ سجاد کے اشارے پر کیا ہے۔ جبھی تو سجاد اس سے دور ہے۔ اس وادی سے باہر ہے۔ سجاد نے اس کے ساتھ جو کیا تھا وہ تو خواب و خیال میں بھی یہ نہیں سوچ سکتی تھی۔ سجاد نے دولت کے حصول کے لئے اس کے وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسے جیسے کسی ویرانے میں پھینک دیا تھا۔ کیا یہ سب کچھ حادثہ تھا۔ شکیلہ نے اپنے دل میں سوچا اور نڈھال ہو کر صوفے پر گر پڑی، وہ سوچتی رہی، خلا میں گھورتی رہی۔ پھر ایک ایک پردہ اس کی نگاہوں کے سامنے سے اٹھتا رہا۔ اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ آج جو کچھ ہوا وہ ایک حادثہ نہیں ایک نہ ایک دن تو یہ سب ہونا ہی تھا۔ شکیلہ کو رنج اس بات کا تھا کہ سجاد نے اسے ایک کھلونا بنا دیا تھا اور وہ دولت کو راتوں رات پانے کے لئے آنکھیں بند کئے چل رہا تھا۔ دنیا کی ساری دولت اپنی جھولی میں سمیٹنے کے لئے پاگل ہو رہا تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس راستے پر چلنے والوں کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوا ہے۔ سوچتے سوچتے معاً اس کی نظر کھڑکی سے باہر ان برف پوش پہاڑوں کی

چوٹیوں پر پڑی جو اندھیرے میں کسی گھٹتے چاند کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ وہی برف جیسے اس کے دل پر جمی جا رہی تھی۔ صدمے کی برف اس کے دل کے تمام گوشوں میں بھرتی جا رہی تھی۔ زندہ رہنے کی آرزو اس برف کے نیچے دفن ہونے لگی تھی۔ اس نے تو سجاد سے محبت کی تھی' اس نے سجاد کی خاطر ماں باپ جیسی ہستیوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ وہ اپنے خوابوں کے پیچھے بھاگتی ہوئی اتنی دور چلی آئی تھی کہ واپسی ناممکن تھی مگر سجاد نے اس کی محبتوں کا کیا صلہ دیا تھا؟ اس کی قربانی و ایثار کیا اس لئے تھا کہ وہ بازار کی کوئی جنس بن جائے؟ سجاد کے لئے بکاؤ مال ہو گئی تھی۔ اس کے لئے ترقی کا زینہ بن گئی تھی۔ کیا اس دن کے لئے اس نے اپنی زندگی اور مستقبل کو داؤ پر لگایا تھا۔ اس کا سانس سینے میں دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ پھر اس کی نظروں میں ان گنت چہرے ابھر آئے۔ ان میں ایک چہرہ صبیحہ کا تھا۔ پھر اس کے ماں باپ کے چہرے ابھر آئے جو لاش کی طرح سفید نظر آ رہے تھے۔ سب سے آخر میں ارشد کا چہرہ ابھر آیا۔ اس نے ان چہروں کو ذہن سے جھٹک دینا چاہا مگر وہ چہرے تو اژدھے بن کر اس کے ذہن سے چمٹ گئے تھے۔ اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس کا دل بے اختیار بھر آیا' اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آیا۔ وہ باوجود کوشش کے اپنے آنسوؤں کو روک نہ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ گو اس نے اپنے آپ پر کسی حد تک قابو پا لیا تھا مگر آنسو اس کی آنکھوں سے چپکے چپکے بہہ رہے تھے اور رخساروں کی شکنوں میں بہتے ہوئے اس کی خالی گود میں گرتے جا رہے تھے۔ اس نے روتے روتے ایک دم سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ آخر سجاد کو کیا حق پہنچتا تھا کہ وہ اسے کسی کے بستر کی شکن بنا ڈالے۔ کیا سجاد آج کے دن کے لئے ہی محبت کا ڈھونگ رچا رہا تھا۔ کیا اس لئے محبت کا فریب دیا تھا؟ آخر سجاد نے کس بات کی اتنی بڑی سزا دی ہے؟

اس کے تصور میں پھر ارشد کا چہرہ ابھر آیا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ اگر اس نے ماں باپ کی بات مان لی ہوتی اور ارشد سے شادی کر لی ہوتی تو آج یوں تاخت و تاراج نہ ہوتی۔ وہ بدصورت مرد جو آج اسے بہت خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ اسے گھر کی چاردیواری کے اندر عزت و احترام سے رکھتا' اس کی عزت و ناموس کی حفاظت کرتا اور اس وہ کبھی آنچ نہ آنے دیتا۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ وہ دولت سے نہیں اس کی ذات سے محبت کرتا اور اس کی محبت میں کوئی کھوٹ نہ ہوتی بلکہ وہ تو سونے کی طرح کھری ہوتی۔ وہ ایک مرد اور شوہر کی پناہ میں ہوتی' جو آنکھ اس کی طرف اٹھتی [illegible]

پھوڑ دیتا' جو ہاتھ اس کی طرف بڑھتا وہ اسے کاٹ کر رکھ دیتا۔ وہ سجاد کی طرح بے شرم اور بے غیرت اور ننگِ انسانیت تو نہ ہوتا کہ وہ اسے کسی بھیڑیے کے آگے ڈال دے۔ مگر اس نے جذبات اور خوابوں کے اندھے جنون میں مبتلا ہو کر ایک ہیرے کو کھو دیا تھا۔ آج اسے اسی بات کی تو سزا مل رہی تھی کہ وہ اپنی ہی نظروں میں گرتی جا رہی تھی اور آج وہ کسی بھی لائق نہ رہی تھی۔

اس ذلت کا ذمہ دار کون ہے؟ شکیلہ نے چادر کے کونے سے اپنی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے سوچا۔ وہ خود' سجاد.......... یا.......... افضال احمد؟

اسے اپنا اور افضال احمد کا کوئی قصور نظر نہیں آ رہا تھا۔ سارا قصور تو سجاد کا ہی لگ رہا تھا۔ جس نے دولت کی خاطر محبت اور عورت کے تقدس کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ سجاد ہی نے تو محبت کی آڑ لے کر اسے خوابناک زندگی کے نشے کا چسکا لگایا تھا۔ اسے روشنیاں دکھائی تھیں اور وہ اسے ایسے تاریک راستے پر لے گیا تھا جہاں پر اسے اب کچھ بھی سجھائی نہیں دے رہا ہے۔

آج کی رات اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس کے صدمے نے اسے ذہنی و جسمانی طور پر پوری طرح مفلوج کر دیا تھا۔ مایوسی کی انتہا نہ تھی۔ دل شکستگی اور شدید صدمے کے سوا اب اس کے ذہن میں کچھ نہ تھا۔ پھر بھی وہ سوچ رہی تھی کہ اب اس کا یہاں رہنا اس کے لئے مزید ذلت کا سبب ہو گا۔

اب افضال احمد رات دن اس پر اپنا تسلط قائم رکھنا چاہے گا۔ جیسے وہ اس کی خریدی ہوئی چیز ہو' اسے کل صبح یہاں سے کسی نہ کسی طرح نکل کر کراچی پہنچنا ہو گا۔ وہ چاہتی تھی کہ کراچی پہنچ کر سجاد کے منہ پر تھوک دے۔ وہ جانتی تھی اور جان گئی تھی کہ سجاد مری نہیں آئے گا۔ وہ مختلف حیلے بہانے سے کراچی ہی رہے گا تاکہ وہ افضال احمد کے ساتھ ہی رہ سکے۔

شکیلہ نے گردن گھما کر افضال احمد کی طرف دیکھا کہیں یہ درندہ جاگ تو نہیں گیا ہو گا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ جاگ رہا ہو اور اس کے رونے کا تماشا دیکھ رہا ہو۔ مگر وہ سو رہا تھا' بڑی گہری نیند۔ اس نے دل میں سوچا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ساری زندگی اسی طرح سوتا رہے۔

وہ صوفے پر ہی لیٹ گئی' اس لئے کہ اس کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ بدن میں جیسے جان ہی نہ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کچھ دیر کے لئے سو جائے تاکہ صبح یہاں سے نکلے تو

اس کی توانائی نیند اور آرام کی وجہ سے کسی حد تک بحال ہو چکی ہو مگر نیند کیسے اور کیوں کر آتی۔ یہ رات تو اس کے لئے قیامت کی رات تھی اور پھر نیند تو اس کے لئے غیر معمول چیز بن گئی تھی۔ ہجر کے بے حساب دنوں کی طرح' فراق کی بے خواب طویل راتوں جیسی عذاب ناک اور بے حد اذیت ناک۔ وہ صوفے پر لیٹی ہوئی کروٹیں بدلتی رہی۔

☆======☆======☆

افضال احمد کی آنکھ کھلی تو انہوں نے دیکھا کہ دن نکل آیا ہے۔ کمرے میں سورج کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ شکیلہ بستر پر نہ تھی۔ وہ سنگھار میز کے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ انہوں نے شکیلہ کے بالوں کی نمی سے محسوس کیا کہ وہ نہا کر نکلی ہے اور وہ بے حد اداس اور مضمحل سی ہے۔ کسی اداس گیت کی طرح نظر آ رہی ہے اس کے چہرے پر بلا کا کرب ہے۔ مگر اس کے باوجود انہیں فضا میں پھولوں کی سوندھی سوندھی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔

افضال احمد نہا کر غسل خانے سے باہر آئے تو انہیں اپنی نظروں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ شکیلہ اپنے ہاتھوں میں سوٹ کیس لئے کھڑی تھی۔ انہوں نے شکیلہ کے پاس آ کر پوچھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"کیا تم سجاد کی واپسی تک رکو گی نہیں؟"

"وہ کل شام تک پہنچ رہے ہیں؟"

"میں کہیں بھی جاؤں آپ کو اس سے کیا؟" شکیلہ نے تنک کر جواب دیا۔ "میں ایک دن تو کیا ایک لمحے کے لئے یہاں نہیں رک سکتی۔"

"تمہارے لئے دن کی روشنی میں بھی نکلنا خطرے سے کم نہیں ہے۔ تنہا عورت ہر مرد کو للچا دیتی ہے۔ تم یہاں سے تنہا نکلو گی تو اپنی منزل پر پہنچ نہ سکو گی۔ خاک چھانتی پھرو گی اور پھر کسی مرد کے فریب میں آ کر اس کی عیاری کا شکار ہو جاؤ گی۔" افضال احمد نے اسے سمجھایا۔

"جیسے میں آپ کی عیاری اور فریب میں آ کر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی۔" شکیلہ کے لہجے میں زہر کے ساتھ ساتھ اس کے دل کا غم بھی نمایاں تھا۔

"لاؤ سوٹ کیس مجھے دے دو۔" افضال احمد اس کی طرف بڑھا۔ "تمہارا دماغ

ٹھکانے نہیں' تمہیں سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔"

افضال احمد نے سوٹ کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو شکیلہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ "کیا اب بھی کسی لڑکی کا دماغ ٹھکانے رہ سکتا ہے؟ کون شریف لڑکی ہو گی' جو اپنا سب کچھ کھونے' ظلم' جبر و زیادتی اور بربریت کا نشانہ بننے کے بعد ہوش و حواس میں رہے گی۔ میں بے غیرت اور بزدل ہوں۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتی وہ کب کی اس کھڑکی سے کود کر اپنے میلے اور غلیظ وجود سے دنیا کو پاک کر جاتی۔"

"کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے۔"

افضال احمد نے اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا۔ سوٹ کیس سنگھار میز کے پاس رکھ کر اسے پلنگ پر لے کر بیٹھ گئے۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولے۔

"تم عورت ہو' عورت نہ صرف جذباتی ہوتی ہے بلکہ خوابوں کی دنیا میں کھوئی رہتی ہے۔ جب کہ مرد حقیقی دنیا کی سنگلاخ زمین پر قدم رکھ کر چاروں طرف دیکھتا ہے۔ یہ دنیا چار روز کی ہے' چار دن کی چاندنی کی طرح' زندگی میں جو خوبصورت وقت ملتا ہے وہ بہت تھوڑا ہوتا ہے اور وہ پر لگا کر اڑ جاتا ہے۔ ہم ان لمحوں کو پکڑنا چاہیں تو پکڑ نہیں سکتے ہیں۔ ایک اچھی اور حسین زندگی گزارنے کے لئے آج دنیا میں ہر شخص جدوجہد کر رہا ہے۔ بڑی طاقتیں اپنے عوام کی خوش حالی کے لئے چھوٹی طاقتوں کا گلا گھونٹ رہی ہیں۔ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگل رہی ہے۔ یہ آج سے نہیں ہو رہا' یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ہے۔

پھر اس طرح ایک خواب ناک زندگی کے لئے دوڑ ہو رہی ہے' اس دوڑ میں ہر کوئی آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے' فریب دیتا ہے' تم نے کبھی عسرت و افلاس کی زندگی نہیں دیکھی ہے۔ یہ کہہ دینا بہت آسان ہے کہ میں جھونپڑی میں رہ کر خوش رہ سکتی ہوں۔ تم ایک دن کسی جھونپڑی میں رہ کر دیکھو گی تو پتا چلے گا وہ زندگی کیسی عذاب ناک ہوتی ہے۔ غربت سے بڑا عذاب کوئی نہیں ہے۔ تم سرکاری ہسپتال میں جا کر دیکھو۔ غریب لوگ کس طرح سسک سسک کر مر رہے ہیں۔ ان کا پرسان حال کوئی نہیں ہے اور پھر غربت کا عفریت تو سب سے پہلے محبت کو نگل جاتا ہے۔ کیا تمہیں چاروں طرف دیکھ کر کچھ عجیب سا نہیں لگتا ہے؟ کیا یہ سوچ سوچ کر حیرت نہیں ہوتی ہے کہ آخر یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ آج ہر آدمی کا اور ہر عورت کا یہ حال ہے کہ ایک خاص نشان پر جا کر اس کی ساری سوچیں' ساری خواہشیں' ساری آرزوئیں اور تمنائیں ختم ہو جاتی ہیں۔ ایک

لڑکی اور عورت یہ چاہتی ہے کہ ایسا فیشن ایبل لباس ہو جس میں اس کی حشر سامانیاں نمائش بن جائیں' نئے قسم کا میک اپ ہو جس سے وہ دنیا کی حسین ترین عورت لگے اور ہر مرد کی نگاہوں کی توجہ کا مرکز بن جائے۔ نئے مشغلے ہوں' دنیا کے حسین ترین خطوں کی سیر و تفریح ہو۔ شاہانہ رہن سہن ہو۔ دولت مند اور اونچا عہدیدار شوہر ہو۔ کم سے کم ذمہ داریاں ہوں۔ کچن میں قدم رکھنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ بچے ناپسند' سیر و تفریح اور پارٹیاں ایک عورت کی فطری خواہش اور اس کے خواب ہیں۔ آج کی ہر لڑکی اور ہر عورت کی ایک ہی سوچ ہے۔ ایک ہی منزل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کوئی نیچے والی سیڑھی پر کھڑی ہے تو کوئی اوپر والی سیڑھی پر کھڑی ہے۔ مردوں کا یہ حال ہے کہ خوبصورت کار ہو' بنگلہ یا کوٹھی ہو جو اندر سے کسی محل کی طرح سجاوٹ لئے ہو۔ پہلو میں حسین اور پُرشباب عورت ہو۔ خوبصورت سی اور اونچی کرسی ہو۔ اونچا عہدہ ہو۔ ان کی نظر میں دنیا میں اس کے علاوہ کوئی اور کام نہیں ہے۔ زندگی کا اب یہی مقصد رہ گیا ہے۔"

افضال احمد سانس لینے کے لئے رکے انہوں نے شکیلہ کا چہرہ بھانپا اور محسوس کیا کہ ان کے جادو اثر الفاظ شکیلہ کے وجود میں خواب ناک راحتوں کے زہر کی طرح سرایت کرتے جا رہے ہیں۔

وہ پتھر کی مورتی کی طرح بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اب افضال احمد نے گہری سانس لے کر اپنی بات جاری رکھی۔ "ہمیں زندگی سے جس طرح سب کچھ لینا پڑتا ہے۔ اس طرح اسے اپنا سب کچھ دینا بھی پڑتا ہے۔ ورنہ آگے بڑھنے کے سارے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ آج ہر آدمی ایک دوسرے سے سہماسہما' خوفزدہ اور الگ الگ نظر آتا ہے۔ کوئی کسی کے قریب جاتے ہوئے ڈرتا ہے اور ایک دو قدم سے دور کھڑے سب اجنبی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ جیسے وہ آدمی' آدمی نہ ہو کوئی خون آشام بھیڑیا ہو۔ آج آدمی کی نظر میں آدمی' آدمی ہی نہیں رہا ہے۔

کبھی تم نے یہ سوچنے کی ضرورت بھی محسوس کی ہے کہ ایک ہی زمین پر بسنے والے انسانوں میں آخر اس قدر تضاد کیوں؟ یا پھر ہم ہی لوگ ایسی پستی میں اتر چکے ہیں جہاں سے ہمیں اونچی باتیں' اونچے انسان اور اونچے کردار کے لوگ نظر نہیں آتے' مجھ سے میرا دل اکثر یہ کہتا ہے کہ میں اس بستی سے نکل کر اوپر آجاؤں۔ میں اوپر آتا ہوں تو مجھے کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا ہے جس کا باطن سیاہ نہ ہو۔ ہر شخص اپنی اپنی غرض میں اندھا نظر آتا ہے۔ وہ جو کرتا ہے غلط نہیں کرتا ہے۔ دوسرا بھی جو کچھ کرتا ہے وہ صحیح

نہیں ہے۔ اب میں اوپر آکر کیا کروں؟"

وہ دل گرفتہ لہجے میں بولی۔ "آپ کچھ بھی کہہ لیں۔ میں تو یہ سوچ رہی ہوں اس زندگی سے تو کسی ندی' نالے میں ڈوب مرنا زیادہ بہتر ہوگا۔ میں اب کس حیلے بہانے اس دنیا میں زندہ رہوں؟"

"جینے والوں کے لئے بہانوں کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ ہزار بہانوں سے ایک حسین اور خوشگوار زندگی گزار سکتی ہو۔" افضال احمد نے کہا۔

افضال احمد کی باتیں ان کی سمجھ میں کچھ کچھ آرہی تھیں۔ "اب سجاد کی نظر میں میری وقعت کیا رہے گی؟"

"یہاں عزت کا نہیں' اہمیت کا خیال ہے۔ جب اسے سال بھر کے لئے آرڈر مل جائے گا۔ بروقت رقم کی ادائیگی ہوتی رہے گی اس کے نزدیک تمہاری اہمیت بڑھی رہے گی اور پھر سجاد کو بتانے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ کیا ایک بہن ایک بھائی کو یہ بتا سکتی ہے کہ وہ اس کے لئے بہت آگے جا چکی ہے؟"

"کیا یہ حقیقت ہے کہ سجاد نے اپنی غرض کے لئے مجھے آپ سے ملایا اور ساتھ بھیجا تھا؟ کیا اس نے آپ نے مل کر منصوبہ بنایا تھا کہ آپ مجھے اپنے ساتھ مری لے جائیں۔ دو تین دن تک سیر و تفریح کریں۔ اسے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ وہ کوئی شکایت نہ کرے گا؟"

"جب کوئی شخص اپنی حسین بیوی اور نوجوان بہن سے متعارف کرواتا ہے تو اس کا یہی مطلب ہوتا ہے۔" افضال احمد کہنے لگے۔ "اس سے پہلے سجاد نے تمہاری بھابی نسرین سے ملوایا تھا۔ اسے بھی میرے ساتھ اسی طرح بھیج دیا تھا جس طرح اس نے تمہیں بھیجا۔ تم میں اور تمہاری بھابی میں مَیں نے ایک فرق پایا ہے۔ وہ عورت حقیقت پسند تھی۔ وہ خوابوں میں کھو کر زندگی گزارنے کی ہرگز قائل نہ تھی۔"

"نسرین.........!" وہ اچھل پڑی۔ "اوہ تو نسرین بھی اس غلاظت کے دلدل میں گر چکی ہے؟"

"ایک بار نہیں' کئی بار' آج جو کچھ بھی سجاد کے پاس ہے وہ نسرین اور میری بدولت ہے۔" افضال احمد بولے۔

"تمہیں زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں اور سجاد کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی سجاد تم سے پوچھے گا۔ کل کلاں اگر وہ تم سے پوچھ بھی بیٹھے تو کہہ دینا کہ

ہم ہوٹل کے الگ الگ کمروں میں تھے۔ دوستوں کی طرح ملتے اور گھومتے رہے تھے۔ میں نے احتیاطاً ایک کمرہ تمہارے نام سے بھی بک کروا رکھا ہے۔ تم کل دوپہر اس کمرے میں منتقل ہو جانا۔ اس طرح انجان اور خوش رہنا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ میں کل صبح یہاں سے نتھیا گلی جا رہا ہوں۔ واپس دوسرے ہی دن آ رہا ہوں۔ اس طرح سجاد کو ذرہ برابر بھی شک نہیں ہو گا۔"

☆======☆======☆

کوئی دس دن بعد وہ سجاد اور افضال کے ساتھ واپس کراچی پہنچی تو اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے وجود میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غلاظت بھر چکی ہے۔ اسے کوئی لاعلاج بیماری لاحق ہو چکی ہے اور وہ اندر ہی اندر گھل رہی ہے۔ اذیت کے نازک مرحلوں سے گزر رہی ہے اس کے وجود میں چھپا کوئی نشتر زنی کر رہا ہے۔ ایک عفریت ہے جو اس کے قلب میں ڈھل گیا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کہاں جائے۔ اس مرض کی دوا کسی معالج کے پاس نہ تھی۔ صرف ایک موت ہی تھی جو اسے نجات دلا سکتی تھی۔ اعصاب شکنی سے دوچار ہو کر رہ گئی تھی۔

اب اسے چیک کی وصول یابی کے لئے بھی جانا پڑتا تھا۔ سجاد نے اسے ایسے دلدل میں دھکیل دیا تھا کہ وہ نکل بھی نہیں سکتی تھی اور یہ بات ایک افضال احمد تک محدود نہ رہی تھی۔ وہ ایک روز اسے تنویر بیگ سے ملانے لے گیا' جو افضال احمد سے دو ہاتھ بڑا تھا اور وہ افضال احمد کی طرح شائستہ مزاج اور خوبصورت نہیں تھا اور بہت زیادہ بدصورت بھی نہیں تھا۔ زخم کا ایک مندمل ہو جانے والا نشان اس کے ماتھے پر دو انچ لمبی لکیر کی طرح بائیں آنکھ کے اوپر اس طرح پھیلا ہوا تھا کہ آخری کنارہ پلکوں کو چھوتا تھا۔ ایسا ہی ایک زخم دائیں رخسار پر بھی تھا لیکن اس سے اس کا چہرہ بدنما اور بدصورت نہیں ہوا تھا۔ جیسے اس کے سیاہ کارناموں کے نتیجے میں ملنے والے یہ تحفے تھے جو اس کے چہرے پر سجے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا۔ ایک بچہ بھی یہ دیکھ کر آسانی سے کہہ سکتا تھا کہ زخموں کے یہ نشان چاقوؤں کے نہیں' ناخنوں کے ہیں۔ واپسی میں سجاد نے اس سے کہا۔

"تنویر بیگ بڑی موٹی مچھلی ہے۔ اسے ہر قیمت پر پھانسنا ہے۔"

"کون سی قیمت پر؟ کیا ہم اس کے ساتھ بھی مری جائیں گے؟" شکیلہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس کے لہجے میں طنز تھا۔

سجاد گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کی نظریں سڑک پر جمی تھیں اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ وہ شکیلہ کے لہجے کے طنز کو نہ سمجھ سکا تھا اس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے تائیدی لہجے میں کہا۔

"اگر وہ سوئٹزرلینڈ چلنے کے لئے بھی کہے تو چلنا پڑے گا۔ اگر یہ مچھلی ہاتھ سے نکل گئی تو یہ سمجھو کہ ہم دوسروں سے دس سال پیچھے رہ جائیں گے۔"

"اس نے مجھے صرف مجھے۔" شکیلہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔ "پرسوں رات ڈنر پر مدعو کیا ہے۔ کیا میں تنہا ہی چلی جاؤں؟"

"جب تمہیں اکیلا ہی بلایا ہے تو اکیلا ہی جانا پڑے گا۔ اب تو تمہیں گاڑی چلانا بھی آ گئی ہے۔ تم گاڑی لے کر چلی جانا۔"

"میں گاڑی نہیں لے جاؤں گی بلکہ تم خود مجھے ہوٹل لے جا کر چھوڑ دینا۔ جس طرح کراچی کی زندگی پُرخطر ہے اسی طرح یہاں کا ٹریفک بھی ہے۔"

تیسرے دن سجاد نے شکیلہ کو ہوٹل پر لے جا کر اتار دیا۔ شکیلہ نے گاڑی سے اتر کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔ "گڈلک شکیلہ! اگر تنویر بیگ سے کام بن گیا تو یہ سمجھ لو کہ ہمارے دن پھر جائیں گے۔ پھر ہم خود ایک فرم قائم کر لیں گے۔ ساری دنیا کی سیر و تفریح کر کے آئیں گے۔ اس شہر میں ہماری حیثیت مثالی ہو گی۔ اتنا بڑا ٹھیکہ آج تک اس ملک میں کسی کو نہ ملا ہو گا۔"

شکیلہ ایڑیوں پر گھوم گئی تھی۔ اس کے چہرے پر اچانک ابھرتی پھیلتی ہوئی زہرخند مسکراہٹ کو وہ دیکھ نہیں سکا تھا۔ وہ تو شکیلہ کا سراپا دیکھ رہا تھا جو اس مخصوص لباس میں کسی آتش فشاں کی طرح دہک رہا تھا جو اس نے ایسے ہی وقتوں کے لئے خرید کر رکھے تھے۔ شکیلہ اس لباس میں جیسے بے لباس ہو جاتی تھی۔ آج کون سی لڑکی اور عورت تھی جو لباس پہن کر بھی بے لباس نظر نہیں آتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ شکیلہ کو سجاد نے مجبور کیا تھا اور کرتا رہتا تھا۔ شکیلہ آج لڑکی نہیں' عورت نہیں' بیوی نہیں اور ظاہری بہن نہیں تھی۔ وہ صرف چارہ تھی۔ بڑی مچھلیوں کو پکڑنے کے لئے۔ وہ اپنے اس چارے کو دیکھ رہا تھا جو آج وہ بڑی مچھلی کے سامنے ڈال رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بڑی مچھلی آج پھنسے بغیر نہیں رہے گی۔

اس روز جو تنویر بیگ کی شکیلہ سے ملاقات ہوئی تھی تو وہ شلوار قمیض میں تھی۔ گو اس کا ریشمی بھڑکیلا لباس تھا اور اس کا حسن و شباب بھی بھڑک اٹھا تھا۔ تنویر بیگ اسے دیکھ کر بھڑک گیا تھا اور اسی روز سے وہ تڑپ رہا تھا۔ اس نے بے شمار لڑکیاں اور عورتیں

دیکھی تھیں۔ کراچی میں حسن و شباب کی کمی نہیں تھی۔ اس کی زندگی میں جو حسین لڑکیاں اور عورتیں آئیں تھیں ان میں سے ایک بھی شکیلہ کے برابر نہ تھی۔ اس نے شکیلہ کو گہرے جامنی رنگ کے لباس میں دیکھا تو اس کا دل بے قابو ہو گیا۔ شکیلہ اس کی نظروں کے سامنے بیٹھی تو وہ کچھ دیر کے لئے دنیا و مافیہا کو بھول گیا۔ شکیلہ نے اس سے کہا۔

"تنویر بیگ صاحب! میں پتھر کی مورتی نہیں ہوں جو آپ مجھے یوں دیکھ رہے ہیں۔ آپ مجھے نہ صرف دیکھئے بلکہ باتیں بھی کیجئے نا؟"

"میں نے آج تمہیں دیکھنے کی خاطر ہی بلایا ہے۔ ہم دونوں باتیں تو کسی غیر ملک میں جا کر کریں گے۔ آپ یورپ یا امریکہ کے کون سے شہر چلنا پسند کریں گی۔"

"مگر اس ٹھیکہ کا کیا ہو گا؟ جب تک سجاد کو ٹینڈر نہیں ملے گا میں کہیں نہیں جا سکتی اور نہ جاؤں گی۔ یہ میری پہلی شرط ہے۔"

"بس یہ سمجھو کہ سجاد کا ٹینڈر منظور ہو گیا اور اسے دو کروڑ کا ٹھیکہ مل گیا۔ اب تو خوش ہو؟ اور ہاں .... اور کیا کیا شرائط ہیں۔"

"شرط تو کوئی اور نہیں ہے لیکن ایک مسئلہ ضرور درپیش ہے۔ اس مسئلہ کو حل کرنا آپ کا کام ہے' میرا نہیں۔" وہ شوخ نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔

"کون سا مسئلہ ہے۔ چندا؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا اور کہا۔ "میں دنیا کا ہر مسئلہ چٹکی بجاتے حل کرنا جانتا ہوں۔"

"سجاد مجھے آپ کے ہمراہ یورپ وغیرہ تو کیا سوات بھی جانے نہیں دے گا۔ وہ ہم دونوں کے بیچ ایک مسئلہ بن جائے گا۔"

"سجاد مسئلہ بن جائے گا!" تنویر بیگ کا شیطانی ذہن بڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر وہ اچھل پڑا۔ "ہم ایسا کریں گے کہ سجاد کو کسی کام سے کسی لڑکی یا عورت کے ساتھ ایک ہفتے کے لئے یورپ بھیج دیں گے اور ہم دونوں سوات میں گھوم پھر آئیں گے۔"

شکیلہ کا جی تو چاہا کہ تنویر بیگ کے منہ پر تھوک دے مگر وہ ضبط کر کے رہ گئی۔ ڈنر کے بعد اس نے شکیلہ کو مغربی رقص دکھانا چاہا لیکن شکیلہ نے بڑی سختی سے یہ شو دیکھنے سے منع کر دیا۔ البتہ اس نے تنویر کے ساتھ کسی بھی فلم کا آخر شو دیکھنے کی ہامی بھر لی۔ ہال میں بیٹھ کر تنویر بیگ نے اسے فلم دیکھنے ہی نہیں دی۔ وہ اسے بے ہنگم باتوں سے بور ہی کرتا رہا تھا۔

رات ایک بجے تنویر بیگ نے اسے گھر پر چھوڑا تھا۔ سجاد اس کے انتظار میں گھڑیاں کاٹ رہا تھا۔ وہ پاگل ہو رہا تھا جیسے ہی اس نے کمرے میں قدم رکھا۔ سجاد نے فوراً ہی سوال کر دیا۔

"کیا ہوا اس دو کروڑ کے ٹینڈر اور ٹھیکے کا۔ ہمیں ہی ملے گا نا؟"

"ہاں .... لیکن اس کے لئے اس نے پُرفضا مقامات پر سیر و تفریح کی شرط رکھی ہے۔ مگر میں کسی مرد کے ساتھ تنہا کہیں نہیں جاؤں گی۔ آخر یہ لوگ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟ تم کیا سمجھ رہے ہو؟ کیا میں کوئی بازاری جنس ہوں؟ کیا میں تمہاری بیوی اور عورت نہیں ہوں؟"

"کیا کہا تم نے .... تم نہیں جاؤ گی؟" اس نے حیرت اور غصے سے شکیلہ کی طرف دیکھا۔ "کیا تم چاہتی ہو کہ میں دو کروڑ کے ٹھیکے سے محروم ہو جاؤں؟ آخر تم تنویر بیگ کے ساتھ کیوں نہیں جاؤ گی؟ جانے میں حرج ہی کیا ہے؟ اس کے ساتھ کچھ دنوں کے لئے سوات گھوم کر چلی آؤ گی تو کون سا فرق پڑ جائے گا؟ کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی؟ تم یہ کیوں نہیں دیکھ رہی ہو کہ اسے خوش کرنے سے دو کروڑ کا ٹھیکہ مل جائے گا۔ پورے دو کروڑ کا۔ جس میں ذرا سا گھپلا کرنا پڑے گا جس کی وجہ سے پورے ایک کروڑ کا فائدہ ہو گا۔ اسے خوش رکھنے ہی کی بدولت یہ فائدہ ہو گا کہ وہ گھپلا چل جائے گا اور وہ یہ گھپلا بھی برداشت کر جائے گا۔ اس لئے کہ وہ تمہاری خاطر سب کچھ منظور کرنے کو تیار ہے۔"

"کیا کہا؟"

حیرت اور غصے سے شکیلہ کا سارا وجود کانپ اٹھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "اس کے ساتھ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا؟ تم یہ بھول رہے ہو کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔ تم مجھے اپنی بہن کی حیثیت سے بھیج رہے ہو۔ تنویر بیگ ایک غیر مرد ہے۔ ایک غیر مرد کے ساتھ میں سوات چلی جاؤں۔ تنہا جا کر اس کے ساتھ سیر و تفریح کروں؟ آخر میں کیا ہوں؟ تمہاری بیوی ہوں' عورت ہوں یا داشتہ ہوں؟"

"یہ تم ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے بارے میں اس انداز سے کیوں سوچتی ہو؟ اس قدر جذباتی کیوں ہو رہی ہو؟" سجاد کا لہجہ تیز و تند ہو گیا۔ "آخر ایک ایسے شخص کے ساتھ جو تمہارے باپ کی عمر کا ہے' اس کے ساتھ تنہا جانے اور سیر و تفریح کرنے میں کیا برائی ہے" تمہیں اس کے ساتھ اسی طرح چلا جانا ہے جس طرح تم افضال احمد کے سات

گئی تھیں۔ سوات جا کر اس کے ساتھ ایک کمرے میں تو نہیں ٹھہرنا ہے۔ جس طرح تم افضال احمد کے ساتھ مری جا کر الگ کمرے میں ٹھہری تھیں۔ اسی طرح تنویر بیگ کے ساتھ جا کر الگ کمرہ لے کر ٹھہر جانا۔ اسے خوش کرنا ہے۔ وہ تمہاری قربت سے خوش ہو جائے گا۔ جب وہ خوش ہو جائے گا ہمیں بھی خوش کر دے گا۔ اتنا خوش کر دے گا کہ ساری زندگی ہنسی خوشی سے گزرتی رہے گی۔ ہم بہت بڑے آدمی بن جائیں گے۔ اتنے بڑے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔"

"مرد کسی ناگ سے کم نہیں ہوتا ہے۔ مجھے اس کے ساتھ جاتے ہوئے اس لئے خوف آ رہا ہے کہ کہیں عزت و ناموس پر حرف نہ آ جائے۔" شکیلہ کو اپنے الفاظ کھوکھلے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کی نظروں میں افضال احمد کا چہرہ گھوم گیا۔ اس روز اس کے سینے میں خلش کا جو خنجر پیوست ہوا تھا وہ آج تک اسے نکال نہ سکی تھی۔ "مرد جس عمر کا بھی ہو وہ ایک عورت کے معاملے میں ناگ ہوتا ہے۔ وہ کسی لمحے مجھے ڈس سکتا ہے۔"

سجاد جز بز ہو کر بولا۔ "کیا افضال احمد تمہارے لئے ناگ بن گیا تھا؟ تم اس کے ساتھ مری میں تین دن رہی تھیں اس نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ صرف تمہاری قربت سے خوش ہو گیا تھا اور آج تک خوش ہے۔ اسی وجہ سے آج تک ابھی تک اس کی نوازشات کا سلسلہ جاری ہے۔ میں لاکھوں روپے کا فائدہ حاصل کر چکا ہوں۔ مزید فائدے حاصل ہونے کی توقع ہے۔ اس لئے کہ اسے ایک بہت بڑا کام ملنے والا ہے۔ ہماری دوستی اس سے برقرار رہی اور وہ خوش ہوتا رہا اور ہم اسے خوش کرتے رہے تو پھر وہ کام بھی ہمیں ہی ملے گا۔"

وہ سجاد کو کیا بتاتی کہ افضال احمد نے اس کے ساتھ کیا کچھ کیا۔ اس نے اس راز کو سینے میں چھپا کر رکھا تھا۔ اس نے سجاد کو نہیں بتایا کہ افضال احمد نے اسے تباہ و برباد کر کے چھوڑ دیا۔ اسی تباہی و بربادی کے نتیجے میں آج تک نوازشات کا سلسلہ جاری ہے اور پھر افضال احمد سے دوستی برقرار رکھنے کی ہی وجہ سے کام مل رہا ہے۔ اگر وہ کل ہی افضال احمد سے رشتہ ناطہ توڑ لے تو نہ صرف کام ملنا بند ہو جائے گا بلکہ ساری رقم بھی رک جائے گی۔ کوئی بل پاس نہ ہو گا۔ مختلف حیلے بہانوں سے پریشان کیا جاتا رہے گا۔ یہ بات اسے افضال احمد نے اشارے کنائے سے سمجھائی تھی۔ وہ بل پاس کرانے کے لئے خود ہی بل لے کر افضال احمد کے پاس جاتی تھی۔ اس لئے بلوں کی ادائیگی ہو جاتی تھی۔ اب وہ تنویر بیگ کے ہاتھوں کسی قیمت کھلونا نہیں بننا چاہتی تھی۔ اس نے چند لمحوں کے بعد پوچھا۔

"سجاد! یہ تو بتاؤ کہ میں کس جگہ ہوں؟ میری جگہ کون سی ہے؟ تم دونوں کے درمیان میری حیثیت کیا ہے؟ میرے ساتھ کس طرح کا تبادلہ ہو رہا ہے؟ کس چیز کا لین دین ہو رہا ہے مجھ سے؟ کیا میرے بغیر زندگی کا یہ کاروبار نہیں چل سکتا؟ کیا اس کاروبار کے لئے ایک حسین عورت کا ساتھ ہونا ضروری ہے؟ ایک عورت کا جو کبھی بیوی بن جائے' کبھی بہن کی حیثیت سے مردوں کے پاس جائے۔ کیا تمہیں یہ سب کچھ گھناؤنا محسوس نہیں ہوتا' سجاد!"

"زندگی ایک طرح کا تبادلہ ہے شکیلہ!" سجاد بولا۔ "اگر یہ تبادلہ نہ ہو تو پھر زندگی بڑی عذاب ہے۔ اس تبادلے کے لئے آگے بڑھنے کے لئے ایک حسین سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے یہ سب کچھ داؤد اور اس کی بیوی سے سیکھا تھا لیکن آج بتا رہا ہوں۔ میں نے ان دونوں کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ داؤد کی بیوی ثروت نے داؤد کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔

وہ ایک دن اپنی فرم کے ڈائریکٹر بن گئے تھے۔ ان سے جو سینئر تھے وہ بیٹھے رہ گئے تھے۔ چانس داؤد کو دیا گیا تھا۔ جانتی ہو کیسے؟ صرف اس کی بیوی کی بدولت اونچے دفتر میں اتنی اونچی جگہ ملی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کے لئے قربانی دی تھی۔ اس لئے کہ داؤد ان لوگوں کے ساتھ اس قطار میں کھڑا تھا جو ترقی کے زینے پر کھڑے تھے اور منزل تک پہنچنا چاہتے تھے۔ مگر داؤد ان سب سے پیچھے کھڑا تھا۔ مگر اس کی بیوی نے اسے ایک ہی جست میں کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ دوسرے کھڑے دیکھتے رہ گئے۔ اس روز سے داؤد اپنی بیوی کا تہہ دل سے مشکور و ممنون ہے۔ پھر اس کی بیوی کو ہر طرح کی سہولت مل گئی۔ ہر طرح کا عیش و آرام' ہر خواہش کی کامیابی' ہر کام کی اجازت' شوہر جو چاہے کرے' بیوی جو چاہے کرے۔ جہاں چاہے وہ جا سکتی تھی۔ جس کے ساتھ چاہے وہ سیر و تفریح کر سکتی تھی۔ داؤد کے چہرے پر شکن تک نہیں آتی تھی۔ وہ دونوں ساتھ بھی تھے اور مختلف راستوں پر چل رہے تھے۔ زندگی بڑے آرام سے گزر رہی تھی۔ نبھ رہی تھی۔ اس لئے کہ ان دونوں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اپنے اوپر کوئی خول نہیں چڑھایا تھا۔ آج وہ دونوں دنیا کے سب سے حسین اور سرسبز و شاداب خطے سوئٹزرلینڈ میں ہیں۔ جہاں جنت جیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ داؤد نے یہ سب کچھ حسین سہارے کی بدولت پایا تھا۔ میں بھی یہی کچھ چاہتا ہوں۔"

"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں اپنے چہرے کو کالی لکیروں سے سجا لوں؟ میں ترقی و

کامیابی' دولت اور دولت کے حصول کے لئے کھلونا بن جاؤں؟"

"نہیں .... یہ بات نہیں شکیلہ! میں کب چاہوں گا کہ محبت پر اور تمہارے وجود پر کوئی داغ آئے؟ کامیابیاں رفاقت سے قدم چومتی ہیں۔ تم دو گھڑی کے لئے ان لوگوں سے مل لوگی' بات کر لوگی تو ہم صدیوں کے لئے بہت کچھ پالیں گے۔"

"سنو سجاد!" وہ بڑی سنجیدگی سے بولی۔ "تم میری زندگی ہو۔ تم میرے بہت ہی پیارے شوہر ہو۔ میں شاید تمہیں وہ محبت نہیں دے سکی ہوں جو تم چاہتے ہو۔ میں اپنے اندر ایک کمی' ایک خلا سا محسوس کرتی تھی۔ مگر جب سے تم کو پالیا ہے تب سے ایسا لگتا ہے کہ وہ کمی اب نہیں رہی اور اب میں نے وہ منزل پالی ہے۔ یقین کرو۔ تمہاری محبت کے سامنے یہ لگاؤ' یہ ہمدردی' یہ پیار کچھ نہیں ہے۔ میرے دل کے اندر کی آواز ہے۔ میری اس روز سے یہ خواہش رہی ہے جس روز سے تمہیں پایا ہے کہ تمہیں میں کچھ دے ڈالوں۔ کیسے اپنے دل کو' اپنے وجود کو' تمہارے دل میں اتار دوں؟ کیسے تمہارے اندر تحلیل ہو جاؤں۔ میں تمہارے لئے بہت دور جاتے ہوئے اس لئے ڈرتی ہوں کہ کہیں ہم دونوں ایک دوسرے کو کھو نہ دیں۔ اس لئے کہ ہر طرف ہزاروں ناگوں کی سرخ سرخ آنکھیں گھورتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اب ایک ایسی زندگی کا آغاز کریں کہ جہاں افضال احمد اور تنویر بیگ جیسے لوگوں کا سایہ تک نہ پڑ سکے۔ میرے سینے پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ میں دب کر مر جاؤں۔"

"اچھا اب چلو .... چل کر سو جاؤ۔ رات زیادہ ہو رہی ہے تمہارا دل و دماغ قابو میں نہیں ہے۔ کل اس موضوع پر باتیں ہوں گی۔"

شکیلہ جب نیند سے بیدار ہوئی تو اس نے محسوس کیا کہ اطلاعی گھنٹی بج رہی ہے۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے دیواری گھڑی کی طرف دیکھا تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ سجاد کب گھر سے گیا اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ سوتی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اطلاعی گھنٹی کے شور سے کھلی تھیں۔ اگر یہ گھنٹی نہ بجتی تو شاید وہ سہ پہر تک سوتی رہتی۔ اس نے چادر ایک طرف پھینکی' بستر سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھی۔ وہ دل میں حیران تھی کہ اس وقت کون آیا ہو گا۔ آج ملازمہ کے آنے کا دن بھی نہیں تھا۔ پھر اسے خیال آیا کہ شاید سجاد آیا ہو۔ وہ کبھی کبھی کسی کام سے آ جاتا تھا۔ مگر ایک چابی تو اس کے پاس بھی ہے۔ کبھی کبھی وہ چابی بھی تو بھول جاتا تھا۔

شکیلہ نے دروازہ کھول دیا اور چونک کر اس نے افضال کو دیکھا جو دروازے کے

پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔

افضال احمد کو دیکھ کر وہ حواس باختہ ہو گئی۔ اس لئے نہیں کہ وہ بے وقت چلا آیا تھا۔ اب اسے افضال احمد سے کوئی خوف اور ڈر نہیں رہا تھا۔ اس لئے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی حجاب' کوئی دیوار' کوئی تکلف نہیں رہا تھا۔ افضال احمد اب اس کے لئے سجاد ہی کی طرح ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے بوکھلانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ نائٹی پہنے کھڑی تھی۔ افضال احمد کے علم میں تھا کہ وہ اور سجاد بھائی بہن ہیں۔ ایک جوان بہن ایک بھائی کے گھر میں ایسے لباس میں ملبوس نہیں رہ سکتی ہے۔ اس نے جلد ہی اپنے حواس پر قابو پا کر مسکرا کر افضال احمد کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ "سویرے' سویرے آپ نے کیسے قدم رنجہ فرمایا ہے؟" شکیلہ نے دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"یاد آئی اور آتی چلی گئی تو دل کے ہاتھوں بے اختیار ہو کر چلا آیا۔" افضال احمد نے جواب دیا۔

"ایک بے حد ضروری کام کے لئے آیا ہوں۔ میں نے سوچا ہے کہ آج میں تم سے بات کر کے دل کی پھانس نکال لوں۔ جو پہلی ملاقات کے دن سے میرے دل میں گڑی ہوئی ہے۔"

"کیسی پھانس؟" شکیلہ نے حیران حیران نظروں سے افضال احمد کی طرف دیکھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ وہ اس سے کہے کہ تمہارے دل میں کون سی پھانس گڑ گئی ہے؟ کتنی ہی پھانسیں تو میرے دل میں کسی خنجر کی طرح پیوست ہو کر رہ گئی ہیں۔ جو میں کسی کو دکھا بھی نہیں سکتی۔ حتیٰ کہ اپنے آپ کو بھی نہیں۔ انہیں نکالنا اب میرے بس میں بھی نہیں رہا ہے۔

"محبت کی پھانس۔" افضال احمد نے دونوں ہاتھوں سے اس کے ہاتھ تھام لئے اور اس کی شدید حیرت بھری نظروں میں جھانکا۔ "اس روز سے میں ایسا محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے بغیر میری زندگی نہیں گزر سکے گی۔ تم میری بہت بڑی کمزوری بن گئی ہو۔"

"اچھا!" شکیلہ نے پھیکی سی ہنسی کے ساتھ ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ بے حد جذباتی ہو رہے تھے۔ "آپ نے تو اپنی منزل پالی ہے۔ یہ ادھورا پن کیسا ہے؟ میں ہر لمحہ آپ کی گرفت میں رہی ہوں۔ آپ نے جب چاہا میں آپ کے نزدیک ہو گئی۔ محبت میں کبھی بھی تو کمی نہیں رہی۔"

"اچھا یہ باتیں پھر ہوتی رہیں گی۔" افضال احمد نے جیب میں ہاتھ ڈالا' ان کا ہاتھ

جب باہر آیا تو ان کے ہاتھ میں ایک خوبصورت سی چابی چمکتی تلوار کی طرح لہرا رہی تھی۔

"یہ میری طرف سے تحفہ ہے۔" انہوں نے شکیلہ کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چابی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

شکیلہ نے پہلے تو بے حد تعجب سے اس چابی کی طرف دیکھا اور پھر اس کی سوالیہ نظریں ان کی طرف اٹھ گئیں۔ "کیسا تحفہ ہے' کس چیز کا تحفہ ہے؟"

ایک حقیر سا تحفہ ہے۔" افضال احمد اسے لئے ہوئے نشست گاہ کی بالکنی میں لے آئے۔

انہوں نے پارکنگ لاٹ کی طرف اشارہ کیا جہاں بہت سی کاریں کھڑی تھیں۔ ان کاروں میں سے ایک سفید براق مرسڈیز کار بھی کھڑی تھی۔ وہ کار بالکل نئی تھی۔ کسی نئی نویلی دلہن کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ اس کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "میں اپنی طرف سے یہ کار تحفے میں دے رہا ہوں۔ یہ تحفہ تمہارے شایانِ شان نہیں ہے۔ مگر میں کیا کروں فوری طور پر اس سے شاندار قسم کی کار کا بندوبست نہیں ہو سکا۔"

وہ کار پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر جلدی سے نشست گاہ میں آ گئی۔ وہ زیادہ دیر تک نشست گاہ میں کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس بات کا خدشہ تھا کہ کوئی بھی اسے اس عالم میں دیکھ سکتا تھا۔ وہ نائٹی میں جو ملبوس تھی۔

افضال احمد بھی اس کے پیچھے پیچھے کتے کی طرح دم ہلاتے ہوئے آ گئے تھے۔ وہ صوفے کے پاس کھڑی ہو گئی اور بولی۔

"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟" پھر اس کے لہجے میں زہر بھر گیا تھا۔ "پہلے ہی آپ کے کیا کم احسانات اور نوازشات ہیں۔ آپ کی نظر عنایت کے بوجھ تلے ہم پہلے ہی اس قدر دبے ہوئے ہیں کہ ساری زندگی نکلنا چاہیں بھی تو نہیں نکل سکتے اور پھر آپ نے تو جیسے مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خرید لیا ہے۔ میں آپ ہی کی تو ہوں۔"

افضال احمد نے اسے صوفے پر ساتھ بٹھا لیا اور بولے۔

"شکیلہ!" ان کی آواز بڑی گھمبیر ہو رہی تھی اور چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔ وہ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولے۔ "شکیلہ! میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"شادی.........!" شکیلہ بڑے زور سے اپنی جگہ سے اچھلی۔ اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بڑے سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔

"ہاں شادی۔" انہوں نے اپنا سر ہلایا۔ "یہ فیصلہ میں نے دو راتیں جاگ کر اور بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"شادی کی کیا ضرورت ہے؟" وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔ "شادی ہونے سے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بغیر شادی کے بھی آپ کی ہوں۔"

"شادی سے بہت فرق پڑتا ہے۔ تم میرے اس نئے گھر میں آ جاؤ گی جو میں نے اچھی طرح دیکھ کر پسند کیا ہے اور تمہیں دکھا کر ابھی سودا کر لینا چاہتا ہوں اور پھر یہ دوری تو نہیں رہے گی۔ میں ساری دنیا کو بتا سکوں گا' دکھا سکوں گا کہ تم میری بیوی ہو' میری زندگی ہو' میری جان وفا ہو۔"

"مگر آپ تو شادی شدہ ہیں۔ آپ کے کئی بچے ہیں۔ آپ کی دو لڑکیوں کی شادیاں بھی ہو چکی ہیں۔" شکیلہ ایک سانس میں سب کچھ بول گئی۔

"ایک مرد چار شادیاں بھی تو کر سکتا ہے اور پھر میری بیوی سدا کی مریض ہے۔ میرا جی اس سے اُوب گیا ہے۔ میری ازدواجی زندگی کا سکون درہم برہم ہے۔ مجھے کبھی عورت کا وہ پیار نہیں ملا ہے جس کا مرد بھوکا ہوتا ہے۔ تم میری محبت کا خلا پُر کر سکتی ہو۔ میرے وجود میں تحلیل ہو سکتی ہو۔"

"مگر میں نے کبھی شادی کے متعلق سوچا بھی نہیں۔ اب میں شادی کرنا بھی نہیں چاہتی ہوں۔ مجھے شادی کی زندگی بالکل پسند نہیں ہے۔ ازدواجی زندگی میں بڑے جھنجھٹ ہوتے ہیں۔ بچے' شوہر' کھانا پکانا اور گھریلو ذمہ داریاں۔ مجھے ان سب سے نفرت ہے۔"

"میں تمہیں اپنی سانس' اپنا وجود' اپنی زندگی اور جان تمنا بنانا چاہتا ہوں اور پھر تمہیں کیا ضرورت ہے کھانا پکانے کی اور گھریلو ذمہ داریاں سنبھالنے کی۔ میرے پاس اتنی دولت ہے کہ تم اندازہ نہیں لگا سکتی ہو۔ میں تمہیں ایک شہزادی کی طرح رکھ سکتا ہوں۔ ایک ایسا گھر خرید کر دے سکتا ہوں جو کسی بھی شاہی محل سے کم نہیں ہو گا۔ ہر طرح کی عیش و آرام تمہارا مقدر ہو گا۔ تمہارے ہاتھ میں الہ دین کے چراغ کا جن ہو گا۔ میں اپنی ساری دولت' کاروبار اور جائیداد تمہارے نام لکھنے کے لئے تیار ہوں۔ بس تم میری ہو جاؤ۔ میں تمہاری زندگی میں' کسی مشغلے میں اور کسی تفریح میں دخل نہیں دوں گا۔ میری پیشانی پر بل تک نہیں آئے گا۔" وہ بہکنے لگے۔

افضال احمد تو بہک رہے تھے' بہکی بہکی سی باتیں کر رہے تھے لیکن وہ تو کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ اگر اس کی شادی سجاد سے نہ ہوئی ہوتی تو شاید وہ افضال احمد کو قبول کر

لیتی۔ افضال مالی اور سماجی حیثیت سے کتنا بڑا آدمی ہے یہ اس کے علم میں تھا۔ وہ تو اس شخص کی بیوی تھی جسے وہ ٹوٹ کر محبت کرتی تھی۔ جس کی خاطر اس نے اپنے آپ کو مٹا دیا تھا۔ افضال احمد نے اچانک اور غیر متوقع شادی کی پیشکش کر کے اسے ششدر اور پریشان کر دیا تھا۔ اس نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ افضال احمد شادی کی پیشکش کرے گا اور اس کے حسن و شباب کا اسیر ہو کر رہ جائے گا۔ جب کہ وہ اپنا دامن بھی آلودہ کر چکا ہے۔

ایسا تو بہت کم ہوتا تھا کہ مرد گری ہوئی چیز کو اٹھا کر اسے تمغے کی طرح سینے پر سجا لے۔ افضال احمد کا آج بھی اب بھی اس میں بے حد کشش محسوس کرنا اس کے لئے بے حد تعجب خیز ہی تو تھا۔ ورنہ مرد بھلا کب اپنے ہی ہاتھوں مسلے ہوئے پھول کو اپنے کالر کی زینت بناتا ہے۔ وہ تو ایک عجیب و غریب مصیبت اور مخمصے میں پھنس گئی تھی۔ وہ اتنی دور آ چکی تھی کہ افضال احمد کو بتا ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ شادی شدہ ہے۔ سجاد اس کا بھائی نہیں شوہر ہے۔ اس راز کا ظاہر کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ سجاد کے لاکھوں روپے پھنس سکتے تھے۔ مستقبل سخت خطرے میں پڑ سکتا تھا۔

افضال احمد نے شکیلہ کو پوری طرح متوجہ نہ پا کر' کسی اور خیال میں ڈوبا پا کر اسے شانے سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔ "تم کس سوچ میں پڑ گئی ہو؟ کیا تم کو مجھ سے شادی کرنا پسند نہیں ہے؟ کیا مجھے اس قابل نہیں سمجھتی ہو کہ میں تمہارا شوہر بن سکوں؟"

"یہ بات نہیں ہے۔" وہ اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر بولی۔ "سجاد کو شاید اس شادی پر اعتراض ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ.........."

"میں ایک عمر رسیدہ آدمی ہوں۔ ہم دونوں کی عمر میں بیس پچیس برس کا فرق ہے۔ تم یہی بات کہنا چاہتی ہو نا؟"

"اگر آپ بھی سجاد کی جگہ ہوتے تو شاید اسی انداز سے سوچتے اور سب سے پہلے یہی اعتراض کرتے کہ آپ کا ایک نوجوان لڑکی سے شادی کرنا بے جوڑ ہو گا۔"

"کیوں نہیں۔" شکیلہ نے افضال احمد کی طرف دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے لمحے کے لئے دل میں سوچا کہ اگر اس نے صاف گوئی سے کام لیا تو سجاد کے لئے پھر ایک نئی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ جس طرح افضال احمد نے اسے دھوکا دے کر تباہ و برباد کیا اب اسے افضال احمد کو فریب دے کر تڑپانا چاہئے۔ یہی موقع ہے کہ وہ اس سے انتقام لے۔ اس ایک ایک شکن کا جو بستر میں پیدا ہوئی تھی اور جس نے اس کی ہنسی چھین لی تھی۔

اس شخص نے تو اسے ایک غلیظ سانس عطا کی تھی۔ اس نے اس کی کچلی ہوئی اور زخمی روح کا احتجاج بھی تو نہیں سنا تھا۔

"افضال احمد!" شکیلہ نے بڑے تمسخر اور استہزائی لہجے میں دل میں اسے مخاطب کر کے کہا۔ "تم مرد ہو۔ تم عورت کو نہیں جانتے ہو۔ جس طرح عورت اپنی پہلی محبت نہیں بھولتی ہے اسی طرح وہ اس بھیڑیے کو بھی نہیں بھولتی جو اس کا سب کچھ چھین کر لے جاتا ہے۔ تم لوگ یہ سب کچھ سمجھتے ہو کہ عورت جو شیشہ بدن ہے نرم و نازک ہے۔ بے حد کمزور ہے۔ اس کی بے بسی اور کمزوری سے فائدہ اٹھا کر فاتح بنا جا سکتا ہے۔ پھر وہ عورت کچھ نہیں کر سکتی ہے۔ تم نے میرا سپنا چھینا ہے۔ تم نے میرے دل کو جو ٹھیس پہنچائی تھی اس کی کرچیاں آج بھی میرے دل میں چبھی ہوئی ہیں اور ان میں سے خون رس رہا ہے۔ میں تم سے انتقام لوں گی۔ افضال احمد!"

"یہ تم پھر کن خیالوں میں ڈوب گئی ہو؟ کیا تم واقعی مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو؟" افضال احمد کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

شکیلہ نے مستی بھری نظروں سے افضال احمد کو دیکھا تو وہ جیسے قتل ہو گئے تھے۔ ان نگاہوں سے' کبھی انہوں نے شکیلہ کی نگاہوں میں ایسی مستی اور ایسا نشہ کہاں دیکھا تھا۔ وہ چہکتی ہوئی بولی۔ "ایک شرط پر۔ اگر آپ وہ شرط پوری کر دیں تو پھر میں سجاد سے کیا ساری دنیا سے بھی ٹکر لے سکتی ہوں۔"

"تم صرف ایک شرط کا کیا کہہ رہی ہو۔ میں تمہاری دس ہزار شرطیں پوری کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"اچھی طرح سے سوچ لیں افضال احمد صاحب! اس لئے کہ کہنا تو بہت آسان ہے مگر اس پر عمل کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔"

"یہ مرد کی زبان ہے شکیلہ! تمہاری کیسی ہی کڑی شرط کیوں نہ ہو مجھے منظور ہے۔ اگر تم مجھے واقعی آزمانا چاہتی ہو تو ایک گھنٹہ انتظار کر لو۔ میں ابھی اور اسی وقت جا کر اسٹامپ پیپر لے آتا ہوں۔ تمہیں اپنے دستخط کر کے دے دیتا ہوں۔ تم اس کاغذ پر جتنی شرائط لکھنا چاہتی ہو لکھ لو۔"

"میں آپ ہی کی بات رکھنا چاہتی ہوں۔" شکیلہ ان کی قمیض کے بٹن سے کھیلتی ہوئی بولی۔ "ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنی ساری دولت' کاروبار اور جائیداد آپ کے نام لکھنے کو تیار ہوں۔ اگر آپ یہ سب کچھ میرے نام کر دیں تو میں آپ

سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ اس سے پہلے ہرگز تم سے شادی نہیں کروں گی۔ اس لئے کہ تنویر بیگ.........“ اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”تنویر بیگ؟“ افضال احمد اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔ ”تم تنویر بیگ سے کب ملی تھیں؟“

شکیلہ کو ذرہ برابر بھی اندازہ نہ تھا کہ تنویر بیگ کا نام افضال کے وجود پر کسی بجلی کی طرح گرے گا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے آخری جملے کا افضال پر بجلی کا سا اثر ہوا تھا۔ بجلی کا سا شدید جھٹکا لگا تھا۔ جیسے تنویر بیگ آدمی نہ ہو کوئی وحشی قاتل ہو جس کا نام سنتے ہی ان کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ وہ کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ کاٹو تو ان کے بدن سے لہو نہ نکلے۔ شکیلہ ان کی یہ کیفیت دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ افضال احمد‘ تنویر بیگ کا نام سنتے ہی حددرجہ خائف اور سراسیمہ ہو گئے۔ اس نے افضال احمد سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا پھر اس نے افضال احمد کا سفید چہرہ دیکھ کر کہا۔ ”آج سے دو تین دن پہلے کی بات ہے اس سے ایک تقریب میں ملاقات ہوئی تھی۔ سجاد نے انہیں کوئی لفٹ نہیں دی تھی۔ مگر وہ خود ہی کسی لالچی بچے کی طرح میری میز پر آ گیا تھا۔ پھر سجاد کو مجبوراً اس سے میرا تعارف کرانا پڑا۔ کل رات بھی اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔“ شکیلہ جان بوجھ کر ان کے زخموں پر نمک چھڑک رہی تھی۔ ”میں کوئی رات دو بجے تک اس کے ساتھ رہی تھی اور پھر وہ مجھے گھر چھوڑ گیا تھا۔“

”رات اس سے کہاں اور کب ملاقات ہوئی تھی؟ اس سے کس سلسلہ میں ملاقات ہوئی تھی؟“ افضال احمد نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

”اس سے کل رات ہوٹل میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے ڈنر پر صرف مجھے مدعو کیا تھا‘ سجاد کو نہیں۔ میں اکیلی ہی گئی تھی۔“ اس نے بڑی بے نیازی سے بتایا۔

”اس نے صرف تمہیں کیوں مدعو کیا تھا‘ سجاد کو کیوں نہیں؟ کیا سجاد نے تمہیں اکیلے جانے دیا تھا‘ کوئی اعتراض نہیں کیا تھا؟“

”وہ مجھ سے پہلی ملاقات میں اتنا متاثر ہوا کہ اس نے سجاد کی چند لمحوں کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر مجھ سے کہا تھا کہ آپ تنہائی میں ملیں۔ آپ سے بے حد ضروری باتیں کرنا ہیں۔ اس لئے میں تنہا چلی گئی۔ جب میں آپ کے ساتھ مری جا سکتی تھی تو ہوٹل بھی جا سکتی تھی۔ سو تنہا ہی چلی گئی۔“

”کل رات اس نے بلایا کیوں تھا؟“

”وہ میرے عشق میں بُری طرح گرفتار ہو چکا تھا۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“ شکیلہ نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

”کیا کہا......... وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے؟“ افضال احمد کا سر گھوم گیا۔ ”تم نے اسے کیا جواب دیا......... تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”میں نے اپنا فیصلہ سنانے کے لئے تین دنوں کی مہلت مانگی ہے۔ میں نے فوری طور پر اسے جواب دینا پسند نہیں کیا۔“

”اب تمہارے کیا ارادے ہیں؟ کیا تم اس سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو؟“

”آخر کیوں نہ تیار ہوں۔ وہ میری شرائط پر شادی سے پہلے عمل کرنے کے لئے تیار ہے۔ میں نے پھر بھی سوچنے اور سجاد سے اجازت لینے کے لئے اس سے وقت لے لیا ہے۔“

”نہیں .... نہیں۔“ افضال احمد ہذیانی انداز میں چلا کر بولے۔ ”میں تمہاری ساری شرائط کل ہی پوری کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میں تنویر بیگ کے ساتھ تمہیں شادی نہیں کرنے دوں گا۔“ دوسرے لمحے افضال احمد اس کے قدموں میں گر گئے۔ ”تم میری ہو شکیلہ! میں تم سے شادی کروں گا۔ اگر تنویر بیگ میری راہ میں .... حائل ہو گیا تو اسے گولی سے اڑا دوں گا۔“

”گو تنویر بیگ ہر لحاظ سے بڑا آدمی ہے‘ اس کے پاس آپ کے مقابلہ میں بہت زیادہ دولت ہے مگر میں پھر بھی اس سے شادی نہیں کروں گی۔ شادی کروں گی تو صرف آپ سے‘ اس لئے کہ آپ بے حد نفیس مزاج کے ہیں اور پھر مجھے آپ سے بے انتہا محبت ہو گئی ہے۔ جب سے میں نے اپنے آپ کو آپ کے حوالے کر دیا ہے‘ تب سے مجھے محبت ہو گئی ہے۔ اتنے دنوں میں ہم دونوں روز بہ روز قریب ہوتے جا رہے ہیں۔“

”ہاں شکیلہ!“ افضال احمد نے اس کے گھٹنوں پر اپنا سر رکھ دیا۔ ”ہم دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب ہو گئے ہیں کہ اب ایک دوسرے کے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتے۔ تم نے تو مجھے پاگل کر کے رکھ دیا ہے۔ میں تمہاری قربت کا اس قدر عادی ہو چکا ہوں کہ میرا وقت بے کیف گزرتا ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں مسٹر افضال احمد!“ شکیلہ انہیں دل میں ہی مخاطب کر کے تمسخر سے بولی۔ ”میں آپ کو واقعی پاگل کر کے رکھ دوں گی۔ ایک ایسا پاگل جس کی جگہ پاگل

خانہ ہوتی ہے۔ آپ کا انجام بھی یہی ہونا چاہئے۔"

شکیلہ افضال احمد کو دیکھ رہی تھی جو اس کے عشق میں مبتلا ہو کر کسی احمق نوجوان کی طرح نظر آ رہے تھے۔ اس کے قدموں میں گرے پڑے تھے۔ آج اسے اپنی اہمیت کا علم ہو رہا تھا۔ وہ چونک کر خوابوں کی دنیا سے نکل کر حقیقی دنیا میں آ گئی تھی۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ایک زہر بھری مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ افضال احمد نے وہ مسکراہٹ اور اس کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی وہ چمک نہیں دیکھی تھی جو کسی وحشی قاتل کی سی تھی۔ اگر افضال احمد دیکھ لیتے تو شاید ان کے بدن پر جھرجھری آ جاتی اور ان کی محبت کا نشہ پل بھر میں اتر جاتا۔ وہ تو کسی کتے کی طرح اس کے قدموں میں لوٹ رہے تھے' خوش ہو رہے تھے۔ خوابوں کی دنیا میں دور بہت دور چلے گئے تھے۔ ایک حسین و جمیل اور جوان بیوی کے شوہر بن گئے تھے اور سارے شہر میں ان کی خوش قسمتی کے چرچے ہو رہے تھے۔

"اور ہاں!" شکیلہ نے پوچھا۔ "آپ کی پہلی بیوی بھی تو ہے اس کا کیا ہو گا؟ آپ اسے طلاق دے دیں گے؟"

"تم کیا چاہتی ہو؟ اگر تم کہو تو میں اسے طلاق بھی دے سکتا ہوں۔ اب اس میں میرے لئے کوئی کشش نہیں رہی ہے۔"

"اسے فوری طور پر طلاق دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ شادی کے دو ایک مہینے بعد اسے طلاق دے دیں گے۔ میں سوکن ہرگز برداشت نہیں کروں گی۔"

"تم جیسا کہو گی میں ویسا ہی کروں گا۔" افضال احمد فرش سے اٹھ کر اس کے پاس جا بیٹھے۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "میں تو تمہارا غلام ہوں۔" افضال احمد کو جلدی نہیں تھی۔ انہیں کہیں جانا نہیں تھا۔ وہ آج فرصت سے آئے تھے۔ جبکہ اکثر شکیلہ ان کے پاس فرصت سے ہوٹل کے اس کمرے میں چیک اور آرڈر وصول کرنے آتی تھی جو انہوں نے کرایہ پر لیا تھا اور ان دونوں کی ملاقاتوں کے لئے مخصوص ہو چکا تھا۔ آج وہ خود آئے تھے۔ کار اور دل کا نذرانہ لئے۔ شادی کا پیغام لئے ہوئے وہ بہت خوش تھے کہ شکیلہ نے ان کی محبت کو اور شادی کے پیغام کو قبول کر لیا تھا۔

شکیلہ نہانے چلی گئی۔ اس کے نہا کر آنے تک وہ ایک فلمی رسالے کی ورق گردانی کرتے رہے۔ شکیلہ نہا کر آئی تو ان کے دل پر بجلی گری تھی۔ شکیلہ تو کئی بار ان پر بجلی بن کر گری تھی اور ان کے وجود کو خاکستر بھی کر دیا تھا۔ مگر آج تو انہیں شکیلہ کسی اور ہی روپ میں نظر آئی تھی۔ یہ روپ انہوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کسی ناگن

کا روپ تھا۔ ناگن جو اپنے روپ بدلتی رہتی ہے۔ یہ روپ انہیں ڈس رہا تھا۔ اس کا زہر ان کے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا۔ افضال احمد اور شکیلہ کو ایک نئی خوشی ملی تھی۔ اس خوشی سے دونوں ہی سرشار ہو رہے تھے۔ اس خوشی میں دونوں خوب گھل مل گئے تھے۔ پھر آپس میں بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے اور مستقبل کے منصوبے بناتے رہے۔ دنیا کی سیر و سیاحت کا پروگرام بناتے رہے۔ ہنی مون کے لئے جگہ کا انتخاب کرنے میں انہیں کوئی ایک گھنٹہ لگ گیا۔ آخر طے پایا کہ وہ ہوائی جائیں گے۔ ہوائی سے حسین جگہ کوئی اور نہیں ہے۔

لنچ کا وقت ہوا تو افضال احمد خود ہی جا کر ایک اعلیٰ قسم کے ریستوران سے لنچ لے آئے تھے۔ لنچ سے فراغت پانے کے بعد شکیلہ بستر پر لیٹ گئی۔ اس لئے کہ رات اس کی نیند آنکھوں سے کوسوں دور رہی تھی۔ وہ بڑی دیر میں جا کر سوئی تھی اور وہ تنویر بیگ کے بارے میں سوچتی رہی تھی اور سجاد کے رویے کے بارے میں غور کرتی رہی تھی۔ سجاد کو وہ پوری طرح سمجھ نہ سکی تھی لیکن اب سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی اور سجاد اس کی سمجھ میں آتا جا رہا تھا اور پھر افضال احمد نے آ کر اسے ایک ایسی خوشی دی تھی جس کا نشہ بڑا تیز تھا۔ خمار تھا کہ دل و دماغ سے اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ بے حد تھک گئی تھی۔ کچھ دیر آرام کر کے اپنے تھکے اور ٹوٹتے بدن کو آرام دینا چاہتی تھی اور رات کی نیند کو پورا کرنا چاہتی تھی۔

شکیلہ بستر پر لیٹتے ہی گہری نیند سو گئی تھی۔ افضال احمد سوئے نہیں تھے۔ جاگ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھے تھے اور ان کی گود میں ایک میگزین رکھا تھا۔ ان کی نظریں شکیلہ کے چہرے اور سراپا کا بڑی بے چینی سے طواف کر رہی تھیں۔ وہ تو اس ہیرے کو دیکھ رہے تھے اور دل ہی دل میں اس ہیرے کی تراش خراش کو سراہ رہے تھے۔ یہ ہیرا اپنی تراش خراش اور چمک دمک میں کوئی ثانی نہیں رکھتا تھا یہ ہیرا ہر لحاظ سے دنیا کا نایاب ترین اور انمول ترین ہیرا تھا۔ انہوں نے ہیرے تو بہت دیکھے تھے اور ان کے ہاتھوں سے گزرے بھی تھے مگر ایسا ہیرا انہوں نے نہ تو دیکھا تھا اور نہ ہی ساری زندگی پا سکتے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ عورت بھی کیا چیز ہے۔ وہ سوچتے سوچتے بہت دور چلے گئے تھے۔ ان کے تصور میں تنویر بیگ کا چہرہ ابھر آیا تھا۔ پھر ان کا منہ بن گیا تھا جیسے انہوں نے بے حد کڑوی دوائی پی لی ہو۔ تنویر بیگ ان کا پرانا کاروباری حریف تھا۔ دو ایک مہینے میں دس کروڑ روپے کا ٹینڈر کھلنے والا تھا۔ اس ٹینڈر کے لئے کئی

لوگ میدان میں آ رہے تھے۔ اصل مقابلہ ان کے اور تنویر بیگ کے درمیان تھا۔ کامیابی کے لئے دونوں طرف تیاریوں کا آغاز ابھی سے ہو گیا تھا۔ جدید ہتھیاروں سے مسلح ہونے کی کوشش کی جا رہی تھی اور پھر مسئلہ انا کا بھی تھا۔ ان کے حریف تنویر بیگ نے انہیں بعض بڑے بڑے محاذوں پر شکست دی تھی۔ وہ اس کا بدلہ اس ٹینڈر کے موقع پر لینا چاہتے تھے۔ اس کی کامیابی کے لئے دولت اور رسوخ کی ضرورت نہ تھی۔ جہاں دولت اور اثر و رسوخ کام نہیں آتے ہیں وہاں عورت کام آتی ہے۔ اس کا حُسن و شباب اپنا کمال دکھا جاتا ہے۔ عورت بڑے کام کی چیز ہے اس میں جو جادو ہے' جو اثر ہے جو کشش ہے وہ دنیا کی کسی شے میں نہیں ہے اور پھر شکیلہ تو دنیا کی حسین ترین عورت تھی۔ جو پہلی ہی نظر میں پاگل بنا دیتی تھی۔ وہ اس پرانی شراب کی طرح تھی جس کا خمار ذہن سے نہیں اترتا تھا۔ وہ تنویر بیگ کو شکست دینے کے لئے شکیلہ سے شادی کر رہے تھے۔ اب کامیابی ان سے دور نہ تھی۔ بلکہ ان کے قدموں میں تھی۔

انہوں نے جذبات کی رو میں بہہ کر شکیلہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی ساری دولت' جائیداد اور کاروبار اس کے نام کرنے کے لئے تیار ہیں۔ شکیلہ نے ان کی اس پیشکش سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا جیسے اسے ان پر بھروسہ نہ ہو' اعتماد نہ ہو۔ اگر تنویر بیگ بیچ میں نہ آتا تو شکیلہ سے اس کی ملاقات نہ ہوئی ہوتی اور اس نے شکیلہ کو شادی کی پیشکش نہ کی ہوتی تو پھر وہ شکیلہ کو اپنے دام میں پھانس لیتے۔ انہوں نے سوچا کہ انہیں پریشان اور خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنا سب کچھ شکیلہ کے نام کرنے کے بعد جب وہ یہ محسوس کریں گے کہ شکیلہ میں تبدیلی آ رہی ہے اس کے تیور بدل رہے ہیں۔ تب وہ اسے بڑی آسانی سے راستے سے ہٹا سکتے ہیں جس طرح انہوں نے ایک ماڈل گرل کو ہٹایا تھا۔
افضال احمد شام سے پہلے ہی چلے گئے تھے۔ سجاد کے آنے میں کچھ دیر باقی تھی۔ وہ بڑی دیر تک پلنگ پر لیٹی سوچتی رہی۔ اس کی مسکراہٹ میں زہر ہی زہر بھرا ہوا تھا۔ اسے خوابوں میں سجاد' افضال احمد اور تنویر بیگ کالے دیو کی طرح نظر آ رہے تھے۔ جو اس کے وجود کو اپنے خوفناک ہاتھوں میں دبائے ہوئے تھے۔ وہ ان ہاتھوں میں جیسے پھڑپھڑا رہی تھی۔ اس کا دم گھٹتا جا رہا تھا۔

اس نے سوچا کہ دن بھر کی تھکن دور کرنے اور تر و تازہ ہونے کے لئے اسے نہا لینا چاہئے۔ وہ بستر سے نکل کر اٹھ کھڑی ہوئی اور غسل خانے میں چلی گئی۔ شاور کے نیچے کھڑی نہاتی سوچتی جا رہی تھی کہ سجاد اسے طلاق دینے کے لئے رضامند ہو جائے گا؟ کیا وہ

کبھی یہ چاہے گا کہ سونے کی چڑیا اس کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے پنجرے میں چلی جائے۔ اگر وہ چلی گئی تو یہ سونے کے پنجرے جیسا گھر اجڑ کر رہ جائے گا۔

سجاد آیا تو دن ڈوب چکا تھا۔ اس نے سجاد کو افضال کے بارے میں بتایا۔ اس کار اور شادی کی پیشکش کے بارے میں بتایا۔ وہ ذہنی طور پر اس بات کے لئے تیار تھی کہ سجاد نے اس کی اجازت اور طلاق نہ دی تو وہ اس بات کا دل پر کوئی اثر نہ لے گی۔ سجاد کے طلاق دینے یا نہ دینے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اسے طلاق کی ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ بغیر طلاق لئے بھی اپنے انتقام کا نشانہ افضال احمد کو بنا سکتی تھی۔

سجاد شادی کی بات سن کر پریشان ہو گیا تھا اور فکر میں ڈوب گیا تھا۔ ”یہ تو بہت بُرا ہوا جانی! اگر اس کی بات اور پیشکش کو قبول نہ کیا جائے تو لاکھوں روپے کی رقم سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ میں نے کل ہی اس کی فرم کو دس لاکھ روپے کا مال فراہم کیا ہے۔ آئندہ مہینے مزید پانچ لاکھ روپے کا آرڈر ملنے والا ہے۔ تم دس لاکھ روپے کا چیک وصول کرنے جاؤ گی تو وہ سب سے پہلے شادی کے بارے ہی میں پوچھے گا۔“

”میں انہیں چھ سات دنوں کے لئے ٹال دوں گی اور چیک لیتی آؤں گی۔ اس رقم کے نکل جانے کے بعد انہیں کوئی سا جواب دے دیں گے۔“

”کیا تم افضال احمد کو اتنا سیدھا اور بے وقوف سمجھتی ہو کہ وہ چیک دے دے گا؟ وہ بہت سیانا کوا ہے۔ وہ اڑتی چڑیا کے پَر گن لیتا ہے۔ وہ حتمی جواب ملنے تک چیک روک لے گا۔ معلوم نہیں۔ اس خبیث کو بیٹھے بٹھائے شادی کی کیا سوجھ گئی ہے۔“ سجاد بُری طرح جل بھن گیا۔

”تم چیک کی فکر نہ کرو۔ میں ان سے کل کسی نہ کسی طرح چیک لیتی آؤں گی۔ اس چیک کے ملنے کے بعد ان سے کام ختم سمجھو۔“

”نہیں۔“ اس نے تشویش کے انداز میں کہا۔ ”میں افضال احمد سے کسی قیمت پر کام ختم کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ اس کے ہاں مال سپلائی کرنے میں جو فائدہ ہے وہ کسی کے ہاں نہیں ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“

”تنویر بیگ سے بھی بڑا آرڈر ملنے والا ہے۔ تنویر بیگ تو افضال احمد سے کہیں بڑی پارٹی ہے نا؟ پھر مٹی ڈالو اس افضال احمد پر۔“

”تنویر بیگ سے بھی بڑا کام ملنے میں ابھی بہت دن باقی ہیں۔ جب تک میں افضال

احمد سے دس پانچ لاکھ روپے تو کما لوں گا۔"

"افضال احمد کو مجھ سے بڑی حد تک عشق ہو گیا ہے۔" شکیلہ نے ابھی تک اصل بات سجاد کو نہیں بتائی تھی۔ لہٰذا وہ بولی۔ "افضال احمد میرے نام اپنی ساری دولت' ساری جائیداد اور تمام کاروبار لکھنے کے لئے تیار ہیں۔ میری خاطر وہ اپنی بیوی اور بچوں کو بھی چھوڑ رہا ہے۔ شادی کے بعد بیوی کو طلاق بھی دے دے گا۔"

"سچ!" سجاد ششدر رہ گیا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ "کہیں وہ تمہیں فریب تو نہیں دے رہا ہے۔ اس کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ اگر شادی کرنے کے بعد اس نے سب کچھ تمہارے نام نہیں کیا تو تم اس کا کیا بگاڑ لو گی؟ بگاڑ بھی کیا سکتی ہو۔ اس معاشرہ میں عورت چاہے کسی طبقہ سے تعلق رکھتی ہو بے حد کمزور ہوتی ہے۔ وہ جی بھرنے کے بعد دودھ میں گری ہوئی مکھی کی طرح نکال کر پھینک سکتا ہے۔"

"وہ شادی سے پہلے میرے نام لکھنے کے لئے تیار ہے۔" شکیلہ کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ایں!" سجاد پر سکتہ سا چھا گیا۔ چند لمحوں تک اس پر سناٹا سا رہا۔ پھر وہ چونک کر بولا۔ "آخر کیوں نہ ہو؟ تم جیسا ہیرا تو اس دنیا میں شاید ہی ہو۔ اگر تم صدیوں پہلے پیدا ہوتی تو تمہارے حصول کے لئے بڑے بڑے بادشاہوں میں جنگیں چھڑ جاتیں۔ آج بھی کوئی فرق نہیں پڑا ہے ایک سرمایہ دار تمہارے لئے پاگل ہو رہا ہے۔ اپنی ساری دولت تمہارے قدموں میں رکھنا چاہتا ہے۔ دور اندیشی اور عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس سنہرے موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ تم افضال احمد سے شادی کر لو۔ میری طرف سے اجازت ہے۔"

"ایں؟" شکیلہ بھونچکی رہ گئی۔ اسے تو ذرا برابر بھی امید نہیں تھی کہ سجاد اسے شادی کی اجازت دے دے گا۔ "سجاد! یہ تم کہہ رہے ہو؟ میں تمہاری بہن نہیں بیوی ہوں' تمہاری محبت ہوں۔ تم.........." وہ آگے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ اس کے سینے میں دکھ بھر گیا تھا۔

"میں تمہیں طلاق دے دوں گا شکیلہ تاکہ تم افضال احمد سے شادی کر سکو۔" سجاد بولا۔ "اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے اور پھر تم میری ہی رہو گی۔ افضال احمد سے شادی کرنے کے بعد تمہارا اور میرا رشتہ ختم نہیں ہو گا۔ بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہو گا۔"

"تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔" وہ حیرت اور صدمے سے بولی۔ "کیا تمہیں اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اگر میں نے افضال احمد سے شادی کر لی تو کیا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہاری دسترس سے نکل نہ جاؤں گی؟ کیا تم مجھے طلاق دے کر مجھ سے دور اور محروم نہیں ہو جاؤ گے؟ کیا تم مجھے کھو نہیں دو گے سجاد! پھر میں ساری زندگی ایک ایسے شخص کی ہمسفر بنی رہوں گی جو میرے باپ کی عمر کا ہے۔"

"میرے ذہن میں کچھ اور ہی منصوبہ ہے شکیلہ!" سجاد کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی اور اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی۔ "تم شادی سے پہلے نہ صرف سب کچھ اپنے نام لکھوا لو بلکہ اس سے شادی بھی کر لو۔ تمہارا اس سے شادی کرنا بے حد ضروری ہے۔"

"شادی سے پہلے ہی جب وہ سب کچھ میرے نام لکھ رہا ہے تو پھر مجھے شادی کرنے کی حماقت کی کیا ضرورت ہے؟ میں کیوں خواہ مخواہ اس کے ساتھ زندگی گزار دوں۔"

"اس لئے کہ اس کے پاس کچھ بھی بچا نہ رہنے دو۔ بہت ممکن ہے کہ وہ شاید حفظِ ماتقدم کے طور پر بہت کچھ اپنے پاس محفوظ رکھ لے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ ایک دم خالی ہاتھ اور تمہارا محتاج ہو جائے۔ کل پائی پائی کے لئے ترسے۔ میں ایک دو دن میں افضال احمد کی ساری دولت' کاروبار اور جائیداد کی تفصیل لا کر دوں گا۔ تم اسے ایک طرح سے قلاش اور فقیر بنا کر چھوڑو گی۔ یہ شخص سانپ کی طرح ہے۔ اگر اس میں ذرا بھی زہر رہ گیا تو وہ تمہیں کسی بھی دن ڈس لے گا۔"

سجاد اسے بڑی دیر تک اپنا منصوبہ سمجھاتا رہا جو اس کے ذہن میں اچانک آیا تھا۔ وہ بڑے غور سے اس کے منصوبے کو سنتی رہی۔ آج اس کی نظروں کے سامنے سجاد کا ایک اور چہرہ نظر آیا تھا جو کئی چہروں میں چھپا ہوا تھا۔ سجاد کا ایک چہرہ نہیں اس کے ان گنت چہرے تھے۔ ہر چہرہ اس قدر مکروہ اور بھیانک تھا کہ اسے سجاد سے نفرت سی ہونے لگی تھی۔ اگر سجاد کے چہرے کے پیچھے چھپے ہوئے چہروں میں سے ایک چہرہ بھی اسے نظر آ جاتا تو شاید وہ سجاد کے پیچھے نہیں آتی۔ اس سے محبت نہ کرتی اور اپنے ماں باپ اور دوسرے عزیز واقارب کو ہرگز نہ ٹھکراتی مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تو وہ پچھتا بھی نہیں سکتی تھی۔ رو بھی نہیں سکتی تھی۔ سجاد سے نفرت بھی نہیں کر سکتی تھی۔ عورت کی سب سے بڑی مجبوری یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی پہلی محبت کے نقش کھرچنا چاہے بھی تو نہیں کھرچ سکتی۔ اسے تو صبیحہ کی بات یاد آ رہی تھی۔ اس نے ٹھیک ہی تو کہا تھا کہ یہ دنیا ایسی نہیں

ہے جیسی تمہیں نظر آتی ہے۔

سجاد کچھ اور کہہ رہا تھا' وہ کچھ اور سوچ رہی تھی۔ اب وہ شکیلہ بن کر اپنی زندگی نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ وہ ساری دنیا کے لئے زہریلی ناگن بن جانا چاہتی تھی۔ دنیا کے ہر مرد سے انتقام لینا چاہتی تھی۔ جس طرح اس کی محبت' چاہت اور عزت برباد ہوئی تھی اس طرح وہ دنیا کے ہر مرد کا گھر تباہ کر کے ان سے انتقام لینا چاہتی تھی۔ اسے اپنی قدر و قیمت کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ وہ دنیا کا ایک ایسا نایاب ترین ہیرا ہے جس کی آب و تاب سے مردوں کی نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور وہ اس کے حصول کے لئے تڑپتے ہیں اور پاگل ہو جاتے ہیں۔

شکیلہ نے نہ صرف گاڑی چلانا سیکھ لیا تھا بلکہ وہ کراچی کے محلوں اور سڑکوں سے بھی اچھی طرح واقف ہو چکی تھی۔ وہ تنہا گاڑی چلانے سے احتراز کرتی تھی۔ کیونکہ اسے کراچی کی سڑکوں پر بہتے ہوئے ٹریفک کے سیلاب سے خوف آتا تھا۔ مگر افضال احمد نے اسے تحفے میں جو کار دی تھی وہ اس کار کو لے کر دو ایک دن تک خوب سیر و تفریح کرتی رہی تھی۔ وہ کار واقعی بہت ہی شاندار اور قیمتی تھی۔

افضال احمد نے ایک ہفتے کے اندر ہی اپنے وعدے کا پاس کیا تھا اس کے نام اپنی ساری دولت' کاروبار اور جائیداد کر دی تھی۔ سجاد جو تفصیلات کسی ذرائع سے حاصل کر کے لایا تھا سب اسی کے مطابق تھا۔ افضال احمد نے کسی چیز میں بھی بددیانتی نہیں کی تھی۔ اب وہ کروڑوں کی مالک تھی۔ افضال احمد نے دونوں ہاتھ کاٹ کر دے دیئے تھے۔ اسے توقع نہ تھی کہ افضال احمد اتنی بڑی حماقت کرے گا۔ سجاد بھی ششدر تھا اسے بھی یہ سب کسی خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ اس نے شکیلہ کو خوب بہکایا تھا کہ افضال احمد کو دودھ میں گری مکھی کی طرح نکال باہر کرے مگر وہ اس کے لئے تیار نہ تھی۔

"اگر تم نے میرے مشورے پر عمل نہ کیا تو پھر میں تمہیں طلاق ہی نہیں دوں گا۔ پھر تم افضال احمد سے کیسے شادی کرو گی؟"

"میں تو طلاق لئے بغیر بھی افضال احمد سے شادی کر سکتی ہوں۔" شکیلہ نے تڑ سے جواب دیا۔ "مجھے تمہارے طلاق کے تین لفظوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

سجاد شکیلہ کے تیور دیکھ کر بھونچکا سا رہ گیا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ شکیلہ کا دماغ اس بلندی پر پہنچتے ہی ساتویں آسمان پر پہنچ جائے گا۔ اسے تو شکیلہ بالکل بدلی بدلی نظر آ رہی تھی۔ اب وہ پہلی سی شکیلہ نہیں رہی تھی۔ ایک خطرناک عورت کی طرح نظر آ

رہی تھی۔ آج اسے ایسا احساس ہو رہا تھا کہ شکیلہ جس قدر نازک اندام اور مہ جمال ہے اسی قدر گہری بھی ہے اب اس کا دل پتھر ہو کر رہ گیا ہے اور اس پر بھروسہ کرنے کے لئے بھی تیار نہیں۔ اب اس کی ساری جبلتیں بیدار ہو چکی ہیں۔ وہ جیسے اس کے سارے جال کو ہر سمت سے کاٹ رہی ہے۔

"میرے طلاق دیئے بغیر تم افضال احمد سے کیسے شادی کر سکتی ہو؟ تم میری بیوی ہو بہن نہیں ہو۔" اس نے دلیل پیش کی۔

"ساری دنیا جانتی ہے کہ میں تمہاری بہن ہوں۔ تم نے ہر ایک کو یہی باور کروایا ہے کہ میں تمہاری بہن ہوں۔ کیا تم دنیا کے سامنے اپنی ہی بات کو جھٹلا سکو گے اور یہ کہہ سکو گے کہ میں تمہاری بہن نہیں بیوی ہوں؟" شکیلہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

سجاد بغلیں جھانکنے لگا۔ اس سے چند لمحوں تک کوئی جواب نہ بڑا۔ پھر وہ جزبز سا ہو کر بولا۔ "شرعی اور قانونی طور پر میری بیوی ہو۔"

"کیا شریعت اور قانون صرف میاں بیوی کے رشتے کی حد تک محدود ہے؟" شکیلہ نے درمیان میں اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "تم نے اس قانون اور شریعت پر کہاں تک عمل کیا ہے۔ کیا شریعت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ اپنی بیوی کو کسی نمائشی چیز کی طرح سجا کر سنوار کر غیر مردوں کے سامنے لے جاؤ اور اپنی غرض کے لئے اسے مہرہ بناؤ' چارہ بناؤ اور ...." وہ سانس لینے کے لئے رکی اور سجاد کے چہرے کی طرف جو زرد ہو رہا تھا دیکھا۔ اس نے سجاد کو لاجواب پا کر اپنی بات جاری رکھی۔ "میرے ہاتھ میں ایک ایسا ترپ کا پتہ ہے جس کی وجہ سے تم مجھے طلاق دینے پر مجبور ہو سکتے ہو۔"

"اگر تم مجھے چیلنج دے رہی ہو تو سن لو۔" سجاد نے اپنے آپ کو سنبھالا دیتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا۔ "تم تو کیا تمہارے فرشتے بھی مجھے طلاق دینے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ تم خلع لینے کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاؤ تو دوسری بات ہے۔ مگر اس میں بھی سال دو سال کا عرصہ لگ جائے گا۔"

فضا میں تلخی گھل گئی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ سجاد اس قدر سنجیدہ ہو جائے گا۔ اسے طیش دلائے گا پھر بھی وہ اپنے آپ پر قابو پا کر بڑے ضبط و تحمل سے بولی۔ "تم شاید بھول رہے ہو کہ اب افضال احمد کی فرم سے جو بھی چیک جاری ہوں گے وہ میرے دستخطوں سے .... تمہاری دس لاکھ کی رقم کا ایک چیک دو دن سے میرے دستخطوں کا

منتظر ہے۔ اب افضال احمد کے نہیں میرے دستخطوں اور احکام پر عمل ہو گا۔ سمجھے ناں میرے سر تاج!"

سجاد سن ہو کر رہ گیا۔ اسے واقعی خیال نہیں رہ گیا تھا کہ اب افضال احمد کا سارا کاروبار' دولت اور جائیداد شکیلہ کی ملکیت میں تھی۔ افضال احمد کی حیثیت صرف ایک کٹھ پتلی کی سی تھی۔ اس کٹھ پتلی کی ڈوری شکیلہ کے ہاتھ میں تھی۔ افضال احمد اس لئے موجود تھے کہ وہ کاروبار چلا سکیں۔ شکیلہ تو اتنا بڑا کاروبار چلا نہیں سکتی تھی اور وہ اس دس لاکھ کے چیک کے لئے شکیلہ کو ایک بار نہیں دس بار طلاق دے سکتا تھا۔ مگر وہ شکیلہ کو کسی قیمت پر ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ شکیلہ جو اس کے لئے سونے کی چڑیا تھی۔ پارس پتھر تھی۔ وہ اس کے حسن و شباب سے جو فائدہ اٹھا سکتا تھا وہ دولت سے بھی نہیں حاصل کر سکتا تھا۔ روز روز ایسی کافر ادا حسینائیں پیدا نہیں ہوتیں۔ قدرت شاید شکیلہ جیسی لڑکیوں کو اپنے ہاتھوں سے بناتی ہے۔ جبھی تو اس میں کوئی کسر باقی نہ تھی۔ اس کا حُسن قیامتیں برپا کر رہا تھا اور شباب فتنے جگاتا تھا۔ وہ حسن میں یکتا و بے مثال تھی۔ شیشہ بدن تھی۔ اس کے سازشی ذہن نے صرف ایک لمحے میں بہت کچھ سوچ لیا تھا۔ وہ چاپلوسی کے انداز میں بولا تو اسے اپنی آواز کھوکھلی محسوس ہو رہی تھی۔ "بھئی تم تو مذاق مذاق میں سنجیدہ ہو گئی ہو اگر تمہارے دل کو میری بات سے دکھ پہنچا ہے تو مجھے معاف کر دینا۔"

"لو میں کب سنجیدہ ہو گئی تھی۔ میں بھی تو تم سے مذاق ہی کر رہی تھی۔" شکیلہ نے بھی دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بھی مکاری اور عیاری سے کام لے گی۔ اس نے سجاد کے چہرے پر اس کے دل کی منافقت کو صاف اور واضح طور پر دیکھ لیا تھا۔ اس لئے اس نے بھی ہنس کر سجاد سے بات بنائی۔

"تم جب کہو گی میں طلاق دینے کے لئے تیار ہوں۔" اس نے شکیلہ کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "مگر میری ایک شرط ہے۔"

"صرف ایک شرط .... میں تمہاری دس شرائط ماننے کو تیار ہوں۔" اس نے ریاکاری سے کام لیا۔

"تم افضال احمد سے شادی کرنے کے بعد بھی میری ہی رہو گی۔ میری محبت کو اور مجھے بھول نہیں جاؤ گی۔ افضال احمد کی موت کے بعد ہم دونوں پھر سے ایک ہو جائیں گے۔ ایک چھت کے نیچے تمام زندگی گزاریں گے۔"

"مجھے اس سے کب انکار ہے۔ میں یہ سب کچھ اور جو کچھ بھی کر رہی ہوں' اپنے

لئے نہیں کر رہی ہوں' تمہارے لئے.......... صرف تمہارے لئے کر رہی ہوں۔ اپنے اس گھر کے لئے کر رہی ہوں جو ہم نے بڑی محبت ایثار اور قربانی سے بنایا ہے اور تم بھول رہے ہو کہ تم میری پہلی محبت ہو' عورت اپنی پہلی محبت کبھی نہیں بھولتی۔"

"سچ شکیلہ!" سجاد کسی بچے کی طرح خوشی سے پھول گیا۔ "تمہیں کب طلاق دوں۔ آج ابھی اور اسی وقت؟"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے سجاد!" اس نے سجاد کے سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔ "اگر تم نے مجھے ابھی طلاق دے دی تو پھر ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے حرام ہو جائیں گے۔ ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔ پہلے میں افضال احمد سے مل کر شادی کی تاریخ اور پروگرام طے کر لوں۔"

"اب تم افضال احمد سے کب مل رہی ہو؟"

"اس نے مجھے کل رات بلایا ہے اور وہ پرسوں ایک ہفتے کے لئے بے حد ضروری کام سے اسلام آباد جا رہے ہیں۔ اس کی واپسی کے بعد ہی شادی کا پروگرام طے ہو گا۔ اب میں ان دنوں تمہاری دسترس میں ہوں۔ کیوں نہ ہم دونوں سوات جا کر تفریح کریں؟" شکیلہ نے تجویز پیش کی۔

"مجھے یہاں بہت سارے کام انجام دینا ہیں۔" سجاد نے جواب دیا۔ "کیوں نہ تم تنویر بیگ کے ساتھ سوات چلی جاؤ اور سیر و تفریح کر آؤ۔ اس کی دلی خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور ہمارا کام بھی بن جائے گا۔"

"میں تو اب اس شخص کی شکل بھی دیکھنا گوارہ نہیں کروں گی۔"

"کیوں؟" سجاد نے تعجب سے پوچھا۔ "اس سے نفرت کس لئے؟"

"اس لئے کہ وہ شخص اچھا آدمی نہیں ہے۔ اگر اس کے ساتھ سوات چلی گئی تو محفوظ نہ رہ سکوں گی۔"

سجاد چپ ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب شکیلہ سے بحث کرنا فضول ہے۔ کہیں پھر تلخی نہ پیدا ہو جائے اس نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ وہ کسی اور وقت شکیلہ کو شیشے میں اتار لے گا۔"

☆======☆======☆

سہ پہر کے وقت وہ تیار ہو کر نکلی۔ سجاد کے گھر آنے کا وقت ہو رہا تھا مگر آج اب اسے سجاد کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ آج سے اپنے انتقام کا آغاز کر رہی تھی۔ وہ زہریلی

ناگن کی طرح دنیا کے ہر مرد کو ڈس لینا چاہتی تھی۔ اس کے دل میں نفرتوں کا غبار بھرا ہوا تھا۔ جس وقت وہ کار ڈرائیو کرتی چلی جا رہی تھی تب اس کے سینے میں سانسوں کا تموج نفرت سے ہچکولے کھا رہا تھا۔ چہرہ سرخ ہو کر تمتما رہا تھا۔ اس کا دل بڑی تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا۔

اس نے لال رنگ کی کوٹھی کے سامنے کار روک دی۔ اس کے گیٹ پر افضال احمد کے نام کی ایک تختی لگی ہوئی تھی۔ گیٹ پر باوردی دربان کھڑا تھا۔ اس نے ایک طرف گاڑی پارک کی۔ دربان کو اشارے سے بلایا۔ وہ آیا تو پوچھا ناہید افضال گھر پر ہیں؟

"جی بیگم صاحبہ!" دربان نے مؤدبانہ جواب دیا۔ "افضال صاحب تو کل ہی اسلام آباد گئے ہیں۔ دس دن بعد آئیں گے۔"

وہ کار سے نیچے اتر آئی۔ کار لاک کی اور دربان سے بولی۔ "میں تمہاری بیگم صاحبہ سے ملنا چاہتی ہوں۔ صاحب سے نہیں۔"

شکیلہ نے کوٹھی کے احاطے میں قدم رکھا تو اس نے دیکھا وسیع و عریض لان پر دو خوبصورت سے لڑکے جن کی عمر دس اور بارہ سال کی ہوگی ایک آٹھ نو سال کی پیاری سی لڑکی کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھے لوڈو کھیل رہے ہیں۔ ان تینوں نے اسے دیکھ کر سلام کیا۔ اس نے بھی بڑے تپاک سے جواب دیا۔ دربان نے اسے نشست گاہ میں لے جا کر بٹھا دیا۔ وہ اس آراستہ و پیراستہ نشست گاہ کا جائزہ لے رہی تھی کہ سامنے والے کمرے کا پردہ ہلا۔ دوسرے لمحے ایک عورت کا سراپا ابھرا۔ اس کے سامنے بیگم ناہید افضال کھڑی تھیں۔ وہ چالیس برس کی ایک عورت تھیں۔ بدن فربہی مائل تھا۔ وہ آج بھی خوبصورت لگ رہی تھیں۔ ان کے چہرے اور رنگ و روپ سے اب بھی ایسا لگ رہا تھا کہ وہ جوانی میں بے حد حسین رہی ہوں گی۔ چہرے کے نقش و نگار میں آج بھی جاذبیت تھی۔ چہرہ کتابی تھا۔ ستواں ناک' پتلے پتلے ہونٹ اور لانبی لانبی سُرمگیں پلکیں تھیں۔ اس کے چہرے پر شادابی اور سکون' ایک ٹھہراؤ سا نظر آ رہا تھا۔ ایک یاسیت سی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر اس طرح سے چونکی تھیں جیسے انہیں بجلی کا سا جھٹکا لگا ہو۔ چند ثانیوں تک وہ مبہوت سی کھڑی اسے دیکھتی رہی تھیں۔ پھر اس کے قریب آ کر بولیں۔ "اگر میں غلطی پر نہیں ہوں یا کوئی خواب نہیں دیکھ رہی ہوں تو آپ مس شکیلہ خانم ہیں؟" اُن کے لہجے میں شدید حیرت تھی' ایک دکھ تھا مگر نفرت یا زہر نہیں تھا۔

چند لمحوں تک شکیلہ پر سناٹا سا رہا۔ وہ بھونچکی سی ہو گئی تھی۔ پھر اس کے لبوں پر

جنبش سی ہوئی۔ "کیا آپ مجھے جانتی .... کیا آپ نے مجھے کبھی کہیں دیکھا تھا؟"

"نہیں تو۔" وہ سر ہلا کے بولیں۔ "آپ کے بارے میں صرف سنا ہی سنا تھا اور آپ کی بو محسوس کی تھی؟"

"میری بو محسوس کی تھی؟" وہ اپنی جگہ سے بڑے زور سے اچھل پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "کیسی بو؟"

بیگم ناہید افضال نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو اس نے محسوس کیا کہ اس گداز ہاتھ میں چوزے جیسی نرمی ہے لیکن اس میں انجانی محبت کی حرارت بھی ہے۔ وہ حرارت اپنائیت بن کر اس کی نس نس میں بجلی کی لہروں کی طرح اترتی جا رہی ہے۔ انہوں نے اسے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا لیا۔ اس کے چہرے اور سراپا پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی مسکراہٹیں تو اس میں اداسی بھی نمایاں تھی۔ "عورت اپنے مرد کے وجود میں دوسری عورت کی بو فوراً ہی سونگھ لیتی ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں برسوں سے اپنے شوہر میں ایسی بو سونگھتی چلی آ رہی ہوں۔ مگر ان پر کبھی ظاہر نہیں کیا؟"

اس عورت نے اس پر جیسے کوئی بم گرا دیا تھا۔ وہ متحیر اور پتھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ حیرت سے پھٹی پھٹی نظروں سے اس عورت کو دیکھ رہی تھی جو برسوں سے اپنے شوہر کے غلیظ وجود کو برداشت کر رہی تھی جس میں سے تعفن اٹھ رہا تھا۔ یہ کیسی عظیم عورت تھی' کتنی صابر و شاکر تھی۔ اس نے نوشتہ تقدیر کو رضائے الٰہی سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ زبان سے اُف تک نہیں کیا تھا۔ کوئی احتجاج نہیں کیا اپنے اس ساتھی سے جس نے اسے اپنا کر اس کے خوابوں کے سارے نگر اجاڑ دیئے تھے۔ اس مرد نے اس عورت سے زندگی کے سفر میں آخر دم تک شریک رہنے کا عہد تو کیا ہوگا جیسا کہ ہر مرد سہاگ رات کو کرتا ہے لیکن راستے سے بھٹک کر برائیوں کی تاریک راہوں پر نکل گیا تھا۔ پھر بھی وہ اپنی ازدواجی زندگی اس اعتماد کے ساتھ گزار رہی تھی کہ اس کا شوہر آج اب بھی اسی کا ہے۔ وہ صرف اسی احساس پر آج تک زندہ تھی۔ شاید اسے فریب نے زندہ رکھا ہوا تھا۔ اگر فریب نہ ہوتا تو شاید عورت کب کی مر چکی ہوتی۔

"آپ کیا سوچنے لگیں؟" بیگم ناہید افضال نے اس کے ہاتھ کی پشت کو تھپتھپاتے ہوئے پوچھا۔ "کیسے آنا ہوا' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"جی .... جی!" وہ چونک کر خیالوں سے نکل آئی۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی تو اسے لگا کہ اس کی مسکراہٹ تازگی کھو بیٹھی ہے۔

"اگر آپ ان سے ملنے آئی ہیں تو وہ گھر پر نہیں ہیں۔ وہ دس بارہ دنوں کے لئے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔"

"جی.......... مجھے علم ہے۔" اس نے ساڑھی کا پلو شانے پر درست کیا۔

"آپ کو علم تھا اور آپ پھر بھی یہاں چلی آئیں۔" ان کے چہرے پر گہرا استعجاب بکھر گیا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "کس لئے..........؟"

"آپ کو دیکھنے' آپ سے ملنے اور باتیں کرنے کے لئے۔" شکیلہ کے یاقوتی لبوں پر دل فریب مسکراہٹ بکھر گئی۔

"مجھ سے ملنے' باتیں کرنے اور مجھے دیکھنے کے لئے؟" وہ حد درجہ حیرت میں پڑ گئیں۔ "وہ کس لئے؟"

"شاید یہ خود میں بھی نہیں جانتی ہوں۔" شکیلہ نے شگفتہ لہجے میں جواب دیا۔ "انجانا سا جذبہ' ایک عجیب سی خواہش مجھے کشاں کشاں یہاں لے آئی۔ میں آپ سے ملنا اور باتیں کرنا چاہتی تھی۔ میں تو یہ سمجھتی تھی کہ آپ مجھے نہیں پہچان سکیں گی۔ میں دفتر کی کوئی لڑکی بن کر آپ سے مل لوں گی۔ مگر آپ نے مجھے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ سچ پوچھئے تو مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا ہے۔"

"میں نے آپ کے ذکر کے ساتھ ساتھ آپ کے حسن کا چرچا بھی سنا تھا بلکہ روز ہی سنتی آ رہی ہوں۔ میری سہیلیوں اور میری بہنوں نے آپ کو دو ایک بار افضال احمد کے ساتھ دیکھا تھا۔ میرے دل میں بڑی خواہش اور اشتیاق تھا کہ آپ کو دیکھوں۔ سو آج دیکھ لیا۔ جیسا سنا اس سے بھی کہیں بڑھ کر آپ کو پایا ہے۔ آپ واقعی ہزاروں میں نہیں بلکہ لاکھوں میں ایک ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں آپ جیسی حسین اور بے حد پُرکشش عورت شاید ہی دیکھی ہو۔ آپ کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے آپ کو فرصت میں اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ اس نے آپ کو حُسن ودیعت کرنے میں ذرہ برابر بھی بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ سچ پوچھئے تو آپ اس کی تخلیق کا نادر اور اچھوتا نمونہ ہیں۔"

شکیلہ پر اس کے تعریفی الفاظ کا اس قدر اثر نہیں ہوا تھا جس قدر اس کی وسیع القلبی پر۔ اس پر شدید حیرت غالب تھی کہ وہ ایک ایسی عورت کے حُسن کی تعریف کر رہی تھی جس نے اس کا شوہر اور اس کے بچوں سے اس کا باپ چھین لیا تھا اور اس کا شوہر اسے جلدی ہی بیچ منجدھار چھوڑنے والا تھا اور پھر بھی اس نے کسی شدید نفرت' حقارت اور غصے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ "عجیب سی بات ہے؟" وہ تحیر زدہ لہجے میں بولی۔

"کون سی بات عجیب سی ہے؟" بیگم ناہید افضال احمد نے مسکرا کے پوچھا۔

"یہ بات عجیب ہی نہیں بلکہ انتہائی حیرت انگیز بھی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "آپ میرے ساتھ نفرت اور حقارت سے پیش آنے کے بجائے اس طرح پیش آ رہی ہیں جیسے میں آپ کی دشمن نہیں بلکہ سگی بہن ہوں؟"

"دنیا کی ہر عورت کو میں اپنی بہن سمجھتی ہوں۔" وہ ہنس پڑیں۔ "میں کس لئے آپ کے ساتھ نفرت' حقارت اور ذلالت کا سلوک کروں؟"

"اس لئے کہ میں آپ کی محبت اور ازدواجی زندگی کی تباہی و بربادی کا سبب بن رہی ہوں۔ میں نے آپ کے شوہر کو غیر محسوس انداز سے آپ سے اور آپ کے بچوں سے دور کر دیا ہے۔ کیا ایک ایسی عورت جو ڈائن اور ناگن کہلاتی ہے' وہ کسی محبت کے لائق ہے؟"

"مگر اس میں آپ کا کیا قصور ہے؟ سارا قصور تو میرے شوہر نامدار کا ہے۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری حسین لڑکیاں اور پُرشباب عورتیں ہیں۔"

"میرے خیال میں آپ اس دنیا کی پہلی اور آخری خاتون ہوں گی جو اس انداز سے سوچتی ہیں۔ ورنہ بھلا کون ایسی عورت ہو گی جو اپنے شوہر کی بانہوں میں کسی دوسری عورت کا وجود برداشت کر سکے؟ بانہوں میں تو درکنار وہ زبان سے کسی دوسری عورت کا نام تک سننا گوارا نہیں کرے۔"

"مجھے تو ہر صورت اور ہر قیمت پر اپنے شوہر کی خوشی چاہئے۔ بس میں انہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کر رہی ہوں۔"

"اور آپ کے شوہر آپ کی کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں اور آپ خاموشی سے اپنی بربادی و تباہی کا تماشا دیکھ رہی ہیں۔"

"تم مرد کو شاید آج تک سمجھ نہیں سکی ہو اور اسے جانتی نہیں ہو۔ مگر میں مردوں کی فطرت سے بخوبی واقف ہوں اور میں اپنے شوہر سے جتنا واقف ہوں بھلا دوسرا کون واقف ہو سکتا ہے؟ اگر میں اپنے مرد کی کمزوری کی راہ میں دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی تو پھر میرا ان سے رشتہ کسی کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتا۔ میں اپنے بچوں کی خاطر' ان کے مستقبل اور ان کے حال کے لئے اپنا رشتہ ناطہ توڑنا نہیں چاہتی ہوں۔" پھر وہ ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "پلیز! ایک منٹ' مجھے کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ اچھا تو آپ یہ بتائیں کہ کیا پئیں گی' چائے یا ٹھنڈا؟"

"آپ محبت سے جو پلا دیں گی وہ پی لوں گی۔" شکیلہ نے جواب دیا۔

بیگم ناہید افضال احمد اندر جا کر ملازمہ سے چائے ناشتے کا کہہ کر آ گئیں اور اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئیں تو شکیلہ نے چند لمحوں کے بعد کہا۔ "اگر آپ اپنا دل مضبوط کر لیں تو میں آپ کو تین ہولناک خبریں سنانا چاہتی ہوں۔ شاید ابھی تک آپ نے یہ خبریں سنی نہیں ہوں گی۔"

"میرا دل بہت مضبوط ہے۔ میری زندگی میں کتنے ہی طوفان آئے اور گزر گئے۔ اب مجھے کسی بڑے سے بڑے طوفان اور حوادثِ زندگی سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔ میں تو ایک چھوٹا سا دیا ہوں مگر بجھنے والے دیئوں میں سے نہیں ہوں۔ آپ جو بھی خبر سنائیں گی وہ میں سننے کے لئے تیار ہوں۔"

"سب سے پہلی خبر یہ ہے کہ آپ کے شوہر نے اپنی ساری دولت' کاروبار اور جائیداد میرے نام لکھ دیا ہے۔" شکیلہ نے اپنا پرس کھول کر ان تمام کاغذات کی نقلیں باہر نکالیں اور ان کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

بیگم ناہید افضال نے یہ کاغذات دیکھے تو ان پر سکتہ سا چھا گیا۔ انہیں جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ لمحے کے لئے ان کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ دوسرے لمحے انہوں نے خود پر قابو پا لیا۔ کاغذات شکیلہ کو لوٹاتے ہوئے بولیں تو ان کے لہجے میں غم بھرا ہوا تھا۔ "اس میں شاید خدا کی کوئی مصلحت ہو!"

شکیلہ نے اپنے پرس میں کاغذات کو رکھنے کے بعد کہا۔ "دوسری خبر یہ ہے کہ وہ دس پندرہ دن بعد مجھ سے شادی کرنے والے ہیں۔"

"جب یہ سب کچھ انہوں نے آپ کے نام کر دیا ہے تو ظاہر ہے آپ سے شادی کرنے کے لئے ہی کیا ہو گا!" وہ بجھے بجھے لہجے میں بولیں۔ "اور آپ نے ان سے شرائط منوائی ہوں گی۔ مگر انہوں نے اتنی بڑی غلطی کیسے کی؟ اپنے دونوں ہاتھ کاٹ لئے۔"

"آپ کا اندازہ سو فیصد درست ہے۔" شکیلہ نے تائید کی۔

"اگر میں مرد ہوتی تو شاید میں بھی آپ کے حُسن و شباب میں پاگل ہو کر شاید یہی حماقت کر بیٹھتی۔ اگر دنیا کا کوئی مرد آپ کے قدموں میں ساری دنیا کی دولت بھی لا کر ڈال دے تو وہ کم ہے۔ تیر کڑی کمان سے نکل چکا ہے تو میں بھلا کیا کر سکتی ہوں۔"

"تیسری اور سب سے منحوس خبر یہ ہے کہ وہ آپ کو مجھ سے شادی کرنے کے بعد طلاق دینے والے ہیں۔"

"کیا کہا.........؟" بیگم ناہید افضال احمد اپنی جگہ سے اچھل پڑیں۔ انہوں نے اپنا دل اچانک دبا لیا جیسے دل باہر آنے والا ہو۔ ان کا چہرہ شدید تکلیف سے زرد ہو رہا تھا۔ وہ چند لمحے سے زیادہ دیر کھڑی نہ رہ سکیں۔ کسی کٹے ہوئے شہتیر کی طرح صوفے پر گر پڑیں اور اپنا سر صوفے کے کنارے پر ٹکا دیا۔ "نہیں.......... نہیں.......... ایسا نہیں ہو سکتا۔" وہ ہذیانی انداز میں بولیں اور کسی بے آب ماہی کی طرح تڑپنے لگیں۔ "میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں۔ اتنا خوفناک فیصلہ مجھے منظور نہیں ہے۔"

"پلیز! آپ اپنے آپ کو سنبھالیں۔" شکیلہ ان کی دگرگوں حالت سے بڑی متاثر نظر آ رہی تھی۔

"مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ افضال نے میرے سینے میں کوئی خنجر بھونک دیا ہے اور اس کی تیز دھار میرے دل کو کاٹتی جا رہی ہے۔" ان کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ پھر وہ دھیرے دھیرے سسکنے لگیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو نکل نکل کر رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ انہوں نے چند ہی لمحوں میں اپنے آنسوؤں پر اور خود پر قابو پا لیا اور دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا آپ نے افضال احمد سے مجھے طلاق دینے پر اصرار کیا ہے؟ انہیں مجبور کیا ہے؟" ان کی آواز گلے میں رندھ رہی تھی۔

"ہاں!" شکیلہ نے اقرار میں گردن ہلائی۔ "میں نے ان کے سامنے جو شرائط رکھی تھیں ان میں یہ شرط بھی شامل تھی۔"

"آخر کس لئے؟" انہوں نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے شکیلہ کی طرف دیکھا۔ "میں نے آپ کا کیا بگاڑا؟ ایک مسلا ہوا' بے رنگ پھول جس میں کوئی خوشبو اور ترو تازگی ہی نہیں رہی ہے' اسے آپ گلی میں پھینک کر کیا کریں گی؟"

"میں نے افضال احمد سے انتقام لینے کے لئے یہ شرط رکھی تھی۔" شکیلہ نے جواب دیا۔

"آپ افضال احمد سے نہیں بلکہ مجھ سے اور میرے بچوں سے انتقام لے رہی ہیں۔ ایک مرد اپنی بیوی کو طلاق دینے اور بچوں کو چھوڑ دینے کے بعد ہلکا تو ہو جاتا ہے مگر اس کی بیوی پر ایک قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ اس کے بچے کہیں کے نہیں رہتے ہیں۔ اگر وہ مجھے چھوڑ دیتے ہیں تو انہیں سزا کہاں ملی؟ انہیں تو آپ جیسی شہزادی مل گئی۔ میرے اور میرے بچوں کے حصے میں تباہی و بربادی آئی۔"

"میں نے افضال احمد کو سزا دینے کے لئے تو یہ سوچا تھا کہ وہ آپ کو طلاق دے دیں

اور پھر میں ان سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دوں تاکہ وہ اس دنیا میں اذیت ناک طور پر تڑپیں اور ساری زندگی کے لئے تنہا ہو جائیں۔ وہ نہ صرف بیوی بچوں اور مجھ سے محروم ہو جائیں بلکہ ایک گھر سے بھی محروم ہو جائیں۔ جس طرح انہوں نے میری زندگی تباہ و برباد کی۔ اس طرح میں بھی ان کی ساری زندگی تباہ کر دوں۔"

"لیکن اس انتقام کی لپیٹ میں' مَیں اور میرے بچے بھی تو آ جاتے ہیں۔ آخر ان کا کیا قصور ہے؟"

"آخر میرا کیا قصور تھا جو انہوں نے مجھے اپنے جذبات کا نشانہ بنایا۔ کمزور لمحے کا شکار بنا دیا؟"

"بات صرف اتنی سی ہے کہ بے قصور کو بھی سزا مل رہی ہے؟ کیا کسی اور نے .... بھگت کوئی اور رہا ہے؟" بڑے دکھ بھرے لہجے میں بولیں۔

"آپ کو اپنے اس شوہر سے اتنا پیار' اتنی چاہت اور اتنی محبت ہے کہ ان سے ذرہ برابر بھی نفرت نہیں کرتی ہیں؟ انہیں ایسی کوئی سزا دینا نہیں چاہتی ہیں جو انہیں ساری زندگی یاد رہے اور وہ ایک جہنم میں جلتے رہیں۔ اذیت اور تنہائی کے جہنم میں۔"

"اس لئے کہ میں ایک عورت جو ہوں اور پھر میں نے محبت کرنا سیکھا ہے۔ مجھے میرے شوہر ہزار برائیوں کے باوجود بہت اچھے لگتے ہیں۔ ان کی برائیوں کو بھی میں نے اپنا تاج سمجھ کر پہن لیا ہے اور پھر میں آپ کے خلاف بھی دل میں کوئی نفرت محسوس نہیں کر رہی ہوں اور نہ ہی اسے جنم دینا چاہتی ہوں۔"

"آپ کی اس محبت نے مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خرید لیا ہے اور میں ساری زندگی آپ جیسی عظیم ہستی کو بھول نہ سکوں گی۔ شاید زندگی کے آخری سانس تک آپ کی یاد آتی رہے گی۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ افضال احمد نے آپ جیسے ہیرے کی کوئی قدر و قیمت نہیں کی۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے۔ آخر ان پر برف جیسی بے حسی کیوں طاری ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ کیا مرد واقعی اتنا خود غرض' ذلیل اور کمینہ ہوتا ہے؟"

بیگم ناہید افضال احمد نے اس کی بات کا جواب دینے کے لئے منہ کھولا تھا کہ معاً ان کی نظر ملازمہ پر پڑی جو ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر آ رہی تھی۔ ٹرالی میں چائے اور ناشتہ تھا۔ پھر ان دونوں کے درمیان خاموشی کی دیوار کھڑی ہو گئی۔ ملازمہ ٹرالی ان کے سامنے لے آئی تو انہوں نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلی گئی تو شکیلہ بولی۔ "افضال احمد آج پوری طرح میری مٹھی میں ہیں۔ میں انہیں دودھ میں گری مکھی کی طرح نکال کر پھینک سکتی

ہوں۔"

"آپ جو چاہیں کریں لیکن مجھ سے میرا شوہر اور میرے بچوں سے ان کے باپ کو نہ چھینیں مجھ پر آپ کا یہ احسان عظیم ہو گا اور یہ احسان آپ ایک بہن بن کر نہیں ایک عورت بھی بن کر سکتی ہیں۔ اس لئے کہ کوئی عورت کبھی دوسری عورت کا گھر نہیں اجاڑتی ہے۔ مجھے آپ میں بھی ایک عورت کی بو اور اس کا عکس نظر آ رہا ہے۔"

"تو کیا آپ تنگ دستی کی زندگی گزار لیں گی' اس زندگی میں خوش رہیں گی؟"

"شوہر کی محبت کی گھنی چھاؤں ہو تو عسرت و افلاس کی زندگی بھی خوشی سے گزر جاتی ہے۔" انہوں نے پیٹیز کی پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "افضال احمد جب ایک عام سے شخص تھے تب وہ مجھ سے شدید محبت کرتے تھے۔ مگر جیسے جیسے وہ امیر و کبیر ہوتے گئے ان کی محبت میں فرق آتا گیا اور مجھ سے دور ہوتے گئے۔ پھر یہ فاصلہ بڑھتا گیا۔ وہ بلندی کی طرف جانے لگے اور میں پستی کی طرف' آج ہم دونوں کے درمیان فاصلہ ہی فاصلہ رہ گیا ہے۔ شاید ساری زندگی رہے۔"

"اور میں اس فاصلے کو مٹانے ہی کے لئے آئی ہوں۔ آپ چاہیں تو یہ فاصلہ ہمیشہ کے لئے مٹ سکتا ہے۔"

"یہ فاصلہ کیسے مٹ سکتا ہے؟" بیگم ناہید افضال احمد نے حیران حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں نہیں مٹ سکتا؟" شکیلہ کہنے لگی۔ "میں آپ کے پاس اس لئے آئی ہوں کہ ایک عورت ہونے کے ناطے آپ کی مدد کروں اور ایک مرد کو عبرتناک سزا دوں۔ میں نے آپ کی بہت تعریف سنی تھی۔ مگر میں نے آپ کو اس تعریف و توصیف سے کہیں زیادہ عظیم پایا اور پھر آپ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نے کچھ عرصہ اپنے شوہر کی سیکرٹری کے فرائض بھی انجام دیئے ہیں۔ آپ چاہیں تو اس فاصلے کو مٹا سکتی ہیں۔ اگر آپ اس بات کا وعدہ کریں تو میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں۔"

"اگر فاصلوں کو مٹانا میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں کب کا انہیں مٹا چکی ہوتی۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولیں۔ "آپ مجھ سے کیا وعدہ لینا چاہتی ہیں؟ اگر وہ میرے اختیار میں ہوا تو آپ سے اس وعدہ پر آخری دم تک قائم رہنے کا عہد کر سکتی ہوں۔"

"وہ آپ کے اختیار میں ہی ہو گا۔ مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ شوہر کی محبت میں برف کی طرح پگھل کر رہ جائیں' ان کے بہکاوے میں آ جائیں۔"

"میرے اختیار میں ہے تو میں اس وعدے پر آخری سانس تک قائم دائم رہوں گی۔ بہکاوے میں آنے کی کوئی غلطی نہیں کروں گی۔"

"آپ کے شوہر نے اپنا جو کچھ میرے حوالے کیا ہے وہ سب کچھ میں آپ کے نام منتقل کر دینا چاہتی ہوں۔" شکیلہ بولی۔

"جی..........!" وہ بھونچکی سی ہو گئیں۔ ان کی کیفیت برسوں گھپ اندھیرے میں گزار کر یک لخت چکا چوند کر دینے والی روشنی میں آ جانے والے سے مختلف نہیں تھی۔ انہیں یہ سب کچھ ایک خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ محض ایک فریب خیال۔ انہوں نے مدت سے یہ خواب دیکھنے چھوڑ دیئے تھے۔ وہ جانتی تھیں کہ ان کا شوہر ان کا کبھی نہیں ہو سکتا۔ اب اس کے لئے مسلے ہوئے پھول میں رکھا ہی کیا ہے۔ وہ تو کسی بھنورے کی طرح کلیوں اور پھول کی تلاش میں ہے۔

انہیں سکتے کی سی کیفیت میں پا کر شکیلہ نے کہنا شروع کیا۔ "آپ یہ سب کچھ اپنے ہی نام اور اپنے ہی ہاتھ میں رکھیں گی۔ آپ کو اسی بات کا مجھ سے وعدہ کرنا ہے۔ اسی وعدے پر آپ کو ساری زندگی قائم رہنا ہے۔ مرد ایک سانپ کی طرح ہوتا ہے۔ آستین مار ہوتا ہے۔ اگر آپ نے اس پر بھروسہ کیا اور اس کی باتوں میں آ کر سب کچھ واپس اس کے نام منتقل کر دیا یا اختیارات دے دیئے تو وہ سب سے پہلے آپ کو ڈس لے گا۔ آپ کو یکسر بدلنا ہو گا۔ آپ کو ایک نئی عورت بن کر دفتر جانا ہو گا۔ اپنی ذمے داریاں سنبھالنی ہوں گی۔ ورنہ سجاد جیسے لوگ اپنی بیویوں کو بہنیں بنا کر افضال احمد سے متعارف کراتے رہیں گے۔ افضال احمد آرڈر دینے کے بہانے کلیوں کو سفارش کے طور پر قبول کرتے رہیں گے۔ چیک دینے سے پہلے انہیں بستر کی شکن بنا دیں گے۔ پھر کوئی شکیلہ آئے گی اور وہ آپ کو کسی کوڑھ کے مریض کی طرح نکال باہر کرے گی۔"

شکیلہ جذباتی ہو گئی تھی۔ اس کی آواز اچانک بھرا گئی تھی۔ کسی جھرنے کی طرح آنسو اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے بکھر گئے اور تھر تھر ہونٹ کانپنے لگے۔ وہ ایک ٹک ان موتیوں اور ان ہونٹوں کو دیکھتی رہیں۔ پھر اچانک نہ جانے کیا ہوا۔ انہوں نے ایک جھٹکے سے گر کر شکیلہ کے قدم چھو لئے اور ان قدموں کی دھول اپنے ماتھے سے لگالی۔

شکیلہ یکایک اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ اس کے ہاتھ سے طشتری کانپنے لگی۔ "آپ نے یہ کیا کیا؟" اس نے طشتری تپائی پر رکھی اور پھر کسی زخمی پرندے کی طرح تڑپ کر ان کے ہاتھ تھام لئے۔ "میں بے حد غلیظ .... گندی .... ناپاک ہوں .... اپنے

ہاتھوں کو میرے وجود سے میلا نہ کریں۔"

انہوں نے شکیلہ کو بے اختیار اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ اس کی پیشانی اور چہرے پر بوسے ثبت کر دیئے۔ پھر ان کی آواز فضا کا حصہ بن گئی۔

"میری بہن بھی ہوتی تو شاید وہ میرے لئے اتنا کچھ نہ کرتی۔ آپ نے جو کچھ کیا اور کرنا چاہتی ہیں، میں اسے کبھی بھی بھلا نہ سکوں گی۔ آپ نے مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خرید لیا ہے۔ آج سے میں آپ کے قدموں کی دھول ہوں۔ آپ نے مجھ پر کتنا بڑا احسان کیا ہے؟ آپ کتنی عظیم ہیں؟ آپ نے میری محبت، میرا گھر اور میرے بچوں کو تباہی و بربادی سے بچا لیا ہے۔ کاش! میرے پاس کچھ دینے کے لئے ہوتا تو میں آپ کو دے دیتی۔ میری جھولی خالی ہے۔ میرے پاس دعاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔"

"مجھے دعاؤں کے سوا کچھ نہیں چاہئے۔" شکیلہ ان کے بازوؤں سے نکل کر بولی۔ "میں یہ سب کچھ اس لئے کر رہی ہوں کہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کروں۔ میرے گناہ آج مجھے زہریلے ناگوں کی طرح ڈس رہے ہیں۔ میں آج پچھتانا چاہتی ہوں تو پچھتا بھی نہیں سکتی ہوں اور اب میری آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک بوند بھی نہیں رہی ہے۔"

شکیلہ نے چلتے چلتے پھر کہا۔ "دیکھئے یہ سب کچھ میں نے صرف آپ کی خاطر ایک بیوی، ایک عورت اور ایک گھر کے لئے اتنا بڑا جوا کھیلا ہے۔ آپ شوہر پرست ہیں، یہ بہت اچھی بات ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ شوہر پرستی کے نرغے میں آ کر سب کچھ اپنے شوہر کے حوالے کر دیں اور ہاتھ ملتی رہ جائیں۔ سارا نظام اور انتظام اپنے ہاتھ میں رکھیں۔ ورنہ یہ کتا آپ کو کاٹ لے گا۔"

"میں شوہر پرست، ایک عورت، ماں اور بیوی ضرور ہوں لیکن احمق نہیں ہوں۔ میں کبھی آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔ میرے سینے میں جو زخم ہیں انہیں ہرا نہیں ہونے دوں گی۔ اب میں کسی بڑے یا چھوٹے زخم کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

"میں کل صبح دس بجے آ رہی ہوں، تیار رہئے گا۔ کل ہی وکیل کے پاس چل کر ساری کارروائی مکمل کر لیتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ افضال احمد کے واپس آنے سے پہلے پہلے آپ دفتر کا سارا کام سنبھال چکی ہوں۔ افضال احمد کو اپنی حیثیت اور رتبے کا بھی احساس ہو جائے۔"

شکیلہ گھر پہنچی تو شام ہو چکی تھی۔ سجاد دفتر سے آ چکا تھا۔ اس کی کار پارکنگ لاٹ پر موجود تھی۔ وہ لفٹ سے اوپر جاتے ہوئے اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہی

تھی۔ اس کے اعصاب پھول کی طرح ہلکے ہو چکے تھے۔ اس کے سر سے جیسے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔

وہ آج بے حد خوش تھی۔ اس نے اپنے آپ کو کبھی اس قدر خوش اور مسرور محسوس نہیں کیا تھا۔ ایک انجانی شادمانی نے اس کے وجود میں عجیب سا احساس بھر دیا تھا۔ وہ اپنے گھر کے دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی سوچ رہی تھی۔ چراغ سے چراغ جلا' دوسروں کو خوشیاں پہنچا کر کیسی سرشاری اور انمول سی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ کہاں اس نے اپنی ساری زندگی میں کبھی ایسی خوشی پائی تھی یا کبھی پا سکتی ہے؟

وہ اندر داخل ہوئی تو اس نے سجاد کو نشست گاہ میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے پایا۔ وہ بڑا پریشان اور مضطرب سا نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس کی طرف بے تابی سے بڑھا۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں؟ میں تو پریشان ہو رہا تھا۔"

"میں گھر میں بیٹھے بیٹھے بور ہو گئی تو ذرا گھومنے چلی گئی تھی۔ واپسی میں دیر ہو گئی۔ شکیلہ نے جواب دیا۔ "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ میں کوئی بچی تو ہوں نہیں۔ کراچی کی سڑکوں اور یہاں کے ٹریفک کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہو چکی ہوں۔"

"اچھا.......... اچھا.......... جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" سجاد بولا۔ "آٹھ بج رہے ہیں اور ہمیں ٹھیک نو بجے پہنچنا ہے۔"

"کہاں پہنچنا ہے؟" اس نے اپنے آپ کو صوفے پر گراتے ہوئے پوچھا۔ "میں اس وقت بے حد تھکی ہوئی آ رہی ہوں۔"

"ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں۔" سجاد صوفے پر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "آج تنویر بیگ نے ہم دونوں کو رات کے کھانے پر بلایا ہے۔"

"میں نہیں جاؤں گی' تم ہو آؤ۔ میرا موڈ بھی نہیں ہو رہا ہے کہیں آنے جانے کے لئے۔" وہ ایک انگڑائی لے کر مسکرائی۔

"اس نے پارٹی صرف ہم دونوں کے لئے دی ہے اور میں اکیلا ہو آؤں۔ وہ کیا سمجھے گا؟ اس کی دعوت ٹھکرا دینا کتنی بری بات ہو گی۔"

"وہ جو سمجھتا ہے سمجھے' میری بلا سے .... میں نے ایک بار کہہ جو دیا کہ مجھے کسی پارٹی اور دعوت میں نہیں جانا ہے' نہیں جاؤں گی۔"

شکیلہ کی تیوریوں پر بل دیکھ کر وہ ایک دم سے نرم پڑ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جو شکیلہ نے صاف طور سے انکار کر دیا تھا۔ آج سے پہلے کبھی شکیلہ نے انکار نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا

تھا کہ شکیلہ کا دماغ اب ساتویں آسمان پر ہے۔ افضال احمد نے اس کے نام اپنی ساری دولت' جائیداد اور کاروبار لکھ کر اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکالتے ہوئے سوچا کہ شکیلہ کو کسی طرح قابو میں کیا جائے۔ اس نے تنویر بیگ کی دعوت قبول کر لی تھی۔ افضال احمد کی واپسی تک شکیلہ کو تنویر بیگ کے ساتھ سوات بھیجنے میں اسے بڑا فائدہ پہنچنے والا تھا۔ تدبیر سوچتے سوچتے اس کی ذہنی رو بہک گئی۔ ایک آوارہ سا خیال اس کے ذہن میں آیا تو وہ اچھل پڑا۔ اس نے سوچا اگر وہ کاغذات اپنے قبضے میں کر لے تو شکیلہ اس کے قابو میں آ سکتی ہے۔

شکیلہ صوفے پر نیم دراز سی تھی۔ بکھری ہوئی سی تھی۔ سجاد فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کے پیر دابتے ہوئے بولا۔ "کیا پیروں میں درد ہو رہا ہے؟"

"یہ کیا کر رہے ہو؟" شکیلہ کو سجاد کی یہ حرکت کس قدر عجیب سی لگی اور اس حرکت میں اسے چاپلوسی محسوس ہو رہی تھی اور پھر ایک انجانے خطرہ کی بو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے پیر سمیٹ کر سجاد کے چہرے کو بھانپا تو اس کا خیال درست ثابت ہوا تھا۔

"تمہارے پیر داب رہا ہوں۔" سجاد ہنستے ہوئے بولا۔ "لگتا ہے کہ سارا دن گاڑی چلاتے ہوئے یہ خوبصورت اور نازک نازک سے پیر درد کر رہے ہیں۔ جبھی تم اس پارٹی میں جانا نہیں چاہتی ہو اور نہ ہی تمہارا کوئی موڈ ہو رہا ہے۔"

"ہاں!" شکیلہ اپنا سراپا سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تین گھنٹے مسلسل گاڑی چلاتی رہی ہوں۔ میں نے کبھی اتنی ڈرائیونگ نہیں کی تھی۔ میرے پیروں نے تو جواب دے دیا ہے۔"

سجاد نے اس کا ہاتھ پکڑ کے پوچھا۔ "کہاں جا رہی ہو؟ صوفے پر لیٹ جاؤ تو میں تمہارے پیر داب دوں۔"

"میں کمرے میں جا رہی ہوں۔" وہ صوفے پر سے اپنا پرس اٹھاتے ہوئے بولی۔ "ایک گھنٹہ' آدھا گھنٹہ کمر سیدھی کر کے اٹھوں گی۔ آج تمہیں میرے پیر دابنے کا دورہ کیوں پڑ رہا ہے؟ تم میرے شوہر ہو' کوئی نوکر نہیں ہو۔ کیا کوئی شوہر بیوی کے پیر دابتا ہے؟"

"ہم دونوں صرف میاں بیوی نہیں بلکہ آپس میں ایک دوسرے کے گہرے دوست بھی ہیں۔ ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹنا ہم دونوں کا فرض ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ بیوی

تو مرد کے پیر داب سکتی ہے اور مرد اپنی بیوی کے پیر نہیں داب سکتا ہے۔ یہ تو انصاف کی بات نہ ہوئی۔ اگر میں تمہارا خیال نہ رکھوں تو پھر کس کا خیال رکھوں گا۔ تم جو میرا خیال رکھتی ہو میرے کاروبار اور خوشیوں کے لئے اتنا کچھ کرتی پھرتی ہو۔"

"ایسی ہی خواہش اور محبت ہے تو بھلا مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے؟ مگر معلوم نہیں کیوں مجھے یہ اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

شکیلہ نے خواب گاہ میں پہنچ کر کپڑے تبدیل کئے۔ وہ نائٹی پہن کر پلنگ پر لیٹی تو سجاد آہستہ آہستہ اس کے پیر دابنے لگا۔ وہ دل میں تمسخر سے کہہ رہی تھی۔ ایک مرد جب عورت کی مٹھی میں آ جاتا ہے تو کتنا گر جاتا ہے۔ عورت اس کی محتاجی سے جو چاہے جب چاہے خوب فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ جبھی تو وہ فائدہ اٹھا رہی ہے۔ سجاد اپنی غرض کے لئے اس کے پیر داب رہا ہے۔ خوشامد اور چاپلوسی کا بھی یہ ایک انداز ہے۔

سجاد نے اس کے پیر دابتے دابتے اچانک اپنے ہاتھ روک کر اس سے پوچھا۔ "جانی! تم نے وہ کاغذات کہاں رکھے ہیں۔"

"کون سے کاغذات؟" شکیلہ نے تکیہ پر سے سر اٹھا کر انجان بن کر اس سے پوچھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ سجاد اس سے کن کاغذات کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ اس نے دانستہ سجاد کو آج بیگم ناہید احمد سے ملاقات کا نہیں بتایا تھا۔

"وہی کاغذات جو افضال احمد کے کاروبار اور جائیداد کے ہیں۔ افضال احمد نے جو تمہیں لکھ کر دیئے ہیں۔"

"تم ان کاغذات کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا کچھ کام ہے ان کاغذات سے؟"

"میں ان کاغذات کو دیکھنا اور کسی وکیل کو دکھانا چاہتا ہوں۔" سجاد نے کہا۔ "میں نے پہلے وہ کاغذات بڑے سرسری انداز سے دیکھے تھے۔"

"وہ کس لئے؟" شکیلہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اس لئے کہ کہیں افضال احمد نے تمہارے ساتھ کوئی فراڈ تو نہیں کیا ہے؟ تمہیں بے وقوف تو نہیں بنا رہا ہے؟"

"میرے ساتھ وہ فراڈ کر ہی نہیں سکتا ہے۔ ساری کارروائی وکیل کے توسط سے کورٹ میں مجسٹریٹ کے سامنے ہوئی ہے۔"

"بیگم سجاد احمد! یہ کراچی ہے۔ یہاں ایسے ایسے زبردست فراڈ ہوتے ہیں کہ عقل

حیران رہ جاتی ہے۔ کیا تم افضال احمد کو شریف آدمی سمجھتی ہو۔ وہ ایک نمبری فراڈی ہے۔ کائیاں ہے۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا ہے۔ تم جیسی دس عورتوں کو بے وقوف بنا سکتا ہے۔"

"مگر میں نے دفتر میں دو دن بیٹھ کر بہت سارے چیک اور کاروباری خطوط پر دستخط کئے تھے اور کل میں دفتر جا رہی ہوں۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ بھی ہو رہی ہے۔ میری مدد اور رہنمائی کے لئے سیکرٹری بھی موجود ہو گی۔ اگر افضال احمد نے فراڈ کیا ہوتا تو وہ مجھے دفتر میں نہیں لے جاتا۔ دفتر کے عہدیداروں سے میرا تعارف نہیں کراتا اور نہ مجھے چیک اور خطوط پر دستخط کرنے دیتا اور اس نے اخبارات میں چھپنے کے لئے مجھ سے متعلق اعلانات بھی بھیجے ہیں جو اتوار کے روز شائع ہوں گے۔"

"وہ تمہیں زبردست پیمانے پر بے وقوف بنا رہا ہے۔" سجاد کہنے لگا۔ "وہ تمہیں جس وکیل کے پاس لے گیا تھا وہ وکیل اسی کا تھا۔ اس نے ایسے کاغذات تیار کئے ہوں گے جو کسی بھی وقت بدلے جا سکتے ہیں۔ رہے اعلانات تو بعد میں ان کی تردید بھی شائع ہو سکتی ہے۔"

"تو کیا دوسرا کوئی وکیل ان کاغذات کو دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ میرے ساتھ فراڈ کیا گیا ہے یا واقعی سب کچھ میرے نام منتقل کیا گیا ہے اور اس نے اپنے بینک جا کر میرے نام سے اکاؤنٹ کھلوایا اور بیس لاکھ روپے میرے اکاؤنٹ میں منتقل کرا دیئے۔ یہ تو فراڈ نہیں ہوا۔"

"میرا وکیل دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر سکتا ہے۔" پھر سجاد نے متحیر ہو کر کہا۔ "کیا کہا.......... اس نے بیس لاکھ روپے تمہارے اکاؤنٹ میں منتقل کر دیئے۔ اس میں بھی اس کی کوئی شاطرانہ چال ہو گی۔ بینک اور بینک منیجر بھی اس کے ہاتھ میں ہو گا۔"

"تو پھر تو ایسا کرو ان کاغذات کی نقول میرے پرس میں رکھی ہیں وہ لے جا کر اپنے وکیل کو دکھا دینا' تسلی کر آنا۔"

"مگر وہ اصل کاغذات ہیں کہاں' انہیں تم نے کہاں رکھا ہے؟ انہیں فلیٹ میں رکھنا خطرے سے خالی نہ ہو گا۔"

"اصل کاغذات میں نے ایک بینک کے لاکر میں رکھ چھوڑے ہیں۔ وہ کاغذات پوری طرح محفوظ ہیں۔ تم ان کی فکر نہ کرو۔"

"بینک کے لاکر میں..........!" سجاد اچھل پڑا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شکیلہ اس قدر ہوشیار اور کائیاں نکلے گی۔ محتاط اور چوکنا ہو گی۔ اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "تم نے تو مجھے بتایا ہی نہیں؟ کون سے بینک کے لاکر میں رکھے ہیں۔ کب لے جا کر رکھے تھے؟"

"اسی علاقے کے بینک میں جس میں تمہارا اکاؤنٹ ہے۔" شکیلہ مسکرا کے بولی۔ "مگر میں نے فرضی نام سے لاکر لے کر کاغذات اس میں رکھ دیئے ہیں۔ یہ کام میں نے آج صبح ہی کیا ہے۔ میں تمہیں اس لئے بتا نہ سکی تھی کہ اس کا خیال تو مجھے اچانک آیا تھا اور اس وقت تم گھر پر نہیں تھے۔"

"تم نے کس خیال کے تحت یہ کاغذات لے کر بینک کے لاکر میں رکھ دیئے؟"

"اس خیال کے زیر اثر کہ کہیں افضال احمد اپنے فیصلے پر پچھتا کر ان کاغذات کے حصول کے لئے ہماری غیر موجودگی میں آ کر وہ کاغذات نکال کر نہ لے جائے یا کسی بہانے مانگ نہ لے۔" شکیلہ نے جواب دے کر دل میں سوچا کہ اب اسے موقع پا کر ان کاغذات کو کہیں چھپانا ہو گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سجاد ان کاغذات کو دیکھ لے اور وہ اس کی نظروں میں جھوٹی بن جائے۔ پھر یہ سوچ کر اس نے اپنے دل کو تسلی دی کہ سجاد اب ان کاغذات کو لے کر اس کا بگاڑ بھی کیا سکتا ہے۔ کل تو وہ سب کچھ بیگم ناہید افضال احمد کے نام لکھ رہی ہے۔ کل آزاد ہو رہی ہے۔ افضال احمد کو ایسا عبرتناک سبق دے رہی ہے کہ وہ ساری زندگی یاد رکھے گا اور پھر کوئی شکیلہ اس کے ہاتھوں تباہ و برباد نہ ہو گی۔

سجاد پر چند لمحوں تک سناٹا رہا۔ پھر اس کے ذہن نے ایک نادر تدبیر سوچ لی تو وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ تاہم اس نے اپنی مسرت کا اظہار نہ ہونے دیا۔ اپنی اس مسرت کو اندر ہی دبا لیا۔ وہ اس تدبیر پر عمل کرنے کے لئے کسی جلدی باز سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ جلد بازی کی صورت میں بات بگڑ بھی سکتی تھی۔ اس کو ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ ہر قیمت پر شکیلہ کو خوش رکھے اور اس کو پنجرے سے اڑ کر جانے نہ دے۔

اس نے تنویر بیگ سے وعدہ کیا ہوا تھا کہ وہ آج ڈنر پر شکیلہ کو لے کر پہنچ رہا ہے۔ ادھر شکیلہ موڈ میں نہیں تھی اور ڈنر پر جانے کے لئے تیار نہ تھی اور نہ ہی وہ تنویر بیگ کی شکل دیکھنے کی روادار تھی۔ وہ شکیلہ کی ناراضی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے بھی کہ اس کا ایک بڑی رقم کا چیک رکا ہوا تھا اور شکیلہ کے دستخط سے جاری ہونے والا تھا۔ اس کا شکیلہ کو ڈنر پر لے جانا بھی بے حد ضروری تھا۔ اس لئے کہ تنویر بیگ سے بڑے اچھے کام

ملنے کے امکانات تھے۔ دیر صرف اس بات کی تھی کہ شکیلہ جلد سے جلد تنویر بیگ کو خوش کر دے۔ تنویر بیگ کی باتوں سے اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ شکیلہ کے لئے پاگل ہو رہا ہے۔ سجاد کے لئے یہ سنہرا موقع تھا کہ تنویر بیگ کے پاگل پن سے فائدہ اٹھائے۔ مگر ادھر شکیلہ تو اس بڑی مچھلی کا چارہ بننے کے لئے کسی طرح تیار نہ تھی۔ مگر اس نے بھی قسم کھا لی تھی وہ شکیلہ کو آخر چارہ بنا کر ہی رہے گا۔

وہ بستر پر لیٹ کر شکیلہ سے محبت بھری باتیں کر رہا تھا اور محبت کے پُرفریب نرغے میں اسے لے رہا تھا۔ ادھر شکیلہ جلد ہی اس کی محبت کے فریب میں آ گئی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد وہ نہا کر کپڑے بدل کر اس کے ساتھ چلنے کے لئے تیار تھی۔ سجاد اپنی کامیابی پر دل میں بہت خوش ہو رہا تھا۔ اِدھر شکیلہ سوچ رہی تھی کہ وہ تنویر بیگ کو تڑپا تڑپا کر مارے گی اور اسے مزا چکھائے گی۔

شکیلہ نے آج تیار ہونے میں ضرورت سے زیادہ اہتمام کیا تھا۔ جب وہ اپنی حشر سامانیوں سمیت ہوٹل پہنچی تو وہ حُسن و نزاکت' رنگت و نکہت اور شوخ و شنگ کا مجسمہ نظر آ رہی تھی۔ چہرے پر قوس قزح کا سیلاب تھا تو آنکھوں میں آفتاب سلگ رہے تھے۔ سرخ سرخ رخساروں پر آفتاب رقص کرتے محسوس ہو رہے تھے۔ ہونٹ ادھ کھلے گلاب کی مانند نظر آ رہے تھے۔ جس وقت وہ کار سے اتر کے لہراتی' بل کھاتی' مہکتی اور رقص کے انداز میں چلتی تنویر بیگ کے میز تک پہنچی' اس دوران اس نے اس مختصر راستے میں دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیا تھا اور ان پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑی تھی۔ جب وہ تنویر بیگ کے سامنے پہنچی تو اسے جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔

سجاد حسب معمول ان دونوں کو تنہائی میں باتیں کرنے اور آزادی سے ایک دوسرے کو دیکھنے کا موقع دینے کے لئے کسی بہانے سے اٹھ گیا تھا۔ ادھر تنویر بیگ خوش ہو گیا تھا۔ وہ اس ہیرے کو دیکھ دیکھ کر مستقبل کے سنہرے خواب بُن رہا تھا جس کی چمک دمک سے دوسروں کی نگاہیں خیرہ کر کے وہ سب کچھ حاصل کر سکتا تھا جو اس کی بہت بڑی تمنا تھی اور افضال احمد کو شکست دے سکتا تھا۔

نصف گھنٹے بعد سجاد آ گیا تھا۔ وہ تنویر بیگ کے ساتھ رات ایک بجے تک رہی تھی اور اس پر بجلیاں گراتی رہی تھی۔ تنویر بیگ نے گھما پھرا کے اسے کئی بار سوئٹزرلینڈ چلنے اور دنیا کی سیر و سیاحت کی دعوت دی تھی اور سجاد سے بھی ساتھ چلنے کے لئے کہا تھا۔ سجاد تیار ہو جاتا تھا مگر وہ کسی حیلے بہانے سے انکار کر دیتی تھی۔ جب وہ لوگ اٹھے تو تنویر بیگ

نے سجاد کو ایک کام کا آرڈر دینے کے لئے دوسرے دن دفتر بلالیا تھا۔

دوسرے دن وہ بھی جلدی ہی نیند سے بیدار ہو گئی۔ سجاد بھی تیار نظر آ رہا تھا۔ وہ تنویر بیگ کے دفتر جا رہا تھا۔ سجاد کے جانے کے بعد وہ نہائی پھر انڈوں کا آملیٹ بنایا۔ ڈبل روٹی اور چائے کے ساتھ ناشتہ کیا۔ وہ تیار ہو کے دس بجے بیگم ناہید افضال احمد کے ہاں پہنچی تو وہ تیار تھیں۔

وکیل' بینک اور کوٹ کے چکر میں دو بج گئے۔ ساری کارروائیوں سے فارغ ہو کر وہ دونوں ایک اعلیٰ درجے کے ریستوران میں آ گئیں۔ ان دونوں نے وہاں پُر تکلف لنچ کیا۔ باتیں کرتی رہیں' منصوبے بناتی رہیں' لائحہ عمل طے کرتی رہیں۔ دوسرے دن ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئیں۔

تین دن کی کارروائی اور دوڑ دھوپ کے بعد شکیلہ کے سر سے جیسے بوجھ اتر گیا اور افضال احمد سے اس کے انتقام کی آرزو بھی پوری ہو گئی تھی۔ اب افضال احمد اپنی بیوی کی مٹھی میں تھے۔ اس نے افضال احمد سے ایسا انتقام لیا تھا کہ وہ خواب و خیال میں بھی نہ سوچ سکتے تھے۔

بیگم ناہید افضال احمد اس کی بڑی ممنون اور احسان مند تھیں۔ مگر اس نے یہ کام تو کسی ممنونیت اور احسان مندی کے لئے نہیں کیا تھا۔ اس نے تو انتقام لیا تھا اور پھر اس نے ایک ایسی خوشی حاصل کی تھی جس کا کیف و سرور اور سرشاری اس کے سوا کوئی اور محسوس نہیں کر سکتا تھا۔

چوتھے دن سجاد نے اسے سویرے سویرے نیند سے بیدار کر دیا۔ وہ نیند سے بیدار ہو گئی تو اس نے پلنگ کے پاس کھڑے ہو کر پوچھا۔ "سر! وہ میرا چیک کب ملے گا۔ اس پر آپ کب دستخط فرمائیں گی۔ اس بار بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"دفتر کی باتیں دفتر میں اچھی لگتی ہیں۔" وہ توبہ شکن انگڑائی لیتی ہوئی بولی۔ "میں گھر پر تمہاری سر نہیں بیوی ہوں۔ میں تمہیں چیک نہیں البتہ ناشتہ تیار کر کے دے سکتی ہوں۔" اس نے فضا میں اپنی مرمریں بانہیں پھیلا دیں۔

سجاد نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کے ہاتھ اپنے شانے پر رکھ لئے۔ "سر' سر ہی ہوتا ہے۔ چاہے وہ گھر میں ہو' دفتر میں ہو' بیوی' باپ ہو یا بیٹا ہو۔ بہر کیف .... آپ حکم فرمائیں بندہ کس وقت چیک کے لئے دفتر تشریف لائے۔"

"صرف دو دن اور صبر کر لو۔" شکیلہ بولی اور اپنا سر اس کے زانو پر رکھ کر لیٹ گئی۔

"دو دن کس لئے؟ افضال احمد نے کبھی میرا چیک دینے میں اس قدر تاخیر سے کام نہیں لیا تھا۔ تم بیوی ہو کر اس قدر دیر کر رہی ہو؟"

"انتظامی امور میں بڑی زبردست تبدیلیاں کی جا رہی ہیں۔ اس لئے کہ دفتر میں بڑی سیاست چل رہی ہے۔" شکیلہ نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ ابھی بیگم ناہید افضال احمد کے بارے میں کوئی بات اس کے علم میں لانا نہیں چاہتی تھی کہ اس نے افضال احمد کی دی ہوئی ساری چیزیں اس کی بیوی کو لوٹا دی ہیں۔ وہ چند لمحوں کے بعد بولی۔ "میں بھی کچھ دیر میں تیار ہو کر دفتر جا رہی ہوں۔ سہ پہر یا شاید رات تک مجھے وہاں رکنا پڑے گا۔ اگر تم جلد آ گئے اور مجھے نہ پایا تو فکر نہیں کرنا۔ کہیں جانا ہو تو چلے جانا۔ میں دفتر سے اٹھ کر سیدھی گھر آؤں گی۔"

شکیلہ گیارہ بجے ناہید افضال احمد سے ملنے دفتر پہنچی۔ اس نے انہیں بے حد مصروف پایا۔ شکیلہ نے محسوس کیا کہ بیگم ناہید افضال احمد ایک ذہین ترین عورت بھی ہے۔ عقل مند بھی ہے اور ان میں بہت ساری صلاحیتیں چھپی ہوئی ہیں جو اب منظر عام پر آ رہی ہیں۔ وہ دفتر کے کاروباری مشیر اور مینجروں سے نہ صرف باتیں کر رہی تھیں۔ بلکہ ہر بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بہت ساری باتیں سمجھ چکی تھیں۔ کچھ اہم معاملات کو نمٹا بھی رہی تھیں۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ کر بڑی خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اس کے علم میں تھا کہ انہوں نے کچھ عرصہ دفتر میں سیکرٹری کے فرائض انجام دیئے تھے۔ اسے بڑی حیرت اور اس سے بڑھ کر اس بات کی خوشی ہو رہی تھی کہ بیگم ناہید افضال احمد پوری طرح اہل ثابت ہو رہی ہیں۔ اس نرم خو عورت کو کوئی بھی شخص بے وقوف نہیں بنا سکتا ہے۔

ٹھیک ایک بجے وہ لنچ کے لئے اٹھ گئیں اور اسے ساتھ لے کر دفتر سے باہر ریستوران میں آ گئیں۔ وہ بے حد تھکی تھکی نظر آ رہی تھیں لیکن ان کے پاس آئندہ کے عزائم کی دل خوش کن خبریں تھیں۔ وہ کھانے کا آرڈر دینے کے بعد شکیلہ سے بولیں۔

"میں دو دن سے صبح سات بجے سے دفتر آ رہی ہوں۔ رات نو نو بجے تک بیٹھ رہی ہوں۔ خدا مجھ پر' میرے گھر اور میرے بچوں پر بڑا مہربان معلوم ہوتا ہے۔ دفتر کے تمام لوگ میرے ساتھ بڑا تعاون کر رہے ہیں۔ دوستوں' بھائیوں اور بچوں کی طرح میرے ساتھ پیش آ رہے ہیں۔ برسوں کے کام چند دنوں میں آ گئے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ میں اس دفتر میں دو سال کام کر چکی ہوں۔ میں نے کل ہی سارے اسٹاف کو بلا کر اجلاس

منعقد کیا تھا۔ میں نے ان سب سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں آپ سب کی باس ضرور ہوں لیکن ایک عورت بھی ہوں۔ ماں' بہن اور دوست بھی ہوں۔ میں اس فرم سے فائدہ نہ صرف اپنی ذات کو بلکہ آپ کی ذات کو بھی پہنچاؤں گی۔ خصوصیت سے ان لوگوں کو جو اپنے کام سے دیانت برتیں گے' محنت اور محبت کریں گے۔ اپنی ذمہ داریاں پوری کریں گے۔ میری ان باتوں کا سبھی کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ ہر شخص گھر کے کسی فرد کی طرح میرے ساتھ پُرجوش تعاون کر رہا ہے۔"

"مبارک ہو۔" شکیلہ بولی۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ اتنی جلدی اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہوں گی۔ مجھے سب سے زیادہ خوشی اس بات سے ہو رہی ہے کہ آپ نے بڑی خوش اسلوبی سے سارا کام سنبھال لیا ہے اور اسے چلا رہی ہیں۔"

"میں آپ سے ایک اور اہم بات کہنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ کو.........."

"کیا آپ مجھے آپ کے بجائے تم کہہ کر مخاطب نہیں کر سکتی ہیں۔" شکیلہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں آپ سے چھوٹی ہوں ایک چھوٹی بہن کی طرح ہوں۔ جب بھی آپ مجھے .... آپ کہتی ہیں تو میں ایک عجیب سی شرمندگی محسوس کرتی ہوں۔ اجنبیت سی محسوس ہوتی ہے۔"

"اگر تمہاری دلی خواہش ہے تو میں اس کا احترام کروں گی۔ تم سچ کہتی ہو۔ اس طرح کے تخاطب اپنائیت کی راہ میں دیوار بن جاتے ہیں۔ مگر تم چھوٹی نہیں ہو۔ کتنی بڑی ہو اور کتنی عظیم ہو یہ میں جانتی ہوں اور خدا جانتا ہے۔" وہ ممنونیت سے بولیں۔

"ہاں تو آپ مجھ سے کوئی اہم بات کہنا چاہ رہی تھیں۔ کون سی بات ہے وہ؟" شکیلہ نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ "تمہارے شوہر سجاد (شکیلہ نے انہیں اپنے بارے میں ساری بات بتا دی تھی۔ اس نے اپنے راز کو راز نہیں رکھا تھا۔ وہ مہینوں سے اس راز کا بوجھ اٹھائے پھر رہی تھی اور اپنا خون جلا رہی تھی۔ اس نے اپنا راز بتا کر اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا سا کر لیا تھا) کا چیک پاس نہ ہو سکے گا۔ اس لئے کہ انہوں نے جو مال سپلائی کیا ہے وہ نہ صرف انتہائی ناقص ہے بلکہ اس کی قیمت بھی کئی سو گنا زیادہ لگائی گئی ہے۔ وہ مال اسلام آباد سے واپس منگوایا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ اس مال کو پاس کرنے کے لئے متعلقہ لوگ دو لاکھ روپے رشوت مانگ رہے ہیں۔ میں ایسے غلط کام کرنا نہیں چاہتی ہوں۔"

"اور میں آپ کی تائید کرتی ہوں۔" شکیلہ بڑی خوش دلی سے بولی۔ ان باتوں کا اس

پر ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوا تھا بلکہ وہ خوش ہوئی تھی کہ سجاد کو کوئی تو آئینہ دکھا رہا ہے۔

"میں نہ تو کبھی کاروباری معاملات میں کوئی دخل دوں گی اور نہ ہی اپنے شوہر کی کبھی کوئی سفارش کرنا پسند کروں گی۔ میں خود بھی غلط کاموں کو پسند نہیں کرتی ہوں۔ بہتر تو یہ ہے کہ آپ خود سجاد کو بلا کر صاف صاف بات کر لیں۔ میں خود بھی چاہتی ہوں کہ اسے اپنے کئے کی سزا ملے اور وہ سیدھی راہ پر آ جائے۔ یہ جھٹکا اُسے شاید راہِ راست پر لے آئے۔"

"میں سجاد کو اس بات کا موقع دوں گی کہ وہ ناقص مال کے بدلے میں اچھا مال سپلائی کرے اور ناقص مال واپس لے لے۔"

"میں آپ کی اس رعایت کے لئے ممنون و مشکور ہوں گی اور.........." ویٹر کھانا لے آیا' باتوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔

دوسرے دن اس نے سجاد کو بتایا تھا کہ وہ دفتر جا رہی ہے اور شام کو واپس آئے گی۔ بیگم ناہید افضال احمد کی سیکرٹری نے آج دس بجے کا وقت سجاد کو دیا ہوا تھا۔ سجاد کو ابھی بھی اس بات کا علم نہیں تھا کہ دفتر کا چارج کس کے پاس ہے اور اس کا مالک اب کون ہے۔ سیکرٹری نے اس بات کو راز رکھا تھا اور اس نے سجاد کے دفتر ٹیلی فون کر کے اتنا کہا تھا کہ وہ چیک کے سلسلے میں دس بجے آ کر باس سے مل لیں۔

سجاد آج صبح آٹھ بجے اپنے دفتر جانے کے لئے نکل رہا تھا۔ وہ اسے بیدار دیکھ کر مسکرایا تھا اور بولا۔ "باس! یہ خادم آج ٹھیک دس بجے چیک لینے پہنچ رہا ہے۔ اب آپ سے وہیں ملاقات ہو گی۔"

وہ مسکرا کے رہ گئی۔ وہ خود بھی دس بجے وہاں رہ کر سجاد کا تماشا دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ بیگم ناہید افضال احمد کے ہاتھوں سجاد کے کس طرح پرزے اڑیں گے۔ اس وقت سجاد کی کیا حالت ہو گی۔ جب وہ باس کی کرسی پر بیگم ناہید افضال کو دیکھے گا۔ اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔ اس وقت اس کی کیا حالت ہو گی جب چیک دینے سے انکار کر دیا جائے گا۔

وہ نو بجے اپنی شاندار گاڑی میں گھر سے نکلی اور سیدھی بینک پہنچی۔ اس نے کچھ سوچ کر دس ہزار کی رقم نکالی۔ اسے کچھ خریداری کرنا تھی۔ وہ بوہری بازار آ گئی۔ ابھی بازار پوری طرح کھلا نہیں تھا۔ صرف گنتی کی دو ایک دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ کچھ دکانیں کھل رہی تھیں۔ پھر اس نے سوچا کہ وہ دفتر سے واپس بوہری بازار آ جائے گی۔ پھر کچھ

خریداری کر کے گھر واپس چلی جائے گی۔

شکیلہ نے کار پارکنگ سے نکالی اور سڑک پر آئی تھی کہ اس کی نظر معاً سامنے والے فٹ پاتھ پر پڑی۔ پھر اس کا سینہ ایک دم سے دھک سے ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ نظروں کا دھوکا نہیں تھا۔ یقین کرنے والی بات نہ تھی۔ وہ صبیحہ اور ارشد ہی تھے۔

صبیحہ اور ارشد کو ساتھ ساتھ دیکھ کر وہ جتنی حیران ہوئی تھی اتنی ہی خوش بھی ہوئی تھی اور پھر دکھ بھی ہوا تھا۔ اس کی نظروں میں اس کے ماں باپ کے چہرے گھوم گئے تھے۔ اسے اکثر اپنے ماں باپ کی یاد آتی رہتی تھی مگر وہ انہیں اپنے ذہن سے جھٹک دیتی تھی۔ ان کی یاد کو بھلانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئی تھی مگر کبھی کبھی اسے اپنے سینے میں بہت ساری پھانسیں گڑی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ ان دونوں کو دیکھ کر اس کے زخم پھر سے تازہ ہو گئے تھے۔ ان میں سے جیسے لہو رسنے لگا تھا۔ وہ رستا لہو جیسے آپ پی رہی تھی۔

ان دونوں کی کراچی میں موجودگی ایک حقیقت تھی۔ اگر وہ ان دونوں سے مل کر بات کرتی ہے تو وہ بھی ایک حقیقت ہی ہو گی۔ انہیں دیکھ کر نظرانداز کر دینا اور منہ موڑ کے چل دینا اس کے بس کی بات نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ غیرارادی طور پر جیسے بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔ صبیحہ کو دیکھتے ہی ماضی کی بہت ساری یادیں اس کے ذہن کے پردوں پر فلمی مناظر کی مانند گھومنے لگی تھیں۔ جبھی اس نے سوچا تھا کہ اسے ان دونوں سے مل لینا چاہئے۔ ان سے مل کر وہ اپنے ماں باپ کے بارے میں تو پوچھ سکتی ہے۔ یہ دونوں ہی اس وقت ایسے لوگ تھے جو اسے اس کے ماں باپ کے بارے میں تفصیل سے بتا سکتے تھے۔ مگر وہ سب کچھ تو اس کے لئے بڑا ہی اذیت ناک اور روح فرسا ہو گا۔ اس کے دل میں ایک خنجر سا اتر جائے گا۔ جگر کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ کیا وہ بری سے بری خبر سننے کے لئے تیار ہو گی؟ تیار ہے۔ کچھ بھی ہو اس نے چند ثانیوں میں فیصلہ کر لیا۔ وہ ایک نارمل آدمی کی طرح ان دونوں کی باتیں سنے گی۔ اپنی باتیں بھی سنائے گی۔ اپنا دل پتھر کر لے گی۔ برف جیسی بے حسی طاری کر لے گی۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔

یہ سوچ کر اس نے اپنی کار کا رخ فٹ پاتھ کی طرف کر لیا لیکن اس کی نگاہیں ان دونوں کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھیں۔ دوسرے لمحے ایک خیال اس کے ذہن میں آیا تھا۔ کیا صبیحہ نے واقعی ارشد سے شادی کر لی ہے؟ اس نے ایک بدصورت مرد کو اپنا کر

دکھا بھی دیا ہے؟ ایک بدصورت مرد' بے کشش انسان اور عام سا آدمی جسے ایک حسین اور نوجوان لڑکی اپنا کر کس قدر خوش نظر آ رہی ہے۔ جیسے اس مرد کا دل بہت خوبصورت ہو۔ آج اسے ارشد بہت خوبصورت نظر آ رہا تھا۔ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ سجاد سے اچھا ہی نہیں بلکہ بہت اچھا تھا۔ وہ اپنی کسی غرض کے لئے اپنی بیوی کو بہن بنا کر غیرمردوں کے سامنے تو پیش نہیں کرتا ہو گا اور پھر صبیحہ کسی مرد کے بستر کی شکن تو نہیں بنتی ہو گی' وہ دنیا کے ہاتھوں کھلونا تو نہیں بن رہی ہو گی' وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں عزت و احترام اور بڑے وقار سے رہ رہی ہو گی' اس کی عزت و ناموس کو تحفظ تو ہو گا!

صبیحہ اور ارشد کے بالکل سامنے اس نے کار لے جا کر روکی تھی۔ ارشد تو کسی اور سمت کچھ دیکھ رہا تھا۔ صبیحہ نے چونک کر پہلے تو گاڑی دیکھی تھی۔ گاڑی کی خوبصورتی اور اس کی آن نے اسے بڑا متاثر کیا تھا۔ پھر اس نے شکیلہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ شکیلہ کو پہچان نہیں سکی تھی۔ شکیلہ نے سفید ساڑھی اور سفید بلاؤز پہنا ہوا تھا اور اپنے بالوں کی چوٹی کو اس نے جوڑے کی شکل دی ہوئی تھی۔ اس کے گلے میں سچے موتیوں کا ایک سفید ہار پڑا تھا۔ آنکھوں پر چشمہ تھا جس کے شیشے گہرے بھورے رنگ کے تھے۔ وہ کسی آسمانی حور کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ صبیحہ نے لمحے کے لئے دل میں سوچا۔ کار جس قدر خوبصورت اور شاندار ہے اس کو چلانے والی اس سے کہیں زیادہ حسین اور دلفریب ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔

جب شکیلہ کار سے اتر کر صبیحہ کی طرف بڑھی تو صبیحہ نے اسے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ کسی بچھڑے دوست کے انداز میں بے اختیار شکیلہ کی طرف بڑھی۔ دوسرے لمحے دونوں بغلگیر ہو گئیں۔ پھر دونوں فرط جذبات سے مغلوب ہو کر چھلک پڑی تھیں۔ چند ثانیوں بعد دونوں نے الگ ہو کر غمناک آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک دوسرے کی آنکھوں میں محبت پاش نظروں سے جھانکتی رہی تھیں۔ بڑی بڑی آنکھوں کی گہرائیوں میں کھو گئی تھی۔

ارشد نے جو صبیحہ کو ایک حسین اور شاداب بدن کی عورت سے بغلگیر ہوتے دیکھا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ شکیلہ کی پشت اس کی طرف تھی لہذا وہ شکیلہ کو پہچان نہ سکا تھا اور نہ ہی اس کے خواب و خیال میں یہ بات آ سکتی تھی کہ یہ عورت شکیلہ ہو گی۔ شکیلہ نے گھوم کر ارشد کی طرف دیکھا تو ارشد اسے دیکھ کر بڑے زور سے اچھلا۔ ”تم ....شکیلہ تم!“ اس پر جیسے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ وہ دونوں کے قریب آ کر

کھڑا ہو گیا۔

"ہاں میں شکیلہ ہوں؟" اس نے چشمہ اتار کر اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے۔ "آپ کیسے ہیں ارشد بھائی!"

"بہت اچھا ہوں' تم کیسی ہو شکیلہ!" ارشد نے پوچھا۔ شکیلہ نے محسوس کیا کہ یہ رسمی انداز نہیں تھا۔ وہ دونوں جس انداز اور محبت سے مل رہے تھے ان میں جذبے فزوں تھے۔ اپنائیت بول رہی تھی۔ ان میں نفرت' حقارت' تمسخر اور استہزا کا دور دور تک شائبہ نہیں تھا۔

"تمہارے ارشد بھائی میرے سرتاج ہیں۔" صبیحہ نے تعارف کرایا۔ "دو مہینے پہلے ہم دونوں کی شادی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کراچی میں ایک شادی کی تقریب میں شرکت کرنے آئے تھے۔ آج اِدھر خریداری کرنے آئے تھے کہ تم مل گئیں۔ گویا ایک جہان مل گیا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مبارک ہو!" اس نے پورے جذبے سے دونوں کو مبارک باد دی مگر وہ اپنے لہجے میں نامعلوم سا دکھ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی اور یہ دکھ اس کے سینے میں بھر گیا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے؟" صبیحہ نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔ "تمہیں کب اور کیسے معلوم ہوا کہ ہماری شادی ہوئی ہے؟"

"آج اور ابھی ابھی .... تم دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ کر۔" وہ پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "ظاہر ہے تم دونوں کراچی جیسے شہر میں موجود ہو تو جاننے والے یہی سمجھ سکتے ہیں۔ ہر کوئی میری طرح تو ہوتا نہیں ہے جو بھاگ کر کراچی آ جائے۔"

"شکیلہ!" صبیحہ نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بے حد افسردگی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "پلیز! ایسی باتیں نہ کرو۔ تمہیں دیکھ کر' تم سے مل کر کس قدر خوشی ہوئی اور ہو رہی ہے۔ اس کا اندازہ شاید تم نہ کر سکو۔ آؤ چلو .... چل کر کہیں بیٹھتے ہیں۔"

"ہاں شکیلہ!" ارشد نے تائید کی۔ "تم سے بہت ساری باتیں کرنا ہیں اور پھر ہمارے پاس وقت بھی بہت کم ہے۔ ہم سہ پہر کی فلائیٹ سے لاہور واپس جا رہے ہیں۔ کراچی میں آج ہمارا آخری دن ہے۔ پھر کبھی موقع ملا تو کراچی آئیں گے اور تم سے خوب باتیں کریں گے۔"

یہ لوگ جیولری کی ایک بڑی دکان کے سامنے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ شکیلہ کو کچھ خیال آیا تو وہ معذرت کر کے کار کے پاس گئی۔ ارشد نے شکیلہ کو کار سے اترتے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس کے علم میں یہ بات تھی کہ یہ کار شکیلہ کی ہے۔ شکیلہ کار سے اپنا پرس نکال کر کار کو مقفل کر رہی تھی۔ تب ارشد نے صبیحہ سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "آخر شکیلہ نے اس خواب ناک زندگی کو پا لیا جس کے وہ خواب دیکھ رہی تھی۔ بڑی خوش نصیب ہے۔"

شکیلہ نے دونوں کے قریب آ کر ساڑھی کا پلو درست کیا اور بولی۔ "مجھے تھوڑی بہت خریداری کرنا ہے۔ اس کے بعد چل کر کہیں بیٹھتے ہیں۔"

وہ دونوں کو لے کر دکان میں داخل ہوئی۔ اس نے ایک شاندار قسم کا زیورات کا سیٹ جو بے حد قیمتی تھا وہ خریدا۔ ہیرے کی ایک جڑاؤ انگوٹھی خرید کر ان دونوں کو پیش کی تو صبیحہ اور ارشد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ایں یہ کیا؟" صبیحہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "نو ہزار کی رقم کے تحفے' نہیں شکیلہ نہیں۔"

"یہ میری طرف سے تم دونوں کے لئے شادی کا تحفہ ہے۔ اتفاق سے میرے پاس پرس میں زیادہ رقم نہیں ہے ورنہ میں تو اس سے کہیں زیادہ قیمتی تحائف دینا چاہتی تھی اور پھر تم دونوں آج جا بھی رہے ہو۔ بس اسے قبول کر لو مجھے بڑی خوشی ہو گی اور میں اسے اپنے لئے عزت سمجھوں گی۔"

"تمہارا مل جانا ہی ہم دونوں کے لئے اس تحفے سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ تم کو اس بات کی وقعت' قدر و قیمت کا اندازہ ہے نا جب کوئی عزیز ترین شے کھو جانے کے بعد مل جاتی ہے وہی حال میرا اور ارشد کا بھی ہے۔ پلیز! تم یہ تکلیف نہ کرو۔ انہیں واپس کر دو۔"

شکیلہ نے ان دونوں کی ایک بات نہ سنی۔ تحفے پیک کرائے۔ نو ہزار کی رقم ادا کی اور ان دونوں کو اپنے ساتھ کار میں بٹھا کر شیزان ریستوران میں لے آئی۔ صبح کا وقت تھا۔ دس بج چکے تھے۔ ہال تقریباً خالی پڑا تھا۔ اس نے ویٹر کو بلا کر چائے اور پُرتکلف ناشتے کا آرڈر دیا۔ جب ویٹر چلا گیا تو اس نے ڈرتے ڈرتے دھڑکتے سینے کو قابو میں کرتے ہوئے پوچھا۔ "میرے ابو .... اور امی .... کا کیا حال ہے؟" اس کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

صبیحہ اور ارشد نے چونک کر ایک دوسرے کی شکل دیکھی اور پھر ان دونوں نے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ جیسے بہت بری خبر ہو بھیانک اور لرزہ خیز خبر ہو۔ ان تینوں پر ایک بے کراں سناٹا چھا گیا۔ وہ دونوں ہی چپ تھے جیسے دونوں اچانک گونگے ہو گئے ہوں۔ جیسے انہیں منحوس خبر سنانے کی ہمت نہ ہو رہی ہو۔ وہ ان دونوں کے چہروں کو بار بار دیکھ رہی تھی۔ شکیلہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا اس کا دل کوئی اندر ہی اندر نچوڑ رہا ہو۔ وہ اپنے اندر کی بکھری ساری قوت مجتمع کر کے بولی تو اسے اپنی آواز کنویں کی تہہ سے آتی سنائی دی۔

"صبیحہ! میں ہر قسم کی خبر اور بات سننے کے لئے تیار ہوں۔ جو بھی جیسی بھی خبر ہے جلدی سے سنا دو۔ ورنہ میرا سینہ پھٹ جائے گا۔ جلدی سے بتا دو۔"

صبیحہ نے اپنی تھرتھراتی پلکیں اٹھا کر ارشد کی طرف دیکھا تو ارشد نے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی۔ "وہ دونوں ہی اس دنیا میں نہیں ہیں؟"

"کیا.........؟" شکیلہ کا سر چکرا گیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھرا سا چھا گیا۔ اس کے وجود پر ایک بم آ کر گرا تھا۔ اس کا دھماکہ اتنا شدید' اتنا خوفناک تھا کہ اس کے جیسے پرخچے اڑ گئے تھے۔ وہ شدید صدمے سے سن سی ہو گئی۔ اگر وہ میز کا کونا نہ پکڑتی تو فرش پر گر پڑتی۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امنڈ آیا۔ وہ دنیا اور ہوٹل میں بیٹھے لوگوں کی پرواہ کئے بغیر روتی رہی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

"شکیلہ .... شکیلہ!" صبیحہ نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ لو پانی پی لو۔"

شکیلہ کو کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ اس اندوہناک خبر نے اس کی حالت بڑی غیر کر دی تھی۔ صدمے سے اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ پانی پینے سے اس کی حالت کسی قدر سنبھلی تھی لیکن وہ آنسوؤں پر قابو نہ پا سکی تھی۔ اس کی ساڑھی کا پلو آنسوؤں سے پوری طرح بھیگ چکا تھا۔ ویٹر جو چائے اور ناشتہ رکھ گیا تھا وہ ویسے ہی رکھا رہ گیا تھا۔ بڑی دیر بعد شکیلہ کی غم کی کیفیت قابو میں آئی تھی۔ پھر بھی اس کا دل رو رہا تھا۔ اس سے گہرا صدمہ اس کے دل کو اور کیا پہنچ سکتا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے ماں باپ اسے داغِ مفارقت دے جائیں گے۔ وہ ان سے محروم ہو کر رہ جائے گی۔

صبیحہ نے اسے بہت غمگین لہجے میں بتایا۔ "تمہاری اچانک گمشدگی نے سب سے پہلے ماں کو گہرا صدمہ پہنچایا تھا۔ وہ دوسرے ہی دن تمہارے گھر سے بھاگ جانے سے نہیں بلکہ بے عزتی کے خیال سے پاگل ہو گئی تھیں۔ اسی پاگل پن میں وہ اس قدر شدید

ذہنی صدمہ لے بیٹھیں کہ پانچویں دن انتقال کر گئیں اور پھر تمہارے ابو تمہاری امی کے سوئم والے دن ان سے جا ملے۔ تم نے جو کچھ بھی کیا وہ اچھا نہیں کیا۔ سچ پوچھو تو تم سے مجھے شدید طور پر نفرت ہو گئی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا' فیصلہ کر لیا تھا کہ جب بھی تم ملو گی میں تمہارا منہ نوچ لوں گی۔ مگر میں آج اس خیال کو عملی جامہ نہیں پہنا سکی۔ معلوم نہیں کیوں؟ میرے اس خیال پر اور میری نفرت پر تمہاری محبت غالب آ گئی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم محبت کو اتنی اہمیت دو گی۔ اتنی خودغرض اور بے رحم بن جاؤ گی کہ اپنے ماں باپ کی عزت اور ان کے جذبات کا بھی کچھ خیال نہیں کرو گی۔ کیا اولاد اپنے ماں باپ کی شفقت اور محبت کا ایسا ہی صلہ دیتی ہے۔ جیسا تم نے دیا؟ کیا تم نے جو قدم اٹھایا وہ اٹھانے سے پہلے تمہیں تکلیف دہ محسوس نہیں ہوا تھا۔ تم کتنی بدنصیب ہو شکیلہ! تم نے ماں باپ جیسی ہستیاں کھو دیں۔ دنیا میں مرد اور شوہر تو بہت مل جاتے ہیں۔ خصوصیت سے ایک حسین اور نوجوان لڑکی کو......... مردوں کو اسی طرح حسین اور پُرشباب بیویاں مل جاتی ہیں۔ مگر ماں باپ نہیں ملتے ہیں۔ ان کا سایہ نہیں ملتا ہے۔ ان کا پیار نہیں ملتا ہے۔ ان کی ممتا کا سمندر نہیں ملتا ہے........."

بولتے بولتے صبیحہ اس قدر جذباتی ہو گئی تھی کہ اس کی آواز شدت جذبات سے مغلوب ہو کر بھرا سی گئی تھی۔ وہ سسک پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔ ارشد جو چپ چاپ بیٹھا دل گرفتہ ہو رہا تھا۔ ان دونوں کی گفتگو سے وہ خود بھی آبدیدہ ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں خود نہیں آ رہا تھا کہ وہ شکیلہ سے کیا کہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اب رونے دھونے اور ماتم کرنے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ شکیلہ کے ماں باپ زندہ نہیں ہو سکتے تھے۔ وقت پلٹ کر نہیں آ سکتا تھا۔ شکیلہ نے جو کچھ بھی کیا وہ ایک انسانیت سوز حرکت تھی۔ اس حرکت کی ساری زندگی تلافی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس گناہ کا کوئی کفارہ نہیں تھا۔ اس جرم کی سزا صرف قدرت ہی دے سکتی تھی اور اس سے بڑی سزا اور کیا ہو سکتی تھی کہ شکیلہ اس بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی۔ اپنے ضمیر کی چبھن سہنے کے لئے اس کا ضمیر اسے ساری زندگی کچوکے لگاتا رہے گا۔ ایک پل بھی چین نہ لینے دے گا اور وہ تڑپ تڑپ اور سسک سسک کر مر جائے گی۔

شکیلہ کی آنکھوں میں پھر آنسوؤں کا سیلاب اڈ آیا تھا۔ شکیلہ نے سسکتے ہوئے سکوت کو توڑا۔ "میں ہی اپنے ماپ باپ کی موت کی ذمہ دار ہوں۔ اس دنیا میں شاید ہی کوئی میری طرح بدقسمت ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ مجھے کوئی عبرتناک اور بڑی بھیانک سزا

دے۔ میں اس سزا کو بھگتنے کے لئے تیار ہوں۔ اس سے بڑا مذموم فعل اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں نے ماں باپ جیسی عظیم ہستیوں کو دکھ پہنچایا۔ انہیں ناکردہ گناہوں کی سزا دی۔ کاش! مجھے بھی ایسی سزا ملے کہ میں ایک لمحہ بھی چین و سکون نہ پاؤں۔ ساری زندگی اذیت ناک طریقے سے تڑپتی اور سسکتی رہوں۔"

"شکیلہ!" ارشد نے کہا۔ "اب ان باتوں میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ بس اب تم ان کی مغفرت کی اور اپنے گناہوں کے درگزر کی دعا رب کے حضور میں گڑگڑا کے کرتی رہنا۔ وہی معاف کرنے والا اور دل کو سکون پہنچانے والا ہے۔ ہم تو اس کے حقیر اور نابکار بندے ہیں۔ وہی ہمارے بڑے سے بڑے گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔ وہی ایک ہے جو گنہگاروں کا بھی ہے اور نیک لوگوں کا بھی۔"

"آپ لوگ بھی مجھے معاف کر دیں۔" شکیلہ زخم خوردہ لہجے میں بولی۔ "میرے لئے دعا بھی کرتے رہیں۔ مجھے جو یہ دکھ ملا ہے ساری زندگی کا ہے اور مجھے یہ دکھ ساری زندگی رہے گا۔ میں کفِ افسوس ملتی اور پچھتاتی رہوں گی کہ میرے ماں باپ محض میری وجہ سے مرے ہیں۔"

خاصی دیر بعد شکیلہ نارمل ہو گئی تھی لیکن اس کے دل پر پہاڑ سا بوجھ تھا۔ یہ غم اس کے لئے تازہ تھا۔ اسے ایسے لگ رہا تھا کہ اس کے ماں باپ نے ابھی ابھی اسے داغِ مفارقت دیا ہے۔ ان کی بے گور و کفن لاشیں گھر میں پڑی ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو بڑی حد تک سنبھال کر چائے کو دیکھا تو وہ برف کی طرح ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ پھر اس نے ویٹر کو بلا کر دوسری چائے منگوائی اور چائے بنا کر ان دونوں کو پیش کی۔

وہ چائے کے دو تین گھونٹ سے زیادہ نہ پی سکی۔ اسے چائے تلخ' بدمزہ اور زہریلی سی لگ رہی تھی۔ ناشتے کو کسی نے بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اس کی طرف دیکھا تک بھی نہیں تھا۔ وہ ہوٹل سے نکل کر بوہری بازار آئے۔ صبیحہ اور ارشد کا شاپنگ کا موڈ ختم ہو چکا تھا۔ دونوں ہی شاپنگ کے حق میں نہیں تھے۔ واپس جانا چاہتے تھے۔ مگر وہ نہ مانی۔ اس نے ان دونوں کو خوب شاپنگ کرائی۔ اس کے پرس میں دو تین ہزار روپے پڑے تھے۔ ساری رقم اس نے خرچ کی۔ ارشد اور صبیحہ کو ایک پیسہ بھی خرچ کرنے نہیں دیا۔ وہ بارہ بجے کے قریب صبیحہ اور ارشد کو اس گھر پر چھوڑ آئی۔ جہاں وہ ٹھہرے تھے۔

شکیلہ فلیٹ پہنچی تو اس کا دل بے اختیار بھر آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔ وہ بستر پر کسی کٹی پتنگ کی طرح گر پڑی اور بکھر گئی اور پھر رو پڑی۔ پھر بچوں کی طرح

پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

جبھی سجاد اندر داخل ہوا تھا' غصے سے کھولتا ہوا۔ اس کی نس نس میں لہو ابل رہا تھا۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں ساری دنیا کی نفرت بھری ہوئی تھی۔ وہ ایک گھنٹہ پہلے بھی اسی طرح تن تناتا ہوا آیا تھا اور شکیلہ کا انتظار کرتا رہا تھا۔ شکیلہ نہیں آئی تو اس کے انتظار میں وقت ضائع کرنے کی بجائے اس کی تلاش میں نکل گیا تھا۔ اس کی غصے سے بُری حالت ہوئی تھی۔ آج افضال احمد کے دفتر میں اس کے ساتھ بیگم ناہید افضال احمد نے اس کے سپلائی کئے ہوئے مال پر جو اعتراض کئے اور انہیں واپس لینے اور اس کی ادائیگی نہ کرنے کے بارے میں کہا تو وہ چراغ پا ہوتا ہوا نکل آیا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ بیگم ناہید افضال احمد کو اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیتا۔ اس عورت نے نہ صرف اسے لاکھوں روپے کا نقصان پہنچایا تھا بلکہ اس کی ساری محنت اور امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا اور وہ حیران بھی تھا کہ یہ کیا تماشا ہو رہا ہے۔ اس فرم کی مالک شکیلہ ہو گئی تھی اور اب بیگم ناہید افضال احمد نے اس کی بیوی کی جگہ لے لی تھی۔ یہ سب کچھ اسے گورکھ دھندے کی طرح لگا تھا اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

اس نے شکیلہ کو جو پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھا تو اپنی جگہ ٹھٹک کے رہ گیا۔ ایک لمحے کے لئے اپنا غصہ بھول کر حیرت سے شکیلہ کی طرف دیکھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ کس لئے اور کیوں رو رہی ہے؟ بہت پہلے جب وہ شکیلہ کو لے کر آیا تھا تب وہ اپنے ماں باپ کو یاد کر کے اداس ہو جاتی تھی یا پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ اس کے بعد اس نے رونا چھوڑ دیا تھا۔ مگر آج اس کا اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا جیسے کسی نے اس کی کوئی بہت ہی انمول شے چھین لی ہو۔

سجاد پلنگ پر اس کے پاس جا بیٹھا۔ اس پر جھک کر اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔ "کیا ہوا' رو کیوں رہی ہو؟"

کئی لمحوں کے بعد شکیلہ نے سسکیوں کے درمیان میں کہا۔ "میری امی اور ابو وفات پر گئے ہیں۔"

"اوہ!" سجاد کو اس خبر سے کوئی افسوس نہ ہوا۔ اس سے بڑا صدمہ تو اسے وہ ہوا تھا جس سے ابھی وہ دوچار ہو رہا تھا۔ اس کے لاکھوں روپے ڈوب گئے تھے۔ وہ رسمی انداز میں بڑی بے پروائی سے بولا۔ "ایک نہ ایک دن ہر ایک کو مرنا ہے۔ جانا ہے' مگر........"

دوسرے لمحے وہ کسی خیال کے زیر اثر چونک پڑا۔ "تمہیں کس نے بتایا؟ کب ہوا ان دونوں کا انتقال؟ کیا تم نے کسی کو خط لکھا تھا؟"

"میری ایک سہیلی سے سرراہ ملاقات ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔" شکیلہ گالوں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھتی ہوئی بولی۔ "جب میں تمہارے ساتھ یہاں آئی تھی اس کے ایک ہفتہ بعد میرے بھاگ جانے اور ذلت و رسوائی کے غم میں پاگل ہو کر مر گئے۔"

"تمہیں کچھ خبر بھی ہے تم نے بھی مجھے پاگل کر کے رکھ دیا ہے۔ میں بھی غم و صدمے اور غصے سے جیتے جی مر گیا ہوں۔" وہ دل کی بات زبان پر لے آیا۔

"کیا ہوا.......... میں نے کیا کیا؟" وہ اپنا غم بھول کر اٹھ بیٹھی اور حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "تم کیا کہہ رہے ہو سجاد!"

"میں اردو میں کہہ رہا ہوں۔" وہ ایک دم سے پھٹ پڑا۔ "اب کہنے کے لئے رہ بھی کیا گیا ہے۔ میرے ساتھ اتنا زبردست فراڈ' دھوکا' تم مجھے بے وقوف بناؤ گی میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ آخر یہ چکر کیا ہے؟ اس فرم کی مالک اب تم ہو۔ تمہاری جگہ افضال احمد کی بیوی بیٹھی ہے۔ اس چڑیل کو کیا تم نے اس جگہ بٹھایا ہے؟ اسے سارا کام سونپ دیا ہے؟ وہ میرے لاکھوں روپے کا مال واپس کر رہی ہے۔ اگر مال واپس ہو گیا اور رقم نہیں ملی تو کہیں کا نہ رہوں گا۔ ہمیں اس فلیٹ سے جھونپڑی میں آنا پڑ جائے گا۔ ہم کسی قابل نہیں رہیں گے۔"

وہ ہیجان خیز انداز میں بولتا چلا گیا۔ اسے خود خبر نہیں تھی کہ وہ کیا بول رہا ہے۔ اس کے منہ میں جو آتا گیا وہ بولتا چلا گیا تھا۔ نفرت' صدمے اور غصے سے اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔ اس پر آج اچانک جو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اس نے اسے نڈھال' مضمحل اور بے حد دکھی کر کے رکھ دیا تھا اور سجاد اس کے زخم پر مرہم رکھنے کی بجائے اپنی غرض بیان کرنے لگا تھا۔ اسے بڑا دکھ ہو رہا تھا کہ سجاد اس قدر خود غرض ہے۔ وہ سجاد جس کی خاطر اس نے اپنے ماں باپ جیسی ہستیوں کو ٹھکرا دیا تھا۔ وہ یہی بات اس کا دکھ بانٹ کر بھی کہہ سکتا تھا۔ مگر اسے تو اپنی پڑی تھی۔

شکیلہ نے بہ دقت تمام اپنے آپ کو سنبھالا اور دل گرفتہ لہجے میں بولی۔ "اس فرم کی مالک میں نہیں مسز افضال احمد ہیں؟"

"تم جھوٹ بول رہی ہو؟" وہ ایک دم سے بھڑک اٹھا۔ "افضال احمد نے سب کچھ

تمہارے نام کر دیا تھا۔ اب تم اس کے تمام اثاثوں کی مالک ہو۔"

"میں جھوٹ نہیں سچ کہہ رہی ہوں۔" اس نے بھی تیز و تند لہجے میں جواب دیا۔ "افضال احمد نے جو کچھ میرے نام کیا وہ سب کچھ میں نے ان کی بیگم کے نام منتقل کر دیا۔ اب میں ان کی کسی چیز کی مالک نہیں رہی ہوں اور ان کی کوئی چیز میرے نام نہیں ہے؟"

"گویا تم مجھے بے وقوف بنانے پر تلی ہوئی ہو۔ دنیا میں ایسا کون احمق ہو گا جو ایسی بے پناہ دولت اور حیثیت کو ٹھکرا دے۔ ہاتھ آئی ہوئی چیز کو دریا میں ڈال دے۔ میں جانتا ہوں شکیلہ کہ تم کتنی گہری' ہشیار' ذہین اور عیار ہو۔ یہ سب کچھ تم مجھے اپنی مٹھی میں رکھنے کے لئے کر رہی ہو۔"

"تم غصے کی حالت میں میری بات پر یقین نہیں کر رہے ہو اور میری ذات پر تہمت لگا رہے ہو۔ اگر میں ایسی ہوتی جیسی تم سمجھ رہے ہو تو پھر میں ایک لمحے کے لئے بھی یہاں نہیں رہتی۔ شاید میں اپنے گھر سے بھی بھاگ کر نہیں آتی۔ اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے تو شام تک صبر کرو۔ میں ان کاغذات کی نقول لا کر تمہیں دکھاتی ہوں جس سے تمہیں اندازہ ہو گا اور پتا چل جائے گا کہ اب افضال احمد کی تمام چیزوں کا مالک کون ہے؟"

"مگر تم نے کچھ روز پہلے جو نقول دکھائی تھیں۔ کیا وہ فریب کا پلندا تھیں اور جعلی کاغذات کی نقول تھیں؟ یہ کیا ڈراما تھا؟"

"نہ تو وہ فریب کا پلندا تھیں اور نہ ہی جعلی کاغذات تھے۔ افضال احمد نے میرے حسن و شباب کے فریب میں آ کر میرے حصول کے لئے بہت بڑا جوا کھیلا تھا۔ اس کے ذہن میں شاید کوئی منصوبہ تھا۔ کیا منصوبہ تھا میں سمجھ نہیں سکی۔ تاہم بہت ہی بڑا اور ایسا منصوبہ تھا جس کی اہم کڑی میں تھی۔ ممکن ہے کوئی منصوبہ ہی نہ ہو۔ یہ تو دل کی بات ہوتی ہے۔ پسند کی بات ہوتی ہے۔ دنیا میں ایسے احمق اور ہوس پرست مردوں کی بھی کوئی کمی نہیں رہی ہے جنہوں نے حسن و شباب کے حصول کے لئے اپنی زندگی' دولت اور سلطنتیں تباہ کر لی ہیں۔ افضال احمد بھی ان میں سے ایک ہے۔"

"یہ ساری کارروائی کب ہوئی؟ تم نے کب اس خبیث عورت کے نام سارا کچھ منتقل کر دیا؟ تم نے مجھے اس کی ہوا بھی لگنے نہیں دی؟"

"یہ کوئی تین چار دن پہلے کی بات ہے۔" شکیلہ نے جواب دیا۔ "اگر میں تمہیں بتا دیتی تو تم مجھے ایسا کرنے نہیں دیتے' روک دیتے۔ بہرکیف اب وہ مالک ہیں۔ افضال احمد

بھی اس کے محتاج ہو کر رہ گئے ہیں۔ بلکہ مٹھی میں آ گئے ہیں۔ وہ جب چاہیں اپنے شوہر کو دودھ میں گری مکھی کی طرح نکال کر پھینک سکتی ہیں۔"

"احمق .... بے وقوف عورت تم نے یہ سب کچھ کیوں کیا؟ اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کی آخر ضرورت کیا تھی؟" وہ فرش پر پیر پٹخ کر بولا۔

"میں نے جو کچھ بھی کیا وہ تمہارے لئے اور تمہاری خاطر کیا ہے سجاد! میں تمہیں........" شکیلہ کی آواز بھرا سی گئی۔

"میرے لئے .... میری خاطر........!" سجاد کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی سی بھر گئی۔ "وہ کس لئے؟ اتنی بڑی اور عظیم قربانی کیوں دی؟" اس کا لہجہ استہزائی تھا۔

"ایک ایسی عظیم قربانی جو فلموں میں ہیروئن اپنے ہیرو کے لئے پیش کرتی ہے۔"

سجاد کے یہ جملے اس کے دل پر تازیانے بن کر لگے تھے۔ مگر وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ وہ چند لمحوں کے بعد بڑے دکھ سے بولی۔ "اس لئے کہ یہ دولت اور حیثیت مجھے تم سے بہت دور کر رہی تھی۔ ایک فاصلہ بڑھ رہا تھا۔ میرے اندر تفاخر پیدا ہو گیا تھا۔ میں ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے میرے اور تمہارے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ میں اوپر چڑھتی جا رہی ہوں، کہیں چاند ستاروں کی طرف تیزی سے۔ اندھا دھند سی، تم نیچے کھڑے مجھے دیکھ رہے ہو۔ پھر تم میری نظروں سے اوجھل ہو گئے ہو۔ فاصلہ ہی فاصلہ رہ گیا ہے۔ تمہارا وجود میرے لئے بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ پھر میں جیسے چونک پڑی۔ میں نے سوچا، بہت سوچا۔ میرے اندر یہ کیسا تغیر ہے؟ کیسی تبدیلی ہے؟ آخر یہ سب کیا ہے؟ پھر میں نے محسوس کیا کہ یہ خواب ناک راحتوں، اس دولت اور سماجی رتبے کا زہر ہے جو میرے وجود میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ یہ دولت کا عفریت ہے جو مجھے نگل رہا ہے۔ مجھے تم عزیز تھے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی .... راحتوں کو تمہاری خاطر چھوڑ سکتی تھی۔ سو میں نے چھوڑ کر اپنی آزمائش کی اور اپنی آزمائش میں کامیاب رہی۔"

"مگر تم وہ سب کچھ میرے نام بھی تو کر سکتی تھیں۔ اس چڑیل اور خبیث عورت کے نام کرنے سے کیا فائدہ ہوا؟" وہ مٹھیاں بھینچ کر دانت پیستے ہوئے بولا۔ "وہ کمینی میری جڑیں کاٹنے پر تل گئی ہے۔ دس لاکھ کا مال ناقص مال کہہ کر واپس کر رہی ہے۔ اب تمہی بتاؤ، میں کیا کروں؟ دس لاکھ روپے کا نقصان کیسے برداشت کروں۔ یہ نقصان تو ہمیں فٹ پاتھ پر لا کھڑا کر دے گا۔ یہ سب کچھ ہم سے چھین لے گا۔" وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ مارنے لگا۔

"جن لوگوں نے تمہیں ناقص مال دیا ہے انہیں واپس کر دو اور اس کے بدلے میں اچھا مال لے کر سپلائی کر دو۔" اس نے مشورہ دیا۔

"مشورہ دینا تو تمہیں خوب آتا ہے۔ ڈائیلاگ بولنے بھی آتے ہیں۔ مگر خیال نہیں آیا تو میرا نہیں آیا۔ اس ذلیل عورت کا بڑا خیال آیا۔ آخر وہ تمہاری کیا لگتی ہے؟ وہ تمہاری ماں، بہن یا قریبی رشتہ دار تو تھی نہیں جو تم نے سب کچھ اس کے نام لکھ دیا اور میری عاقبت خراب کر دی۔ کس بات کی سزا دی تم نے؟"

"ٹھیک ہے۔ وہ میری کچھ نہیں ہے لیکن اس سے میرا ایک انجانا رشتہ ضرور ہے اور وہ پھر وہ ایک عورت ہی نہیں بیوی بھی ہے اور پیارے پیارے بچوں کی ماں ہے۔ افضال احمد اسے طلاق دے کر نہ صرف اس کی بلکہ اپنے بچوں کی زندگی بھی تباہ و برباد کر دینا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے اس کے شوہر کی دولت، کاروبار اور جائیداد اسی کو سونپ دی تاکہ برسوں سے بسا بسایا گھر اجڑنے نہ پائے۔ اس کے معصوم بچے دربدر کی ٹھوکریں نہ کھانے پائیں۔ ایک عورت اپنے پیار سے، بچے اپنے باپ کی شفقت سے محروم نہ ہو جائیں۔" اس نے گہری سانس لینے کے لئے توقف کیا اور سجاد کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ جیسے شکیلہ کی باتیں اس کے لئے ناقابل برداشت ہوئی جا رہی ہوں۔ اس نے کچھ کہنا چاہا تو شکیلہ نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ "اور پھر تمہیں کس چیز کی کمی ہے سجاد! تم آج کل ویسے بھی لاکھوں میں کھیل رہے ہو۔ لاکھوں کا بینک بیلنس ہے۔"

"تم نے جو کچھ بھی کیا وہ تمہارے نہیں بلکہ میرے حق میں اچھا نہیں ہوا۔ اب تو پانی سر سے گزر چکا ہے۔ اس چڑیل کو معلوم نہیں ہے کہ اس کا پالا کس سے پڑا ہے۔ اس سے دس لاکھ تو کیا بیس لاکھ بھی وصول کر سکتا ہوں۔ اس کی ساری دولت جائیداد اور کاروبار ایک دن میرا ہو جائے گا۔"

☆======☆======☆

افضال احمد طیارے میں اپنی نشست پر بیٹھے تو ان کی نظروں میں شکیلہ کا چہرہ اور سراپا گھوم رہا تھا۔ وہ پورے دس دن بعد کراچی جا رہے تھے لیکن انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پوری دس صدیوں بعد واپس جا رہے ہوں۔ ان کا بس چلتا تو وہ پَر لگا کر اڑ جاتے اور آن کی آن میں کراچی پہنچ جاتے اور اپنی شکیلہ کے پاس پہنچ جاتے جس نے انہیں دس دنوں میں ایک دن اور رات بھی چین لینے اور سونے نہیں دیا تھا۔ مری قریب ہی تھا۔ اُن دنوں کے لمحات اور راتیں ان کے تصور میں گھومتی رہی تھیں۔ ان کی رگ رگ میں آگ دوڑتی رہی تھی۔ وہ اس آگ کے کیف میں تڑپ رہے تھے۔ مچل رہے تھے۔ انہیں کسی لمحے قرار نہ تھا۔

اِدھر ان کی بدنصیبی ان کے سر پر کھڑی ہنس رہی تھی۔ ادھر وہ طرح طرح کے منصوبے بنا رہے تھے۔ انہوں نے اپنے کرم فرماؤں کو شکیلہ کی دو ایک تصویریں دکھا کر اس قدر للچا دیا تھا کہ انہیں پیشگی بڑے بڑے آرڈر مل گئے تھے۔ سب سے بڑے اس آرڈر کا بھی وعدہ مل گیا جسے حاصل کرنے کے خواب تنویر بیگ دیکھ رہا تھا جس کے لئے وہ شکیلہ کو اپنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے پہلے انہوں نے یہ خبر سنی تھی کہ تنویر بیگ کسی ابھرتی ہوئی نوخیز اداکارہ کے ذریعے آرڈر حاصل کرنے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ مگر اب وہ شکیلہ پر ریجھ کر رہ گیا تھا۔ تنویر بیگ سے پہلے انہوں نے شکیلہ کو اپنے دام میں گرفتار کر لیا تھا۔ شکیلہ کے لئے انہوں نے بہت بڑا منصوبہ بنایا تھا۔ بڑا رسک لیا تھا۔ اتنی بڑی قیمت ادا کی تھی کہ شاید ہی کوئی مرد ادا کر سکتا تھا۔

وہ اسلام آباد سے کراچی پہنچنے تک شکیلہ کے سراپا اور اس کے تصور میں اس طرح کھوئے ہوئے تھے جیسے اس کی آن اور تابانیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔ اسے دیکھ رہے ہوں۔ دل ہے کہ سیر نہیں ہو رہا ہو۔ شکیلہ تو ان کے وجود پر نشہ بن کر چھائی جا رہی تھی۔

کراچی ایئرپورٹ پر کھڑے ہو کر انہوں نے لمحے کے لئے سوچا تھا کہ کیوں نہ وہ

سیدھے شکیلہ کے ہاں چلے جائیں۔ مگر یہ دیکھ کر کہ رات کے گیارہ بج رہے ہیں اور اس وقت جانا مناسب نہیں ہے گھر کی طرف چل دیئے۔ وہ اس طوفان سے بے خبر تھے جو چپکے سے اور غیر محسوس انداز سے ان کی زندگی میں آ چکا تھا۔ جو ان کی پُرسکون زندگی پر کسی بم کی طرح گر چکا تھا۔ کتنا بڑا انقلاب آ چکا ہے۔ کیا کچھ ہو چکا ہے۔ اس کی انہیں خبر بھی نہ ہو سکی تھی۔

گھر پہنچے تو بیوی اور بچوں نے ان کا بڑا زبردست خیرمقدم کیا تھا۔ پھر انہوں نے محسوس کیا کہ بیوی میں کوئی نمایاں تبدیلی نظر آ رہی ہے۔ کیا تبدیلی ہے وہ پوری طرح محسوس نہیں کر سکے تھے مگر اتنا تو اندازہ ہو رہا تھا کہ بیوی کچھ کچھ بدلی سی نظر آ رہی ہے جیسے اس نے ان کی زندگی کے سارے بھید جان لئے ہوں۔ شادی کے بعد چند برسوں تک بیوی سے محبت کے جذبے میں گہرائی اور وارفتگی رہتی ہے۔ اس کے بعد یہ سب کچھ آہستہ آہستہ دم توڑتی جاتی ہے۔ محبت اور چاہت تو ایک رسم کے مانند رہ جاتی ہے۔ زندگی میں کوئی حرارت اور گرم جوشی نہیں رہتی تھی۔ مرد تو ایک ہی عورت کی یکسانیت سے بہت جلد اکتا جاتا ہے۔ وہ تو ازدواجی زندگی اور بچے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیتے۔ ورنہ مرد ذات تو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتا پھرے۔ وہ بھی تو انہی مردوں میں سے تھے۔ اس وجہ سے وہ پوری توجہ نہ دے پاتے تھے اور یہی حال ان کی بیوی کا بھی تھا مگر بیوی کی محبت اور چاہت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

آج کی رات ان کی بیوی جیسے ان کے لئے کسی شکیلہ کی طرح بن گئی تھی۔ ناہید میں والہانہ پن آ گیا تھا۔ محبت میں جذبہ فزوں ہو گیا۔ وہ ان کے قدموں میں داسی بن کر بیٹھ گئی تھیں۔ انہیں شادی کی پہلی سہاگ رات یاد آ گئی تھی۔ ناہید نے اس رات کی یادوں کو جیسے تازہ کر دیا تھا۔ گو اب اس پھول میں کوئی مہکار تھی نہ تازگی مگر محبت اتنی گہری اور اس قدر شدید تھی کہ وہ اس سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ وہ حیران تھے کہ ناہید کو آج یہ کیا ہو گیا ہے۔ پھر اس محبت کے پیچھے انہیں کوئی انجانا سا خطرہ ہچکولے کھاتا نظر آ رہا تھا۔ ایک خوف سا تھا جو دل میں بیٹھا جا رہا تھا کہ آج ضرور کوئی بات ہونے والی ہے۔

ناہید نے پہلے تو یہ سوچا تھا کہ وہ انہیں کچھ نہیں بتائے گی۔ دفتر پہنچ کر جب عقدہ کھلے گا تب ان پر سب کچھ آشکارا ہو جائے گا۔ مگر وہ اپنے شوہر کو تماشا بنانا نہیں چاہتی تھیں۔ انہیں اپنے شوہر کی ذلت و رسوائی پسند نہ تھی۔ جو کچھ بھی ہو افضال اس کے شوہر تھے' اس کی عزت تھے۔ آج اب بھی سب کچھ تھے۔ شوہر کے دم ہی سے یہ دنیا تھی اور

اس میں ان کی عزت بھی تھی۔ افضال احمد نے باہر جو کچھ کیا تھا وہ اس لائق نہ تھا کہ درگزر کر دیا جائے مگر وہ اپنے مزاج کی وجہ سے اپنے شوہر کو معاف کر چکی تھی اور ان کے زخموں پر نمک چھڑکنا نہیں چاہتی تھیں۔

وہ آنکھیں بند کئے شکیلہ کے تصور میں گم تھے کہ ناہید نے ان کے بازوؤں سے سر نکال کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر شادمانی کی لہروں کی ریل پیل تھی۔ وہ اپنے بازوؤں میں شکیلہ کو محسوس کر رہے تھے۔ گو ان کے لئے بیوی کا سراپا کسی بجھے ہوئے آتش فشاں کی طرح تھا۔ اب وہاں لاوا نہیں تھا۔ وہ کب کا بجھ چکا تھا۔ آب و آتش کا طوفان گزر چکا تھا۔ مگر ان میں دل کشی تو تھی۔ اسلام آباد سے دس دنوں کے بعد بیوی کو دیکھا تو انہیں لگا تھا کہ سراپا میں بجلی سے کوند رہی ہو۔ حیرت ہوئی تھی۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر بیوی کو دیکھا تو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ وہ یہ حقیقت سمجھ رہے تھے کہ بیوی کی جگہ شکیلہ موجود ہے۔ پھر یہ سوچ کر انہوں نے دل کو تسلی دی کہ صرف ہفتہ بھر کی تو بات ہے یہ تصور اور خیال بھی تو حقیقت بن جائے گا۔ اس جگہ بیوی نہیں شکیلہ ہو گی۔

"افضال!" وہ اس کے سینے کے گھنے گھنے سیاہ بالوں میں اپنی انگلیاں سہلاتے ہوئے بولیں۔ "میں آج ابھی آپ سے بے حد ضروری بات کہنا چاہتی ہوں۔"

"کہو!" انہوں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اس نے اپنی تھرتھراتی پلکیں نیچی کر لیں۔ "کیا میں نے کبھی تمہیں کوئی بات کہنے سے روکا ہے؟"

"یہ شکیلہ کون ہے؟" ناہید نے چند لمحوں کے تذبذب کے بعد جی کڑا کے کہہ ہی دیا لیکن اپنی نگاہیں ان کا چہرہ دیکھنے کے لئے نہیں اٹھائیں۔ انہیں اس بات کی ذرہ برابر پرواہ نہیں تھی کہ ان کے سوال کا افضال احمد پر کیا اثر ہو گا۔ وہ ردعمل دیکھنے کے لئے بے چین بھی نہیں تھیں۔

"شکیلہ........" وہ ایک دم سے اچھل پڑے جیسے ناہید نے ان کے بدن پر بجلی کی ننگی تار پھینک دی ہو اور اس تار کا شدید جھٹکا لگا ہو۔ کسی عورت کے بارے میں ان کی بیوی کی زبان پر یہ پہلا سوال آیا تھا۔ بیس برسوں سے وہ اپنا منہ کالا کرتے پھر رہے تھے۔ ان کے پیر پھیلتے ہی رہے تھے۔ بیوی کے علم میں بھی یہ باتیں آئی تھی۔ مگر اس خدا کی بندی نے کبھی ان سے تعرض نہیں کیا تھا' احتجاج نہیں کیا تھا۔ ان لڑکیوں اور عورتوں کے خلاف کوئی گالی نہیں بکی تھی۔ جنہوں نے اس کے حق پر ڈاکہ مارا تھا۔ مگر آج وہی عورت' وہی بیوی ان سے شکیلہ کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ پھر ایک دم سے ان کا خیال دفتر کی

شکیلہ کی طرف چلا گیا جس کی شادی ہونے والی تھی۔ اس نے ایک مہینے کی تنخواہ پیشگی مانگی تھی اور چھٹی کی درخواست بھی دی ہوئی تھی۔ وہ اس درخواست کی منظوری دیئے بغیر چلے گئے تھے۔ وہ سمجھے کہ شاید اس شکیلہ نے ان کی غیر موجودگی کی وجہ سے بیوی سے رابطہ قائم کیا ہو۔ "کیا تم دفتر کی شکیلہ کے بارے میں پوچھ رہی ہو........"

"میں اس شکیلہ کے بارے میں پوچھ رہی ہوں جو سجاد کی بہن ہے۔" وہ درمیان میں بولیں۔ "جو بے حد حسین و جمیل ہے' لاکھوں میں ایک ہے۔"

"اچھا........ اچھا........ وہ شکیلہ۔" وہ اندر ہی اندر سن سے ہو گئے تھے اور ان کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ "وہ ہمارے ایک سپلائر کی بہن ہے۔" انہوں نے بڑی آہستگی سے اپنی بیوی سے اپنے بازو خالی کئے اور اٹھ بیٹھے۔ ان کا دل بڑے زور زور سے دھڑک اٹھا تھا۔ "اس کے بارے میں تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"اس لئے اس کے اور آپ کے بارے میں بہت ساری باتیں حلقۂ احباب میں گشت کر رہی ہیں۔ چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ صاف شفاف آئینے پر بال نظر آ رہے ہیں۔ بہت سارے قصوں کی بازگشت سنائی دے رہی ہے۔ میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا یہ سب کچھ سچ ہے؟"

وہ بات کی تہہ میں پہنچ گئے تھے۔ بیوی سے کھلے میدان میں مقابلہ اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ لمحے کے لئے بدحواس ہو گئے تھے اور ان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ انہیں سنبھلنے کے لئے تھوڑی سی مہلت درکار تھی۔ بیوی انہیں یہ مہلت دینا چاہتی تھی جبھی اس نے ان کی طرف دیکھا نہیں تھا۔ وہ بستر سے نکل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ انہوں نے سوچا کہ یہ سنہرا موقع ہے۔ اچھا ہے' جو بات کل ہونے والی تھی آج ہو جائے۔ جو فیصلہ کل کرنا تھا وہ آج ابھی کر لیا جائے۔ یہ لمحہ اور دن تو آنا ہی تھا۔ چلو آج ہی آ گیا ہے' یہ سب اچھا ہوا ہے۔ یہ سوچ کر ان کے اعصاب ہلکے ہوتے جا رہے تھے۔ وہ سگریٹ اور ماچس تپائی سے اٹھا کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ اپنی بیوی کی طرف دیکھا جس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے یکسر عاری تھا۔ انہوں نے سگریٹ سلگا کر اس کا ایک کش لیا۔ فضا میں دھواں چھوڑتے ہوئے وہ گویا ہوئے۔ "بالفرض محال یہ سب کچھ سچ ہے تو .... تم کیا چاہتی ہو' کیا میں اس کی تصدیق کروں کہ یہ سب کچھ سچ ہے؟"

"میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ ان نشانوں کو وہیں ختم کر دیں جہاں تک یہ پہنچے

ہیں۔ انہیں کلائمکس تک مت لے جائیں۔" ناہید نے بڑی نرمی سے کہا۔

"مگر میں اب ایسا ہرگز ہرگز نہیں کر سکتا ہوں۔" ان کے لاشعور میں بڑائی کے چوٹ کھائے ہوئے جذبے نے سر اٹھایا۔ بیوی کا یہ مشورہ ان کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ انہوں نے سوچا' بیوی کو بتا دینا ہی بہتر ہے کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس بات سے بیوی کے دل کو کوئی صدمہ پہنچتا ہے تو کوئی بات نہیں۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ دنیا کے وہ مرد جو دوسری شادیاں کرتے ہیں آخر وہ بھی اپنی پہلی بیویوں کو دکھ پہنچا کر یہ قدم اٹھاتے ہوں گے۔

"کیوں؟ آپ ہرگز ہرگز کیوں نہیں کر سکتے ہیں؟ کیا آپ کی عمر' سماجی حیثیت اور شخصیت اس کی متقاضی ہے؟"

"یہ میرا اپنا ذاتی معاملہ ہے' تمہیں اس میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میری مرضی .... میں جو چاہے کروں۔" وہ تپ کر بولے۔

"میں نہیں بولوں گی تو بھلا اور کون بولے گا۔ میں آپ کی بیوی ہوں۔ آپ کے بچوں کی ماں ہوں' پھر ایک عورت ہوں اور پھر میرے حقوق پر اور میرے بچوں کے مستقبل پر اس کا گہرا اور جذباتی اثر پڑ رہا ہے۔ ہم سب بدنام ہو رہے ہیں۔ ہمارا مذاق اڑ رہا ہے۔"

"صرف آٹھ دس دن صبر کر لو۔ سب کی زبانیں اور چہ میگوئیاں بند ہو جائیں گی۔ میں لوگوں کا منہ بند کرنے کے لئے شادی کر رہا ہوں۔" وہ تیز لہجے میں بولے۔

"آپ شادی کر رہے ہیں .... وہ کس لئے؟ کیا اس عمر میں آپ کو شادی کرتے ہوئے زیب دیتا ہے جب کہ آپ بیوی بچوں والے ہیں۔"

"اسلام نے چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔ میں تو دوسری شادی کر رہا ہوں۔ یہ میرا حق بنتا ہے اور میں یہ شادی کر کے رہوں گا۔" وہ تن گئے۔

"اسلام نے دوسری شادی کے لئے بھی شرائط رکھی ہیں اور پھر آپ میری اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتے ہیں۔" وہ تند لہجے میں بولیں۔ "آپ اس حسین اور پُرشباب لڑکی کے پیچھے دیوانے ہو رہے ہیں جس کا نام شکیلہ ہے' جس کے ساتھ آپ مری میں سیر و تفریح کرتے رہے ہیں۔ وہ لڑکی جو آپ کی بڑی بیٹی کی عمر سے بھی چھوٹی ہے۔ یہ کیا میل' کیا جوڑ ہے؟ کیوں آپ اس جوان لڑکی سے شادی کر کے اپنے بڑھاپے کا مذاق اڑا رہے ہیں؟"

"اگر تم نے سیدھی طرح سے مجھے شادی کی اجازت نہیں دی تو .... پھر مجھے ٹیڑھی انگلی سے گھی نکالنا ہو گا اور میں ایسا کروں گا۔"

"آپ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔ بہتر ہے کہ آپ میرے ایک اچھے شوہر اور اپنے بچوں کے اچھے اور شفیق باپ بن کر رہیں۔ زندگی کو خوشگوار بنائیں۔ اس حسین ازدواجی زندگی کو اپنے ہی ہاتھوں تباہ و برباد نہ کریں۔ میں آپ کی پہلی جیسی وفا شعار بیوی بن کر رہوں گی اور اس حسین لڑکی شکیلہ کا خیال دل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکال دیں۔ نہ وہ آپ کے لائق ہے اور نہ ہی آپ اس کے لائق ہیں۔"

"تم حد سے تجاوز کرتی جا رہی ہو ناہید!" وہ خشونت لہجے میں کہنے لگے۔ "میں نہیں چاہتا ہوں کہ تمہاری زندگی اجیرن کر دوں۔ میں تمہیں طلاق دے دوں گا تو تم میرا کیا بگاڑ لو گی اور یہ بات واضح اور صاف طور پر سن لو کہ شکیلہ میری کمزوری بن چکی ہے۔ آئندہ ہفتے میں اس سے شادی کر رہا ہوں۔"

"میں آپ کی ان دھمکیوں سے مرعوب ہونے والی نہیں ہوں۔ میں پورے بیس برس سے آپ کے چہرے پر سیاہی دیکھ رہی ہوں۔ میں بیس برس سے چُپ تھی مگر میں آج چپ نہیں رہوں گی۔ وہ ناہید تو اسی روز مر گئی جس روز آپ یہاں سے اسلام آباد گئے تھے۔ یہ ایک نئی ناہید ہے' نئی عورت ہے جو اپنا جائز حق لینا جانتی ہے۔ میں کوئی ڈیکوریشن پیس نہیں ہوں جسے آپ ایک طرف رکھ چھوڑیں۔ میں نے نیا جنم لیا ہے اور ہاں .... میں آپ کو یہ بات بتا دوں کہ میں اب آپ کو کسی قیمت پر شادی کرنے نہیں دوں گی۔"

"اگر تم نے اپنی زبان بند نہیں کی اور بکواس جاری رکھی تو میں ابھی اور اسی وقت تمہیں طلاق دے کر گھر سے نکال دوں گا۔" وہ کرخت لہجے میں بلند آواز سے بولے۔ "تم میری نرمی' شرافت اور محبت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو۔ بہتر تو یہ ہے کہ تم اس وقت میری نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ۔ جا کر ٹھنڈے پانی سے غسل کرو تاکہ تمہارا دماغ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو جائے۔"

"میں اس کمرے سے جا تو رہی ہوں۔ اس لئے نہیں کہ آپ کی طلاق کی دھمکی سے مرعوب ہو گئی ہوں۔ اس لئے کہ آپ تنہائی میں بیٹھ کر سوچیں اور غور کریں کہ شکیلہ سے آپ کی شادی کیسے ہو سکتی ہے؟ آپ اس کا جو خواب دیکھ رہے ہیں کیا وہ پورا بھی ہو سکتا ہے؟" ناہید کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی۔

"میرا خواب ضرور پورا ہو گا۔ اب میں ایک ہفتے بعد نہیں بلکہ دو دن بعد اس سے شادی کروں گا۔ تم بھی دیکھ لینا دنیا بھی دیکھ لے گی؟"

"مگر آپ شکیلہ سے شادی کیسے کر سکتے ہیں؟ اس کی شادی ہو چکی ہے اور وہ شادی شدہ ہے؟" ان کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ ناچ اٹھی۔

"تم سے کس نے کہہ دیا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے؟ وہ نہ صرف مجھ سے شادی کر رہی ہے بلکہ وہ اس گھر کی' میری جائیداد' کاروبار اور دولت کی حصہ دار بھی بن رہی ہے۔ یہ سب کچھ میں نے اس کے نام اسلام آباد جانے سے پہلے ہی لکھ دیا تھا۔ بہتر ہے تم اپنی خوش فہمی دور کر لو۔" انہوں نے تمسخر سے کہا۔

"شکیلہ نے خود مجھ سے کہا تھا۔" وہ کہنے لگیں۔ "بلکہ اس نے مجھے اپنا نکاح نامہ بھی دکھایا تھا۔ وہ سجاد کی بہن نہیں بیوی ہے۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے تو آپ کل ہی بلکہ سویرے سویرے' علی الصباح اس کے فلیٹ پر پہنچ جائیں۔ جب آپ اندر جائیں گے تو میری صداقت کا اندازہ ہو جائے گا۔ کوئی بہن نائٹی پہن کر بھائی کے ساتھ ایک پلنگ پر سوتی نہیں ہے۔ نیم عریاں ہو کر ساتھ نہیں نکلتی ہے۔"

"کیا کہا.........؟" افضال احمد بڑے زور سے اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔ ناہید کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ان کے وجود پر ڈنک بن کر لگا۔ ان کے ذہن میں جو تاریکی چھائی ہوئی تھی وہ ایک دم سے چھٹ گئی۔ انہوں نے سوچا۔ مڑ کے دیکھا تو وہ اندھیرے سے روشنی میں آ گئے تھے۔ کچھ باتیں صاف اور واضح ہوئیں تو وہ پھر سے اچھل سے پڑے تھے۔ "یہ جھوٹ ہے' جھوٹ ہے۔" ان کی آواز دم توڑتی چلی گئی۔ دوسرے لمحے ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "شکیلہ نے تم سے کہا تھا......... مگر شکیلہ تم سے کب......... کیوں......... اور کس لئے ملی تھی؟"

"وہ سب کچھ میرے نام لکھ دینے کے لئے جو آپ نے اس کے نام لکھ دیا تھا۔" ناہید کے چہرے پر سکون ہلکورے لے رہا تھا۔ "اس نے آپ کا دیا مجھے لوٹا دیا ہے اور میں نے دفتر کا سارا نظام سنبھال لیا ہے۔ اب سب کچھ میرے نام اور میرے قبضے میں ہے۔ اب آپ کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ آپ صفر......... صفر......... صفر ہیں۔ سمجھے میرے سر تاج!؟"

ناہید تو اپنے بچوں کے کمرے میں چلی گئی تھی لیکن جاتے جاتے ان کے دل میں' جسم میں اور وجود میں اتنے کانٹے چبھو گئی تھی کہ وہ ساری زندگی نکال نہیں سکتے تھے۔ وہ

سوچ بھی تو نہیں سکتے تھے کہ ان کی زندگی میں نہایت ہی غیر متوقع طور پر سب کچھ درہم برہم ہو جائے گا اور ان کے سارے خواب ملبے کا ڈھیر بن جائیں گے۔ سب کچھ متزلزل ہو کر رہ جائے گا۔ آج ان کا اعتماد' حیثیت اور برسوں سے بنائی ہوئی حسین زندگی زمین بوس ہو گئی تھی۔ وہ ندامت اور ذلت کے انتہائی گہرے گڑھے میں جا گرے تھے۔ اب ان کا وہاں سے نکلنا ناممکن سا تھا اور پھر باہر نکلنے کا کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔ ان کی بیوی نے جیسے اس گڑھے کا منہ بند کر کے انہیں ہمیشہ کے لئے نظر بند کر دیا تھا۔

اس میں اتنی حیرت کی بات نہ تھی کہ سجاد نے اپنی بیوی کو بہن کے طور پر ان سے متعارف کرایا تھا اور ایک منصوبے کے تحت پیش کیا تھا۔ اس لئے کہ اس ریاکاری اور منافقت کے دور میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہاں سب کچھ جائز تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک یہ سب کچھ چلتا تھا جو دولت کے حصول کے لئے اندھے ہو رہے تھے۔ ان ریاکاروں نے آج سجاد کو ایک کامیاب انسان بنا دیا تھا۔ وہ راتوں رات بے حد دولت مند بن گیا تھا اور اس کے پاس شکیلہ ایک ایسا نایاب اور نادر ہیرا تھی کہ وہ اس کی ایک جھلک دکھا کر ساری دنیا کو پاگل بنا سکتا تھا۔ جیسے انہیں پاگل بنا دیا تھا۔ وہ پاگل ہو کر رہ گئے تھے۔

مگر ایک بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ شکیلہ کی شخصیت ان کے لئے معمہ بن گئی تھی۔ وہ ایسے معمے کو حل کرنے کی جتنی کوشش کر رہے تھے ان کے ذہن میں اتنا ہی خلفشار بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کا ذہن اذیت ناک مرحلے سے گزر رہا تھا۔ یہ شکیلہ نے کیا کیا؟ اس نے اتنی بڑی حماقت کیوں کی؟ کیا کوئی مستی میں آ کر اتنی ساری دولت کو ٹھوکر مار دیتا ہے؟ آخر ایسا کر کے اسے کیا ملا ہو گا؟ کیا اس نے یہ سب کچھ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا ہو گا؟ کیا ناہید کی شکیلہ سے کوئی سازباز تھی؟ شکیلہ نے ایسی مجہول حرکت کی تھی کہ وہ ان کی ساری زندگی کے لئے عذاب بن گئی تھی اور تو اور ناہید ان کے لئے قبر کا بچھو بن گئی تھی۔ اب وہ ان کے جسم وجاں سے چمٹ کر زندگی کے آخری سانس تک ان کے وجود پر ڈنک مارتی رہے گی۔ تیز نوکیلے اور زہریلے۔

صبح ناہید ان کے کمرے میں آئیں تو اپنے شوہر کو دیکھ کر بری طرح چونک پڑی تھیں۔ وہ پہلی نظر میں اپنے شوہر کو بالکل پہچان نہ سکی تھیں۔ انہیں ایسا لگا تھا کہ کوئی پاگل ان کے شوہر کے کمرے میں گھس آیا ہے۔ معاً ان کی نظر تپائی پر رکھے ہوئے ایش ٹرے پر پڑی۔ وہ پورا کا پورا بھر چکا تھا اور اب بھی ان کے منہ میں ایک سگریٹ دبا ہوا تھا۔ سگریٹ نوشی کی کثرت کی وجہ سے ان کے ہوٹ سوجے ہوئے تھے۔ آنکھیں انگاروں کی

طرح سرخ تھیں اور ان کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو چکے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نیند کا خمار بھی چھایا ہوا تھا۔ ایک رات ہی میں ان کے چہرے کے نقوش میں بڑھاپا چھلکنے لگا تھا۔ وہ اپنی عمر سے دس سال بڑے نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ساری رات ایک پل کے لئے بھی سو نہیں پائے ہیں۔

ناہید کے دل پر چوٹ سی لگی۔ آخر کچھ بھی ہو وہ جان وفا تھیں۔ اپنے شوہر کے لئے جان تک دے سکتی تھیں۔ مگر جو کچھ ان کے ہاتھ آیا تھا وہ کسی قیمت پر ان کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہ تھیں۔ وہ ان کے سامنے کھڑی ہو کر بولیں۔ "میں ناشتے کی میز پر آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔ جلدی تیار ہو کر آیئے۔"

افضال احمد نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پھر انہوں نے اپنا حلق تر کیا اور بولے۔ "مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔ تم خود ہی ناشتہ کر لو۔"

"میں آپ سے بے حد اہم' بے حد ضروری بات کہنا چاہتی ہوں۔ امید ہے کہ آپ ذرا غور سے سنیں گے۔" وہ اپنے شوہر کے قدموں میں بیٹھ گئیں۔

وہ جس ذلت' حیرت و صدمے سے گزرے تھے اس کے بعد ان کے نزدیک کوئی بات اہم نہیں رہی تھی۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا' گنگ سے بیٹھے رہے۔

انہوں نے اپنے شوہر کے گھٹنوں پر اپنا سر رکھ دیا۔ "اب بھی آپ میرے مالک ہیں اور میں آپ کی کنیز ہوں۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود میرے دل میں آپ کی وہی عزت ہے جو پہلے تھی۔ مجھے آپ سے اتنی ہی محبت ہے جتنی ازدواجی زندگی کے آغاز سے ہے۔ میں اسی مقام پر ہوں جو میرا ہے۔ یہ سب کچھ آپ ہی کا ہے۔ آپ ہی دفتر کے مالک ہیں۔ آپ ہی دفتر بھی چلائیں گے۔ میں آپ کے کسی معاملے میں دخل نہیں دوں گی۔ کوئی قدغن نہیں لگاؤں گی لیکن یہ سب کچھ میرے نام رہے گا۔ صرف اس لئے کہ ہم دونوں کی زندگی میں کوئی زہریلی ناگن پھنکارتی ہوئی داخل نہ ہو جائے اور ہمارا گھر اور ہماری زندگی اجڑ کر نہ رہ جائے۔ آپ نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایسی سنگین غلطی کی تھی جس کا خمیازہ نہ صرف آپ بلکہ ہم سب بھی بھگتتے۔ معلوم نہیں یہاں کون سی نیکی کام آ گئی کہ خدا نے اس گھر کو بچا لیا اور ہم سب کو تباہی و بربادی سے محفوظ رکھا۔ اگر شکیلہ چاہتی تو ہمیں دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک سکتی تھی۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ آپ نے اس کو تباہ کیا وہ چاہتی تو اپنی تباہی و بربادی کا انتقام لے سکتی تھی مگر اس نے معاف کر دیا۔ کتنی عظیم عورت ہے شکیلہ۔ کتنی بڑی ہے۔ اس کا قد کتنا اونچا ہے۔ معلوم

نہیں اسے کن گناہوں کی سزا ملی ہے کہ وہ سجاد جیسے شخص کی بیوی ہے۔ سجاد دنیا کے ان ذلیل ترین مردوں میں ایک ہے جو دولت کے حصول کی خاطر اپنی ماں' بہنوں اور بیویوں کو بھی نیلام کر دیتے ہیں۔ بہرکیف اب آپ دنیا پر یہ راز منکشف نہیں کریں گے کہ شکیلہ سجاد کی بیوی ہے۔ آپ اپنے گھناؤنے ماضی کو بھول جائیں۔ چلئے ہم ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔ سیدھے راستے پر چلیں۔ اس گھر کی بنیادوں کو اور مضبوط کریں۔ میں زندگی کے اس نئے سفر میں آپ کے ساتھ قدم ملا کر چلوں گی۔ چلئے اٹھئے۔ دفتر وقت پر پہنچنا ہے۔ دیر ہو رہی ہے۔"

افضال احمد نے زندگی اور دفتر کے معمولات کو اپنا تو لیا تھا اور وہ باقاعدگی سے دفتر جانے لگے تھے اور دنیا کے سامنے اس طرح ہنستے بولتے اور مسکراتے رہتے تھے جیسے بہت خوش ہیں۔ بہت مطمئن ہیں۔ جیسے ان کی زندگی میں خوش قسمتی کے ساتوں در کھلے ہوئے ہیں۔ مگر وہ اندر ہی اندر سے بجھے بجھے سے رہتے تھے جیسے ان کی کوئی عزیز شے کھو گئی ہو۔ زبردستی چھین لی گئی ہو۔ اپنے آپ کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا محسوس کرتے تھے جیسے ناہید دیمک بن کر ان کی زندگی کو چاٹتی جا رہی ہے۔ انہوں نے اچھی طرح سے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ ساری زندگی کے لئے اپنی بیوی کے قیدی بن کر رہ گئے ہیں۔

اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ عملی زندگی میں حصہ لیں لیکن ادھر ان کے دل سے شکیلہ کا خیال نہیں نکلا تھا۔ وہ آج بھی ان کے ہوش و حواس پر ان کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ ان کا دل بہت کرتا تھا کہ شکیلہ سے ملیں۔ اسے دیکھیں اور ان لمحات کی یاد تازہ کریں جو ان کے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی تھی۔ وہ سارے منظر' فلم کے مناظر کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے گھومتے رہتے تھے۔ وہ بہت دنوں سے اپنی بیوی سے دوبارہ اپنا سب کچھ ہتھیانے کا سوچ رہے تھے جو کسی کالے ناگ کی طرح پھن لہرائے ان کی ساری دولت پر بیٹھی ہوئی تھی تاکہ پھر سے وہ دور لوٹ آئے اور شکیلہ ان کے بازوؤں میں آ جائے اور زندگی پھر سے حسین اور رواں دواں ہو جائے۔

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ افضال احمد دفتر میں دیر تک بیٹھتے تھے۔ ناہید شام ٹھیک چھ بجے اٹھ جاتی تھی۔ جب کہ چند لوگوں کے سوا باقی سارے لوگ پانچ بجے چلے جاتے تھے۔ دفتر کی چھٹی کا وقت بھی یہی تھا۔ وہ دفتر سے سیدھی اور جلد گھر اس لئے آتی تھیں۔ کہ گھر اور بچوں کو دیکھ سکیں۔ گھر پہنچ کر نہا کر کچھ دیر ستا کر وہ باورچی خانے میں گھس جاتی تھی اور رات کے کھانے کی تیاری میں جت جاتی تھیں۔ وہ نوکروں کے ہاتھ کا کھانا پسند نہیں

کرتی تھیں اور نہ ہی ان کے شوہر کو پسند تھا۔ ان کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے شوہر کو بے حد پسند تھے۔

وہ آج بھی دفتر سے حسب معمول شام چھ بجے نکلیں۔ اپنی کار ڈرائیو کرتی ہوئی اپنے محلے میں داخل ہوئیں۔ ان کی کار اس گلی سے گزر رہی تھی جو سارا دن ویران و سنسان پڑی رہتی تھی۔ وہ کسی سوچ میں گم تھیں۔ اچانک ہی بغلی گلی سے ایک سیاہ رنگ کی مورس کار نکل کر ان کی کار کے سامنے آ گئی۔ اگر وہ فوراً ہی اپنی کار کے بریک نہ لگاتیں تو حادثہ یقینی طور پر ہو جاتا۔ ان کی کار اس کار سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گئی تھی۔

اس مورس کار میں دو افراد سوار تھے جو اگلی نشستوں پر بیٹھے تھے۔ وہ اپنی وضع قطع اور چہرے مہروں سے ایک نمبری بدمعاش دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں اس کار والے پر بہت غصہ آیا تھا۔ غلطی مورس کار والے ہی کی تھی۔ ان کا جی چاہا تھا کہ ان دونوں کو خوب کھری کھری سنائیں مگر ان دونوں کے چہرے دیکھ کر ان کے جسم پر جھرجھری سی آ گئی۔ انہیں اپنا غصہ آپ پینا پڑا تھا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔

اس کار کے رکتے ہی دونوں دروازے کھلے اور وہ دونوں بدمعاش بڑی تیزی کے ساتھ کار سے اترے۔ کار سے اتر کے انہوں نے دروازے بند نہیں کئے۔ وہ دونوں تیزی کے ساتھ ان کی کار کی طرف بڑھے تو وہ سراسیمہ سی ہو گئیں۔ ان دونوں بدمعاشوں کی آنکھوں میں درندگی تھی۔ ایک عورت ہونے کے ناتے وہ خوب سمجھتی تھیں۔ یہ کوئی فرشتے تھے نہیں۔ انہوں نے چاہا کہ گیئر بدل کر گاڑی کو تیزی سے پیچھے کی طرف لے جائیں مگر وہ اس خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکیں۔ ایک تو دہشت غالب آنے کی وجہ سے ان کا ہاتھ کانپ گیا تھا اور دوسرا وہ دونوں ان کے سر پر پہنچ گئے تھے۔

پھر ان کی آنکھیں دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ ایک بدمعاش کے ہاتھ میں چھرا تھا اور اس کے پھل کی تیز دھار چمک رہی تھی۔ وہ بڑے بے رحم لہجے میں غرایا۔ "بیگم صاحبہ! اگر آپ کو اپنی جان پیاری ہے تو جلدی سے اپنی کار سے اتر کے ہماری کار میں آ جائیں۔"

"ک.......... کک.......... کون ہو تم؟" ان کے سارے بدن میں دوڑتی ہوئی سنسنی نے ان کے سارے بدن کا لہو منجمد کر دیا تھا۔ ان کا دل کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے کی ہر چیز پر دھند سی چھا رہی تھی۔

دوسرے بدمعاش نے دروازہ کھول کر ان کی کلائی پکڑ لی۔ "اترتی ہے کہ نہیں یا پھر

گود میں اٹھا کر لے جاؤں۔"

انہوں نے اپنی بکھری ہوئی اور ساتھ چھوڑتی ہوئی ساری قوت کو مجتمع کیا اور اس بدمعاش کے ہاتھ سے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی تو انہیں لگا کہ اس بدمعاش کا ہاتھ کسی فولاد کی طرح ہے۔ اس بدمعاش کے ہاتھ کی گرفت اتنی سخت اور مضبوط تھی کہ انہیں اپنی کلائی چٹختی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ وہ ہذیانی انداز میں چیخ پڑیں۔ "ذلیل.......... کمینے.......... پاجی! چھوڑو میرا ہاتھ.........."

اس بدمعاش نے فوراً ہی ان کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ پھر انہیں گھسیٹ کر گاڑی سے نکالا۔ انہیں اس نے اپنے بازوؤں میں اس طرح اٹھا لیا جیسے وہ چار پانچ سال کی کوئی بچی ہوں۔ وہ اس کے بازوؤں میں تڑپیں، مچلیں، ہاتھ پیر چلائے مگر یہ سب کچھ بے سود رہا۔ پھر انہوں نے اس کا چہرہ نوچا اور اس کے منہ پر تھوک بھی دیا۔ مگر اس بدمعاش پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بے غیرت ہنستا رہا۔ وہ اس ذلت پر اور زیادہ کھول گئیں۔ اس کے منہ پر دو تھپڑ رسید کر دیئے۔ مگر اس بدمعاش پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ہنستا ہی رہا۔

وہ انہیں لئے کار کے قریب پہنچا تو دوسرے بدمعاش نے آگے بڑھ کر کار کا پچھلا دروازہ کھول دیا۔ اس بدمعاش نے جو انہیں اٹھائے ہوئے تھا انہیں پچھلی نشست پر گرا دیا۔ اسی بغلی گلی سے دو بدمعاش نکل کر تیزی سے اس کار کی طرف آئے چھرے والا بدمعاش عجلت سے اندر آ کر بیٹھ گیا اور چھرے کی نوک ان کے سینے پر رکھ کر بولا۔ "بیگم صاحبہ! شرافت سے بیٹھی رہیں۔ ورنہ یہ چھرا سینے میں اتر جائے گا اور.........."

اس نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ دوسرا دروازہ کھلا۔ ایک بدمعاش آ کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ اب وہ دونوں بدمعاشوں کے بیچ میں تھیں۔ دوسرے لمحے انہیں غش سا آ گیا تھا۔

جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے دیکھا کہ کار بڑی تیز رفتاری سے جا رہی ہے۔ دونوں بدمعاش انہیں اپنے نرغے میں لئے ہوئے ہیں اور ان کی پسلی میں کسی چیز کی نوک چبھ رہی ہے۔ انہوں نے اس طرف دیکھا تو ان کا سارا خون خشک ہو کر رہ گیا تھا۔ چھرے کی نوک تھی جو ان کی پسلی میں چبھ رہی تھی۔ بائیں طرف بیٹھے ہوئے بدمعاش نے چھرے کی نوک ان کی پسلی سے لگا رکھی تھی اور اس ہاتھ پر رومال ڈال رکھا تھا۔ انہیں ہوش میں دیکھ کر وہ سفاک لہجے میں بولا۔ "اگر آپ نے چیخنے چلانے کی کوئی کوشش کی تو یہ چھرا آپ کی نازک پسلیوں میں اتر جائے گا۔ لہٰذا چپ چاپ بیٹھی رہیں۔"

ان کی حالت بڑی غیر ہو رہی تھی۔ دہشت اور انجانے خیالوں سے ان کا بدن لرزنے لگا۔ حوصلہ برقرار رکھنے کی ہر جدوجہد بے سود ہو رہی تھی۔ انہیں زندگی میں کبھی ایسے بدترین لمحے سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ یہ لمحہ تو جان لیوا تھا۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ انہیں کہاں لے جا رہے ہیں؟ کس لئے لے جا رہے ہیں؟ اور پھر وہ کوئی نوجوان اور حسین و جمیل لڑکی یا عورت تو ہیں نہیں جو ان سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ وہ چالیس بیالیس برس کی عمر کی ایک عورت ہیں۔ اس شہر میں ایک سے ایک حسین' پُرشباب' پُرکشش' فتنہ انگیز جوان لڑکیاں اور عورتیں ہیں جو سرِراہ نظر آتی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو اغوا کر سکتے تھے اور انہیں اغوا کرنا کچھ دشوار بھی نہیں تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ انہوں نے کسی غلط فہمی کی بنا پر انہیں اغوا کیا ہو۔

انہوں نے کسی حد تک اپنے آپ پر قابو پالیا تھا مگر ان کے دل کی دھڑکن قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر بھی انہوں نے اپنا حوصلہ مجتمع کیا۔ اپنے خشک حلق کو تر کیا۔ اپنے ہونٹوں کو جنبش دی تو ان کی آواز میں انتشار تھا۔ "کون لوگ ہو تم؟ تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"ہم لوگ تو انسان ہیں۔" ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے بدمعاش نے سرعت سے اپنی موٹی گردن گھما کر جواب دیا اور ہنس پڑا تو اس کے ساتھیوں نے بھی بے ہنگم قہقہے لگائے۔ ان قہقہوں میں تمسخر نمایاں تھا۔ "ہم آپ کو ایک ایسی جگہ لے جا رہے ہیں جہاں آپ کی شوٹنگ ہو گی؟"

"کیسی شوٹنگ..........؟" انہوں نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا وہ کچھ سمجھ نہیں سکی تھیں۔

"فلم کی شوٹنگ۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "آپ کو ہیروئن کا پارٹ ادا کرنا ہے۔ آپ کو ہیروئن بنایا جائے گا۔"

"کاسو!" گاڑی چلاتے ہوئے بدمعاش نے چیخ کر کہا۔ "یہ تم نے کیا بکواس لگا رکھی ہے؟" پھر اس نے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے اسے مخاطب کیا جو ان کے دائیں طرف بیٹھا تھا۔ "درو! چلو اپنا کام دکھاؤ۔"

اس نے فوراً ہی اپنی جیب سے ایک رومال نکالا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتیں' رومال ان کے منہ پر رکھ دیا۔ دوسرے لمحے وہ تاریکیوں میں ڈوبتی چلی گئیں۔ پھر بے ہوش ہو کر دائیں طرف بیٹھے ہوئے بدمعاش کے بازوؤں میں جھول گئیں۔

جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے اپنے آپ کو ایک پلنگ پر بے ترتیب پایا۔ یہ انہیں دوسری بار ہوش آیا تھا۔ جب انہیں پہلی بار ہوش آیا تو وہ اس کمرے اور اسی بستر پر تھیں۔ ان کے ساتھ جو انسانیت سوز مظاہرہ ان بدمعاشوں نے کیا تھا اور اسے ایک کیمرے میں محفوظ کر کے جس طرح ان کے وجود کو ناپاک کیا تھا وہ ان کے لئے اس قدر شرمناک تھا کہ اب وہ ایک لمحے کے لئے بھی زندہ رہنا نہیں چاہتی تھیں۔ ان کے بدن میں اتنی سکت ہی نہیں رہی تھی کہ وہ اٹھ کر بیٹھ سکتیں۔ کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل کیا ہوا تھا۔ خون آشام بھیڑیے جا چکے تھے۔ ایک سناٹا سا طاری تھا۔ اس سناٹے میں ان کی سسکیاں گونجنے لگیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہیں۔ خاصی دیر بعد وہ اٹھیں۔ وہ پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھیں کہ قدموں کی چاپیں سنائی دیں۔ دروازہ کھلا پھر ایک مرد کا سراپا دیکھا تو وہ چونک پڑیں۔ اصل شیطان ان کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں معنی خیز بے رحمی کی چمک' چہرے پر پھیلی ہوئی درندگی اور ہونٹوں پر فاتحانہ شیطانی مسکراہٹ دیکھ کر سمجھ گئیں کہ یہ ہے اصل شیطان جس کی ایما پر یہ سب کچھ ہوا ہے۔ اس نے کس لئے ایسا کیا ہے۔ وہ پوشیدہ نہیں تھا۔ اس دولت اور ہوس کے پجاری سے کچھ بھی تو بعید نہیں تھا۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ لوگ دولت کے حصول کے لئے اتنا نیچے بھی گر سکتے ہیں۔ وہ اپنی جگہ سے تڑپ کر اٹھیں۔ "تم .... ذلیل' کمینے' خبیث .... یہ تم ہو؟" ان کی آواز حیرت' نفرت' صدمے اور غصے سے بھرا گئی اور وہ کسی شیرنی کی طرح غضب ناک ہو کر اس شیطان پر جھپٹیں جو سامنے کھڑا تھا۔

بیگم ناہید افضال احمد کے دل میں ایک آوارہ سا خیال اس وقت آیا تھا جب انہیں وہ خطرناک غنڈے اغوا کر کے گاڑی میں لے جا رہے تھے کہ یہ مذموم حرکت ان کے شوہر کی ہو گی۔ پھر ان کا شک پختہ یقین میں تبدیل ہو گیا تھا کہ یہ گھناؤنا منصوبہ ان کے شوہر کے سوا کوئی اور بنا نہیں سکتا ہے۔ اس لئے کہ وہ نہ صرف اپنے شوہر کی ساری دولت اور جائیداد کی مالک بن گئی تھیں بلکہ سارے کا سارا کاروبار بھی ان کے ہاتھ میں تھا۔ بہت سارے اختیارات شوہر کو دینے کے باوجود ان کے شوہر اپنے آپ کو ایک کٹھ پتلی کی طرح محسوس کرتے تھے۔ اس لئے کہ اصل ڈوری ان کے ہاتھ میں تھی۔ انہوں نے کاروبار میں سے اس گندگی اور غلاظت کو نکال کر پھینک دیا تھا جو برسوں سے ان کے شوہر کا وطیرہ رہی تھی۔ وہ آرڈر دینے اور بلوں کی فوری ادائیگی کے لئے حسین لڑکیوں اور عورتوں کو سازش کے طور پر قبول کرتے تھے۔ انہوں نے کاروبار سنبھالتے ہی ان گورکھ دھندوں کو

بند کر دیا تھا بلکہ ان کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو چکا تھا۔ اب ہر ایک کے لئے سیدھا سادا اور صاف ستھرا راستہ رہ گیا تھا۔ مگر ان کے شوہر تو اپنے آپ کو کسی پرندے کی طرح ایک پنجرے میں محبوس خیال کرنے لگے تھے اور بے چین مضطرب اور پریشان نظر آتے تھے۔ ہر وقت کسی سوچ میں مبتلا نظر آتے تھے۔ اس لئے کہ صیاد نے ان کے پَر جو کاٹ کر رکھ دیئے تھے۔ انہیں اپنے شوہر کی سوچتی آنکھیں اور ان کے چہرے پر دل کا کرب اور اذیت دیکھ کے ایک انجانا سا خوف محسوس ہوتا تھا۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی روز اچانک ہی کوئی جان لیوا واقعہ غیر متوقع طور پر پیش آنے والا ہے اور وہ منحوس دن ان کی زندگی میں آ گیا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھیں کہ اب ان کا آخری وقت آ پہنچا ہے۔ یہ غنڈے بدمعاش انہیں قتل کر کے کسی ویرانے میں پھینک دیں گے۔ ان کی موت کے بعد ان کے شوہر آپ ہی آپ پھر سے بلاشرکت غیرے مالک بن جانے تھے۔ مگر یہ سب کچھ نہ ہوا جو انہوں نے سوچا تھا جس کا خوف تھا اس کے برعکس ہوا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا ان کے نزدیک اس سے تو دردناک موت بہتر تھی۔ اس دردناک موت کے بجائے انہیں ایسی ذلت نصیب ہوئی تھی کہ وہ ایک لمحہ کے لئے زندہ رہنا نہیں چاہتی تھیں۔ مگر موت سے قبل اس درندہ صفت انسان سے انتقام لینے کی آرزو میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ وہ اسے دیکھنا چاہتی تھیں کہ وہ ان کے سامنے اپنا مسخ شدہ چہرہ لئے آتا ہے یا نہیں اور وہ آ گیا تھا۔ سامنے کھڑا تھا۔

مگر وہ شخص ان کا شوہر نہیں تھا' وہ تو سجاد تھا۔ وہ شخص' وہ آدمی اور وہ انسان جس نے اپنی خون آشامی سے درندوں کو بھی شرمندہ کر دیا تھا۔ شیطان صفت شخص جس کے دل کے کسی کونے میں انسانیت نام کی کسی چیز کا وجود نہیں تھا۔ انسانی درندگی کی روایات کا امین' سفاکی اور بربریت کا علمبردار' تشدد ایذا رسانی اور عورت کے وجود کو ناپاک کرنے کا ماہر' اس کے نزدیک عورت کی کوئی وقعت' حیثیت اور عزت نہیں تھی۔ اگر تھی تو دولت کی۔ انہیں اس کا چہرہ اس قدر گھناؤنا' بدنما اور بھیانک نظر آیا کہ وہ آپے میں نہ رہ سکیں۔ وہ اس پر ٹوٹ پڑی تھیں اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گریبان پکڑ کے اسے جھنجھوڑ ڈالا اور اس کے سینے پر کئی تھپڑ جما دیئے۔ "ذلیل آدمی! تم نے کیا کیا' کیوں کیا.......... بتاؤ؟"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ تم ایک ذہین اور فہیم عورت ہو۔ تمہارے لئے تو یہ اشارہ ہی کافی ہو گا۔"

"بھیڑیئے .... درندے۔" انہوں نے طیش میں آ کر اپنے ناخنوں سے سجاد کا

چہرہ نوچ لیا۔ "میں تمہاری آنکھیں پھوڑ دوں گی۔"

سجاد نے بڑی عجلت سے ان کے دونوں ہاتھوں کی کلائیوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو بیگم ناہید افضال احمد واقعی اس کی آنکھیں پھوڑ دیتیں۔ سجاد نے جیسے ہی ان کی کلائیوں کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لیا تب انہوں نے اپنی کلائیوں کو آزاد کرانے کی بڑی کوشش اور جدوجہد کی تھی۔ جب وہ اپنی تمام کوششوں میں ناکام رہیں تو انہوں نے سجاد کے منہ پر تھوک دیا۔

سجاد کو ایسا لگا کہ انہوں نے اسے بجلی کے تار سے جھٹکا لگایا ہو۔ وہ مشتعل ہو گیا اور اس نے انہیں بستر پر دھکا دے دیا۔ وہ بستر پر گر کے بکھر سی گئیں۔ چند لمحوں کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو سمیٹا اور بستر سے نکل کر اٹھ کھڑی ہوئیں تو ان کی سانسیں سینے میں بے قابو سی ہو رہی تھیں۔ غصے اور دہشت سے ان کا سارا بدن لرزاں تھا اور سینہ ان کی آواز کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ سجاد ان کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتیں اس نے ان کے منہ پر بڑے زور کا طمانچہ دے مارا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکیں۔ اُلٹ کر بستر پر ڈھیر ہو گئیں۔

"خبیث عورت!" سجاد کے لہجے میں نفرت اور حقارت بھری ہوئی تھی۔ "میں تمہیں بخشوں گا نہیں۔ تم نے میرے منہ پر نہیں تھوکا ہے بلکہ.........." وہ غصے کی وجہ سے اپنا جملہ پورا نہ کر سکا۔ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنا چہرہ صاف کیا۔

سجاد کے اس تھپڑ سے ان کا دماغ سنسنا گیا اور نس نس میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ ان کا جبڑا سخت درد کر رہا تھا۔ رخسار پر جلن سی ہو رہی تھی۔ وہ چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح بستر سے نکل کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کی آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے بھی سرعت سے اس کی طرف بڑھ کر اس کے منہ پر زناٹے کا تھپڑ رسید کر دیا۔ سجاد تھپڑ کھا کر طیش میں آ گیا اور آگے بڑھ کر اس نے ان کا گلا دبوچ لیا لیکن دوسرے لمحے کچھ سوچ کر اُس نے ان کی گردن آزاد کر دی اور خشونت کے لہجے میں بولا۔ "میں چاہوں تو تمہیں ایک پل میں موت کی نیند سلا سکتا ہوں۔ مگر میں ایسی حماقت اور سنگین غلطی نہیں کروں گا۔ میں تمہیں زندہ رکھنا چاہتا ہوں مسز ناہید افضال احمد! .... منیجنگ ڈائریکٹر آف نیو انڈس کارپوریشن۔"

"اور میں ذلت کی اس زندگی سے مر جانا اچھا سمجھتی ہوں۔" انہوں نے برہمی اور

انتہائی نفرت سے جواب دیا۔ "تم نے مجھے اس قابل ہی کہاں رکھا ہے کہ میں عزت سے زندہ رہ سکوں۔ ذلیل کتے' کمینے' شیطان! تم نے مجھے درندوں کے آگے ڈلوا دیا' کس لئے؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا' شیطان کی اولاد؟"

پھر انہیں جیسے اپنے آنسوؤں پر کوئی اختیار نہیں رہا۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو پڑیں۔ بستر پر اوندھے منہ گر کر روتی رہیں۔ وہ اس خون آشامی کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھیں۔ مگر آنسو تھے کہ کسی سیلاب کی طرح تیزی سے اُمڈتے چلے آ رہے تھے۔ ان کی ہر جدوجہد بے سود ہو رہی تھی۔

سجاد ان کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چند لمحوں تک انہیں دیکھتا رہا پھر وہ کسی شیطان کی طرح قہقہے لگانے لگا۔ اس پر ان آنسوؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ ان کی حالت زار پر ہنس رہا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو جنبش دی تو فضا میں جیسے زہر سرایت کرنے لگا۔ "شاید تم بھول گئی تھیں کہ تاریخ جس طرح اپنے آپ کو دہراتی ہے اسی طرح وقت بھی اپنے آپ کو دہراتا ہے۔ اس روز تم نے مجھے چیک کے سلسلے میں بلا کر اپنے دفتر کے چند لوگوں کے سامنے کیسا ذلیل کیا تھا۔ ایک طرح سے مجھے جھوٹا' بے ایمان اور ذلیل ثابت کیا تھا۔ میں نے آج اسی روز کا بدلہ لیا ہے۔ سمجھیں مسز ناہید افضال احمد!"

وہ تو پہلے ہی سے نیم جان ہو رہی تھیں۔ ان درندوں کی وجہ سے ہر آبلہ رسنے لگا تھا۔ ان میں طاقت ہی نہیں رہی تھی۔ اتنی سکت بھی نہ رہی تھی کہ وہ اس شخص کا منہ نوچ لیں۔ وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھیں' صرف زبان کو حرکت دے سکتی تھیں۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے آنسوؤں کو ساڑھی کے پلو میں جذب کیا اور کہنے لگیں۔ "میں نے تمہیں ذلیل نہیں کیا تھا۔ میں نے تمہیں تمہارا اصل چہرہ دکھایا تھا۔ تم کمپنی کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے تھے۔ مگر میں اتنا زبردست دھوکا اور بے ایمانی کیسے برداشت کر سکتی تھی؟ تم سپلائر نہیں ایک ڈاکو ہو ڈاکو........... پھر بھی میں نے تمہیں ایک موقع تو دیا تھا۔"

سجاد نے ان کی باتوں کو جیسے اَن سنی کر دیا تھا۔ وہ ان کی بات سن کر بڑی بے رحمی سے بولا۔ "آج میں بھی تمہیں ایک موقع دے رہا ہوں۔"

"کیسا موقع؟" ان کی حیرت میں نفرت بھی نمایاں تھی اور وہ اب بھی دھیرے دھیرے سسک ہی رہی تھیں۔ "میں تمہارے کسی بھی موقع کی محتاج نہیں ہوں۔"

"عزت و آبرو اور اسی شان و شوکت سے زندگی گزارنے کا موقع۔ دنیا کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ آپ کے ساتھ کیا کچھ ہوا صرف ایک دو شرائط پر۔"

"اگر تم نے آج کے مذموم ترین واقعہ کے بارے میں کسی سے ذکر کیا تو میں تمہیں کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

"کیا تمہیں اب بھی اس بات کا احساس نہیں ہو رہا ہے کہ وقت کی گردش پلٹ گئی ہے اور آج تم میری مٹھی میں ہو۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"یہ تمہارا وہم ہے ذلیل انسان!" وہ تپیدہ لہجے میں بولیں۔ "تم میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتے ہو۔ میں تم جیسے کتوں سے نمٹنا آسانی سے جانتی ہوں۔"

"میں کیا کر سکتا ہوں اور کیا نہیں کر سکتا ہوں یہ تو وقت آنے پر پتا چل جائے گا اور میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اب میں کیا ہوں۔ بہرکیف تم تحمل سے بات کرو۔ تم حد سے زیادہ بڑھتی جا رہی ہو اور مجھے اشتعال دلا رہی ہو۔ بہتر ہے کہ میرے صبر و ضبط کا امتحان نہ لو۔" وہ ایک ہی سانس میں بول گیا۔

"تم جو کوئی بھی ہو اس سے مجھ پر فرق نہیں پڑتا ہے۔ میں اتنا جانتی ہوں کہ تم انسان نہیں ہو۔ اگر تم انسان ہوتے تو میرے ساتھ یہ سلوک نہ ہوتا۔ اس طرح تم ایک عورت کے تقدس کو پامال نہ کرتے اور اس کی دھجیاں نہ اڑاتے۔ تم سے بدتر انسان شاید اس سرزمین پر نہ ہو گا۔"

"اگر تم دس لاکھ روپے کے چیک پر اپنے دستخط کر دیتیں تو شاید اس کی نوبت ہی نہ آتی۔ اب کیا خیال ہے' کل اپنے دستخط کر رہی ہو چیک پر؟"

"میں کسی قیمت پر تمہیں وہ چیک نہیں دوں گی اور نہ ہی اس پر میرے کوئی دستخط ہوں گے۔ لہٰذا تم منہ دھو رکھو۔"

"میں بھی دیکھتا ہوں تم کل چیک پر دستخط کیسے نہیں کرو گی؟" اس کے ہونٹوں پر استہزائی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "تم مجھ سے ٹکر لے رہی ہو؟" اس نے اچانک اپنا ایک ہاتھ جیب میں ڈالا تو وہ ایک دم سے چونک پڑی تھیں۔ ذرا سی دیر کے لئے ان کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ جیب سے فلم رول نکال کر مسکرایا۔ "تمہارا چہرہ تو لاش کی طرح سفید پڑ گیا ہے جیسے میں جیب سے پستول نکال رہا ہوں۔ میں مرے ہوئے لوگوں کو مارنے کا قائل نہیں ہوں۔ تمہاری زندگی' عزت اور موت تو اس فلم رول میں ہے۔ میرے خیال میں اب تو تم چیک پر ضرور دستخط کرو گی۔"

وہ فلم رول دیکھ کر سمجھ گئی تھیں کہ کچھ دیر پہلے ان پر جو قیامت گزری تھی وہی کچھ اس فلم رول میں ہے۔ حقیقت بھی یہ تھی کہ اب وہ انکار نہیں کر سکتی تھیں وہ انہیں تباہ و برباد کر سکتا تھا۔ اس لائق بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا کہ وہ دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہیں۔ وہ واقعی اس کی مٹھی میں آ چکی تھیں۔

ایک لمحے کے لئے انہوں نے دل میں سوچا کہ کیا وہ ساری زندگی سجاد کے ہاتھوں بلیک میل ہوتی رہیں گی۔ اس طرح تو سجاد انہیں دیمک بن کر چاٹ جائے گا۔ آہستہ آہستہ انہیں اندر سے کھوکھلا کرتا جائے گا۔ پھر ان کے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا۔ نہ دولت نہ جائیداد' نہ کاروبار اور نہ ہی گھربار۔ ایک دن وہ آئے گا ان کے پاس کھانے اور رہنے کو بھی تو نہیں رہے گا۔ وہ کسی شکاری کی طرح ان کے گرد اپنا حلقہ تنگ کرتا جائے گا۔

"سنو ذلیل انسان!" وہ اپنی آواز کی لرزش پر قابو پا کے مضبوط لہجے میں بولیں۔ "اگر تمہیں اپنے اس گھناؤنے کارنامے پر کوئی خوش فہمی یا غلط فہمی ہے تو اس کا علاج میں بھی جانتی ہوں۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہو۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ ان تصویروں کے عوض مجھے ساری زندگی بلیک میل کرتے رہو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میں ان کمزور عورتوں میں سے نہیں ہوں جیسا تم سمجھ رہے ہو۔ میں مر جانا پسند کروں گی مگر تمہارے اشارے پر نہیں چلوں گی۔"

"تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہاری ان باتوں میں آ جاؤں گا۔" سجاد نے تمسخر سے کہا۔ "ابھی تم نے یہ تصویریں کہاں دیکھی ہیں۔ جب اس فلم رول کی تصویریں تمہارے پاس اور ان کی ایک ایک کاپی .... افضال احمد کے ہاتھوں میں پہنچے گی تب تمہیں ان تصویروں کی اہمیت کا اندازہ ہو گا۔ پھر ان تصویروں کی قیمت کا اندازہ کر سکو گی۔ پھر ان تصویروں کا نیلام ہو گا۔ میں جانتا ہوں کہ ان تصویروں کی کیا قیمت ہے اور کس طرح وصول کی جا سکتی ہے۔"

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟ تم اپنے دل کی حسرت بھی پوری کر کے دیکھ لو۔" وہ نفرت اور غصے سے پھنکاریں۔

"تمہارا ذہن آج کے واقعے نے بُری طرح متاثر کیا ہے۔ لہٰذا تمہارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہو کر رہ گئی ہیں۔" سجاد کہنے لگا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا تم بھی عام عورتوں کی طرح بے وقوف اور جذباتی ہو گی۔ نادان اور ناتجربہ کار عورتوں کی طرح ہو گی

اب تم اٹھو' غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھو لو' نہا لو' میں تمہیں تمہارے گھر لے جا کر چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہ تمہارے بچے تمہارے انتظار میں پریشان ہو رہے ہوں گے اور ہاں۔" اس نے توقف کر کے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ انہوں نے دیکھا کہ سجاد کی آنکھوں میں شیطانی ہنسی ناچ رہی ہے۔ "یہ تصویریں تمہارے بچے دیکھیں گے تو تم پر کیا گزرے گی؟"

وہ اس لمحے سناٹے میں آ گئیں۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ شخص اس قدر ذلیل اور کمینہ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ شاطر ذہن کا مالک تھا۔ قیافہ شناس تھا۔ اسے نفسیاتی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا خوب آتا تھا۔ یہ شخص توقع سے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئیں۔ انہوں نے دل میں سوچا کہ پہلے تو انہیں یہاں سے کسی نہ کسی صورت نکل جانا چاہئے' پھر انہیں اس موذی سانپ کا سر کچلنے کے لئے کوئی تدبیر سوچنا ہو گی۔

سجاد اپنی کار میں انہیں اس گلی میں لے آیا جہاں سے انہیں اغوا کیا گیا تھا۔ ان کی گاڑی اس گلی میں موجود تھی اور سڑک کے ایک طرف کھڑی تھی۔ کار مقفل بھی تھی۔ انہیں اچھی طرح سے یاد تھا کہ جب ایک بدمعاش نے انہیں کھینچ کر گاڑی سے نکالا تو اگنیشن میں چابی لگی ہوئی تھی۔ پرس بھی گاڑی میں رہ گیا تھا۔ گاڑی بیچ راستے میں تھی۔ مگر اب گاڑی کنارے کھڑی تھی اور مقفل بھی نظر آ رہی تھی۔ جب وہ سجاد کی کار سے اترنے لگیں تو سجاد نے جیب سے ان کی کار کی چابی نکال کر لہرائی۔ جب انہوں نے چابی لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو سجاد نے چابی کو مٹھی میں بند کر لیا اور بڑے جارحانہ انداز میں بولا۔ "مسز افضال! اگر آپ نے قانون کی مدد لینے کی کوشش کی تو یاد رکھئے .... اس میں سراسر نقصان آپ ہی کا ہو گا۔ اسکینڈل کے بھوکے اخبارات آپ کو خودکشی کرنے پر مجبور کر دیں گے۔ آپ ساری دنیا کو اپنا منہ دکھا سکتی ہیں لیکن اپنے بچوں کو نہیں۔"

انہوں نے بڑی خاموشی اور ضبط و تحمل سے سجاد کی زبان سے نکلتا ہوا ایک ایک لفظ سنا۔ ان کی نس نس میں لہو اُبل رہا تھا۔ وہ دل میں سوچ رہی تھیں کہ کاش! ان کے پاس پستول ہوتا اور وہ اس کی ساری گولیاں اس خبیث شخص کے جسم میں اتار دیتیں اور اس کی جیب سے فلم رول نکال لیتیں۔ سجاد نے اپنی بات ختم کر کے گاڑی کی چابی ان کی طرف بڑھائی تو انہوں نے اس کے ہاتھ سے چابی جھپٹ لی اور سجاد کے منہ پر تھوک کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھیں۔ نہ تو وہ یہ دیکھنے کے لئے رکیں کہ ان کی اس نفرت کے اس

اظہار کا اثر اور رد عمل کیا ہوا ہے اور نہ ہی انہوں نے اس شیطان کی طرف مڑ کر دیکھنا گوارہ کیا۔

دوسرے لمحے سجاد کی کار ایک جھٹکے سے مخالف سمت چیختی چلاتی بڑھ گئی۔ وہ دروازہ کھول کر اپنی کار میں آ بیٹھیں۔ گلی میں سیاہ سنسان رات کا اندھیرا تھا۔ قبرستان جیسا سناٹا طاری تھا۔ کیا وقت ہو گیا ہے' انہیں کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ ان غنڈوں نے ان کی دستی گھڑی بھی نہیں چھوڑی تھی۔ انہوں نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے اگنیشن میں چابی ڈالی اور انجن اسٹارٹ کیا تو پھر ان کا دل بے اختیار بھر آیا۔ انہوں نے بڑا ضبط کیا۔ خود پر بڑا جبر کر کے دل کو قابو میں کیا۔ پھر وہ گاڑی کو سڑک پر لے آئیں اور گھر کی طرف چل پڑیں۔

ان کا دل جو زخموں سے چُور چُور تھا' جن میں سے لہو رس رہا تھا وہ ہر لمحہ جیسے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہ رہی تھیں۔ ان کا دل گھر جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ ان کا جی کر رہا تھا کہ وہ اتنی دور چلی جائیں کہ ان کی واپسی ہی نہ ہو سکے اور وہ پھر کبھی اپنے گھر نہ پہنچ سکیں۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ وہ یہ چہرہ لے کر گھر جا کر کیا کریں گی۔ اپنا چہرہ کیسے دکھا سکیں گی جو کسی کو دکھانے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

وہ گھر پہنچیں تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ ان کے شوہر سے زیادہ ان کے بچے بہت پریشان تھے۔ ان کا رو رو کر بُرا حال ہو چکا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی بچے دوڑ کر ان سے لپٹ گئے تھے۔ رو پڑے تھے۔ پھر وہ خود بھی رو پڑی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے جھوٹ بول کر اپنے شوہر اور بچوں کو مطمئن کیا کہ ان کی ایک سہیلی راستے میں حادثے کا شکار ہو کر پڑی تھی' زخمی تھی۔ اسے ہسپتال لے گئی تھیں۔ اس کی جان خطرے میں تھی۔ اسے خون کی ضرورت تھی۔ دوائیوں کی ضرورت تھی۔ اس وجہ سے وہ نہ گھر ٹیلی فون کر کے بتا سکی تھیں اور نہ جلد گھر آ سکی تھیں۔ پریشانی میں انہیں کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔

بچوں نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ بچوں کا ساتھ دینے اور کھلانے کے لئے انہیں بھی چند لقمے زہر مار کرنا پڑے تھے۔ ورنہ ان کا دل تو چاہ رہا تھا کہ وہ زہر کھا کر سو رہیں۔ جب وہ بچوں کو کھلا پلا اور سلا کر اپنے کمرے میں آئیں تو رات کے تین بج رہے تھے۔ افضال احمد ان کے انتظار میں بیٹھے انگریزی ناول پڑھ رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی افضال احمد نے ناول بند کر کے تپائی پر رکھ دیا۔ وہ کپڑے بدل کر پلنگ پر آ بیٹھیں تو افضال احمد نے پوچھا۔

"اصل بات کیا ہے ناہید!"

"اصل بات..........؟" وہ بڑے زور سے اچھل پڑیں۔ انہوں نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا تو شوہر کو معنی خیز نظروں سے ان کے چہرے اور آنکھوں میں کسی چیز کو تلاش کرتے پایا۔ ان کا دل سینے میں دھک سے ہو کر رہ گیا۔ وہ بھی اس دل خراش واقعہ کو سنانا نہیں چاہتی تھیں۔

"ہاں اصل بات!" افضال احمد نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم اصل بات مجھ سے چھپا رہی ہو' کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"آپ کے خیال میں اصل بات کیا ہو سکتی ہے؟" انہوں نے سرد انداز میں پوچھا۔ "کیا میں نے جو کچھ سنایا ہے وہ غلط ہے؟ کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں ہے؟ کیا میں آپ سے جھوٹ بول سکتی ہوں؟"

"تمہارا یہ چہرہ تمہارے جھوٹ کی چغلی کھا رہا ہے۔ کیا تم نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا ہے؟ نہیں دیکھا ہے تو جا کر دیکھ لو۔ یہ سامنے تو سنگھار میز ہے۔" افضال احمد نے توقف کر کے ان کا بازو پکڑا اور انہیں سنگھار میز کے قد آدم آئینے کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ "تمہاری آنکھوں میں بے نوری ہے' تمہارا چہرہ ستا ہوا اور لاش والے چہرے کی طرح سفید نظر آ رہا ہے۔ تمہارے چہرے پر چھایا ہوا رنج والم کوئی اور ہی کہانی سنا رہا ہے؟"

"جی ہاں! اصل بات کچھ اور ہی ہے..........؟" انہوں نے کسی مجرم کی طرح اپنا سر جھکا لیا۔ انہوں نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ اب اپنے شوہر سے اس واقعہ کو چھپانے سے کیا حاصل ہو گا؟ آخر وہ کب تک چھپا کر رکھ سکتی ہیں؟ آج نہیں تو کل بتانا پڑے گا۔ کیا معلوم کہ سجاد ہی ان کے شوہر سے مل کر وہ واقعہ بتا دے اور وہ تصویریں بھی دکھا دے جو ان کے وجود پر کسی بدنما داغ کی طرح ہیں۔

"جو بات بھی ہے وہ مجھے بتا دو۔" افضال احمد نے انہیں خاموش پا کر بڑی نرمی سے کہا۔ "آخر میں تمہارا شوہر ہوں' ہمدرد اور غمگسار ہوں اور پھر تمہارا دوست ہوں۔ اس کے علاوہ تمہاری کمپنی میں ملازم بھی ہوں۔ تمہارا ماتحت بھی تو ہوں۔"

انہوں نے سر اٹھا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ "کیا آپ میرے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہیں۔"

"نہیں ناہید!" افضال احمد نے انہیں بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا لیا۔ "آخری جملے غیر ارادی طور پر میری زبان سے نکل گئے ہیں۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ ہرگز.......... ہرگز میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں تمہارے زخموں پر نمک چھڑکوں۔ تم نے مجھے وہی

عزت اور مقام دیا ہوا ہے جو پہلے میرا تھا۔ اس کے باوجود کہ میرا دامن گناہوں اور بدکاریوں سے داغ دار ہے۔ میری ان برائیوں کے باوجود تم نے مجھے تاج سمجھ کر پہنا ہوا ہے۔ ا۔ ا عظیم عورت کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے میں نمک چھڑکوں۔ کیا تم مجھے اس قدر ذلیل اور گرا ہوا شخص سمجھتی ہو؟"

"مجھے معاف کر دو افضال!" وہ سسک پڑیں۔ "میں نے آپ کی بات کو سمجھنے میں غلطی کی۔ اس میں میرا بھی تو کوئی قصور نہیں ہے۔ میں کیا کروں؟ اس واقعہ اور صدمے نے میرا ذہن اس قدر ماؤف کر دیا ہے کہ .... میرا دماغ اور میں کسی قابل ہی نہیں رہی ہوں۔"

"تم جلد سے جلد وہ واقعہ سنا کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لو۔ اپنے اعصاب ہلکے کر لو۔ ورنہ ساری رات کرب اور اذیت سے تڑپتی رہو گی۔" وہ اصل بات جاننے کے لئے بڑے بے تاب اور مضطرب سے ہو رہے تھے۔ "تمہاری کہانی میں نہیں سنوں گا تو بھلا اور کون سنے گا؟"

پھر انہوں نے مختصر طور پر زخم خوردہ لہجے اور سسکیوں میں شروع سے لے کر آخر تک وہ کہانی سنا دی جو ان کے دل میں کسی نیزے کی طرح چبھ رہی تھی اور ان کے اعصاب واقعی ہلکے ہو گئے تھے۔ مگر پھر بھی دل پر ایک بوجھ اور بے امانی سی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ ایسا زخم نہیں تھا جو بھر جاتا۔ ایسے زخم کے لئے دنیا میں کسی کے پاس مرہم نہیں تھا۔ ان کے نزدیک اس غم اور زخم سے صرف موت ہی چھٹکارا دلا سکتی تھی۔

"سجاد.........." افضال احمد ہذیانی انداز میں چیخ پڑے۔ انہوں نے اپنی بیوی کو سینے سے الگ کیا اور کھڑے ہوتے ہوتے ہوئے نفرت اور غصے سے ان کا بدن کانپ رہا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اور چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ اپنی مٹھیاں بھینچ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔ "اس درندے اور بھیڑیے نے تمہارے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا' کیا تم کسی جانور کا گوشت تھیں جو اس نے تمہیں ان درندوں کے سامنے ڈال دیا تھا۔ اس نے دس لاکھ روپے کے چیک کے حصول کی خاطر تمہارے ساتھ اس قدر بہیمانہ سلوک کیا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا ناہید! میں اس ذلت اور بے عزتی کا انتقام اس سے لے کر رہوں گا۔ اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کو کھلا دوں گا۔" ان کی خشونت ہوتی ہوئی آواز کمرے میں گونجتی رہی۔

افضال احمد اپنی بات ختم کر کے نفرت' غصے اور دیوانگی کے عالم میں بڑبڑاتے ہوئے

چند لمحے تک بے چینی سے ٹہلتے رہے۔ پھر یکایک وہ الماری کی طرف بڑھے۔ وہ الماری کی طرف بڑھے تو ناہید افضال ایک دم سے چونک گئیں۔ دوسرے لمحے اپنے شوہر کے ہاتھ میں پستول دیکھا تو سراسیمہ سی ہو گئیں اور بستر سے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ نکل کر ان کے پاس پہنچ گئیں۔ ان کے ہاتھ سے پستول چھین کر اپنا پستول والا ہاتھ اپنے پیچھے کر لیا اور پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان پوچھا۔ "ایں! یہ آپ کیا کرنے جا رہے ہیں؟"

"میں اس حیوان اور بھیڑیے کو قتل کرنے جا رہا ہوں جس نے تمہاری ہی نہیں بلکہ میری عزت بھی لوٹ لی۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میں اسے قتل کر دوں گا' جہنم رسید کر دوں گا۔ لاؤ .... مجھے پستول دے دو۔" افضال احمد نے اُن کے ہاتھ سے پستول لینے کی کوشش کی۔

وہ ایک قدم اور پیچھے ہٹ گئیں۔ "نہیں .... نہیں۔" وہ ہذیانی انداز میں بولیں۔ "میں آپ کو ایسا ہرگز کرنے نہیں دوں گی۔"

"کیا تم چاہتی ہو کہ وہ کمینہ نہ صرف ساری زندگی بلیک میل کرتا رہے' بلکہ ہماری ساری دولت اور خون بھی نچوڑتا رہے۔" افضال احمد نفرت اور غصے سے بل کھا کر بولے۔

"مگر آپ یہ بھی تو سوچیں کہ آپ اپنے ہاتھ خون سے رنگنے جا رہے ہیں؟ اگر آپ نے اسے قتل کر دیا تو پھر قانون کبھی آپ کو معاف نہیں کرے گا۔ آپ تختہ دار پر لٹک جائیں گے۔ پھر میرا کیا ہو گا؟ میرے بچوں کا کیا ہو گا؟ اس برسوں سے بسے بسائے گھر کا کیا ہو گا؟ سبھی کچھ تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔"

"مگر ناہید..........!" وہ مضطرب ہو کر بڑے کرب ناک لہجے میں بولے۔ "مجھے اپنی زندگی اور جان سے زیادہ تمہاری زندگی اور محبت بے حد عزیز ہے۔ میں تمہارے سکھ اور تمہاری عزت کے لئے اپنی جان تک قربان کر سکتا ہوں۔ کیا تم ساری زندگی اس کے اشاروں پر ناچتی رہو گی؟"

وہ اپنے شوہر کے جذبات اور احساسات سے بڑی متاثر ہوئی تھیں۔ انہیں اندازہ نہ تھا کہ وہ آج بھی اور ان باتوں کے باوجود جس نے ان کے شوہر سے سب کچھ چھین لیا ہے پھر بھی بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ اب ان کے شوہر بدل کر رہ گئے تھے۔ قریب آ گئے تھے۔ پہلے سے کہیں زیادہ چاہنے لگے تھے۔ وہ اسی محبت اور چاہت کی بھوکی تھیں۔ شوہر کی محبت ہی تو ان کے لئے سب کچھ تھی۔ وہ کسی قدر جذباتی ہو کر کہنے لگیں۔ "مجھے ہر قیمت پر آپ کی زندگی عزیز ہے۔ میں اپنی عزت اور زندگی کو داؤ پر لگانا نہیں چاہتی ہوں

اور نہ یہ چاہتی ہوں کہ سجاد ہمارے جسموں سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لے۔ ابھی ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ کچھ دن صبر کریں اور کوئی ایسی تدبیر سوچیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے۔"

انہوں نے پستول لے جا کر الماری میں رکھ دیا۔ کچھ دیر بعد افضال احمد یک لخت اچھل پڑے۔ "میرے ذہن میں ایک تدبیر آ رہی ہے۔"

"کیسی تدبیر.........؟" وہ جو بستر پر لیٹی ہوئیں اپنے آپ کو انگاروں پر لوٹتا محسوس کر رہی تھیں، اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

افضال کا چہرہ جو کسی قمقمے کی طرح روشن ہوا تھا وہ ایک دم سے بجھ گیا۔ "نہیں نہیں......... تم اس تدبیر سے میری بات کا غلط مطلب لے لو گی۔"

"غلط مطلب کیسا؟" انہوں نے حیران سے پوچھا۔ "یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

"وہ تدبیر ہی کچھ ایسی ہے؟" افضال احمد نے جواب دیا۔ "تم خواہ مخواہ شک شبہے میں مبتلا ہو جاؤ گی۔ میں کوئی اور تدبیر سوچتا ہوں۔"

"میں قسم کھا کر آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ آپ کی کسی بھی تدبیر سے کوئی غلط مطلب اخذ نہیں کروں گی۔ بتائیے تو وہ تدبیر کیا ہے؟"

"بڑی اچھی تدبیر ہے جو اچانک میرے ذہن میں آئی ہے۔ اس تدبیر پر عمل کرنے سے نہ صرف سجاد کے ہاتھ کٹ جاتے ہیں بلکہ وہ بے بس اور مجبور ہو کر رہ جاتا ہے بلکہ وہ تمہیں کسی بھی صورت اور قیمت بلیک میل نہیں کر سکتا ہے۔ اس طرح سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔"

"ایسی تدبیر کے لئے تو میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے بھی تیار ہوں۔ ایک عورت کو عزت سے زیادہ پیاری چیز کوئی اور نہیں ہوتی ہے۔"

وہ چند لمحوں کے لئے تذبذب میں پڑ گئے۔ انہیں دل کی بات زبان پر لانے میں گریز ہو رہا تھا۔ وہ جھجک سے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے شوہر کے قریب ہو کر اپنی بانہیں ان کے گلے میں حمائل کر دیں۔ وہ ان کی آنکھوں میں محبت پاش نظروں سے جھانکتی ہوئی بولیں۔ "دیکھئے! میرا امتحان مت لیجئے میں آپ کی بیوی ہوں محبوبہ نہیں ہوں جو کسی مشکل میں ساتھ چھوڑ دوں۔ میرا جینا مرنا، میری عزت اور خوشی، میرا تن من اور ہر چیز آپ ہی کی تو ہے۔ جو بات دل میں ہے وہ زبان پر لے آئیے۔ خدا کے لئے جلدی سے

بولئے۔ میرا دل ڈوبا سا جا رہا ہے۔"

"تمہیں میرا وہ سب کچھ لوٹا دینا ہو گا جو شکیلہ نے تمہارے نام لکھ دیا ہے۔ اس لئے کہ......... یہ سب کچھ میرے نام ہو جانے سے وہ تمہیں بلیک میل نہیں کر سکے گا۔ اس نے یہ سب کچھ اس لئے کیا ہے کہ......... تم بے پناہ دولت اور اس فرم کی مالک ہو۔ وہ تمہیں بلیک میل کر کے فائدہ اٹھاتے رہنا چاہتا ہے۔"

ان کی سمجھ میں شوہر کی بات آ گئی تھی۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں، اگر وہ اس وجہ سے مجھے بلیک میل کرنا چاہتا ہے تو پھر میں دو ایک دن میں یہ سب کچھ لوٹا دوں گی۔ مجھے سوائے آپ کے اور عزت کے کچھ نہیں چاہئے۔ مگر آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہو گا۔ وعدہ کر کے نبھانا ہو گا؟"

"میں وعدہ کروں گا تو وہی وعدہ کروں گا جو پورا کر سکوں گا۔ تم چاہو تو مجھے آزما سکتی ہو۔" وہ پُراعتماد لہجے میں بولے۔

"اب آپ عمر کے اس حصے میں آ گئے ہیں کہ لغزشیں زیب نہیں دیتی ہیں۔ آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ اب آپ کبھی نہیں بہکیں گے۔"

"تو تمہارا دل اب تک مجھ سے صاف نہیں ہوا ہے۔" وہ ہنس کر بولے۔ "دیکھو......... میں ایک ہی ٹھوکر سے سنبھل گیا ہوں۔ اگر میں ضد میں آ جاتا تو تم میرا کیا بگاڑ سکتی تھیں۔ میں نے ایک بینک میں اکاؤنٹ کھول رکھا ہے جو میرا نجی اکاؤنٹ ہے۔ اس میں میری دس لاکھ روپے کی رقم جمع ہے۔ یہ وہ رقم ہے جو ٹیکس سے بچائی ہوئی ہے۔ اگر مجھے عیاشی کرنا ہوتا تو کیا میں اس رقم سے نہیں کر سکتا تھا؟ جبکہ عیاشی کے لئے چند ہزار روپے بھی کافی ہوتے ہیں۔ میں چاہتا تو تم سے الگ ہو کر زندگی گزار سکتا تھا۔ مگر اس ٹھوکر اور تمہاری محبت نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اسی محبت کی وجہ سے تو میں بندھ گیا ہوں۔"

"میں دو چار دن گھر میں نظر بند ہو کر رہنا چاہتی ہوں۔" وہ بولیں۔ "آپ وکیل سے کہہ کر کاغذات تیار کروائیں۔ میں آئندہ ہفتے ان پر دستخط کر دوں گی۔"

"تم دو چار دن گھر میں نظر بند کیوں رہو گی؟ کیا دفتر بھی نہیں آؤ گی؟" افضال احمد نے تعجب سے پوچھا۔

"اس لئے کہ میرے دل میں ہیبت سی بیٹھ گئی ہے۔ میں حد سے زیادہ خوفزدہ ہو گئی ہوں۔ میرا دل و دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔ میں کل ہی ڈاکٹر کو بلا کر مسکن گولیاں لکھوا کر کھا

کر سو جانا چاہتی ہوں۔ شاید اس طرح میرا دماغ ٹھکانے آ جائے اور میں شاید کسی حد تک اپنے آپ پر قابو پا لوں۔"

"تم کل تک نارمل ہو جاؤ گی۔" افضال احمد نے ان کی پشت تھپتھپائی۔ "کوشش کر کے اس اندوہناک واقعہ کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرو۔"

"کیا آپ کے نزدیک یہ سانحہ کوئی معمولی سانحہ ہے جو میں دو ایک دن میں نارمل ہو جاؤں گی۔ نہیں افضال نہیں .... یہ ایسا بدترین اور المناک سانحہ ہے کہ میں اسے آخری سانس تک بھول نہیں سکتی ہوں۔ ایسی بربریت اور درندگی کا سلوک مجھ سے کیا گیا ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وہ منظر اب بھی میری نظروں میں بار بار گھوم رہا ہے اور مجھے دنیا کے ہر مرد سے نفرت ہو گئی ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آپ سے بھی نفرت ہو جائے گی۔"

☆======☆======☆

شکیلہ کچھ دنوں سے سجاد کی حرکات و سکنات کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ ایک تو وہ گھر دیر سے آ رہا تھا اور کچھ کچھ پُراسرار سا لگ رہا تھا اور پھر وہ اس طرح سے خوش خوش نظر آ رہا تھا جیسے اس نے کوئی بہت بڑی دولت پا لی ہو۔ ایک روز اس کا جی اکتایا تو وہ بوہری بازار خریداری کے لئے چلی گئی۔ اس نے اپنی کار بوہری بازار میں پارک کی اور زیبی کی طرف ٹہلتی ہوئی نکل گئی۔

وہ چلتے چلتے ٹھٹک کے رک گئی۔ اس نے افضال احمد اور سجاد کو چائنیز ریستوران میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ کچھ سمجھی اور کچھ نہیں سمجھی۔ بہرکیف اسے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا تھا۔ اس کا ذہن بڑی سرعت سے سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ وہ ان دونوں کی باتیں سننا چاہتی تھی۔ اس کے اندر تجسس اور سراغ رسی کی خواہش پیدا ہو رہی تھی جسے وہ عملی جامہ پہنانا چاہتی تھی۔

اس کے ذہن میں ایک تدبیر کے آتے ہی اس نے سوچا کہ اس تدبیر پر عمل کر کے دیکھنا چاہئے۔ اس نے سامنے والی دکان میں داخل ہو کر ایک سیاہ رنگ کا برقع خرید کر دکان میں کھڑے ہو کر پہن لیا۔ نقاب سے اس نے اپنا نصف چہرہ ڈھک لیا۔ برقعے کی دکان سے باہر آ کر وہ چشمے کی چھوٹی سی دکان میں داخل ہو گئی۔ تاریک شیشوں کا چشمہ لے کر پہن کر دیکھا تو وہ بالکل پہچانی نہیں جا رہی تھی۔

چند لمحوں کے بعد اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس ہوٹل میں قدم رکھا جس

ہوٹل میں سجاد اور افضال احمد داخل ہوئے تھے۔ اس کا وسیع و عریض ہال نصف سے زیادہ بھرا ہوا تھا۔ اس نے ایک جگہ کھڑے ہو کر ہال کا جائزہ لیا۔ اس نے سجاد اور افضال کو ایک گوشے میں بیٹھا پایا۔ ان کے آس پاس کی میزیں خالی پڑی تھیں۔ سجاد اپنا بریف کیس کھول کر اس میں سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکال رہا تھا۔ وہ اس میز کی طرف بڑھی جو ان دونوں کی میز کے بالکل پاس تھی۔ افضال احمد کی نگاہ جو اس کی طرف اٹھی تو اس کے سراپا پر جم کر رہ گئی۔ وہ شکیلہ کو بالکل پہچان نہ سکے تھے۔ وہ شکیلہ کو کوئی اور ہی عورت سمجھ رہے تھے۔ شکیلہ کے بدن کے نشیب و فراز برقعے کے اندر سے جیسے چیخ رہے تھے۔ ان کی نگاہ شکیلہ پر جیسے جم کر رہ گئی تھی۔

سجاد نے بریف کیس سے لفافہ نکال کر افضال احمد کی طرف دیکھا تو اس نے انہیں بڑی محویت سے مخالف سمت دیکھتا پایا۔ افضال احمد کی نگاہوں میں معنی خیز چمک دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ افضال احمد کسی قیامت کو دیکھ رہے ہیں۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا تو اس کا اندازہ درست نکلا۔ وہ واقعی ایک تراشیدہ مجسمہ میں کھوئے ہوئے تھے۔

سجاد کی تجربہ کار نظریں بھی فریب کھا گئی تھیں۔ وہ بھی شکیلہ کو پہچان نہیں سکا تھا۔ وہ شکیلہ کو دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ وہ چہرہ اور اس کے نقوش دیکھنے کے لئے کسی بے آب ماہی کی طرح تڑپ سا گیا تھا۔ ایک تو نصف چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا اور آنکھوں کو چشمے نے چھپا رکھا تھا۔ اس نے سجاد کو اور پیاسا بنا دیا تھا۔ سجاد دیکھ رہا تھا کہ سراپا جو برقعے میں چھپا ہوا ہے وہ بول رہا ہے اور بھرپور بدن کی شراب چھلکتی ہوئی سی محسوس ہو رہی ہے اور وہ جس انداز سے بل کھاتی' لہراتی اور لچکتی ہوئی قریب والی میز کی طرف بڑھ رہی تھی اس نے سجاد کے دل پر بجلی سی گرا دی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ یہ مجسمہ شکیلہ سے کہیں بڑھ کر فتنہ خیز ہے۔ کسی وقت شکیلہ کا نعم البدل ثابت ہو سکتا ہے۔

افضال احمد نے اس بت طناز کے سحر سے نکل کر سجاد کی طرف دیکھا تو اسے اس بت طناز کے سحر سے مبہوت پایا۔ انہوں نے اپنا منہ سجاد کے کان کے پاس لے جا کر سرگوشی کی مگر ان کی نظروں کی گرفت میں تو شکیلہ کا سراپا جکڑا ہوا تھا۔ "سجاد! کیا دیکھ رہے ہو؟ لاکھوں میں ایک ہے نا؟"

"اس سے کس کافر کو انکار ہے۔" سجاد نے چونک کر آہستگی سے جواب دیا۔ "ایسے انمول شاہکار تو صدیوں میں ایک نظر آتے ہیں۔"

"اس نے تو تمہاری بہن شکیلہ کے حُسن کو بھی مات کر دیا ہے۔" افضال احمد کے

منہ سے غیر ارادی طور پر نکل گیا تھا۔ انہوں نے سجاد پر یہ ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ شکیلہ کے راز سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ وہ انجان تھے اور انجان ہی رہنا چاہتے تھے۔ ان کے منہ سے غیر ارادی طور پر جو جملہ نکل گیا تھا اس پر انہیں کوئی ندامت یا تاسف نہیں ہوا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سجاد ایسے بے غیرت لوگ ایسی باتوں کا برا نہیں مانتے ہیں۔

"اس کا جیسا سراپا ہے چہرہ بھی ویسا ہی حسین اور تیکھا ہو گا۔ آخر اسے اپنا چہرہ چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا حسین چہرے چھپانے کے لئے ہوتے ہیں؟"

"اس ابہام ہی نے تو اس کی شخصیت میں بے پناہ کشش اور سحر پیدا کر دیا ہے۔" افضال احمد کہنے لگے۔ "قدرت نے عورت بھی کیا چیز بنائی ہے۔ لگتا ہے کہ اس کے کارخانے میں حسین لڑکیوں اور عورتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس بت طناز کو دیکھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ قدرت نے اسے نو بہ نو تیار کر کے آب کوثر میں نہلا کر ابھی ابھی دنیا میں بھیج دیا ہے۔ قیامت ہے قیامت۔" افضال احمد نے اپنی بات ختم کر کے ایک سرد سی آہ بھری۔

شکیلہ نے میز کی طرف بڑھتے ہوئے ان دونوں کو ندیدوں کی طرح گھورتے اور معنی خیز انداز سے سرگوشیاں کرتے ہوئے پایا تو وہ لمحے کے لئے گھبرا سی گئی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان دونوں نے اسے پہچان لیا ہو۔ اس خیال کے آتے ہی وہ پسینہ پسینہ ہو گئی تھی۔ حالانکہ ہال ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ مگر جب وہ ان کے سامنے سے گزری اور ان دونوں میں سے کسی نے اس کا نام لے کے نہ تو پکارا تھا اور نہ ہی پہچانا تھا وہ سمجھ گئی تھی کہ دونوں ہی شاطر دھوکا کھا گئے ہیں۔ وہ قریب والی میز پر ان دونوں کی طرف پشت کر کے بیٹھ گئی تھی۔ ان دونوں کی پشت بھی اس کی طرف تھی۔ کیوں کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھنے کے بجائے برابر بیٹھے تھے۔

ویٹر آیا تو شکیلہ نے اسے چکن کارن اور چکن رائس کا آرڈر دیا۔ جب ویٹر چلا گیا تو اس نے سوچا کہ اسے محتاط ہو بیٹھنا اور سوپ پینا ہو گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سجاد اس کی صورت دیکھنے کے لئے کسی بہانے اچانک اس کے سامنے نہ آ جائے۔ اس نے اپنے کان اپنی پشت کی سمت لگا دیئے۔

سجاد نے افضال احمد کی طرف لفافہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تصویروں کا نتیجہ دیکھئے کس قدر واضح اور شاندار آیا ہے؟"

افضال احمد نے اس کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا۔ انہوں نے لفافے میں سے

تصویریں نکال کر بڑی احتیاط سے ایک ایک کر کے دیکھنا شروع کیں۔ وہ ایک ایک تصویر دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے اور ایک ایک تصویر کی داد دیئے جا رہے تھے۔ "کیا شاندار نتیجہ ہے؟ فوٹوگرافر نے کمال کر دیا۔"

"وہ فوٹوگرافر کہاں تھے۔ وہ تو بدمعاش تھے' بدمعاش۔ بہرکیف انہوں نے پھر بھی میرے کہنے پر پوری طرح عمل کیا اور تصویریں بہت اچھی بنا ڈالیں۔"

افضال احمد نے تصویریں لفافے میں رکھ کر نیگیٹوز نکالیں اور اس پر سرسری نظر ڈالی۔ پھر انہیں لفافہ میں رکھ کر لفافہ اسے واپس کر دیا اور بولے۔ "تم انہیں اپنے ہی پاس سنبھال کر رکھو۔ ہاں' اس واردات میں کسی قسم کی دشواری یا پریشانی تو پیش نہیں آئی ہے؟"

"خلافِ توقع منصوبہ بڑی آسانی سے اور بخیر و خوبی انجام پا گیا تھا۔ آخر کیوں نہ ہوتا۔ وہ بدمعاش بھی معمولی نہ تھے۔ وہ تو اپنی جان پر کھیل جانے کے لئے بھی تیار تھے۔ اس لئے کہ انہیں صرف مالی فائدہ ہی نہیں بلکہ دوسرا فائدہ بھی تو حاصل ہو رہا تھا۔ سو انہیں فائدہ ہی فائدہ ہو گیا تھا۔"

"ایک کام تو بخیر و خوبی انجام پا گیا۔ ورنہ میں دل میں بہت ڈر رہا تھا کہ کہیں سارا منصوبہ چوپٹ نہ ہو جائے۔"

"دوسرا کام انجام دینے کے لئے میں دفتر کب پہنچوں؟ میرے خیال میں کل کا دن مناسب رہے گا۔ آپ کل دفتر نہ آئیں تو اچھا ہو گا۔"

"تمہیں اس کے لئے دو چار دن انتظار کرنا ہو گا۔ بہت ممکن ہے کہ اس کی نوبت ہی نہ آئے؟" افضال احمد کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیوں .... اس کی نوبت کس لئے نہیں آئے گی؟ کیا آپ کو اپنی بیوی پر رحم آ گیا ہے؟"

"کل کے واقعہ سے وہ اس قدر دہشت زدہ ہو گئی ہے کہ اس نے کچھ دنوں تک گھر سے نکلنے سے صاف انکار کر دیا ہے اور پھر وہ اس بات کے لئے بھی تیار ہو گئی ہے کہ وہ سب کچھ جو کچھ میرا تھا اور اس کے نام ہو گیا ہے اسے وہ میرے نام لکھ دے گی۔ اب، دو چار دنوں کی بات ہے۔ جو میں نے اپنی حماقت سے کھویا تھا اسے جلد ہی دوبارہ پانے والا ہوں۔ میری زندگی میں پھر سے بہار کے دن آنے والے ہیں۔"

"مبارک ہو!" سجاد نے بڑی گرم جوشی سے افضال احمد سے مصافحہ کیا۔ "پس اس

سے ثابت ہوا کہ یہ دنیا گول ہے۔"

"شکریہ!" افضال احمد کہنے لگے۔ "ہماری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ پھر سے وہ سنہرا دور لوٹ کر آنے والا ہے جس کے لئے ہم ترس رہے تھے۔ اب وہ سب کچھ میرے نام ہونے کی دیر ہے۔ پھر دیکھنا میں کیا کرتا ہوں۔ اس ناہید کو اپنی زندگی سے کس طرح نکال کر پھینکتا ہوں۔ اس کمینی عورت نے جس طرح میری بے عزتی کی اور مجھے جو اذیت پہنچائی میں اسے ساری زندگی بھول نہیں سکتا ہوں۔ میں بھی اس سے کہیں زیادہ اذیت پہنچاؤں گا۔ وہ ساری زندگی کسی خارش زدہ کتیا کی طرح سڑکوں پر ماری ماری پھرتی رہے گی۔ میں تو کل تک ایک جہنم میں جلتا رہا ہوں۔"

"مگر ایک بات میری سمجھ میں اب تک نہیں آئی ہے کہ آپ کی شاطر بیوی سب کچھ آپ کے نام لکھ دینے کے لئے کس طرح تیار ہو گئی؟"

"اس کے لئے مجھے ڈرامہ کرنا پڑا تھا۔ کل لوہا اس قدر گرم تھا کہ میں نے ایک ہی ضرب لگائی۔ لوہا فوراً ہی نرم پڑ گیا۔"

"آپ کو کون سا ڈرامہ اسٹیج کرنا پڑا تھا؟ کیا آپ اداکاری کے فن سے بھی واقف ہیں؟" سجاد مسکرایا۔

"ہر مرد اور ہر شوہر ایک اداکار ضرور ہوتا ہے۔ اس کے اندر ایک اداکار پناہ لئے ہوئے ہوتا ہے۔ کل میں نے اسے مزید دہشت زدہ کیا' آپ کی ہیبت اس قدر بٹھا دی کہ وہ حواس باختہ ہو گئی۔ پھر میں نے اسے اپنے اعتماد میں لیا۔ محبت کا فریب دیا۔ عورت محبت کے فریب میں بہت جلد آ جاتی ہے۔ میں نے اس پر اپنا سکہ کچھ اس طرح جمایا ہے کہ وہ پوری طرح میرے جال میں آ گئی ہے۔ اسے اپنی عزت بہت پیاری ہے۔ اسی لئے تو وہ میرے نام سب کچھ لکھ کر دے رہی ہے تاکہ کل آپ اسے بلیک میل نہ کر سکیں۔ وہ اس بھرے میں آ گئی۔"

"دو چار دن میں وہ نارمل ہو جائے گی۔ نارمل ہو جانے کے بعد اس کی نیت میں فتور آ گیا تو آپ کیا کریں گے؟"

"میں اسی دن کے لئے تو ان نیگیٹوز اور تصویروں کو آپ کے پاس رکھوا رہا ہوں۔ آپ اسے حفاظت سے اپنے ہی پاس رکھیں۔ اگر اس کمینی عورت کی نیت میں کوئی فتور آیا تو پھر آپ کو میدان میں آنا ہو گا۔ جیمز بانڈ زیرو زیرو سیون کی طرح۔"

"آپ اس کی چنداں فکر نہ کریں۔ ہم دونوں کے درمیان کوئی عارضی معاہدہ تو

نہیں۔ میں ہر وقت آپ کے حکم اور اشاروں کا منتظر رہتا ہوں۔"

"کل کے کارنامہ پر کس قدر رقم خرچ ہوئی؟ وہ رقم مجھ سے لیں۔" افضال احمد نے جیب سے بٹوہ نکالتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے شرمندہ کیوں کر رہے ہیں؟ اس پر صرف دو ہزار کی رقم خرچ آئی ہے۔ کیا آپ مجھے اس خدمت سے بھی محروم رکھنا چاہتے ہیں۔"

"مگر یہ سب کچھ میری ایما اور منصوبے کے مطابق ہوا ہے لہٰذا اس کا خرچ بھی میرے ذمہ ہونا چاہئے۔ بدقسمتی سے میرے پاس بڑی رقم نہیں ہے۔ بینک میں صرف دس ہزار روپے پڑے ہیں۔ میرا دل تو یہ کر رہا ہے کہ اس خوشی میں آپ کو ایک لاکھ روپے انعام دوں۔" افضال احمد بولے۔

"مجھے دس لاکھ روپے کا چیک مل جائے گا تو میں اسے ہی اپنا انعام سمجھوں گا۔ میں نے یہ سب کچھ آپ ہی کے لئے تو کیا تھا؟" سجاد انکساری سے بولا۔

شکیلہ ان دونوں کی باتیں سن سن کر سُن ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ بیگم ناہید افضال احمد کے ساتھ کل کون سا اور ایسا واقعہ پیش آ چکا ہے جو اندوہناک تھا۔ کچھ باتیں اس کی سمجھ میں آئی تھیں اور کچھ نہیں آ رہی تھیں۔ دو دن پہلے رات سجاد ایک بجے آیا تھا۔ بہت خوش تھا۔

اس کے بارہا پوچھنے پر بھی سجاد نے اسے اپنی بے پایاں خوشی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ بڑی صفائی سے ٹال گیا تھا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ اصل بات کیا ہے۔

اس کے لئے بیٹھنا دوبھر ہو رہا تھا۔ ویٹر اس کے لئے چکن کارن سوپ لے کر آیا تو وہ پیئے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے پرس سے دس دس کے دو نوٹ نکال کر میز پر رکھ دیئے اور بولی۔ "سوپ اور رائس میری طرف سے .... باقی رقم تم رکھ لو۔"

پھر اس نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ وہ تیزی کے ساتھ بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ افضال احمد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور سجاد سے کہا۔ "مسٹر سجاد! یہ کافر تو جا رہی ہے۔ مزا تو جب ہے جب آپ اسے مسلمان بنا کر دکھائیں۔" ان کا انداز چیلنج کا سا تھا۔

"اچھا۔" سجاد نے جیسے ان کا چیلنج قبول کر لیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر تیزی سے اس کی طرف لپکا اور شکیلہ کو دروازے کے پاس جا لیا۔ "سنئے!" سجاد کی آواز اس کے کانوں

میں گرم گرم سیسے کی طرح پگھلنے لگی۔ اس کے دل کی حرکت جیسے رک گئی تھی۔ اس نے پلٹ کر سجاد کی طرف دیکھا تو سجاد بڑی شائستگی سے بولا۔ "اگر آپ کے ساتھی نہیں آئے ہیں تو.......... آپ ہمارے ساتھ لنچ کر لیں۔ ہم آپ کو کمپنی دے سکتے ہیں؟"

وہ اپنی آواز بدل کر پھنکاری۔ "شٹ اپ' آپ کو شرم نہیں آتی ہے؟"

"اس میں شرم کی کیا باتی ہے؟" سجاد نے بڑی ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں ایک دوست کی حیثیت سے آپ کو مدعو کر رہا ہوں۔"

شکیلہ نے لمحے کے لئے دل میں سوچا کہ اگر وہ اسی طرح کھڑی باتیں کرتی رہی تو وہ زیادہ دیر تک اپنی بدلی ہوئی آواز پر اختیار نہ رکھ سکی اور پھر سجاد اسے پہچان لے گا۔ اس قدر قریب سے سجاد کو دھوکا دینا آسان نہیں تھا اور پکڑے جانے کا خوف و خدشہ تھا۔ یہ سوچ کر اس نے سجاد کی بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ تیزی سے گھومی اور بجلی کا کوندا بن کر باہر آ گئی۔ سجاد کھڑا منہ دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ اس کا تعاقب کرے۔

شکیلہ نے کوئی پچیس تیس قدموں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد پلٹ کر دیکھا کہ کہیں سجاد اس کے تعاقب میں تو نہیں آ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا کہ سجاد اس کے تعاقب میں نہیں ہے۔ پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی بوہری بازار کی جانب گھوم گئی۔ اس نے بوہری بازار اپنی گاڑی کے پاس پہنچ کر اپنا برقعہ اور چشمہ نکالا اور اسے گاڑی کی ڈگی میں رکھ لیا۔ دوسرے لمحے اس کی کار بڑی تیزی سے افضال احمد کے گھر کی طرف جا رہی تھی۔

بیگم ناہید افضال احمد اپنے کمرے میں حسرت و یاس کی تصویر بنی بیٹھی تھیں۔ شکیلہ ان کا زرد چہرہ دیکھتے ہی اچھل پڑی تھی۔ وہ اسے کسی مُردے سے بھی بدتر نظر آ رہی تھیں۔ وہ شکیلہ کو دیکھتے ہی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں۔ اس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ وہ شکیلہ کو اپنا محسن اور دوست سمجھتی تھیں۔ ان کے نزدیک شکیلہ ایک اور ہستی تھی جو اُن کی سچی ہمدرد تھی۔

اُن کے آنسوؤں نے شکیلہ کا سینہ بھگو دیا تھا۔ جب آنسوؤں کا سیلاب رکا تو انہوں نے سسکیوں کے درمیان اس روز کا واقعہ سنایا۔ اس روز کا واقعہ سن کر شکیلہ سکتے میں آ گئی۔ اب ہوٹل میں افضال احمد اور سجاد کے درمیان ہونے والی تمام باتیں اس کی سمجھ

میں آ گئی تھیں۔ اب کچھ بھی اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ سجاد اس قدر ذلیل اور کمینہ شخص ثابت ہو گا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ سجاد کی اس حرکت پر اس کا خون نس نس میں ابلتا رہا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی اور اسی وقت جا کر سجاد کو شوٹ کر دے۔

شکیلہ نے کچھ دیر کے بعد اچانک ان سے پوچھا۔ "کیا یہ سچ بات ہے کہ آپ ساری دولت جائیداد اور کاروبار اپنے شوہر کے نام کر رہی ہیں؟"

"یہ بات تمہیں کس نے بتائی؟" وہ بڑے زور سے اچھل پڑیں۔ ان کی بھیگی آنکھوں میں حیرانی سی بھر گئی۔

"پہلے آپ میری بات کا جواب دیں کہ.......... کیا یہ بات صحیح ہے؟ آپ چار پانچ دن کے اندر اندر اپنے شوہر کے نام سب کچھ لکھ رہی ہیں؟"

"ہاں۔" انہوں نے مجرمانہ انداز سے سر ہلا کر اقرار کیا۔ "یہ بات بالکل سچ ہے۔ اس میں ذرّہ برابر بھی مبالغہ نہیں ہے۔"

"مگر آپ یہ سب کچھ کس لئے کر رہی ہیں؟" شکیلہ نے ناراضگی سے کہا۔ "آپ نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا۔ میں نے آپ کو یہ سب کچھ اس لئے نہیں سونپا.........."

وہ شکیلہ کی بات کے درمیان میں بولیں۔ "میں ایک بہت بڑی مجبوری' اپنی اور اس گھر کی عزت کی خاطر ایسا کر رہی ہوں۔"

"مگر سب کچھ اپنے شوہر کے نام کرنے کا عزت سے کیا تعلق ہے؟ کیا اس طرح آپ کے ماتھے پر سے بدنامی کا داغ مٹ جائے گا؟"

"سجاد مجھے بلیک میل نہیں کر سکے گا۔ اس لئے کہ میرے پاس کچھ بھی نہ ہو گا۔ اسے بلیک میل کر کے فائدہ بھی کیا ہو گا؟"'

"وہ آپ کو نہیں تو آپ کے شوہر کو بلیک میل کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ آپ اپنے شوہر اور شوہر کے گھر کی عزت ہیں۔ وہ ان تصویروں اور آپ کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ساری زندگی دونوں ہاتھوں سے آپ کے شوہر کو لوٹتا رہے گا۔"

"پھر میں کیا کروں؟" انہوں نے شکیلہ کی طرف اس بے بس ہرنی کی طرح دیکھا جو چاروں طرف سے ناامید ہو گئی ہو۔

"آپ کو کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے' اسے غور سے سن کر فیصلہ کریں۔ خدا کا شکر ہے کہ اتفاقیہ اور بروقت میں پہنچ گئی ورنہ آپ ان دونوں شیطانوں کے ہاتھوں نہیں

بچتیں۔" پھر شکیلہ نے انہیں تفصیل سے سارا واقعہ اور تمام گفتگو من و عن سنا دی۔

شکیلہ کی زبانی یہ سارا واقعہ سن کر انہیں جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ ان پر کتنے ہی لمحوں تک سکتہ سا چھایا رہا۔ اب انہیں معلوم ہوا تھا کہ یہ سارا منصوبہ اور کارستانی کس کی ہے۔ انہیں یہ جان کر کتنا دکھ اور صدمہ ہو رہا تھا۔ اتنا دکھ اور صدمہ تو ان لٹیروں کے ہاتھوں لٹ کر نہیں ہوا تھا۔ وہ تو سجاد کو ننگ انسانیت اور انتہائی ذلیل آدمی سمجھ رہی تھیں۔ مگر ذلیل تو ان کے شوہر تھے۔ اس شخص نے تو ذلالت کی انتہا کر دی تھی۔ وہ نفرت' صدمے اور غصے سے پیچ و تاب کھاتی ہوئیں الماری کی طرف بڑھیں۔ الماری کے خفیہ خانے سے پستول نکال کر تکیئے کے نیچے رکھنے لگیں تو شکیلہ کے بدن پر سنسنی دوڑ گئی۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ "یہ پستول کس لئے ہے؟"

وہ دانتوں سے ہونٹ کاٹتی ہوئی بولیں۔ "میں نہ صرف اس پستول سے افضال کو قتل کر دوں گی بلکہ خود کو بھی گولی مار کر مر جاؤں گی۔ میں اس ذلیل اور مکار شخص کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس دنیا میں زندہ رہے۔"

"آپ.......... اپنے شوہر کو قتل کر دیں گی اور اپنے ہاتھ خون سے رنگ لیں گی؟" شکیلہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "آپ..........!"

"تمہی بتاؤ شکیلہ! کیا یہ شخص اس قابل ہے کہ اسے زندہ چھوڑ دیا جائے۔ معاف کر دیا جائے؟ کیا کوئی شخص ایسا ہو گا جو اپنی بیوی کو دولت کے حصول کی خاطر بھیڑیوں کے آگے ڈال دے؟ ایسا بے رحم' سفاک اور درندہ صفت شخص زندہ رہنے اور انسان کہلانے کا مستحق ہے؟"

"آپ سچ کہتی ہیں۔" شکیلہ نے گردن ہلا کر اقرار کیا۔ "مگر اس طرح مارنے سے حاصل کیا ہو گا۔ یہ تو ایسے نابکار اور ناہنجار شخص کے لئے سزا نہ ہوئی۔ یہ موت ان کے لئے کسی نعمت سے کم نہ ہو گی۔ ایک گولی ان کے سینے میں داغ دینے سے وہ ایک لمحہ میں مر جائیں گے۔ کوئی تکلیف اور اذیت نہ ہو گی۔ بلکہ ساری زندگی ہم اس جرم کی سزا بھگتتے رہیں گے۔ اس لئے کہ قانون ہمیں کبھی اور کسی بھی صورت میں معاف نہیں کرے گا۔"

"پھر میں کیا کروں؟ کیا میں خودکشی کر لوں یا پھر خدا پر چھوڑ دوں؟ کیا انہیں اپنے کئے کی سزا دنیا میں مل جائے گی؟"

"میں چاہتی ہوں کہ آپ سسکا سسکا کر ماریں۔ اس قدر اذیت پہنچائیں کہ وہ

ساری زندگی کرب اور اذیت سے تڑپتے رہیں۔ وہ موت مانگیں تو موت نہ ملے۔ انہیں معلوم ہو کہ جو عورت محبت کرنا جانتی ہے اسے انتقام لینا بھی آتا ہے۔" شکیلہ نفرت و حقارت کے لہجے میں بولی۔

"یہ سب میں کس طرح کر سکتی ہوں؟ اس موذی سانپ جیسے شخص کو میں کس طرح اذیت پہنچا سکتی ہوں؟" انہوں نے پوچھا۔

"یہ سب کچھ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ آپ انہیں ہر قسم کے اختیارات سے محروم کر دیں۔ کسی پالتو کتے کی طرح انہیں گھر پر رکھیں۔ دفتر میں قدم رکھنے نہ دیں۔ ہر مہینے جیب خرچ کے لئے پچاس روپے سے زیادہ نہ دیں۔ انہیں گھر کے کام کاج اور بچوں کو اسکول کالج سے لانے لے جانے پر مامور کر دیں۔"

"اس سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ وہ میرا دباؤ قبول نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنے ایک نجی اکاؤنٹ میں دس لاکھ کی رقم رکھی ہوئی ہے۔ وہ میرے اس سلوک پر فوراً ہی الگ ہو کر اپنا گھر بسا لیں گے۔ اپنا کاروبار اور نئی زندگی شروع کر دیں گے۔ میرے انتقام کی تمام حسرتیں میرے دل میں رہ جائیں گی۔"

"یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ ان کے بینک اکاؤنٹ میں دس لاکھ روپے کی بڑی رقم موجود ہے؟"

انہوں نے شکیلہ کو اس رات والی گفتگو سنائی تو شکیلہ بے اختیار ہنس پڑی۔ "یہ سفید جھوٹ انہوں نے آپ کو اپنے اعتماد میں لینے کے لئے کہا تھا۔ ان کے پاس دس ہزار سے زیادہ رقم نہیں ہے۔ وہ رقم میں ان سے کل ہی کسی نہ کسی بہانے وصول کر لوں گی۔" پھر شکیلہ نے انہیں ہوٹل والی گفتگو سنائی۔

"میں اس وقت تک ان کے اور سجاد کے خلاف کوئی قدم اٹھا نہیں سکتی ہوں تاوقتیکہ وہ تصویریں اور ان کے نیگیٹوز میرے ہاتھ نہیں لگ جاتے۔"

"اس کے بغیر تو انہیں ذلیل و خوار کیا بھی نہیں جا سکتا ہے اور نہ ہی انتقام لینے کی آرزو پوری ہو سکتی ہے۔" شکیلہ توقف کر کے ذہن پر زور دے کر کچھ سوچنے لگی۔ چند لمحوں کے بعد بولی۔ "میں اپنی پوری پوری کوشش کروں گی کہ وہ تصویریں اور نیگیٹوز سجاد سے حاصل کر کے آپ تک پہنچا دوں۔"

وہ شکیلہ کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ایک ٹک اس کی آنکھوں میں جھانکتی رہیں۔ محبت' ممنونیت اور چاہت کے تمام جذبوں کے ساتھ' پھر ان کی آنکھیں بھر

آئیں۔ انہوں نے شکیلہ کے ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگایا اور بڑی عقیدت سے شکیلہ کے ہاتھوں کو چوم لیا جیسے وہ کوئی اعلیٰ و ارفع ہستی ہو۔ پھر وہ چومتی رہیں۔ چومتی رہیں۔ اس کے قدموں میں گر کر بولیں۔ "اگر تم نے یہ کرم مجھ پر کیا تو میرے تمام بچے بھی ساری زندگی تمہارے احسان مند رہیں گے۔"

"یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟" شکیلہ فوراً ہی ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور انہیں شانوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ "آپ مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔"

"قدرت نے تمہیں میرے لئے فرشتہ بنا کر بھیجا ہے۔ کاش! میں تمہارے احسانات کا بدلہ چکا سکتی۔ کوئی کام آ سکتی؟"

"میں فرشتہ نہیں عورت ہوں۔ مجھے اس بات پر ناز ہے کہ خدا نے مجھے عورت بنایا ہے۔ دنیا میں عورت سے عظیم شے کوئی اور نہیں ہے۔ یہ عورت ہی ہے جس نے خدا کے وجود اور اس کی عظمت کا احساس دلایا ہے۔ عورت نہ ہوتی تو یہ دنیا نہ ہوتی۔ عورت محبت ہے۔ میں بھی محبت ہوں۔ وہ جو صحیح معنوں میں عورت ہو وہ کبھی کسی عورت کو دکھی اور پریشان نہیں دیکھ سکتی ہے۔ آپ مجھے اپنا فرض ادا کرنے دیں۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کروں؟ افضال کا اصل اور گھناؤنا چہرہ شاید مجھے قابو میں رہنے نہ دے؟"

"آپ کو اس وقت تک اپنے آپ کو قابو میں رکھنا ہو گا تاوقتیکہ تصویریں ہاتھ نہ لگ جائیں۔ اپنے طرز عمل سے انہیں کسی قسم کا شک و شبہہ نہ ہونے دیں۔ انجان بنی رہیں بلکہ اپنی جھوٹی محبت ان پر نچھاور کر دیں۔ اپنی محبت سے جس قدر بے وقوف بنا سکتی ہیں بنائیں۔ کاغذات پر دستخط نہ کریں بلکہ ٹالتی رہیں۔ سب سے بہتر تو یہی ہے کہ آپ گھر سے ہی نہ نکلیں۔ میں دو ایک دن میں وہ تصویریں آپ کو پہنچا دوں گی۔"

"شکیلہ' خوب سوچ سمجھ کے قدم اٹھانا۔ مجھے اپنی جان اور عزت سے زیادہ تمہاری زندگی اور سلامتی عزیز ہے۔"

"آپ میری بالکل پرواہ نہ کریں۔ یوں بھی میں نے اپنے خوابوں کے چکر میں اپنی زندگی ایک ذلیل اور درندہ صفت انسان کے پاس رہن رکھ دی ہے۔ میں خود نہیں جانتی کہ اس سے نجات پانے کے لئے مجھے کیا قیمت ادا کرنا ہو گی؟"

"ذرا یہ بلا میرے سر سے ٹل جانے دو' پھر دیکھو میں تمہارے لئے کیا کرتی ہوں؟ میری بڑی تمنا ہے کہ تمہارے لئے بہت کچھ کروں؟"

"آپ میرے لئے صرف دعا کیجئے۔" شکیلہ جذباتی ہو کر بولی۔ "مجھے دعاؤں کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہے۔"

شکیلہ نے کچھ دیر کے بعد ان کے ہاں سے افضال احمد کو دفتر ٹیلی فون کیا تو وہ دفتر میں مل گئے تھے۔ افضال احمد کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ شکیلہ کا فون ہے' شکیلہ نے ان سے شام کے وقت اس ہوٹل کے کمرے میں ملنے کا وقت طے کیا جو راز و نیاز کے لئے مخصوص تھا اور انہوں نے فائدہ اٹھانے کے لئے کرائے پر لے رکھا تھا۔ وہ کئی بار چیک کی وصول یابی کے لئے وہاں جا چکی تھی۔ شکیلہ ان سے ملاقات کر کے ان کی آخری رقم پر بھی ہاتھ صاف کرنا چاہتی تھی۔

افضال احمد شام کے وقت اس کمرے میں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے شکیلہ کے انتظار میں جیسے مرے جا رہے تھے' پل پل ان کے لئے صدی اور اذیت ناک بنتا جا رہا تھا۔ ان کے سینے میں شکوے شکایتوں کا انبار تھا جو وہ شکیلہ کے حضور پیش کر دینا چاہتے تھے اور ان کی نظروں میں شکیلہ کا چہرہ اور سراپا گھوم رہا تھا اور انہیں بیتے ہوئے دن یاد آ رہے تھے۔ بجلی بھرے بدن کی آن انہیں کسی پھنکارتے سانپ کی طرح ڈستی محسوس ہو رہی تھی۔

شکیلہ دانستہ مقررہ وقت سے کوئی ایک گھنٹے بعد پہنچی تھی۔ انہوں نے شکیلہ کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہے تھے۔ یہ کتاب ان کے لئے نئی نہیں تھی۔ وہ اسے کئی بار پڑھ چکے تھے۔ مگر انہیں ایسا محسوس ہو رہا کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھنا تو دور کی بات ہے اسے چھوا تک نہیں ہے۔ اس کی حشر سامانیاں دیکھ کر سارے شکوے شکایتیں ڈھل کر رہ گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے بازو فضا میں پھیلا دیئے۔ مگر شکیلہ روٹھے ہوئے انداز میں ایک کرسی پر جا بیٹھی۔

وہ کسی پالتو کتے کی طرح اس کے قدموں میں آ بیٹھے اور اس کے ہاتھ اپنے منہ میں لئے تو انہیں لگا کہ انگارے دہک رہے ہوں۔ شکیلہ نے منہ پھیر لیا تو وہ چونک کر بولے۔

"تم اور مجھ سے ناراض ہو۔ جب کہ مجھے تم سے ناراض ہونا چاہئے اور مجھے تم سے ایک نہیں ہزار شکایتیں ہیں۔"

وہ یک لخت ان کی طرف منہ پھیر کر بولی۔ "کیسی شکایتیں؟ کس بات کی شکایتیں؟ اگر آپ کی ایک ہزار شکایتیں ہیں تو میری بھی دو ہزار شکایتیں ہیں۔ آپ نے میرے ساتھ جو کچھ کیا اچھا نہیں کیا۔ مجھے آپ سے ایسی امید نہ تھی۔"

"میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟ دنیا میں کون مرد ایسا ہو گا جو عورت اور اس کی

محبت کے لئے اپنی ساری دولت جائیداد اور کاروبار اس کے قدموں میں ڈال دے؟"
افضال احمد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "مگر تم نے مجھے اس کا کیا صلہ دیا؟ مجھے نہ صرف میری بیوی کی نظروں میں ذلیل رسوا کر دیا بلکہ اس کا محتاج بنا دیا اور اس ذلیل عورت نے مجھے ایک غلام بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہ سب کچھ تم نے کس لئے کیا' شکیلہ!؟"

"اس لئے کہ آپ نے مجھے دھوکا دیا؟ آپ کسی کام کے بہانے اسلام آباد جا کر مری میں نجم کی بہن کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے پھر رہے تھے؟"

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں نے مری جا کر نجم کی بہن کے ساتھ سیر و تفریح کی۔ میں نے تو ان دنوں اس کی شکل تک نہیں دیکھی۔"

"میں نے یہ بات سنی تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں نے یہ سب کچھ آپ سے انتقام لینے کے لئے کیا؟ میں آپ کو یہ بتا دینا چاہتی تھی کہ مجھے آپ سے محبت ہے آپ کی دولت سے نہیں۔ اس دنیا میں عورت کے لئے محبت سے بڑھ کر کوئی شے زیادہ قیمتی اور عزیز نہیں ہے۔ عورت نے اس محبت کے لئے کیا کچھ قربانیاں نہیں دی ہیں اور ان مردوں نے جو عورت سے سچی محبت کرتے تھے' اپنی سلطنتیں تک دے ڈالیں۔ اگر آپ نے یہ سب کچھ کیا تو کون سا کارنامہ کیا؟ آپ کی دولت آپ ہی کے گھر پہنچ گئی لیکن میں جہاں تھی وہیں رہ گئی ہوں۔"

"مگر یہ بات تم سے کس نے کہی تھی؟ یہ مجھ پر سراسر بہتان اور الزام ہے' جھوٹ ہے۔" وہ تیز و تند لہجے میں بولے۔ "کیا سجاد نے کہا تھا؟"

"تنویر بیگ نے مجھ سے ایک تقریب میں مل کر کہا تھا بلکہ طنز کیا تھا کہ تمہارے دوست خاص تو آج کل نجم کی بہن کے ساتھ مری میں سیر و تفریح کرتے پھر رہے ہیں۔"

"تنویر بیگ نے کہا تھا؟" افضال کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ "اس ذلیل' سوّر' پاجی اور خبیث نے کہا تھا۔ میں اس کا منہ توڑ دوں گا۔"

"ان باتوں پر مٹی ڈالیں اور اپنا غصہ تھوک دیں۔" شکیلہ نے اپنی بانہیں ان کی گردن میں حمائل کر دیں۔ "جو نہیں ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ اس میں میری بھی غلطی تھی۔ مجھے تصدیق کئے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھانا نہیں چاہئے تھا۔ مگر میں کرتی بھی کیا.......... میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔"

"تمہاری اس غلطی کی سزا نہ صرف میں بھگت رہا ہوں بلکہ سجاد بھی بھگت رہا ہے۔ میں آج کل اس کے رحم و کرم پر ہوں۔ ادھر سجاد کا دس لاکھ کا چیک دستخط نہیں ہو رہا

ہے۔ میری بیوی اس کا سارا مال واپس کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اتنی بڑی اور ایسی سنگین سزا کبھی نہیں ملی تھی۔"

"مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کے پاس معافی مانگنے آئی ہوں۔ اس وقت تک یہاں سے نہیں جاؤں گی جب تک آپ مجھے معاف نہیں کر دیتے۔"

"چلو.......... میں نے تمہیں سچے دل سے معاف کر دیا۔ آئندہ ایسی سنگین غلطی نہ کرنا اور نہ ہی میری محبت کے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونا۔"

افضال احمد نے اپنی بات ختم کر کے شکیلہ کو اپنے بازوؤں میں بھرنا چاہا تو وہ تڑپ کر بازوؤں کے حصار سے نکل آئی۔ اس نے ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے کہا۔ "اس وقت میں جلدی میں ہوں' مجھے آپ سے ایک کام آن پڑا ہے۔ میں آپ کو ایک تکلیف دینا چاہتی ہوں۔"

"ایک تکلیف کیا دس تکلیفیں دو تو میں سہنے کے لئے تیار ہوں۔ بس تمہارے حکم دینے کی دیر ہے۔" وہ خوشامدی لہجے میں بولے۔

"مجھے بیس ہزار رقم کی اشد ضرورت ہے۔ مجھے کچھ دنوں کے لئے آپ بیس ہزار روپے بطور قرض دے دیں تو بڑی نوازش ہو گی۔"

وہ اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولے۔ "یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ غیریت کیوں برت رہی ہو؟ میرے پاس بیس ہزار روپے تو نہیں ہیں۔ صرف دس ہزار روپے ہوں گے۔ ایک ہفتے کی بات ہے' پھر تم مجھ سے ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں بات کر سکتی ہو۔ کیا دس ہزار سے کام چل سکتا ہے؟"

"چلئے دس ہزار روپے ہی سہی۔" شکیلہ نے گہری سانس لی۔ "آپ کو فوری طور پر رقم کی واپسی کی ضرورت تو نہیں ہو گی نا.........."

"میں تمہیں قرض تھوڑی دے رہا ہوں جو تم اس کی واپسی کی باتیں کر رہی ہو۔ یہ میں اپنی طرف سے تمہیں جیب خرچ دے رہا ہوں۔" افضال احمد نے جیب سے چیک بک نکال کر دس ہزار روپے کا چیک کاٹ کر اس کی طرف بڑھایا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں بیس ہزار کی رقم دے نہیں سکا۔"

"کوئی بات نہیں؟" شکیلہ نے مسکرا کر ان کے ہاتھ سے چیک سلپ لے لی اور اسے پرس میں رکھ کر پرس کا منہ بند کر کے بولی۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ.......... اچھا اب مجھے جانے کی اجازت دیں۔" وہ پرس لہرا کے دروازے کی طرف بڑھی۔

افضال احمد نے آگے بڑھ کر اس کی بانہہ تھام لی۔ "تم کچھ دیر کے لئے تو رُک جاؤ نا! اتنے دنوں بعد دیکھا ہے جی بھی تو نہیں بھرا ہے اور پھر ان شکوہ شکایتوں اور باتوں میں مَیں تمہاری خاطر مدارت بھی نہیں کر سکا۔ آخر ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ گھوڑے پر سوار آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"کسی دن اور سہی۔" شکیلہ نے انہیں مستی بھری نظروں سے دیکھا تو وہ اپنا دل تھام کر رہ گئے۔ "میری ایک سہیلی دکان پر انتظار کر رہی ہو گی۔ اگر آپ کہیں تو چار پانچ دن بعد آپ کو ٹیلی فون کر کے یہاں پہنچ جاؤں گی۔ آپ بھی دفتر سے سیدھے یہاں آ جائیں۔"

"میں یہ کمرہ کل ہوٹل والوں کو واپس کر رہا ہوں۔ پھر ایک ہفتہ بعد ہی اس کمرے کو دوبارہ کرایہ پر لے سکوں گا۔" افضال احمد نے بتایا۔

"آپ یہ کمرہ ہوٹل والوں کو واپس کیوں کر رہے ہیں؟ اس کمرے کو تو آپ نے دو برس پہلے کرایہ پر لیا تھا اور اب ہم کہاں ملا کریں گے؟"

"اس لئے کہ میرے پاس کرایہ دینے کے لئے رقم نہیں رہی ہے۔ ایک ہفتہ بعد میرے پاس رقم آ جائے گی تو میں اسے پھر سے حاصل کر لوں گا۔"

"تو آپ ایسا کیجئے کہ اپنی رقم کا چیک واپس لے لیں اور اس سے ہوٹل کا کرایہ ادا کر دیں۔" شکیلہ نے پرس سے چیک نکال کر ان کی طرف بڑھایا۔

"مجھ پر ہوٹل کا کرایہ واجب الادا نہیں ہے۔ میں نے دو سال پہلے دو سال کا کرایہ پیشگی دے دیا تھا۔ اب میں پھر دو سال کا کرایہ پیشگی دے کر کمرہ لینا چاہتا ہوں۔"

شکیلہ نے چیک واپس پرس میں رکھتے ہوئے ایک سرد سی آہ بھری۔ "تو آپ سے ملاقات کرنے کے لئے ایک ہفتہ انتظار کرنا ہو گا؟"

"اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں لنچ کے وقت لنچ سمیت تمہارے فلیٹ پر پہنچ جاؤں۔ تمہارے فلیٹ سے اچھی جگہ تو کوئی اور نہیں ہے؟"

"میری ایک عزیز ترین سہیلی لاہور سے اپنے شوہر کے ساتھ آئی ہوئی ہے۔" شکیلہ نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔ "میں دو تین دن اس کے ساتھ مصروف رہوں گی۔ لہٰذا آپ کو گھر پر مل نہیں سکوں گی۔ جب وہ چلی جائے گی تب ہم ملنے کا پروگرام بنا لیں گے۔"

پھر بھی افضال احمد نے بے حد اصرار کر کے دو ایک منٹ کے لئے روک لیا تھا۔ وہ

نیچے آئی تو بہت خوش تھی کہ اس کا منصوبہ بے حد کامیاب رہا۔ اب افضال احمد کے پاس جیسے پھوٹی کوڑی بھی نہیں رہی تھی۔ وہ دل میں افضال احمد پر ہنس رہی تھی کہ وہ دوبارہ دولت پانے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ خواب جو کبھی پورا نہیں ہو گا۔ خواب پورے کہاں ہوتے ہیں۔ وہ بڑے دغا باز ہوتے ہیں۔ کسی عیار کی طرح ساری زندگی اپنا اسیر بنا کر رکھتے ہیں۔

سجاد نے صبح شکیلہ کو تیار ہوتے دیکھا تو حیرت سے پوچھا۔ "خیریت تو ہے۔ یہ صبح صبح کہاں کی تیاری ہے؟ آج تم نے تو اپنے تمام سابقہ ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔"

"میری ایک سہیلی لاہور سے آئی ہوئی ہے۔" شکیلہ نے سجاد سے بھی جھوٹ بولا۔ "اس کے ساتھ صبح سے رات تک کا پروگرام ہے۔ میں شاید رات دیر سے گھر آؤں۔ اس لئے کہ اسے اور اس کے شوہر، بچوں کو کراچی شہر کی سیر کرانا ہے۔ تم رات کھانے پر میرا انتظار نہیں کرنا۔"

"میں بھی رات دیر سے گھر پہنچوں گا۔" سجاد نے کہا۔ "آج سارا دن تنویر بیگ کے ساتھ ایک کام کے سلسلے میں مصروف رہوں گا اور شاید اس کے ساتھ حیدر آباد جانا پڑے گا۔"

سجاد اس سے پہلے تیار ہو کر گھر سے نکل گیا تھا۔ وہ ٹھیک دس بجے گھر سے نکلی اور سیدھی بینک پہنچی۔ اس نے افضال احمد کا دیا ہوا چیک کیش کرایا۔ وہ بیگم ناہید افضال احمد کو اپنے منصوبے کی کامیابی سنانے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔ صدر کے چوراہے پر اس نے سجاد کو کار میں دیکھا تو وہ چونک پڑی۔ وہ سجاد کو دیکھ کر نہیں چونکی تھی جو سجاد کے پہلو میں بیٹھی تھی اس عورت کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی پشت نظر آ رہی تھی۔ اس کی کار، ٹریفک کے ہجوم میں پھنسی تھی اور سجاد کی کار سے بہت پیچھے کھڑی تھی۔ لہٰذا وہ سجاد کی نظروں میں نہیں آ سکتی تھی۔ مگر سجاد کی کار کو اپنی نظروں کی گرفت میں رکھ سکتی تھی اور رکھے ہوئے تھی۔

اس عورت نے اپنی لمبی اور خوبصورت سی گردن گھما کر باہر کی طرف دیکھا اور کھڑکی سے جھانکا تو اس کے حسین چہرے کا رخ شکیلہ کو نظر آ گیا۔ شکیلہ نے اسے فوراً ہی پہچان لیا تھا اور بڑے زور سے اچھل پڑی تھی۔ وہ نسرین تھی۔ سجاد کی پہلی بیوی۔ مگر سجاد نے تو اسے بتایا تھا کہ وہ نسرین کو طلاق دے چکا ہے۔ طلاق دے کر اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹکارا پا چکا ہے۔ نسرین کی امارت اور غرور کو لات مار چکا ہے۔ اگر وہ ایسا کر چکا ہے تو

پھر نسرین اس کے ساتھ کیسے بیٹھی ہے؟ تو کیا سجاد نے اس سے جھوٹ بولا تھا؟ فریب دیا تھا؟ اگر نسرین مطلقہ تھی تو وہ سجاد کے پاس کس لئے آئی ہے؟ وہ اور سجاد کہاں جا رہے ہیں؟ وہ لائل پور سے کراچی کب' کیوں اور کس لئے آئی ہو گی؟ آج صبح سجاد نے اس سے کہا تھا کہ وہ تنویر بیگ کے ساتھ ایک کام کے سلسلے میں حیدر آباد جا رہا ہے۔ گویا اس نے جھوٹ کہا تھا' سارا دن نسرین کے ساتھ گزارنے کے لئے بہانہ کیا تھا۔

سجاد کے چہرے پر جو ایک اور نقاب پڑی تھی آج وہ بھی اتر گئی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے سے ایک پردہ اور ہٹ گیا تھا۔ سگنل کی سبز بتی جل اٹھی تھی۔ رکا ہوا ٹریفک کسی سیلاب کی مانند بہنے لگا۔ سجاد کی کار وکٹوریہ روڈ کی طرف مڑ گئی تھی اور تیزی سے ریکس سینما کی طرف جا رہی تھی۔ چشم زدن کار ریکس سینما کی طرف جانے کے بجائے سیدھی جا رہی تھی۔ وہ ریکس سینما پر رکی نہیں تھی۔ اس نے سجاد کی کار کی رفتار سے اندازہ لگایا تھا کہ کار ریکس سینما پر رکے گی۔ مگر وہ رکی نہیں تھی۔ دفعتاً اسے ایک خیال سا آیا کہ سجاد کہیں نسرین کو فلیٹ میں لے کر تو نہیں جا رہا ہے؟ اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنے شبہے کو دور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اپنی کار ریکس سینما کے سامنے والے پٹرول پمپ پر روکی۔ اس کے مینیجر کو کچھ ہدایات دے کر وہ چوراہے پر آئی۔ وہ ایک خالی ٹیکسی میں بیٹھ کر فلیٹ پر پہنچی تو اس کا شبہہ یقین میں بدل گیا تھا۔ سجاد کی کار فلیٹ کی عمارت کے احاطے میں کھڑی تھی۔

شکیلہ کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں اوپر پہنچی اور چابی کے سوراخ سے جھانکا تو نشست گاہ میں اندھیرا سا نظر آیا۔ وہ تمام پردے کھینچ کر چلی آئی تھی اس لئے اندر اندھیرا سا ہو جاتا تھا۔ اسے ایک تپائی پر سجاد کا بریف کیس رکھا نظر آ رہا تھا۔ خواب گاہ کا دروازہ بھڑا ہوا سا تھا۔ شکیلہ نے دھڑکتے دل سے پرس سے چابی نکالی اور سوراخ میں ڈال کر اسے اتنی آہستگی سے گھمایا کہ ایک ہلکی سی کلک ہوئی۔ پھر اس نے ہینڈل کا لٹو پکڑ کر گھمایا۔ دروازہ بے آواز کھل گیا۔ اس نے چابی نکال کر ہاتھ میں رکھ لی اور اندر داخل ہو کر دروازے کو بے آواز بند کر دیا۔

شکیلہ کے سینے میں دل بڑے زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ چوروں کی طرح اپنے ہی گھر میں کھڑی تھی اور پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔ وہ اپنے سینے میں سانسوں کے تلاطم پر قابو پائے خواب گاہ کی طرف بڑھی۔ خواب گاہ کا دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا۔ اندر سے نسرین اور سجاد کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ فرش پر گھٹنوں

کے بل بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھ کر چابی کے سوراخ میں سے جھانکا۔ سجاد اور نسرین پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ نسرین سجاد سے کہہ رہی تھی۔ "تم نے تو کہا تھا دو تین مہینے میں شکیلہ کو کسی سیٹھ کے ہاتھ ٹھکانے لگا کر آ رہا ہوں۔ چار مہینے ہونے کو آ رہے ہیں۔ تم نے نہ تو آنے کا نام لیا اور نہ ہی کوئی خط لکھا۔ تم تو صرف شکیلہ کے ہو کر رہ گئے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تم اسی کے ہو کر رہ جاؤ گے۔"

"یہ بات نہیں ہے ڈارلنگ!" سجاد نے جواب دیا۔ "اس بار میں حالات میں کچھ ایسا جکڑ گیا کہ شکیلہ سے جلد نجات نہ پا سکا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس سے نجات بھی نہ پاؤں۔ اس لئے کہ اس سے پہلے جو میں دوسری لڑکیوں کو یہاں لے کر آیا اور ساہوکاروں کے ہاتھ بیچ دیا تو مجھے کیا ملا۔ لاکھ سے زیادہ کی رقم نہیں ملی تھی۔ مگر شکیلہ کو میں نے بہن بنا کر یہاں کی سوسائٹی میں پیش کیا تو وارے نیارے ہو گئے۔ سپلائی کے کام میں اس کا حُسن' جوانی اور شباب بڑا کام دے رہا ہے۔ میں نے اسے سب سے پہلے افضال احمد کا چارہ بنایا۔ تو بڑا فائدہ ہوا۔ افضال احمد تو اس کا غلام ہو کر رہ گیا ہے۔ شکیلہ کی ذات کی وجہ سے سپلائی کے کام میں .... کوئی دس لاکھ روپے کما چکا ہوں۔ وہ کسی گاڑی کی طرح منزل کی طرف چل پڑی ہے۔ آج کل ایک چکر کی وجہ سے افضال احمد غریب اپنی بیوی کے پھندے میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے میرے بھی دس لاکھ روپے پھنسے ہوئے ہیں۔ کچھ دنوں میں یہ رقم ہاتھ آ جائے گی۔ ذرا ذہنی سکون ہو جائے گا۔ پھر اس کے بعد شکیلہ کو کسی نہ کسی بہانے سے تنویر بیگ کے ساتھ یورپ بھیج دوں گا۔ تنویر بیگ کے ایک آدمی نے مجھ سے کل ہی مل کر کہا تھا کہ اگر شکیلہ کو ا کے باس کے ساتھ غیر ممالک کی سیاحت کے لئے بھیج دیا جائے تو بیس لاکھ روپے کا آرڈر پکا .... میں نے ہامی بھر لی۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم شکیلہ سے چھٹکارا پانا ہی نہیں چاہتے ہو بلکہ مجھ سے نجات حاصل کرنے کی فکر میں ہو۔" نسرین نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"تو کیا تم چاہتی ہو کہ میں سونے کے انڈے دینے والی مرغی کو ذبح کر دوں؟ ہمارے خواب ادھورے رہ جائیں۔"

"میرے خواب تو ادھورے ہو کر رہ گئے ہیں۔ میں لائل پور میں تمہارے بغیر رہ نہیں سکتی ہوں۔ مجھے اس مرغی سے زیادہ تمہاری ضرورت ہے۔"

"شکیلہ آئندہ ہفتے دو مہینے کے لئے تنویر بیگ کے ساتھ یورپ چلی جائے گی۔ تم دو مہینے میرے ساتھ رہ لو۔"

"میں تمہاری بیوی ہوں۔ میں دو مہینے نہیں بلکہ اب ہمیشہ ساتھ رہوں گی۔ میں واپس جانے کے لئے نہیں آئی ہوں' سمجھے!"

"مگر تم کراچی میں رہ کر کیا کرو گی؟ آرام سے لائل پور ہی میں جا کر رہو۔ میں تمہیں ہر ماہ نہ صرف ڈرافٹ بھیجتا رہوں گا بلکہ مہینے میں دو ایک چکر بھی لگا لیا کروں گا۔ اس طرح تم سکون و آرام سے زندگی گزارتی رہو۔" سجاد نے اسے بڑے پیار سے سمجھایا۔

"میں کراچی میں رہ کر وہی کچھ کروں گی جو پہلے کرتی رہی تھی۔ جو شکیلہ کر رہی ہے۔" نسرین کہنے لگی۔ "میں تمہارے لئے ترقی کا زینہ بنوں گی۔ آج تم جو اس مقام پر ہو وہ سب کچھ میری ہی وجہ سے تو ہے۔ کیا مجھے اتنا بھی حق نہیں ہے کہ میں کراچی میں رہ کر یہاں کی لذتوں سے محظوظ ہوتی رہوں۔ کیا میں لائل پور میں رہ کر ایک سرد' سپاٹ اور بے کیف سی زندگی گزاروں۔ کراچی کے مقابلے میں وہ شہر کسی گاؤں کی طرح لگتا ہے۔"

"تمہیں کراچی میں رکھنے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں نہیں چاہتا ہوں کہ شکیلہ کے علم میں کوئی بات آ جائے۔ اس نے مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا تو وہ بدک جائے گی۔ میں اسے ابھی ناراض کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ ورنہ وہ سونے کے انڈے دینا بند کر دے گی۔"

شکیلہ ان دونوں کی باتیں بڑے غور سے سنتی رہی تھی۔ وہ دونوں بدروحوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ سجاد کی باتوں سے اسے حیرت اور صدمہ نہیں ہوا تھا۔ وہ اب تک تو یہ سوچ رہی تھی کہ اس روز افضال احمد نے اس کی تنہائی' بے بسی اور مجبوری سے فائدہ اٹھایا تھا لیکن آج وہ بات صاف ہو گئی تھی۔ سجاد کے چہرے سے ایک ایک کر کے جو نقاب اترتی گئی تھی اس نے اسے صدمات کا عادی بنا دیا تھا۔ اب اس کے نزدیک بڑے سے بڑا صدمہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اسے شدید دکھ پہنچا نہیں سکتا تھا۔

☆======☆======☆

آج اس راز کے انکشاف کے بعد کہ وہ اس روز جو کچھ ہوا تھا وہ سجاد کا سوچا سمجھا منصوبہ تھا' اس پر برف کی سی بے حسی طاری ہو گئی تھی۔

شکیلہ نے ان دونوں کو دیکھا۔ نسرین نے بستر پر اس کی جگہ لے لی تھی۔ سجاد اس پر کسی بدلی کی طرح چھا رہا تھا۔ اب اس کے لئے کھڑے رہنا بیکار تھا۔ ایک ایک لفظ' ہنسی'

قہقہے اور چھیڑ چھاڑ کی باتیں اس کے وجود پر تازیانے بن کر لگ رہی تھیں۔ وہ دبے پاؤں پلٹی تو معاً اس کی نظر بریف کیس پر پڑی۔ بریف کیس دیکھتے ہی وہ اس طرح سے اچھلی جیسے اس نے کوئی سانپ دیکھ لیا ہو۔ اس پٹاری میں سانپ ہی تو بند تھا جسے بیگم ناہید افضال احمد کو اور ان کے گھر کو ڈس لیتا تھا۔ رات بریف کیس دیکھ کر اسے خیال ہی نہیں آیا تھا کہ اس میں وہ تصویریں اور نیگیٹوز موجود ہیں۔

شکیلہ نے اس کمرے کی طرف دیکھا جہاں وہ دونوں بند تھے اور ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔ اس سے اچھا موقع اسے مل نہیں سکتا تھا۔ وہ بریف کیس اٹھا کر کمرے میں لے آئی۔ اسے وہ نمبر یاد تھے جس سے بریف کیس کھلتا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے نمبر سیٹ کر کے بریف کیس کھولا تو بریف کیس کھل گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس کے ہاتھ میں وہ لفافہ تھا جس میں تصویریں اور نیگیٹوز تھے۔

اس نے بریف کیس بند کر کے نمبروں کو بے ترتیب کر دیا اور اسے لے جا کر واپس اسی جگہ رکھ دیا جیسے پہلے رکھا تھا۔ جب وہ دروازے کی طرف بڑھی تو اس کے پیر منوں بھاری ہو رہے تھے۔ جیسے کوئی عفریت اس کے تعاقب میں ہو۔ خوشی اور لطیف احساسات کی ہنسی اسے کمرے سے سنائی دے رہی تھی۔ اس نے کس طرح دروازہ کھولا' اسے خود یاد نہیں رہا تھا۔ سڑک پر آ کر اس نے ایک گزرتی ہوئی خالی ٹیکسی روکی اور اس میں سوار ہو کر اپنے آپ کو سیٹ پر گرا دیا۔ تب اسے ایسا لگا کہ اسے نئی زندگی ملی ہو اور اس کے مردہ جسم میں نئی روح پھونک دی گئی ہو۔

فرطِ خوشی سے اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ اسے یہ سب کچھ کسی خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس آسانی سے یہ تصویریں اور نیگیٹوز اس کے ہاتھ لگ جائیں گے۔ جو کچھ بھی ہوا تھا وہ کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ اسے اس بات کی بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ افضال احمد کے سارے خواب ایک بار پھر ادھورے رہ گئے تھے اور پھر سجاد کے ہاتھ سے بازی نکل گئی تھی' ساری بساط اُلٹ کر رہ گئی تھی۔

شکیلہ نے پٹرول پمپ اسٹیشن سے اپنی کار لی اور سیدھی بیگم ناہید افضال احمد کے ہاں پہنچی۔ وہ اپنے بچوں کو جو اسکول اور کالج سے واپس آئے تھے کھانا کھلا رہی تھیں۔ شکیلہ انہیں اشارے سے خواب گاہ میں لے گئی۔ وہ شکیلہ کو حیرت اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔ انہیں شکیلہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس کی خوشی کی وجہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اسے خوش پا کر وہ بھی چہرے سے خوشی کا اظہار کرنے لگیں۔

شکیلہ نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور اپنے پرس سے لفافہ نکال کر ان کی طرف بڑھایا تو انہوں نے سوالیہ نظروں سے اس لفافے کی طرف دیکھا اور ان کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ انہوں نے لفافہ لے کر اسے کھول کر دیکھا تو وہ بڑے زور سے اچھل پڑیں۔ انہیں یقین نہیں آیا۔ وہ خواب کی سی حالت میں کھڑی ان تصویروں کو دیکھتی رہی تھیں۔ ان پر سکتہ سا چھا گیا تھا۔ انہوں نے حیرت کے عالم سے نکل کر پوچھا۔ "یہ تصویریں کیسے ملیں، کہاں سے ملیں؟"

اس کے جواب میں شکیلہ نے مختصر طور پر سارا واقعہ سنایا۔ اس کی زبانی سارا واقعہ سن کر وہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں بولیں۔ "شکیلہ! سجاد اور افضال احمد ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ یہ لوگ آدمی نہیں خون آشام ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہم دونوں کے ساتھ ایک ہی جیسا سلوک ہوا ہے۔ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ آج تم نے پھر میری ذات پر اتنا بڑا احسان............"

شکیلہ نے جھٹ سے ان کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "میں نے یہ سب کچھ کسی صلے اور تمنا کی غرض سے نہیں کیا ہے۔ اگر آپ نے ایسی باتیں کیں تو میرے دل کو خوشی نہ ہو گی بلکہ رنج پہنچے گا۔" پھر اس نے سرگوشی سی کی۔ "جتنی جلدی ہو سکے آپ ان تصویروں کو ضائع کر دیں۔ اس غلاظت سے جو تعفن اٹھ رہا ہے وہ ناقابل برداشت ہو رہا ہے۔"

پھر وہ شکیلہ کو ساتھ لے کر کچن میں پہنچیں۔ کچن میں ملازمہ برتن دھو رہی تھی۔ انہوں نے ملازمہ کو کسی بہانے سے بازار بھیج دیا۔ جب وہ کچن سے نکل گئی تو انہوں نے سب سے پہلے گیس کا چولہا جلا کر سارے نیگیٹوز ایک ایک کر کے اچھی طرح سے جلا دیئے۔ وہ چند لمحوں میں راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔ صرف ایک تصویر اپنے پاس رکھ کر باقی ساری تصویریں نذرِ آتش کر دیں۔

"یہ تصویر آپ نے کس لئے بچالی؟" شکیلہ نے حیرت سے پوچھا۔

جواب میں ان کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ "میں افضال کو یہ تصویر دکھانا چاہتی ہوں تاکہ انہیں میری بات کا یقین آ سکے۔" کچھ دیر بعد وہ شکیلہ کو کھانے کی میز پر لے آئیں۔ "اس روز سے میری بھوک اڑ گئی تھی۔ میں صرف پانی پر گزارہ کر رہی تھی۔ اس لئے کہ میرے سینے میں خلش کا خنجر پیوست تھا۔ آج وہ خنجر نکل چکا ہے تو کچھ خوشی اور کچھ بھوک سی محسوس ہو رہی ہے۔"

"مگر میری بھوک تو بالکل اڑ چکی ہے۔" شکیلہ بولی۔ "میرا دل دکھ کے بوجھ سے دبا ہوا ہے۔ میں کھانے میں آپ کا ساتھ نہ دے سکوں گی۔"

"میرا دل کون سا خوش ہے شکیلہ!" وہ افسردگی سے بولیں۔ "میرے دل میں جو گھاؤ لگ چکا ہے کیا اس گھاؤ کو وقت بھر دے گا۔ کوئی دوا ایسی ہے جو اس زخم کو بھر دے؟ کیا میں اس لرزہ خیز واقعہ کو کبھی بھلا سکوں گی؟ نہیں شکیلہ نہیں .... ساری زندگی اس زخم سے رستا ہوا لہو پینا پڑے گا۔ سچ پوچھو تو میں اپنے معصوم بچوں کے لئے زندہ ہوں۔ اگر میں اس سانحے کی وجہ سے خودکشی کر لوں تو ان کا باپ انہیں در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ دے گا۔ اسی لئے میں مرنا نہیں چاہتی ہوں، زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ زندہ رہنے کے لئے کھانا چاہتی ہوں۔"

"اور ہاں مجھے یاد آیا۔" شکیلہ نے اپنے پرس سے دس ہزار کی رقم نکال کر ان کی طرف بڑھائی جو اس نے بینک سے افضال احمد کا چیک کیش کرا کے لی تھی۔

"کل میں نے افضال احمد سے چیک لے لیا تھا۔ اب ان کے اکاؤنٹ میں چند روپے کے علاوہ کوئی رقم نہیں ہے۔" پھر شکیلہ نے توقف کر کے انہیں کل شام کا سارا واقعہ سنایا۔ یہ منصوبہ اس نے کل ان کے ساتھ ہی بیٹھ کر بنایا تھا۔

"اس رقم کو تم اپنے ہی پاس رکھو۔ میں یہ رقم لے کر کیا کروں گی؟ میرے پاس کس چیز کی کمی ہے؟" وہ رقم لینے سے انکاری ہوتی ہوئی بولیں۔

"نہیں .... یہ رقم آپ ہی کی ہے۔" شکیلہ نے اصرار کیا۔ "آپ کی رقم آپ کے پاس پہنچ رہی ہے اور پھر میرے پاس بھی تو رقم کی کمی نہیں ہے۔ سجاد نے میرے وجود سے لاکھوں روپے حاصل کر کے بینک میں جمع کر کے رکھ چھوڑے ہیں۔ میں اس میں سے چاہے کتنی ہی رقم کیوں نہ نکالوں اسے کوئی اعتراض نہیں۔ میرے اخراجات پر بھی وہ تعرض نہیں کرتا ہے۔ اس لئے کہ میں سونے کے انڈے دینے والی مرغی جو ہوں۔"

شکیلہ کی آنکھوں کے کنائیوں میں آنسوؤں کے قطرے چمکنے لگے۔ وہ شکیلہ کی پشت تھپتھپاتی ہوئی بولیں۔ "ابھی تو تم اس رقم کو اپنے پرس میں رکھو۔ میں بعد میں لے لوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ بچوں کے علم میں یہ بات آ جائے۔ کوئی بھی بچہ کسی کام سے آ سکتا ہے۔" پھر انہوں نے توقف کر کے اپنی ساڑھی کے پلو سے ان آنسوؤں کو پونچھا جو شکیلہ کی آنکھوں سے نکل پڑے تھے۔ "چلو چند لقمے زہر مار ہی کر لو۔ رونے کے لئے تو ساری عمر پڑی ہے۔ عورت کی زندگی میں رونا ہی رونا لکھا ہے۔ رونا جیسے اس کا مقدر ہے۔"

شاید وہ عورت' عورت ہی نہیں جس کے نصیب میں رونا نہ ہو۔"

شکیلہ نے چند لمحوں کے بعد کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اسے یکایک متلی سی محسوس ہوئی اور سر چکراتا ہوا سا لگا۔ وہ منہ پر پلو رکھ کر بڑی تیزی کے ساتھ غسل خانے کی طرف بڑھی اور غسل خانہ میں جا کر اس نے قے کر دی۔ قے کرتے وقت اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کا سر پھٹا جا رہا تھا اور چکر کھاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور اسے اپنے پیروں پر کھڑے ہونا دشوار لگا تو اس نے دیوار کا سہارا لے لیا۔

وہ میز سے اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی تھیں۔ شکیلہ کو انہوں نے دیوار سے پشت ٹکائے کھڑے دیکھا تو ان کے ہونٹوں پر ایک محبت پاش مسکراہٹ ابھر آئی۔ وہ اسے سہارا دے کر اپنے کمرے میں لے آئیں اور اسے بستر پر لٹا دیا۔ شکیلہ نے بستر پر لیٹ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں تو وہ ایک ٹک شکیلہ کے چہرے کو دیکھتی رہیں اور اس پر جھک گئیں۔ اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر بولیں۔ "مبارک ہو!"

شکیلہ نے فوراً ہی اپنی آنکھیں کھول کر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ "کس بات کی مبارک باد؟"

"تم ماں بننے والی ہو۔" ان کا لہجہ خوشی سے چھلک رہا تھا۔ "کیا تمہیں کچھ خیال نہیں رہا اور.........."

شکیلہ ان کی بات کی تہہ میں پہنچ گئی۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ بات تو اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں تک وہ کچھ سوچتی رہی۔ یک لخت اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "کیا آپ مجھ پر ایک احسان کریں گی۔ میں آپ کا یہ احسان آخری سانس.........."

"تم احسان کی بات کر رہی ہو۔" انہوں نے شکیلہ کو پیار بھری خفگی سے گھورا۔ "تم ایک احسان کی بات کر رہی ہو' میں تو تمہارے لئے اپنی جان تک دے سکتی ہوں۔"

"مجھے آپ کی جان کی نہیں بلکہ ہمدردی' محبت اور تعاون کی ضرورت ہے۔ میں اس ہستی کو ضائع کرا دینا چاہتی ہوں جو میرے وجود میں جنم لے رہی ہے۔"

"ایں!" وہ تحیر زدہ ہو گئیں۔ "تم اس وجود کو قتل کرنا چاہتی ہو۔ وہ کیوں' کس لئے؟"

"اس لئے کہ میں اس ذلیل شخص کے بچے کی ماں بننا نہیں چاہتی ہوں۔ یہ گندا خون دنیا میں آ کر ساری دنیا میں اپنی نجاست پھیلا دے گا۔" شکیلہ نفرت سے بولی۔

"بچے تو قدرت کا عطیہ ہوتے ہیں شکیلہ!" وہ محبت بھرے لہجے میں اسے سمجھانے لگیں۔ "ہمیں اس بات کا کوئی حق نہیں پہنچتا ہے کہ ہم انہیں اپنے ہی ہاتھوں سے قتل کر دیں۔ قانونی' شرعی اور اصولی طور پر بہت بڑا جرم ہے۔ یہ ناقابل معافی گناہ ہے۔ کوئی ماں کہیں اپنے بچے کو قتل کرتی ہے؟"

"اگر ایک سپنولیے کو قتل کرنا جرم ہے تو مجھے یہ جرم منظور ہے اور میں اس جرم کی سزا بھگتنے کے لئے بھی تیار ہوں۔ مگر میں نہیں چاہتی ہوں کہ اس سپنولیے کی اپنے خون سے پرورش کروں۔ اپنا خون جلاؤں۔ اسے نو ماہ تک اپنی کوکھ میں لئے پھروں۔ تکلیفیں اٹھاؤں۔" وہ اندر ہی اندر تپ رہی تھی۔

وہ بڑی دیر تک شکیلہ کو سمجھاتی رہیں۔ آخر شکیلہ کی سمجھ میں آ گیا۔ اس نے پھر ان سے وعدہ کر لیا کہ وہ کسی قیمت پر اس بچے کو ضائع نہیں کرے گی۔ وہ سہ پہر کے وقت ان کے ہاں سے نکل کر گھر کی طرف جا رہی تھی تو بہت خوش تھی۔ اسے ماں بننے پر ایک انجانی مسرت سی ہو رہی تھی۔ وہ اسی مسرت کی سرشاری میں ڈوبی اپنے تصور میں ایک خوبصورت اور گول مٹول سے بچے کو دیکھ رہی تھی۔

☆======☆======☆

سجاد اور نسرین خواب گاہ سے نکل کر نشست گاہ میں آئے تو دونوں بے حد خوش تھے۔ دونوں ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔ سجاد صوفے پر بیٹھ کر ایک ٹک اپنے بریف کیس کو دیکھنے لگا۔ وہ بریف کیس کو دیکھنے میں اس قدر محو ہو گیا کہ اس نے نسرین کی موجودگی بھی بھلا دی تھی۔ نسرین کو بھی اچانک احساس ہوا تو اس نے سجاد کا شانہ ہلاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بات ہے سجاد! تم بریف کیس کو اس طرح سے دیکھ رہے ہو جیسے یہ الہ دین کا چراغ ہے؟"

سجاد نے چونک کر نسرین کی آنکھوں میں جھانکا جن میں اب بھی خمار بھرا ہوا تھا۔ سرخ سرخ ڈورے ابھرے ہوئے تھے۔ اس نے نسرین کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لیتے ہوئے کہا۔ "یہ کسی جادوئی چراغ سے کم نہیں ہے؟ اس بریف کیس میں واقعی جادوئی چراغ رکھا ہوا ہے۔"

"کیسا جادوئی چراغ؟" نسرین نے چونک کر اپنا چہرہ سجاد کی طرف گھمایا۔ "کیا دو تین لاکھ روپے رکھے ہوئے ہیں؟"

سجاد نے اسے بڑی تفصیل سے سارا واقعہ سنایا۔ نسرین سارا واقعہ سن کر بولی۔

"شکیلہ تو بڑی احمق نکلی' کیا وہ واقعی اتنی بڑی احمق ہے؟"

"احمق نہیں بلکہ وہ کریک ہے۔" سجاد نے جل بھن کر کہا۔ "معلوم نہیں اس کمینی کے دماغ میں کیا آیا کہ اس نے سب کچھ افضال احمد کی بیوی کے نام لکھ دیا۔"

"افضال احمد کی بیوی نے اس پر یقیناً کوئی جادو کیا ہو گا؟ اسی جادو کے زیر اثر شکیلہ نے یہ قدم اٹھایا ہو گا۔ ورنہ کون ہے جو مستی میں آ کر اتنی ساری دولت کو ٹھوکر مار دے۔ لوگ جادو ٹونے سے اپنے دشمن کو اپنا مطیع بنا لیتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات تو روز ہی پیش آتے رہتے ہیں۔"

"اور تم بھی شاید اس جادو سے واقفیت رکھتی ہو۔ جبھی تو جادو ٹونے کے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہو۔ جب کہ مجھے جادو کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہے۔"

"جادو سے میری کوئی واقفیت نہیں ہے۔" نسرین نے بتایا۔ "البتہ یہ جانتی ہوں کہ لوگ جادو کے علم سے بہت فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"

"سب سے بڑا جادو تو میرے پاس آ گیا ہے۔ اب میں نہ صرف اس ناہید کو اپنا مطیع بنا لوں گا بلکہ اس کی ساری دولت' کاروبار اور جائیداد پر بھی آسانی سے قابض ہو جاؤں گا۔ تم یہ سن کر اچھل پڑو گی کہ افضال احمد کا سارا اثاثہ ڈیڑھ کروڑ روپے سے کہیں زیادہ ہے۔"

"ڈیڑھ کروڑ روپے.........!" نسرین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ دوسرے لمحے وہ اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگی۔ "مگر سجاد تم یہ سب کچھ اپنے نام کیسے کروا سکو گے؟ تم ابھی ابھی کہہ رہے تھے کہ ناہید پھر سے سارے اثاثے اپنے شوہر کے نام کر رہی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے گا۔ طلاق دینے کے بعد تم نہ تو افضال احمد کو بلیک میل کر سکو گے اور نہ ہی ناہید کو......... اب یہ تصویریں کس کام کی؟"

"اس کی نوبت ہی نہیں آئے گی' سارے اثاثے افضال احمد کے نام منتقل ہو جائیں۔ میں ایسا ہرگز ہونے نہیں دوں گا۔"

"تم ناہید کو ایسا کرنے سے کیسے روک سکتے ہو؟ وہ ہر قیمت پر سب کچھ اپنے شوہر کے نام کر دے گی۔ اس لئے کہ بقول تمہارے وہ بے حد خوف زدہ ہے اور اسے اپنی عزت اپنی جان سے زیادہ پیاری ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم کسی خوش فہمی میں مبتلا ہو۔" نسرین نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"افضال احمد زندہ ہو گا تو نا' اس کی بیوی اس کے نام اپنے اثاثے منتقل کر سکے گی؟" سجاد کے چہرے پر سفاکی چھا گئی۔

"کیا مطلب؟" نسرین اپنی جگہ سے اچھل پڑی اور اس کے بازو کے حلقے سے نکل آئی۔ "کیا افضال احمد زندہ نہیں ہے؟"

"افضال احمد زندہ ہے لیکن دو تین دن سے زیادہ کا مہمان نہیں ہے۔" اس کی آنکھوں میں درندگی تھی۔ "اسے اب زندہ رہنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ وہ پچاس برس کا ہو چکا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں بہت سارے عیش کر لئے ہیں۔ اب دوسروں کو بھی اس کے مواقع ملنے چاہئیں۔"

"تو......... تو کیا تم افضال احمد کو راستے سے ہٹا رہے ہو؟" نسرین کی آنکھیں خوف اور حیرت سے پھیل گئیں۔ "آخر کس لئے ایسا کر رہے ہو؟"

"یہ بہت ضروری ہو گیا ہے نسرین!" سجاد بے رحمی کے لہجہ میں بولا۔ "اس کمینی عورت نے میری بڑی زبردست توہین کی ہے۔ مجھے اپنے دفتر میں بلا کر مجھے ذلیل کیا ہے۔ میرے گھر میں میرے چہرے پر ایک بار نہیں دو تین بار تھوکا ہے۔ الٹے سیدھے ریمارکس لگا کر میرا دس لاکھ روپے کا چیک روک لیا ہے اور دس لاکھ روپے کا مال واپس کر رہی ہے جو اب دو کوڑی کا بھی نہیں رہا ہے اور وہ لوگ مجھ سے رقم کا مطالبہ کر رہے ہیں جن سے میں نے ادھار مال لیا تھا۔ اسی لئے میں گن گن کر اس سے بدلے لینا چاہتا ہوں۔ اسے نیست و نابود کر دینا چاہتا ہوں۔"

"کیا یہ تصویریں ایسی ہیں کہ ناہید تمہارے مطالبات کے آگے اپنے گھٹنے ٹیک دے؟ کیا تم اس کے سارے اثاثوں پر قابض ہو سکو گے؟"

"یہ تصویریں اس طرح کی ہیں کہ اسے اپنی ساری دولت میرے نام کرنا ہی پڑے گی۔ اس لئے کہ اسے اپنے بچوں کا مستقبل بھی تو بے حد عزیز ہے۔"

"جبھی تو یہ بریف کیس اپنے ساتھ ساتھ لئے پھر رہے ہو؟ ان تصویروں کو کسی بینک کے لاکر میں رکھ کیوں نہیں دیتے ہو۔ اس طرح یہ تصویریں اور محفوظ ہو جائیں گی۔" نسرین نے اسے مشورہ دیا۔ "ورنہ یہ بریف کیس کسی کے ہاتھ لگ گیا تو تم کف افسوس ملتے رہ جاؤ گے۔"

سجاد نے چٹاخ سے اس کے رخسار کا بوسہ لے لیا۔ "واہ! کیا اچھا مشورہ دیا ہے۔ حیرت ہے کہ اتنی چھوٹی سی بات میرے ذہن میں نہیں آئی۔"

"اچھا یہ تصویریں مجھے بھی تو دکھاؤ۔" نسرین بولی۔ "میں تمہارا یہ عظیم کارنامہ دیکھنا چاہتی ہوں۔"

سجاد نے تپائی سے بریف کیس اٹھا کر اپنی گود میں رکھا اور اسے کھولتا ہوا بولا۔

"جب یہ تصویریں ناہید دیکھے گی نا........... تب اس کی حالت دیکھنے کے قابل ہو گی۔ وہ تو جیتے جی مر جائے گی۔ وہ مجبور ہو جائے گی کہ ان تصویروں کے عوض اپنا سب کچھ مجھے دے دے۔ میرے قدموں میں ڈال دے۔"

سجاد نے اپنی بات ختم کر کے بریف کیس کھولا۔ اس نے اپنے بریف کیس کی تلاشی لی پھر سن سا ہو کر رہ گیا۔ وہ لفافہ کہیں نہیں تھا جو اس نے اندر رکھا تھا۔ اس نے حواس باختہ ہو کر پاگلوں کے انداز میں دو تین بار بریف کیس کی تلاشی لی۔ جب وہ لفافہ نہیں ملا تو اس نے اپنا بریف کیس صوفے پر الٹ دیا۔ ایک ایک چیز دیکھ لی۔ بریف کیس کا استر تک ادھیڑ لیا۔ لفافہ ہوتا تو ملتا۔ اس کا وجود ہی نہیں تھا۔

"کہاں گیا میرا لفافہ؟" وہ پاگلوں کی طرح صوفے پر بکھرے کاغذات کا جائزہ لینے لگا۔ وہ وحشت زدہ سا ہوا جا رہا تھا۔ "تم بھی تو میرا لفافہ تلاش کرو۔ وہ نیلے رنگ کا بڑا سا لفافہ ہے۔ اس میں بارہ تصویریں اور بارہ ہی نیگیٹوز ہیں۔"

نسرین نے ان کاغذات میں جو بریف کیس سے نکلے تھے' لفافہ تلاش کرنا شروع کیا۔ وہ ناکام ہونے کے بعد بولی۔ "سجاد! کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے وہ لفافہ دفتر میں کہیں رکھ چھوڑا ہو۔ وہ اس بریف کیس میں تو نہیں ہے۔ لفافہ الماری میں تو نہیں رکھا ہے؟"

"میں نے کل اس لفافے کو دفتر میں اس خیال سے رکھ دیا تھا کہ گھر میں رکھنے کی صورت میں کہیں شکیلہ کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ میں نے صبح دفتر پہنچ کر سب سے پہلے اس لفافے کو نکال کر بریف کیس میں رکھا تھا اور بریف کیس میں رکھنے سے پہلے ان تصویروں اور نیگیٹوز کو دو تین مرتبہ دیکھا بھی تھا۔ پھر اسے بریف کیس میں بڑی احتیاط سے رکھا تھا۔ مجھے یہ سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔"

"ایسا کرو........... ابھی اور اسی وقت ہم دفتر چلتے ہیں۔ دفتر چل کر دیکھتے ہیں۔ بہت ممکن ہے تم نے بے خیالی میں وہ لفافہ بریف کیس میں رکھنے کے بجائے میز کی دراز یا سیف میں رکھ دیا ہوں بعض اوقات کام کی زیادتی کے باعث ایسا ہو جاتا ہے۔" نسرین نے کہا۔

"تم کہتی ہو تو دفتر چل کر تسلی کر لیتے ہیں۔ ویسے مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں

نے لفافہ بریف کیس ہی میں رکھا تھا۔" اس نے تکرار کی۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ مسز ناہید افضال احمد نے جادو کے زور سے وہ لفافہ غائب کر لیا ہو۔" نسرین نے مذاق کے لہجے میں کہا۔

"ادھر میری جان پر بنی ہے اور تمہیں مذاق سوجھا ہے۔" سجاد کو ایک دم غصہ آ گیا۔ "میں اس کے لئے پاگل ہو رہا ہوں اور تم ہنس رہی ہو؟"

"پاگل ہونا تمہاری پرانی عادت ہے۔" نسرین معنی خیز لہجہ میں بولی۔ "کبھی تم میرے لئے بھی پاگل ہوئے تھے اور آج میں تمہارے لئے..........."

"اچھا اب دفتر چلو۔" سجاد کاغذات سمیٹ کر بریف کیس میں رکھتے ہوئے بولا۔ "تم کو ہر وقت مذاق سوجھتا رہتا ہے۔"

☆======☆======☆

افضال احمد رات گیارہ بجے گھر پہنچے تو بہت خوش تھے۔ آج انہوں نے وکیل کے پاس بیٹھ کر جائیداد منتقلی کے کاغذات تیار کروا لئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ نیک کام میں دیر نہیں ہونا چاہئے۔ وہ آج کا کوئی کام بھی کل پر ڈالنے کے قائل نہیں تھے اور پھر وہ جلد سے جلد پھر سے اپنے اثاثوں کے مالک بن جانا چاہتے تھے۔ مالک بنتے ہی وہ شکیلہ کو پا لینا چاہتے تھے جو ان کے ذہن اور دل پر پوری طرح چھائی ہوئی تھی اور اب ان کے لئے شکیلہ سے دور رہنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ زندگی جو عذاب ناک ہوتی جا رہی تھی اور فراق اذیت ناک بنتا جا رہا تھا۔ جدائی جو سوہانِ روح تھی۔ ناہید ان کے لئے سرد سی شے تھی جس میں نہ تو حرارت تھی' تازگی تھی اور نہ ہی جوانی تھی۔ جب کہ شکیلہ تو ایک آتش فشاں تھی جس کی تپش میں ہر لمحہ محسوس کرتے رہتے تھے۔

بچے سو چکے تھے۔ ان کے کمروں میں اندھیرا تھا۔ برآمدے میں چوکیدار اور ساٹھ پاور کا بلب اونگھ رہے تھے۔ چوکیدار نے ہارن کی آواز سن کر گیٹ کھولا۔ وہ گھر کے اندر داخل ہوئے تو خواب گاہ میں روشنی نظر آئی۔ اندر پہنچے تو دیکھا کہ ان کی بیوی جاگ رہی ہیں۔ انہوں نے بریف کیس پلنگ پر رکھ کر بیوی کو بانہوں میں بھرا تھا۔

انہیں اپنے شوہر کی یہ حرکت بڑی مضحکہ خیز لگی۔ اس میں چاپلوسی کی بو آ رہی تھی۔ شادی کے پہلے دو تین برس کچھ ایسے گزرے تھے کہ شوہر کی محبت میں انہوں نے والہانہ پن' بڑی گرم جوشی اور محبت کا جذبہ محسوس کیا تھا۔ وہ دفتر جانے اور دفتر سے آ کر اسی طرح بانہوں میں بھر لیتے تھے۔ سرشاری کی یہ کیفیت ایک بھولا بسرا خواب بن گئی

تھی۔ آج تو وہ کسی بجھے ہوئے آتش فشاں کی مانند تھیں۔ عمر کے اس حصے میں اور آج محبت کے اس بھونڈے اظہار کے پیچھے جو جذبہ کارفرما تھا اسے وہ خوب سمجھتی تھیں۔ وہ غیر محسوس انداز میں ان کے بازوؤں سے تڑپ کر نکل آئی تھیں اور افضال احمد کے ہونٹوں کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

وہ ان سے الگ ہو کر سنگھار میز کے قد آدم آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئیں۔ انہیں ایسا لگا تھا کہ وہ کسی موذی سانپ کے حلقے سے نکل آئی ہوں۔ انہوں نے اپنے بالوں اور ساڑھی کے پلو کو سینے اور شانے پر درست کرتے ہوئے آئینے میں انہیں دیکھتے ہوئے شکایتی لہجے میں کہا۔ "آج آپ کو بہت دیر ہو گئی؟"

افضال احمد کچھ خفیف سے ہو کر پلنگ پر بیٹھ گئے تھے۔ انہیں اس سرد مہری کی ذرّہ برابر بھی توقع نہ تھی۔ اگر وہ آج بااختیار ہوتے تو شاید ایک لات مار کر بیوی کو کمرے سے نکال دیتے اور اس بے رخی کا اس انداز سے انتقام لیتے۔ تاہم انہوں نے ضبط کر کے جواب دیا۔ "آپ ہی کا کام کر کے آ رہا ہوں۔"

"میرا کام؟" وہ اپنے بالوں کا جُوڑا بناتے بناتے ان کی طرف گھوم گئیں۔ "میں نے آپ کو کون سا کام دیا تھا؟ مجھے تو یاد نہیں آ رہا ہے۔"

"وہی اثاثوں کی منتقلی کا۔" انہوں نے جواب دیا۔ "وکیل کے پاس بیٹھ کر کاغذات تیار کروا کر لایا ہوں۔ صبح دس سے رات کے گیارہ بج گئے۔ سر کھجانے کی فرصت ہی نہیں مل سکی تھی۔ بڑی مشکل سے کاغذات ٹائپ ہو گئے۔ کل آپ کو چل کر دستخط وغیرہ کرنا ہوں گے؟"

"یہ آج آپ مجھے .... تم کے بجائے .... آپ .... آپ کہہ کر مخاطب کیوں کر رہے ہیں؟"

"میں تم کہوں یا آپ کہوں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل چیز ہے محبت، محبت میں تو ہر چیز جائز ہے۔" افضال احمد بھونڈے پن سے ہنسے۔

"اچھا .... لائیے .... وہ کاغذات تو دکھائیے جو آپ کے وکیل نے بڑی عرق ریزی سے تیار کیے ہیں۔" وہ سپاٹ لہجہ میں بولیں۔

افضال احمد نے فوراً ہی بریف کیس سے فائل نکال کر ان کی طرف بڑھا دی۔ "اطمینان سے صبح دیکھ لیں۔ اس وقت خاصی رات ہو رہی ہے۔"

انہوں نے اپنے شوہر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ فائل لے کر اسی کرسی پر

بیٹھ گئیں جو ان کے قریب تھی۔ وہ چند لمحوں تک کاغذات کی ورق گردانی کرتی رہیں اور عبارت پر سرسری نظریں ڈالتی رہیں۔ افضال احمد اپنی بیوی کا رویہ دیکھ کر چونکے تھے اور ماتھا بھی ٹھنکا تھا۔ مگر یہ سوچ کر انہوں نے اپنے دل کو تسلی دی تھی کہ اس روز سے وہ بے حد مغموم نظر آ رہی ہیں۔ آخر کیوں نہ ہو۔ اس کی ہیبت جو دل میں بیٹھی ہوئی ہے۔ گھاؤ جو گہرا ہے۔

وہ اپنے شوہر کی طرف دیکھتی ہوئی بولیں۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپ کو ان کاغذات کی تیاری کے لئے اپنے بارہ قیمتی گھنٹے ضائع کرنے پڑے۔ میں آپ کو بروقت اطلاع نہیں دے سکی۔ میں نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ میں کل سے دفتر جا رہی ہوں اور اپنے معمولات کا آغاز کر رہی ہوں۔"

"ایں!" افضال احمد کو ایسے لگا کہ کسی نے انہیں انتہائی بلندیوں سے نیچے گرا دیا ہو۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ان پر چند لمحوں تک سکتہ سا چھایا رہا تھا اور انہیں اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ "تمہاری عقل ٹھکانے نہیں ہے؟"

"پہلے میری عقل ٹھکانے نہیں تھی مگر اب ٹھکانے پر آ گئی ہے۔" انہوں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"کیا تم چاہتی ہو کہ سجاد تمہیں بلیک میل کرے؟ کل اخبارات تمہارا اسکینڈل اچھالیں۔" وہ ایک دم سے کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے تھے۔ "پھر میں، تم اور ہمارے بچے اس گھر سے نکل نہ سکیں؟ ساری دنیا میں ذلیل و رسوا ہو جائیں؟"

"سجاد کی کیا مجال ہے کہ وہ میری طرف انگلی بھی اٹھائے۔ میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے ڈال دوں گی۔ اخبارات میں میرا کوئی اسکینڈل آ ہی نہیں سکتا ہے؟" انہوں نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا۔

افضال احمد نے جھلا کر اپنی گود میں رکھا ہوا بریف کیس اٹھایا اسے پلنگ پر زور سے پھینک کر اٹھ کھڑے ہوئے اور برہمی سے بولے۔ "تم نہیں جانتی ہو سجاد کیسا خطرناک آدمی ہے۔ کس قدر ذلیل شخص ہے۔ اگر وہ دشمنی پر اتر آیا تو .... پھر تم تو کیا ہم میں سے کوئی بھی اس کے ہاتھوں سے بچ نہ سکے گا۔"

"سجاد سے کہیں زیادہ خطرناک اور ذلیل آدمی تو آپ ہیں .... آپ!" وہ غضبناک ہو کر بولیں۔

"کون میں.........؟" افضال احمد ایک دم بھونچکے سے ہو گئے۔ انہیں یقین نہیں آیا

کہ ان کی بیوی اس نفرت اور حقارت سے پیش آ سکتی ہے۔ انہیں نفرت انگیز گالی دے سکتی ہے' انہیں ذلیل کر سکتی ہے۔ "تم مجھے ذلیل کہہ رہی ہو .... مجھے .... اپنے شوہر کو؟" وہ بھڑک اٹھے تھے۔

"آپ کو نہیں تو کسے کہوں۔" انہوں نے بھی تنک کر ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "میں نے اپنی زندگی میں آپ جیسا ذلیل' کمینہ اور انتہائی گھٹیا شخص نہیں دیکھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اس قدر نیچ اور گرے ہوئے شخص ہیں۔ آپ نے تو ذلالت اور کمینگی کی انتہا کر دی ہے.........."

"اپنی زبان کو لگام دو ناہید!" وہ فرش پر پیر پٹخ کر بولے۔ "تم .... تم حد سے زیادہ تجاوز کرتی جا رہی ہو۔ اگر تم نے مزید کوئی بکواس کی تو.........." نفرت اور غصے سے ان کے سینے میں سانسیں پھول رہی تھیں' چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا اور سانسیں آواز کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ "میں تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔ میں نے تمہارے ساتھ کیا ذلالت کی جو تم مجھ پر بہتان لگا رہی ہو۔ گالی بک رہی ہو۔ صدمے نے تمہارا دماغ خراب تو نہیں کر دیا ہے؟"

"اگر آپ میں ہمت ہے تو زبان کھینچ کر بتائیں؟" وہ چیلنج کے انداز میں سینہ تان کر کھڑی ہو گئیں۔ "آپ نے میرے ساتھ کیا ذلالت کی یہ خود آپ مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ اگر آپ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں تو آپ کو خود پتا چل جائے گا۔"

"پہیلیاں نہیں بجھواؤ' صاف صاف بتاؤ کہ اصل بات کیا ہے؟ کیا تم میرے ماضی کا دکھڑا رونا چاہتی ہو؟" وہ ہذیانی انداز میں چیخے۔

"ذرا آہستہ بولئے۔" انہوں نے آگے بڑھ کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ "بچے سو رہے ہیں۔ اگر وہ شور سے جاگ کر آ گئے تو.......... کیا آپ اپنا گھناؤنا چہرہ انہیں دکھا سکیں گے؟ بچوں نے آپ کا یہ سیاہ اور گھناؤنا چہرہ دیکھ لیا تو پھر.......... آپ کا یہ سر ان کے آگے ہمیشہ جھکا رہے گا۔" وہ دروازے کے پاس سے ہٹ کر کرسی کے پاس آ گئیں۔ "مجھے آپ کی اس سیاہ کاری کے بارے میں کچھ نہیں کہنا ہے جو آپ نے دولت کے بل بوتے پر کی۔ اپنی حیثیت اور سماجی رتبے سے فائدہ اٹھایا۔ مجبور اور بے کس لڑکیوں اور عورتوں کے بدن لوٹے۔ اس لئے کہ اس کی سزا تو آپ کو خدا دے گا۔ میں نے اس کی ذات پر بھروسا کر کے سب کچھ اس پر چھوڑ دیا تھا۔ کیوں کہ میں جانتی تھی کہ مرد کے منہ کو ایک بار حرام لگ جائے تو اتنی آسانی سے نہیں چھوٹتی ہے۔ میں جانتی تھی کہ ایک نہ ایک دن

ان لڑکیوں اور عورتوں کی آہیں آپ کو لگیں گی۔ مگر میں یہ سب کچھ برداشت کرتی چلی آئی مگر آپ نے جو نیچ' نفرت انگیز اور غلیظ حرکت کی ہے میں اسے آخری سانس تک بھی بھلا نہ سکوں گی اور آپ کو معاف بھی نہیں کروں گی۔ کیا آپ واقعی اس قدر ذلیل انسان ہیں' افضال احمد!"

"تم بار بار ایک ہی رٹ لگائے جا رہی ہو۔ تکرار کر رہی ہو۔ میرا جرم اور میری ذلالت بتا کیوں نہیں رہی ہو؟" وہ پھر چیخے تھے۔

"مجھے اغوا کر کے برباد کرنے اور گھٹیا سطح پر لانے کا منصوبہ کس نے بنایا تھا؟ کیا یہ ذلیل منصوبہ آپ کا نہیں تھا؟"

"میرا!" وہ اتنے زور سے اچھلے جیسے کسی نے ان کی پشت میں چھرا گھونپ دیا ہو۔ "تم سے کس نے بتایا کہ یہ منصوبہ میرا تھا؟"

"جس کسی نے بھی بتایا ہو؟ کیا آپ کو اس سے انکار ہے' کیا آپ کو اس سے بھی انکار ہے کہ آپ نے سجاد کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلائی تھی؟"

"یہ جھوٹ ہے۔ میری ذات پر سراسر بہتان ہے۔ اس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ یہ منصوبہ میرا تھا؟"

"اس کا ثبوت آپ مجھ سے کیا مانگتے ہیں؟ اپنے ضمیر سے پوچھئے اور اس سے مانگئے ثبوت' آپ کا ضمیر آپ کو ثبوت دے گا۔"

"تم اندھیرے میں تیر چلا کر میرے وجود پر سیاہی نہیں مل سکتی ہو۔ آخر ان باتوں کا مقصد کیا ہے؟ اس کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے؟"

"کیا آپ اس حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں کہ میرے اغوا اور میری بربادی کا منصوبہ آپ نے اس غرض سے سجاد کے سامنے رکھا تھا کہ میں اس بدترین سانحہ کے بعد سارے اثاثے آپ کو اس وجہ سے منتقل کرنے پر مجبور ہو جاؤں گی کہ سجاد بلیک میل کرے گا۔"

"یہ محض تمہارا اندازہ ہے۔" افضال احمد دل میں ششدر ہو رہے تھے کہ ان کی بیوی کو اس منصوبے کا کیسے اندازہ ہو گیا۔ وہ تو خواب میں بھی سوچ نہیں سکتے تھے کہ ایک سیدھی سادی عورت ان کی باتوں سے اس منصوبے کی تہہ میں پہنچ بھی سکتی ہے۔ جس عورت کو وہ سیدھی سادی' اللہ میاں کی گائے اور نرم خو سمجھتے چلے آ رہے تھے وہ آج کل سے یکسر بدلی ہوئی اور تند خو نظر آ رہی تھی۔ شیرنی بن گئی تھی۔ خطرناک ہو گئی تھی۔

"کیا یہ بھی میرا اندازہ ہے کہ آپ اثاثوں کی منتقلی کے فوراً ہی بعد مجھے طلاق دے رہے تھے اور اپنی زندگی سے نکال رہے تھے۔ کیوں؟"

"یہ سب کچھ تمہارے کچے ذہن کی پیداوار ہے۔ اگر مجھے تم سے نجات پانا ہوتا تو میں تمہیں کب کا راستے سے ہٹا چکا ہوتا۔ کراچی شہر میں ایسے بدمعاشوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو چند سو روپوں کے عوض بڑے سے بڑا جرم کرنے سے بھی نہیں چوکتے ہیں۔ میں تمہیں ان کے ہاتھوں ٹھکانے لگا سکتا تھا۔"

"مگر یہ کام ذرا مشکل تھا اور قانون کو شک ہو سکتا تھا۔ لہٰذا دوسرا راستہ اختیار کیا گیا۔ ان بدمعاشوں کو نہ صرف میری عزت کا بلکہ دو ہزار کا لالچ دیا گیا اور یہ رقم بھی سجاد نے خرچ کی۔ آپ نے دو ہزار روپے دینا چاہے تو اس نے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ کیا یہ بات بھی غلط ہے؟"

افضال احمد کو تو سانپ سونگھ گیا۔ وہ حیران تھے کہ یہ بات ان کی بیوی کے علم میں کیسے آئی۔ یہ ایک راز تھا جس کا علم دو افراد کے سوا کسی تیسرے کو نہ تھا۔ سجاد نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ نہ تو شکیلہ کو اس منصوبے میں شریک کرے گا اور نہ ہی یہ بات وہ شکیلہ کو بتائے گا۔ پھر بھی وہ سنبھل کر بولے تو انہیں اپنی آواز میں کھوکھلا پن صاف محسوس ہو رہا تھا۔ "بہت دور کی کوڑی لائی ہو؟ تم جو چاہو بکتی جاؤ......... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"کیا یہ بھی غلط ہے کہ تین چار دن پہلے آپ اور سجاد اے بی سی چائنیز ریستوران میں ملے تھے۔ سجاد نے آپ کو تصویریں اور نیگیٹوز دکھائے تھے اور آپ نے اس سے یہ کہا تھا کہ یہ لفافہ تم سنبھال کر رکھو۔ میرے پاس رکھنا خطرے سے خالی نہ ہو گا اور وہاں میرے خلاف منصوبہ بنتا رہا۔ میری بربادی کے فیصلے ہوتے رہے۔ مستقبل کے منصوبے بنتے رہے۔ خواب دیکھے جاتے رہے۔ آپ اس سے بھی صاف انکار کر دیں۔"

افضال احمد کا چہرہ کسی لاش کی طرح سفید پڑتا چلا گیا۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ اپنی جگہ بے حس و حرکت ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے فائل کے اندر لگے ٹائپ شدہ اسٹامپ والے کاغذ نکال کر تیزی سے پھاڑے' اس کے پرزے پرزے کر کے افضال احمد کے منہ پر دے مارے۔ افضال احمد نے ان کاغذات کا یہ حشر دیکھا تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ ہذیانی انداز میں بولیں۔ "میں کوئی چیز آپ کے حوالے نہیں کروں گی۔ کل سے آپ دفتر بھی نہیں جائیں گے۔ آپ کا کوئی اختیار نہیں رہے گا۔

حتیٰ کہ آپ رات اس کمرے میں بھی نہیں گزاریں گے۔ آپ چھت والے کمرے میں رہا کریں گے۔ ہم اس گھر میں دو اجنبیوں کی طرح رہیں گے۔ میں آپ کو ہر مہینے جیب خرچ سو روپے دوں گی۔ بولئے منظور ہے؟"

"کیا میں پالتو کتا ہوں جو تم میرے ساتھ آلت آمیز سلوک کرنا چاہتی ہو؟ یہ مت بھولو کہ میں تمہارا شوہر ہوں۔"

"کتا تو پھر بھی وفادار ہوتا ہے۔ وہ آپ کی طرح پنچ اور گرا ہوا نہیں ہوتا ہے۔ میں آپ کے ساتھ نرمی سے اس لئے پیش آ رہی ہوں کہ آپ میرے شوہر ہیں۔ جس کا مجھے بے حد دکھ بھی ہے' پھر بچوں کے باپ بھی ہیں۔ بچے نہ ہوتے تو میں آپ کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیتی۔"

"اب اس میں کون سی کسر رہ گئی ہے؟" وہ خشونت کے لہجے میں بولے۔ "میں ابھی اور اسی وقت گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ مجھے توہین اور ذلت منظور نہیں ہے۔ میں تم سے گن گن کر بدلے لوں گا۔ میں جاتے جاتے تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ منصوبہ واقعی میرا تھا۔ میں نے سجاد کی مدد سے کامیابی حاصل کی ہے۔ اگر تم نے دو دن کے اندر اندر میرے نام اثاثے منتقل نہیں کئے تو میں ساری تصویروں کی کاپیاں بنا کر دفتر اور محلے میں تقسیم کرا دوں گا۔ پھر اخبارات کو بھیج دوں گا۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ تم کس طرح گھر سے باہر نکلتی ہو؟ کاروبار چلاتی ہو' زندہ رہتی ہو؟"

"آخر بلی تھیلے سے باہر آ گئی۔" وہ زہر بھرے لہجے میں بولیں۔ "آپ اپنی حسرت تو تب پوری کریں گے نا جب آپ کے پاس تصویریں اور نیگیٹوز ہوں؟ وہ سجاد کے پاس کہاں ہیں؟ میرے پاس آ گئی تھیں۔ میں نے انہیں جلا دیا۔"

افضال احمد قہقہہ مار کر ہنسے۔ "کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو؟"

ناہید نے تکیہ کے نیچے سے وہ تصویر نکال کر دکھائی۔ انہوں نے اسی لمحے کے لئے جلایا نہیں تھا۔ یہ تصویر دیکھتے ہی افضال احمد کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ وہ اس تصویر کے پرزے پرزے کرتے ہوئے بولیں۔ "آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے تو سجاد سے جا کر پوچھ لیں۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہے کہ وہ لفافہ اس کے بریف کیس سے کیسے غائب ہوا اور کس نے غائب کیا؟"

"یہ ساری حرکت شکیلہ کی معلوم ہوتی ہے؟" وہ مردہ لہجے میں بولے۔

"شکیلہ........." انہوں نے کہا۔ "میری اس غریب سے اس روز کے بعد سے کوئی

ملاقات نہیں ہوئی ہے۔" وہ شکیلہ کو اس معاملہ میں ملوث کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ اس لئے جھوٹ بول رہی تھیں۔ "آپ اپنی گندی زبان سے اس کا نام نہ لیں بلکہ میری نظروں کے سامنے سے دفع ہو جائیں۔ اب تو میں آپ کو اپنے گھر میں بھی دیکھنا نہیں چاہتی ہوں۔ گیٹ آؤٹ فراہم ہیئر۔"

افضال احمد کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک اٹھی تھیں۔ بیوی کی بات سن کر انہیں ایسا محسوس ہوا تھا کہ ان کے منہ پر جوتا آ کر لگا ہو۔ ان کا دماغ سنسنا گیا۔ وہ سنسناتے ہوئے الماری کی طرف بڑھے۔ الماری کے پاس پہنچ کر دروازہ کھولا۔ چند لمحے بھی نہیں گزرے تھے بیوی کی استہزائی آواز کمرے میں گونجی۔ "کیا آپ کو اس کی تلاش ہے؟"

انہوں نے یکبارگی مڑ کے دیکھا تو ان کی بیوی کے ہاتھ میں وہی پستول تھا جسے وہ تلاش کر رہے تھے۔

اس کی نالی کا رخ ان کی طرف تھا۔ وہ نشانے کی زد میں تھے۔ بیوی کی انگلی لبلبی پر تھی۔ وہ کسی بھی لمحہ حرکت کر سکتی تھی۔

"میں تمہیں یہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گی افضال!" وہ نفرت سے بولیں۔

اپنی بیوی کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر افضال احمد اپنی جگہ سے بڑے زور سے اچھل پڑے تھے۔ دوسرے لمحے انہیں جیسے سانپ سونگھ گیا تھا اور رگوں میں دوڑتا ہوا لہو برف کی طرح منجمد ہو گیا تھا۔ ان کا چہرہ جو ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا اور سفید پڑتا چلا گیا۔ وہ دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پستول کی نالی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کی سیدھی سادی بیوی کا ذہن اس قدر تیز ہو گا۔ آج وہ ایک دم سے بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی اور پہلے ہی سے خطرے کی بو سونگھ کر پستول کو بھی اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ ان کی بیوی کو جیسے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ نفرت اور غصے کے عالم میں کوئی خطرناک قدم بھی اٹھا سکتے ہیں۔ ان کی ساری بساط الٹ چکی تھی۔ وہ نہ صرف بدترین شکست کھا چکے تھے بلکہ ذلیل بھی ہو چکے تھے۔ اپنی بیوی کے سامنے' آج اب ان کے پاس کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے موت کا فرشتہ ناچ رہا تھا۔ کسی بھی لمحے پستول کی نالی سے نکلتی ہوئی گولی ان کی زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ کیا وہ مرنا چاہتے ہیں یا زندہ رہنا؟ انہیں یہ فیصلہ بھی کرنا تھا۔

انہوں نے اس پل زندہ رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ابھی وہ مرنا نہیں چاہتے تھے۔ پھر

ان کی نظروں کے سامنے وہ سب کچھ گھوم رہا تھا جو زندگی کا حسن تھا۔ ان کا ماضی جو بڑا رنگین تھا ان کا خیال تھا کہ وہ زندہ رہ کر پھر سے اس ماضی کو پا سکتے ہیں۔ وہ دن لوٹ کر آ سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ کوشش کر کے حالات پر قابو پا لیں۔ انہوں نے اس لمحے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی بیوی کے قدموں میں گر جائیں گے مگر اس ذلت و خواری کا بدلہ ضرور لیں گے۔ کوئی تدبیر کر کے پھر سے ساری دولت' کاروبار اور جائیداد پر قابض ہو جائیں گے۔ گو اس کے لئے انہیں ایک طویل عرصہ انتظار کرنا ہو گا لیکن اس کی انہیں کوئی پرواہ نہ تھی۔ انہیں امید تھی کہ وہ وقت سے بہت پہلے اپنی بیوی کو اپنے راستے سے ہٹا دیں گے۔ ایک عورت ہے' کمزور ہے' بے وقوف ہے۔ اسے پھر سے محکوم بنانا کون سے مشکل کام ہو گا۔

"میں پستول تلاش نہیں کر رہا تھا۔" وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولے۔

"پستول نہیں تو کیا پارس پتھر تلاش کر رہے تھے جو آپ کی تقدیر بدلنے کا باعث بن جاتا؟" بیگم ناہید تمسخر سے بولیں۔

"میں رقم تلاش کر رہا تھا۔" ان کا حلق خشک ہو رہا تھا اور کانٹے چبھ رہے تھے۔

"اس وقت آپ کو رقم کی کیا ضرورت پڑ گئی؟ بقول آپ کے' بینک اکاؤنٹ میں بارہ لاکھ تو پڑے ہیں۔"

"اکاؤنٹ میں رقم بالکل نہیں ہے۔ میں ابھی اور اسی وقت یہاں سے چلا جانا چاہتا ہوں۔" افضال احمد نے جواب دیا۔ "اس لئے رقم تلاش کر رہا تھا۔"

"گھر سے نکل کر جانے کے لئے رقم کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے۔ یوں بھی آپ کی جیب نوٹوں سے بھری رہتی ہے۔"

"میں اس گھر سے ہمیشہ ہمیشہ نکل کر جانا چاہتا ہوں۔ اتنی دور جانا چاہتا ہوں کہ تم میں سے کوئی بھی مجھے پا نہ سکے۔"

"یہ آپ نے دانشمندانہ فیصلہ کیا ہے۔ میں آپ کے اس فیصلے کی قدر کرتی ہوں۔" وہ بولیں۔ "آپ اٹیچی اٹھا کر چلنے کی تیاری کریں۔ اپنے کپڑے وغیرہ رکھ لیں۔ میں آپ کو ایک معقول رقم دوں گی تاکہ آپ اس شہر سے نکل کر کسی اور شہر میں جا کر پناہ لے لیں اور میں آپ کو ہر مہینے اتنی رقم بھیجتی رہوں گی جو آپ کے گزارہ کے لائق ہو۔"

بیوی کی باتیں سن کر ان کا سر چکرا گیا تھا۔ ان کی بیوی نے ان کی ساری تدبیر الٹ کر رکھ دی تھی۔ وہ تو انہیں جڑ سے کاٹ کر پھینکنے پر تلی ہوئی تھی۔ یہاں سے جانے کے

بعد ان کی حیثیت ایک کٹے ہوئے درخت کی سی رہ جاتی تھی۔ وہ یہاں اس گھر میں رہ کر ہی کچھ کر سکتے تھے۔ اس گھر اور شہر سے دور جانے کے بعد وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ انہیں پچھتاوا ہو رہا تھا کہ ان کی زبان سے اس منصوبے کے بارے میں کیوں نکلا۔ اگر اس منصوبے کا ذکر ان کی زبان پر نہیں آتا تو پھر بھی ایک راستہ اس گھر میں رہنے کا ہو جاتا تھا۔ مگر اب تو کمان سے تیر نکل چکا تھا۔ نکلا تیر واپس نہیں آ سکتا تھا۔

مگر وہ حوصلہ ہارنے والوں میں سے نہیں تھے۔ ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ انہوں نے تنکے کا سہارا لیا۔ "تم نے تو کہا تھا کہ یہاں سے زندہ جانے نہیں دوں گی۔ تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ گولی چلاؤ' میرا خاتمہ کر دو۔ مجھے جانے کیوں دے رہی ہو؟"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے' تم تو زندہ درگور ہو چکے ہو۔" بیگم ناہید نے پستول کو فضا میں لہرایا۔ "کیا آپ کے لئے یہ سزا کافی نہیں ہے؟ اگر آپ نے اسی سزا سے سبق لیا تو یہ سمجھئے کہ آپ نے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔"

"میں اس زندگی سے مر جانا بہتر سمجھتا ہوں۔ بہتر ہے کہ تم مجھے گولی مار دو اور میری لاش لے جا کر کسی ویرانے میں پھینک دو۔"

"کیا آپ مجھے اتنا احمق سمجھتے ہیں کہ میں آپ کو قتل کر کے اپنے ہاتھ خون سے رنگ لوں گی؟ نہیں میرے سرتاج نہیں' میں آپ کو قتل نہیں کروں گی۔ اس سے نہ صرف میری ساری زندگی تباہ و برباد ہو جائے گی بلکہ میرے معصوم بچوں کا سارا مستقبل غارت ہو کر رہ جائے گا۔"

بیگم ناہید ان کا جواب نہ پا کر بولیں۔ "آپ جیسے بے غیرت لوگ کبھی مرنا پسند نہیں کرتے' وہ مرنا چاہیں بھی تو نہیں مر سکتے۔ آپ کی بہتری اسی میں ہے کہ آپ ابھی اور اسی وقت اپنا گھناؤنا چہرہ لے کر یہاں سے نکل جائیں۔ میں اب ایک لمحے کے لئے آپ کا وجود برداشت نہیں کر سکتی ہوں۔"

"اگر میں یہاں سے نہیں گیا تو تم میرا کیا بگاڑ لو گی؟ زیادہ سے زیادہ یہی کرو گی نا کہ مجھے گولی مار دو گی۔ یہی میں چاہتا ہوں۔"

"میں بچوں کو لا کر آپ کا گھناؤنا چہرہ دکھاؤں گی اور ان سے کہوں گی کہ دیکھو .... یہ ہے تمہارا باپ جس نے شیطان کو بھی مات کر دیا ہے۔"

افضال احمد بچوں کا ذکر سن کر نرم پڑ گئے اور بولے۔ "ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں لیکن میری ایک شرط ہے۔ میں چاہوں گا کہ تم میری وہ شرط پوری کر دو۔"

"اول تو تم اس لائق نہیں رہے کہ تمہاری کوئی شرط پوری کی جائے۔ اگر وہ شرط میرے لئے قابل عمل رہی تو اسے ضرور پوری کروں گی۔"

"میں دو تین مہینے میں ایک بار اپنے بچوں کو آ کر دیکھنا اور ان کے ساتھ کچھ دن گزارنا چاہتا ہوں۔ اس کی اجازت ہونا چاہئے۔"

"آپ شوق سے اپنے بچوں سے مل سکتے ہیں۔ اس گھر کے اندر قدم رکھ کر نہیں' بچے آپ سے اسی جگہ آ کر مل لیں گے جہاں آپ کی رہائش ہو گی۔"

"بچے کیا سوچیں گے؟ کیا کہیں گے؟ کیا تم مجھے ان کی نظروں میں بھی ذلیل کر کے رکھنا چاہتی ہو؟"

"وہ کچھ نہیں سوچیں گے' میں بچوں کو سمجھا دوں گی' بتا دوں گی کہ ہمیں ایسا کس وجہ سے کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ مسئلہ میرا ہے آپ کا نہیں۔"

"اچھا تو میں اب جا رہا ہوں لیکن ایک بات یاد رکھو۔ تم میرے ساتھ جو کچھ بھی کر رہی ہو وہ اچھا نہیں کر رہی ہو۔ کل تم اپنے کئے پر پچھتاؤ گی۔"

"میں پچھتاؤں گی نہیں بلکہ خدا کا شکر ادا کرتی رہوں گی کہ اس نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔"

افضال احمد ان کی بات سن کر اندر ہی اندر تپ کر رہ گئے۔ وہ مسلسل ان کے وجود پر جوتے مارتی چلی جا رہی تھیں۔ بہرکیف وہ زندہ رہنا چاہتے تھے۔ اس عورت سے انتقام لینے کے لئے جو انہیں زندہ درگور کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس وقت وہ یہاں سے نکل کر کہیں دور چلے جانا چاہتے تھے۔ پھر سجاد سے باہم مشورہ کر کے کوئی قدم اٹھانا چاہتے تھے۔ انہوں نے چند لمحوں تک سوچتے رہنے کے بعد کہا۔ "اس وقت میری جیب میں سو روپے پڑے ہیں۔ تم مجھے پانچ ہزار کی رقم دے دو تا کہ میں کسی شہر میں جا کر مکان لے کر رہ سکوں۔"

بیگم ناہید نے ان کی بات سن کر پستول کو میز پر رکھا اور وہ اپنی الماری کی طرف بڑھیں تا کہ الماری سے رقم نکال کر ان کے منہ پر دے ماریں۔ جیسے وہ الماری کی طرف بڑھیں افضال احمد میز کی طرف غیر محسوس انداز سے بڑھے۔ پستول اور ان کے درمیان چند قدم تھے جسے وہ ایک ہی جست میں طے کر سکتے تھے اور جب کہ بیگم ناہید کی پشت بھی

ان کی طرف تھی۔ وہ اپنی بیوی کی غفلت کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ انہوں نے دیر نہیں کی۔ بیگم ناہید الماری کھول کر اس کے خفیہ خانے سے رقم نکال رہی تھیں کہ وہ تیزی کے ساتھ میز کی طرف بڑھے اور دوسرے ہی لمحے پستول ان کے ہاتھ میں تھا۔

بیگم ناہید نے آہٹ سی محسوس کی تو پلٹ کر دیکھا تو ایک لمحے کے لئے سن سی ہو کر رہ گئی تھیں۔ اپنے شوہر کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر ان کے اوسان ذرہ برابر بھی خطا نہیں ہوئے تھے۔ وہ خود پر قابو پا کر کھڑی رہیں۔ البتہ ان کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ وہ اپنے شوہر کے چہرے پر مکروہ اور شیطانی مسکراہٹ دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں فتح مندی کسی ابلیس کی طرح رقص کر رہی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

"افضال احمد!" وہ بڑے پُرسکون لہجے میں بولیں۔ "بہتر ہے کہ آپ پستول کو وہیں رکھ دیں جہاں سے اسے اٹھایا ہے۔"

"وہ کس لئے؟" افضال احمد کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اس لئے کہ اس پستول سے آپ کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا انتہائی کمینگی ہے۔" وہ خشونت سے بولیں۔

"محبت اور جنگ میں ہر چیز جائز ہے۔" افضال احمد نے جواب دیا۔ "میرا پستول پہلے تمہارے قبضے میں تھا۔ اب میرے قبضے میں ہے۔"

"ہم دونوں کے درمیان ایک سمجھوتہ طے پا چکا ہے۔ آپ نے اس پر عمل کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ لہٰذا آپ اپنا وعدہ پورا کریں۔"

"تم نے وہ سمجھوتہ اس پستول کی نالی پر کیا تھا۔ لہٰذا اب میں اسی پستول کی نالی پر اپنا سمجھوتہ اور اپنی کچھ شرائط پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ ایک نہیں اپنی دس ہزار شرائط پیش کریں۔ مگر ایک بات کان کھول کر سن لیں۔ آپ کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

"فائدہ کیوں نہیں ہو گا۔" افضال قہقہہ مار کر ہنسے۔ "اس سے مجھے جو فوائد حاصل ہوں گے تم اس کا تصور تک نہیں کر سکتی ہو۔"

"میں آپ کی کوئی بات کسی قیمت پر نہیں مانوں گی۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں ہے تو آزما کر دیکھ لیں۔"

"آزماؤں گا' ضرور آزماؤں گا۔" وہ بیگم ناہید کے روبرو آ کھڑے ہوئے۔ اپنی انگلیوں پر پستول نچاتے ہوئے بولے۔ "میز پر سے کاغذ قلم اٹھاؤ۔ جو میں کہتا ہوں اس پر

لکھتی جاؤ۔ اس میں تمہاری زندگی اور بہتری ہے۔"

"اگر میں نے آپ کے حکم کی تعمیل نہ کی تو؟" وہ بے خوفی سے ان کی آنکھوں میں جھانکنے لگیں۔

"تو پھر میں اس پستول کی دو گولیاں تمہارے سینے میں اتار دوں گا اور تمہاری لاش کسی ویرانے میں لے جا کر پھینک دوں گا۔"

"مجھے قتل کر کے آپ پھانسی پر چڑھ جائیں گے۔ پھر آپ کے ہاتھ موت کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔"

"میں تمہیں قتل کر کے اس طرح ٹھکانے لگواؤں گا کہ مجھ پر کسی کو بھی شک نہیں ہو گا اور نہ ہی تمہاری لاش پولیس والوں کے ہتھے لگ سکے گی۔ اگر پولیس والوں کو مجھ پر شک ہوا بھی تو میں ان کا منہ اتنا بھر دوں گا کہ وہ کھل نہیں سکے گا۔"

"شاید آپ بھول رہے ہیں کہ جرم کبھی نہیں چھپتا ہے۔ جرم کا اپنا ایک وجود ہوتا ہے جو بولتا رہتا ہے اور پھر پولیس کوئی بکاؤ مال نہیں ہے۔"

"فضول باتوں میں میرا اپنا وقت ضائع نہیں کرو۔ میں جو کہتا ہوں وہ کرو۔ چل کر میز پر بیٹھو۔ میں جو کہتا ہوں وہ لکھتی جاؤ۔"

افضال احمد نے ناہید کے ساتھ ایک نہیں پورے بیس برس ان کے ساتھ گزارے تھے۔ ان بیس برسوں میں بھی وہ اپنی بیوی کو سمجھ نہیں پائے تھے اور نہ ہی انہیں اندازہ ہو سکا تھا کہ ان کی بیوی کن صفات اور خوبیوں کی حامل ہے۔ کتنی ذہانت' دور اندیشی اور ہشیاری موجود ہے۔ افضال احمد نے بیگم ناہید کے شانے میں پستول کی نالی چبھوتے ہوئے انہیں میز کی طرف دھکیلا۔ چشم زدن میں جو کچھ ہوا وہ اتنا غیر متوقع اور اچانک تھا کہ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ جو کچھ ہوا وہ کسی جاسوسی فلم کے سنسنی خیز منظر سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ بیگم ناہید نے ایک دم سے پلٹ کر بے خوف ہو کر اپنے دونوں ہاتھ ان کے سینے پر رکھ کر اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے۔ قلابازی کھاتے ہوئے پلنگ پر جا گرے تھے۔ مگر وہ فوراً ہی سنبھل کر اٹھے۔ ان کی آنکھیں غصے سے ابل پڑیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ "ذلیل' کمینی' میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"چلئے یہی سہی۔" وہ میز کے پاس کھڑے ہو کر شانے پر ساڑھی کا پلو درست کرنے لگیں۔ "مگر میری موت کے بعد آپ کو جائیداد' دولت اور کاروبار میں سے کچھ بھی نہیں ملے گا۔ میں زندہ رہوں گی تو آپ یہ سب کچھ پا سکیں گے۔"

"تمہاری موت کے بعد یہ سب کچھ میرے نام آپ ہی آپ ہو جائے گا۔ اب میں تمہیں بخشوں گا نہیں، قتل کر کے رہوں گا۔"

"آپ مجھے قتل نہیں کر سکتے ہیں۔"

"اچھا۔" وہ طیش میں آ گئے۔ ان پر قتل کا جنون سوار ہو گیا تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ پستول سے بیگم ناہید کے سینے کا نشانہ لیا۔ وہ دل کی جگہ پستول کی گولی داغ دینا چاہتے تھے۔ بیگم ناہید اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑی رہیں جیسے ان کے پیر فرش پر گڑ کے اس کا حصہ بن گئے ہوں۔ ان کے چہرے پر خوف نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھیں۔ جیسے وہ جانتی تھیں کہ اپنے آپ کو موت سے بچانے کی ہر کوشش بے سود ہو گی۔

افضال احمد نے لبلبی پر انگلی رکھ کر اس پر دباؤ ڈالا۔ ایک .... دو .... تین .... چار مرتبہ انہوں نے اپنی انگلی کو حرکت دی۔ اس پستول میں سے ایک گولی بھی نہیں نکلی۔ چاروں مرتبہ کلک کی آواز گہرے سکوت میں گونج کر رہ گئی۔ افضال احمد نے حیرت اور صدمے سے پستول کی طرف دیکھا۔ اب ان پر انکشاف ہوا کہ پستول کا چیمبر خالی پڑا ہے۔ ان کی بیوی خالی پستول سے انہیں دھمکاتی رہی تھی۔ انہوں نے نفرت، غصے اور جنون میں آ کر بیگم ناہید پر پستول دے مارا۔ اگر وہ فوراً ہی جھکائی نہیں دیتیں تو ان کی کھوپڑی بچ جاتی۔

پستول دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑا۔ انہوں نے اپنی بیوی کے ہونٹوں پر تمسخرانہ سی مسکراہٹ دیکھی۔ چہرے پر ایک مغرور فاتحانہ سا انداز تھا۔ اس نے انہیں کھولا دیا۔ وہ ایک لخت کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے تھے۔ ان کے اندر جو نفرت کا لاوا تھا ان کی نس نس میں پگھلنے لگا تو وہ غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے اپنی بیوی کا گلا دبانے کے لئے بڑھے۔ اس لمحے ان کی حالت ایک پاگل کتے کی سی ہو رہی تھی۔ انہیں کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان پر اُس وقت یہ جنون سوار تھا کہ کسی بھی قیمت پر اپنی بیوی کا گلا دبا کر اسے جہنم رسید کر دیں۔ اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر ویرانے میں پھینک آئیں۔ وہ اپنی ساری زندگی میں کبھی نفرت اور غصے سے اس طرح آپے سے باہر نہیں ہوئے تھے۔

وہ نفرت اور غصے میں اس قدر اندھے ہو چکے تھے کہ انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اندھا دھند بیوی کی طرف بڑھے تو ان کا پیر تپائی سے ٹکرایا۔ وہ اس تیزی

میں تھے کہ پیر کے ٹکراتے ہی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے تھے۔ فرش پر منہ کے بل گر پڑے۔ چند لمحے بعد اٹھے تو ٹھٹک کے رہ گئے۔ بیگم ناہید کے ہاتھ میں پستول تھا جو انہوں نے میز کی دراز سے نکالا تھا۔ یہ پستول ان کا اپنا تھا۔ جو انہوں نے کچھ دنوں پہلے ہی حفظ ماتقدم کے طور پر خریدا تھا۔ افضال احمد پہلے تو یہ سمجھے تھے کہ یہ وہی خالی پستول ہے جو انہوں نے ابھی ابھی اپنی بیوی پر کھینچ مارا تھا۔ دوسرے لمحے ان کی نظر اپنے اس پستول پر پڑی جو فرش پر پڑا ان کا منہ چڑا رہا تھا، انہیں اس دوسرے پستول کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔

وہ اس پستول کو بھی خالی سمجھ کر بیوی کی طرف بڑھے۔ بیگم ناہید نے پستول پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر کے لبلبی پر انگلی رکھ دی۔ وہ تیز و تند لہجے میں بولیں۔ "ذلیل .... کمینے انسان! اس پستول کو خالی مت سمجھنا اور میری بات کو گیدڑ بھبکی نہیں سمجھنا۔ اگر تم نے میری طرف ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو میں اپنی جان بچانے کے لئے تمہیں شوٹ کرنے سے دریغ نہیں کروں گی۔ اس کی ساری گولیاں تمہارے جسم میں اتار دوں گی۔"

"مگر تم مجھے قتل کر کے قانون کے ہاتھوں سے بچ نہیں سکتی ہو اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم مجھے قتل نہیں کرو گی، تم بچوں کی خاطر قاتلہ بننا پسند نہیں کرو گی۔"

"میں آپ کو قتل کر کے بھی قانون کے ہاتھوں سے بچ سکتی ہوں کہ میں نے یہ قتل حفاظت خود اختیاری کے لئے کیا ہو گا۔"

"اس کے لئے قانون ثبوت مانگتا ہے۔ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم نے اپنی جان کے لئے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے۔"

"میرے پاس جو ثبوت ہے آپ اس کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ ہم دونوں کی ساری گفتگو ٹیپ ہو رہی ہے۔" بیگم ناہید معنی خیز انداز سے مسکرائیں۔

"کہاں ہے ٹیپ ریکارڈر؟" افضال احمد اچھل پڑے۔ انہوں نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ انہیں کہیں ٹیپ ریکارڈر نظر نہیں آیا۔

"پلنگ کے نیچے رکھا ہے۔" وہ فاتحانہ انداز سے بولیں۔ "یقین نہ آئے تو آپ یہیں سے پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھ سکتے ہیں۔ پلنگ کے قریب جانے کی آپ کو اجازت نہیں ہے۔ اگر آپ نے ٹیپ ریکارڈر کی طرف ہاتھ بڑھایا تو پھر میں آپ کو بخشوں گی نہیں۔"

انہوں نے اپنی تسلی کرنے کی غرض سے فرش پر دو زانو بیٹھ کر پلنگ کے نیچے جھانک کر دیکھا۔ وہاں واقعی ٹیپ ریکارڈر رکھا ہوا تھا۔ یہ وہی ٹیپ ریکارڈر تھا جو وہ گزشتہ سال امریکہ سے لے کر آئے تھے۔ بڑا حساس قسم کا ٹیپ ریکارڈر تھا اور بڑا قیمتی تھا۔ گفتگو کو ٹیپ ہوتا دیکھ کر ان کے بدن میں جیسے جان ہی نہ رہی۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہ تھا۔ اب ان میں اتنی سکت نہ رہی تھی کہ اپنی جگہ سے ہل سکیں۔

"اب میں آپ کو ایک دمڑی اور ایک لمحے کی مہلت دینے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں۔" وہ کسی غضب ناک شیرنی کے انداز میں غرائیں۔ "آپ جس حالت میں ہیں اس حالت میں یہاں سے دفع ہو جائیں۔ چلیں اٹھیں یہاں سے نکلیں۔ میں ایک سانپ پر بھروسہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

افضال احمد اس بازی میں اپنا سب کچھ ہار چکے تھے۔ اب ان کے پاس کچھ بھی نہیں رہا تھا جو وہ داؤ پر لگاتے۔ انہیں اپنی بیوی کے حکم کی تعمیل بلا چوں وچرا کرنا پڑی۔ وہ ان پر پستول تانے گیٹ تک آئی تھیں۔ گیٹ کے پاس آ کر بیگم ناہید نے انہیں پیچھے سے اتنے زور سے دھکا دیا تھا کہ وہ زمین پر کسی گیند کی مانند لڑھک گئے تھے۔

وہ گیٹ کو قفل کر کے اپنے کمرے میں جانے کے بجائے چھت پر چلی گئیں۔ چھت پر کھڑے ہو کر اپنے شوہر کو دیکھتی رہیں جو اپنے کپڑوں سے گرد جھاڑتے کسی لٹے ہوئے مسافر کی طرح جا رہے تھے۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ اپنے کمرے آئیں۔ اپنا کمرہ اندر سے بند کر کے پلنگ پر کسی کٹی پتنگ کی طرح بکھر گئیں اور پھر ایک دم سے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

☆------☆------☆

شکیلہ نے گھر واپس جاتے ہوئے مسکن گولیوں کی ایک شیشی خرید لی تھی۔ اس کے ذہن میں ایک نادر تدبیر آئی تھی۔ اب اس نادر تدبیر پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ گھر پہنچ کر سیدھی غسل خانے میں گئی۔ وہ بڑی دیر تک شاور کے نیچے کھڑی رہی۔ وہ اپنے ذہن اور بدن کو رم جھم برستی پھواروں کی ٹھنڈک سے سکون پہنچا رہی تھی اور ساتھ ساتھ اپنے منصوبے کے پہلوؤں کا جائزہ بھی لیتی جا رہی تھی۔

شکیلہ نہا کر بالوں میں تولیہ لپیٹ کر پلنگ پر نیم دراز ہو گئی تو اس کی نظروں کے سامنے ماں باپ کے چہرے گھومنے لگے۔ وہ بڑے دکھ اور کرب سے سوچ رہی تھی' پچھتا رہی تھی۔ کتنا اچھا تھا کہ وہ ماں باپ کا کہا مان لیتی۔ اپنے خوابوں کے پیچھے یوں نہ بھاگتی۔

اگر وہ ماں باپ کی پسند سے اپنا گھر بسا لیتی تو آج نہ صرف سکون کی بلکہ عزت کی زندگی گزار رہی ہوتی۔ اسے ایک تحفظ تو ملتا۔ اس کے ناموس کا تقدس تو رہتا۔ آج اس نے اپنی پسند کی شادی کر کے' ماں باپ کی عزت کو تاراج کر کے کیا پایا؟ سجاد نے اسے بیوی نہیں بازاری جنس بنا دیا اور وہ اسے غیر محسوس انداز سے بیچتا رہا۔

وہ اب سجاد سے بدلہ لینا چاہتی تھی۔ ایک ایسا انتقام کہ سجاد ساری زندگی یاد کرے۔ وہ دل میں سجاد سے مخاطب تھی۔ "سجاد! تم عورت کو نہیں جانتے ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ عورت ایک بکاؤ مال ہے۔ اسے محبت کے فریب پر لوٹا جا سکتا۔ عورت کو محبت کے نام پر فریب دیا جائے تو وہ اس فریب کو کبھی نہیں بھولتی ہے۔ تم یہ سمجھ رہے ہو کہ آسائش کی خوابناک اور شاہانہ زندگی کا فریب دے کر اور جنت جیسی زندگی کے حصول کا جھانسہ دے کر تم مجھے غیر مردوں کے بستر کی چادر کی شکن بناتے پھروگے۔ تم نے میرا بدن میلا کر دیا۔ مجھے بیوی نہیں بلکہ طوائف بنا دیا۔ میری عزت و ناموس کی دھجیاں بکھیر دیں۔ مگر سجاد! تم یہ بھول گئے کہ جو عورت مرد کی زندگی کو جنت بنا سکتی ہے اسے جہنم بھی بنا سکتی ہے۔"

رات گیارہ بجے سجاد آیا تو اس کی حالت دیکھ کر شکیلہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی سجاد ہے۔ اس نے بڑی حیرت سے سجاد کو دیکھا۔ سجاد کا چہرہ برسوں کے دق کے مریض کی طرح پیلا نظر آ رہا تھا۔ چند گھنٹوں ہی میں اس کی آنکھوں کی رونق اُڑ گئی تھی اور وہ اندر دھنسی ہوئی ویران اور بے جان سی لگ رہی تھیں۔ اس کے بالوں پر گرد سی جمی ہوئی تھی اور لباس پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے حواس میں نہیں تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ سجاد کی یہ حالت اس تصویروں والے لفافے کی گمشدگی نے کر دی ہے۔ وہ اسی لفافے کے لئے سخت پریشان ہو رہا ہے جو اس کی تقدیر بدلنے والا تھا۔ وہ سجاد کی یہ حالت دیکھ کر دل میں بہت خوش ہو رہی تھی' ہنس رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس کی حالت پر قہقہے لگائے۔ دل کھول کر ہنسے۔ تمسخر اڑائے۔ مگر اس کی اسے ضرورت نہ تھی۔ اس کے خیال میں سجاد کو جو سزا مل رہی تھی وہی کافی تھی اور پھر وہ خود بھی تو اسے اس سے کہیں بڑھ کر عبرتناک سزا دینے والی تھی۔

"خیریت تو ہے سجاد!" شکیلہ نے انجان بن کر بڑی بے دردی سے پوچھا۔ "تم اس قدر پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

"خیریت ہی نہیں ہے جانی!" سجاد نے اپنے آپ کو پلنگ پر گراتے ہوئے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ "میرے اہم کاغذات گم ہو گئے ہیں۔ وہ کاغذات ایسے تھے جس پر میری

ترقی کا دار و مدار تھا۔ میں ان کی بدولت ایک کروڑ پتی شخص بن سکتا تھا۔ وہ میری تقدیر بدلنے والے تھے۔"

"مگر تم نے کبھی مجھ سے ان کاغذات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا' کون سے ایسے کاغذات تھے وہ؟ کس قسم کے کاغذات تھے وہ؟ کیسے گم ہو گئے وہ؟"

"میں نے تم سے اس لئے اس کا ذکر نہیں کیا تھا کہ تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا لیکن وہ کیسے گم ہو گئے میں خود حیران ہوں۔ میں نے دفتر میں سیف سے نکال کر خود اپنے ہاتھوں سے بریف کیس میں رکھا تھا۔ بریف کیس کو گھر لایا تھا۔ جب میں نے گھر پہنچ کر ان کاغذات کو بریف کیس سے نکال کر الماری میں رکھنے کے لئے بریف کیس کو کھولا تو بریف کیس میں کاغذات موجود نہیں تھے۔"

"ایں .... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" شکیلہ نے بڑے زور سے اچھل کر اپنی شدید حیرت کا اظہار کیا۔ "شاید تم اسے کسی اور جگہ رکھ کر بھول گئے ہو گے۔"

"نہیں شکیلہ!" وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "میں نے کاغذات کے اس لفافے کو اپنی جان سے زیادہ اہمیت دی تھی۔ میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں' کہیں رکھ کر۔"

"تو پھر میرے خیال میں دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔" شکیلہ اپنے ذہن پر زور دیتی ہوئی بولی۔ "اس کے سوا تیسری بات ممکن نہیں ہے۔"

"کون سی دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں؟" سجاد نے حیرت سے پوچھا۔

"پہلی بات تو یہ ہو سکتی ہے کہ کسی نے جادو کے زور سے ان کاغذات کو اڑا لیا ہے۔ اس لئے کہ یہ کاغذات کروڑ پتی بنا سکتے تھے۔"

"ہشت!" سجاد نے منہ بنا کر کہا۔ "میں کسی جادو وغیرہ کا قائل نہیں ہوں۔ کسی کو کیا معلوم کہ ان کاغذات میں کیا ہے۔ جادو بھلا کون کرنے لگا؟"

"تو پھر کسی ایسے شخص نے جو آپ کا قریبی دوست ہو' جو آپ کے ساتھ رہا ہو اس نے ان کاغذات پر ہاتھ صاف کیا ہو گا۔" شکیلہ بولی۔

"مگر میں نے تو بریف کیس کو نمبروں کے ذریعے سے مقفل کر دیا تھا۔ اس بریف کیس کے نمبر تمہارے اور میرے سوا کوئی نہیں جانتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ تم عجلت میں اسے مقفل کرنا بھول گئے ہو۔ اچھا یہ بتاؤ' کوئی دوست تمہارے ساتھ ساتھ اور تمہارے ساتھ بڑی دیر تک رہا تھا؟"

"ہاں!" سجاد نے اقرار میں اپنی گردن ہلائی۔ "میرے بچپن کا ایک دوست لاہور سے

آیا تھا۔ وہ صبح سے سہ پہر تک میرے ساتھ تھا۔"

"مگر آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تنویر بیگ کے ساتھ رہوں گا۔ اس کے ساتھ حیدر آباد بھی جاؤں گا۔ یہ اچانک آپ کا دوست کہاں سے آ گیا۔ جب کہ میری ایک سہیلی لاہور سے آئی ہوئی ہے جس کے ساتھ میں گھومتی رہی ہوں۔"

"میں نے اپنے اس دوست کی اچانک آمد اور ملاقات کی وجہ سے تنویر بیگ کے ساتھ حیدر آباد جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا۔" سجاد بولا۔

"اپنے دوست کو کیا آپ نے ان کاغذات کے بارے میں بتایا تھا؟ وہ کاغذات اسے دکھائے تھے؟" شکیلہ نے پولیس والوں کے انداز میں پوچھا۔

"میں نے ان کاغذات کا اس سے کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا اور پھر وہ کاغذات ایسے نہیں تھے جو میں ہر کس و ناکس کو دکھاتا پھرتا۔" سجاد نے جواب دیا۔

"کیا آپ اس دوست کو اپنے ساتھ کسی ہوٹل میں یا اس فلیٹ میں لے کر آئے تھے؟" شکیلہ نے منجمد آنکھوں سے اس کی حیرت زدہ آنکھوں میں جھانکا۔

"میں اپنے دوست کو نہ صرف ہوٹل لے گیا تھا بلکہ اپنے گھر میں بھی لے آیا تھا۔ ہم دونوں نے دو تین گھنٹے یہاں گزارے تھے۔ باتیں کیں۔" سجاد نے بتایا۔

"تو پھر آپ کے اسی عزیز از جان دوست نے آپ کی پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے۔ اس نے آپ کے کاغذات آپ کے بریف کیس سے غائب کئے ہیں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے شکیلہ!" سجاد نے تعجب آمیز لہجے میں کہا۔ "وہ میرے گھر میں بیٹھ کر میری موجودگی میں چوری جیسی حرکت کیسے کر سکتا ہے اور پھر اسے کیا معلوم کہ میرے بریف کیا ہے۔ جب کہ میں نے اسے ان کاغذات کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ ہوا تک نہیں لگنے دی تھی۔"

"کیا آپ نے اپنے دوست کو گھر میں کچھ دیر کے لئے چھوڑ کر کسی کام سے باہر گئے تھے یا غسل خانے میں جا کر نہاتے رہے تھے؟" شکیلہ نے دریافت کیا۔

سجاد نے اپنے ذہن پر زور دیا تو اسے یاد آ گیا۔ وہ گردن ہلا کر بولا۔ "میں نہانے کے لئے غسل خانے میں گیا تھا۔ اس میں پانچ دس منٹ لگے تھے۔"

"تمہارے دوست نے تمہاری خواب ناک زندگی اور اس شاندار قسم کے فلیٹ کو دیکھ کر دل میں جلن محسوس کی ہو گی۔ اس نے کسی اور خیال سے اس بریف کیس کو کھولا ہو گا۔ اتفاق سے وہ کاغذات اس کے ہاتھ لگے ہوں گے۔ وہ ان کاغذات کو دیکھتے ہی ان

کی اہمیت سے آگاہ ہوگیا ہوگا۔ اس نے ان کاغذات کو غائب کرکے جیب میں رکھ لیا ہوگا اور بریف کیس کو بند کرکے ان کے نمبر گڈمڈ کردیئے ہوں گے تاکہ تمہیں کسی قسم کا شک وشبہ اس پر نہ ہو۔ اس کے سوا کوئی اور بات پیش نہیں آسکتی ہے۔ کاغذات خود بخود غائب ہونے سے رہے۔ آپ کے دوست ہی نے انہیں غائب کیا ہے۔"

سجاد کی سمجھ میں جیسے ہی شکیلہ کی بات آئی وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ وہ حیرت زدہ سا رہ گیا۔ اب اس کی نظروں کے سامنے کوئی پردہ نہیں رہا تھا۔ اس میں ذرہ برابر شک و شبے کی بات نہیں تھی کہ یہ حرکت نسرین ہی کی تھی۔ وہ نسرین کی فطرت سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نسرین کس قماش کی عورت ہے۔ اب نسرین کی عیاری اس پر آشکار ہوگئی تھی اور اس کی نس نس میں لہو ابلنے لگا تھا۔ خون کی تیز رو اس کے دماغ میں چڑھ گئی۔

شکیلہ نے سجاد کے چہرہ سے اندازہ لگالیا تھا کہ اس کا تیر ٹھیک نشانے پر جا کر لگا ہے۔ یہ تیر تو پوری طرح زہر میں بجھا ہوا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس تیر کا زہر سجاد کی نس نس میں سرایت کرتا جارہا ہے۔ اس کے چہرے پر شدید کرب اور اذیت پھیل رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر تڑپ رہا ہے۔ اس کی حالت بے آب ماہی کی طرح ہو رہی تھی۔ وہ خوش تھی کہ اس نے سجاد کو نسرین کے خلاف اچھی طرح سے ورغلا دیا ہے۔

سجاد کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اس وقت نسرین کے پاس جا نہیں سکتا تھا۔ نسرین اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں ٹھہری تھی۔ وہ اس کا گھر نہیں جانتا تھا بلکہ نسرین نے خود اسے وہاں آنے سے منع کیا تھا بلکہ وہ گھر بھی نہیں بتایا تھا۔ اس حرکت نے سجاد کو نسرین کے خلاف اور شک وشبے میں مبتلا کردیا تھا۔ نسرین نے اسے کل گیارہ بجے اس کے دفتر میں ملنے کا وقت دیا تھا۔ اسے کل صبح گیارہ بجے نسرین سے مل کر کسی نہ کسی قیمت پر وہ لفافہ نکلوانا تھا۔ وہ کپڑے تبدیل کرکے پلنگ پر لیٹ کر ایسی تدبیر سوچ رہا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

شکیلہ اس کے لئے دودھ کا گلاس لے کر آئی تو سجاد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ "آج یہ کرم کیسا؟ یہ دودھ کس لئے لائی ہو؟"

"پینے کے لئے۔" شکیلہ بولی۔ "میں نے آج سے پہلے تمہیں کبھی اس قدر پریشان اور مضطرب نہیں دیکھا اور پھر تمہاری پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں گئی تو میں دودھ لیتی آئی ہوں۔ دودھ پی لو تو ہیجانی کیفیت میں کمی آجائے گی اور نیند بھی آجائے گی۔ صبح سو کر اٹھیں گے تو دل کو دوبارہ قرار آجائے گا۔"

"تم سچ کہتی ہو۔" سجاد اس کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لیتے ہوئے بولا۔ "اور ہاں تم صبح سات بجے کا الارم لگا دینا۔"

"اتنی جلدی اٹھ کر کیا کرو گے؟" شکیلہ پلنگ پر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ "کیا تم تنویر بیگ کے ساتھ حیدر آباد جاؤ گے؟"

"میں اپنے اس خبیث دوست کو پکڑنا چاہتا ہوں جس نے میرے کاغذات بریف کیس سے چرائے ہیں۔ وہ کل دوپہر کی فلائٹ سے لاہور جا رہا ہے۔"

سجاد نے دودھ کا گلاس خالی کرکے اسے خالی گلاس واپس کیا تو وہ دونوں ہاتھوں کے درمیان گلاس کو تھام کر بولی۔ "سجاد! میں تمہیں خوشخبری سنانا چاہتی ہوں۔ ایسی خوشخبری جسے سن کر تم خوشی سے پھولے نہیں سماؤ گے؟"

"کیسی خوشخبری؟" سجاد نے اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کرتے ہوئے تعجب سے پوچھا۔ "یوں بھی آج تم خوش نظر آرہی ہو۔"

"ایک نہیں دو خوشخبریاں ہیں۔" وہ اپنی پلکیں جھپکاتی ہوئی بولی۔ "پہلی خوشخبری یہ ہے کہ آج میری تنویر بیگ سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ یورپ جانے کی ہامی اس شرط پر بھری ہے کہ وہ اپنی فرم کا سارا آرڈر تمہیں دے دے گا۔ جس روز وہ آرڈر تمہارے ہاتھ میں دے گا اسی روز میں اس کے ساتھ یورپ کی سیر وسیاحت کے لئے روانہ ہو جاؤں گی۔ وہ اس شرط پر راضی ہوگیا ہے۔ اب تو تم خوش ہو نا؟"

"اوہ......... نو۔" سجاد کی آنکھیں حیرت اور خوشی سے پھیل گئیں۔ اس نے شکیلہ کو اپنی بانہوں میں بھرلیا۔ "میری جان! تم نے تو کمال کردیا۔ ویری گڈ!"

"تمہاری خوشی میری اپنی خوشی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تمہیں ایسے مقام پر پہنچا دوں کہ تم ساری زندگی مجھے یاد رکھو۔ مجھے ایک لمحے کے لئے بھی نہ بھولو اور میں........."

شکیلہ کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ وہ شکیلہ کی زبانی یہ خوشخبری سن کر اس قدر سرشار ہوا تھا کہ پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس خوشی کی کیفیت میں وہ دونوں بڑی دیر تک کھوئے اور ڈوبے رہے تھے۔ سجاد کو یقین نہیں آرہا تھا کہ شکیلہ خود بخود اس آسانی سے تنویر بیگ کے ساتھ یورپ جانے کے لئے تیار ہو جائے گی۔ اس کا ایک بہت بڑا مسئلہ آپ ہی آپ حل ہوگیا تھا۔

بہت دیر کے بعد سجاد کو اچانک دوسری خوشخبری کے بارے میں خیال آیا تو اس نے

شکیلہ کی طرف دیکھا۔ شکیلہ اس کے سینے پر خوشنما سر رکھے اور اپنی لمبی لمبی مخروطی انگلیوں سے اس کے سینے کے گھنے سیاہ بال سہلا رہی تھی۔ اس نے آہستگی سے پوچھا۔ "جانم! تم نے دوسری خوشخبری نہیں سنائی؟"

"دوسری خوشخبری؟" شکیلہ نے ایک لمحے توقف کر کے جواب دیا۔ "دوسری خوشخبری یہ ہے کہ میں .... تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔"

"کیا کہا..........؟" سجاد خوش ہونے کے بجائے ایک دم سے اس طرح اچھل پڑا جیسے کوئی زہریلا ڈنک لگا ہو۔ دوسرے لمحے اسے شکیلہ کا سر اپنے سینے پر کن کھجورے کی طرح لگا تھا۔ وہ شکیلہ کے سر کو اپنے سینے سے الگ کر کے بجلی کی سی تیزی سے اٹھ بیٹھا۔

"کیا .... کیا.......... تم ماں بننے والی ہو؟"

شکیلہ کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت اور شدید دکھ ہوا کہ سجاد کو اس خوشخبری سے کوئی خوشی نہیں بلکہ تکلیف ہوئی ہے۔ سجاد کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس پر کوئی بجلی آگری ہو۔ وہ یہ خوشخبری سنتے ہی پریشان ہو گیا تھا۔ وہ چند لمحے پہلے تک جس خوشی میں ڈوبا ہوا تھا وہ یک لخت کافور ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ سجاد خوش ہونے کے بجائے اس قدر پریشان اور بدحواس کیوں ہو گیا ہے۔ اسے تو خوش ہونا چاہئے تھا۔

"یہ کب کی خبر ہے؟ یہ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ جلدی سے بتاؤ کتنے دن اوپر ہو چکے ہیں؟" سجاد نے اسے شانوں سے پکڑ کے جھنجھوڑ دیا۔

"یہ آج ہی کی خبر ہے۔" اس نے حیران حیران لہجے میں جواب دیا۔ "کچھ ہی دن اوپر ہوئے ہیں مگر تم اتنے بدحواس کیوں ہو رہے ہو؟ کیا تمہیں یہ سن کر کوئی خوشی نہیں ہو رہی ہے کہ تم ایک بچے کے باپ بننے والے ہو۔ میں ماں بننے والی ہوں۔ اس گھر میں ایک ہنستا کھیلتا اور.........."

"لگتا ہے کہ تم پاگل ہو گئی ہو۔" سجاد نے اسے ایک طرف ہٹا دیا اور بستر سے نکل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "کیا اس میں خوشی کی بات ہے کہ تم ابھی سے اتنی جلدی ماں بن جاؤ؟ ہمیں ابھی کسی بچے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"سجاد!" شدتِ غم سے اس کی آواز بھرا سی گئی۔ "یہ تم کہہ رہے ہو کہ ہمیں بچے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہاں .... ہاں .... ہاں۔" وہ فرش پر پیر پٹخ کر طیش کے عالم میں بولا۔ "ہمیں بچے کی نہیں، دولت، مسرت، آسائش اور سیر و تفریح کی ضرورت ہے۔"

"بچے بھی تو کسی دولت، مسرت اور رونق سے کم نہیں ہوتے۔ ایک بچے کے آ جانے سے اس گھر کا نقشہ ہی بدل جائے گا اور پھر بچے تو قدرت کا سب سے انمول تحفہ ہوتے ہیں۔ تم کیسے آدمی ہو سجاد! جو تمہیں باپ بننے کی خبر سن کر خوشی نہیں ہو رہی ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"مجھے تمہاری کسی بات سے انکار نہیں ہے شکیلہ!" سجاد اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر فوراً ہی کچھ سوچ کر ایک دم سے نرم پڑ گیا۔ اس کے پاس جا بیٹھا۔ اس کا نرم و نازک خوبصورت سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔ "ابھی ہمیں بچے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"بچے کی ضرورت کیوں نہیں ہے سجاد! اور پھر میں ایک عورت ہوں۔ ایک عورت کی تکمیل بچے ہی سے ہوتی ہے۔ اس کے لئے سب سے بڑا اعزاز اس کا ماں بننا ہے۔"

"میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم صرف چند سال تک انتظار کرو۔"

"ابھی کیوں نہیں .... چند سال بعد کیوں؟" شکیلہ کی آنکھوں میں شدید حیرانی ہو گئی۔ "ابھی بچہ ہونے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟"

"دیکھو شکیلہ!" وہ اس کے ہاتھ کی پشت کو نرمی سے تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم ابھی نوجوان اور حسین ہو۔ زندگی میں شباب و مسرت کے محض چند سال ہوتے ہیں جو کسی گھرے بادل کی طرح برستے ہیں اور برس کر گزر جاتے ہیں۔ عہدِ شباب بڑا مختصر سا ہوتا ہے۔ مسرت بے فکری اور آسائش کے لمحے زندگی میں بار بار نہیں آتے ہیں۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ ہم اس عہدِ شباب کو پُرلطف انداز میں گزاریں۔ دنیا کی سیر و سیاحت کریں۔ غرض کہ یہ چند سال ہماری زندگی کے لئے ناقابل فراموش بن جائیں۔ بچے ہونے کے بعد ہم ایسا نہ کر سکیں گے۔ اس کے علاوہ تمہارا شباب اور بدن ڈھلتا جائے گا۔"

"یہ سب کچھ تم نے پہلے کہا ہوتا، مجھے سمجھایا ہوتا۔" شکیلہ نظریں نیچی کر کے بولی۔ "اب جس کا وجود میری کوکھ میں جنم لے چکا ہے اسے کیسے مٹا سکتے ہیں۔"

"اس وجود کو مٹانا کون سا مشکل کام ہے۔" سجاد نے کہا۔ "چونکہ زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں لہٰذا اسے تو بڑی آسانی سے مٹایا جا سکتا ہے۔ میں ایک ایسی لیڈی ڈاکٹر کو جانتا ہوں جو اس کام میں بڑی مہارت رکھتی ہے۔"

"مگر سجاد..........!" وہ متذبذب سی ہو گئی۔ "ایک لمحے کے لئے ذرا یہ تو سوچو کہ

اس وجود کو مٹا کر ہم کتنے بڑے گناہ کے مرتکب ہوں گے۔"

"اس موضوع پر ہم صبح گفتگو کریں گے۔" وہ شکیلہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے الگ کر کے بولا۔ "تمہارے دودھ پلا دینے سے مجھے نیند آ رہی ہے۔ مجھ پر نشہ سا چھا گیا ہے۔ سارے دن کی بھاگ دوڑ اور اس لفافے کی تلاش میں اتنا خوار ہو چکا ہوں کہ بدن تھکن سے ٹوٹ رہا ہے اور پھر تم نے پہلی خوشخبری سنا کر مجھے اتنا خوش کر دیا تھا کہ میں قابو میں نہیں رہا تھا۔ بہرکیف اب میں سو جانا چاہتا ہوں۔ سو جانے دو۔ دیکھو صبح سات بجے کا الارم ضرور لگا دینا۔"

شکیلہ نے بستر سے نکل کر اپنا لباس اور اس کی شکنیں درست کیں اور دودھ کا خالی گلاس اٹھا لیا۔ وہ پلنگ کے پاس چند لمحوں تک کھڑی سجاد کو دیکھتی رہی جو گہری نیند میں ڈوب گیا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی جو اترتی ہوئی اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ شکیلہ نے ٹائم پیس اٹھا کر سات بجے کا الارم رکھنے کے بجائے اس کا الارم ہی بند کر دیا تاکہ کسی بھی وقت الارم نہ بجے۔ وہ جانتی تھی کہ اب سجاد دوسرے دن سہ پہر سے پہلے کسی وقت جاگ نہیں سکتا ہے۔ اس نے دودھ میں اس قدر تیز نشہ آور دوا ملا دی تھی کہ وہ پورے دو دن سونے کے لئے کافی تھی۔

اس نے کچن میں آ کر دودھ کا گلاس دھو کر رکھ دیا۔ پھر وہ غسل خانے میں آ گئی۔ وہ نہا کر نکلی تو اس کا ذہن اور بدن تر و تازہ ہو رہا تھا اور اپنے آپ کو وہ بے حد ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہی تھی۔ اس نے کپڑے تبدیل کئے اور لکھنے کی میز پر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ جانے سے پہلے سجاد کے نام ایک خط لکھ کر جانا چاہتی تھی۔ شکیلہ نے سجاد کے نام جو خط لکھا تھا وہ خط نہیں تھا بلکہ اس کے منہ پر تھوکا تھا۔

خط لکھنے کے بعد اس نے اس خط کو سجاد کے تکیہ کے برابر جو تکیہ تھا اس کے نیچے دبا دیا۔ سجاد کے نیند سے بیدار ہوتے ہی سب سے پہلے اس کی نظر اس خط پر پڑتی۔ پھر اس نے اپنا اٹیچی کیس نکال کر اس میں اپنے چند جوڑے رکھے۔ تمام زیورات کو پوٹلی میں باندھ کر رکھ لیا اور پھر اس نے وہ ساری رقم نکال لی جو الماری کے خفیہ خانے اور سجاد کی جیب میں تھی۔ ایک طرح سے اس نے سارے گھر میں جھاڑو پھیر دی تھی۔

وہ صبح نو بجے اپنا اٹیچی کیس لے کر نیچے آئی اور اسے اپنی کار کی ڈگی میں رکھا۔ سب سے پہلے اس نے بینک پہنچ کر تقریباً ساری رقم نکال لی۔ مینیجر نے اس طرح ساری رقم نکالنے پر حیرت اور تذبذب کا اظہار کیا تو اس نے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ وہ کسی وجہ سے

صرف ایک دن کے لئے رقم نکال رہی ہے۔ اب اس کے اور سجاد کے مشترکہ اکاؤنٹ میں کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ کوئی چودہ لاکھ کی رقم کی مالک تھی۔ یہ رقم وہ تھی جو اس نے بینک سے نکالی تھی۔ اس نے گھر سے جو رقم الماری اور سجاد کی جیب سے نکالی تھی وہ پچیس تیس ہزار کے لگ بھگ تھی اور اس نے ایک تیسرے بینک جا کر چودہ لاکھ کی رقم کا ڈرافٹ اپنے نام بنوا لیا۔ وہ بہت خوش تھی کہ اس نے سجاد کو ایک دم قلاش کر کے رکھ دیا ہے۔ سجاد کے لئے اس سے بڑی سزا اور اذیت کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے اپنی کار کو سجاد کے دفتر کے باہر لے جا کر پارک کر دیا اور ایک ٹیکسی لے کر وہ ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔

☆-------☆-------☆

افضال احمد بڑے بے آبرو ہو کر گھر سے نکلے تو ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ وہ مین روڈ پر پہنچے تو انہیں ایک خالی ٹیکسی نظر آئی۔ وہ ٹیکسی سے سیدھے اس ہوٹل میں پہنچے جہاں ان کا کمرہ ان کے لئے مخصوص تھا جسے دو ایک دن میں وہ چھوڑنے والے تھے۔ اس کمرے میں پہنچ کر وہ جوتوں سمیت پلنگ پر گر پڑے۔ سوچ سوچ کر ان کے دماغ کی شریانیں پھٹی جا رہی تھیں۔ آج ان کی جو ذلت اور رسوائی ہوئی تھی اس نے ان کی ذہنی حالت بہت خراب کر دی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ ان کی ذہنی حالت بگڑنے لگی تو انہوں نے ویٹر سے مسکن گولیاں منگوائیں اور کھا کر سو رہے۔ انہوں نے بہت ساری گولیاں کھا لی تھیں۔ دوسرے دن شام کے وقت ویٹر نے شک کی بنا پر مینیجر سے کہہ کر کمرہ کھلوایا تو وہ گہری نیند سو رہے تھے۔ ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا گیا اور پھر انہیں ہسپتال لے جا کر دکھایا گیا۔ بیگم ناہید کو اطلاع ملی تو انہوں نے ہسپتال والوں کو ہدایت کر دی کہ وہ علاج معالجے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں۔ ان کے علاج پر جو اخراجات ہوں گے وہ خود برداشت کریں گی۔ وہ خود تو ہسپتال نہیں گئیں البتہ اپنے بچوں کو بھیج دیا تھا۔

سجاد نیند سے بیدار ہوا تو صبح کے نہیں بلکہ شام کے سات بج رہے تھے۔ وہ ایک دم سے ہڑبڑا کے بستر سے نکلا۔ پہلے تو وہ یہ سمجھا کہ صبح ہو چکی ہے لیکن بالکنی میں آ کر دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ یہ تو شام کا وقت ہے۔ اس کے علاوہ اس کی طبیعت بڑی مضمحل اور بوجھل بوجھل سی ہو رہی تھی۔ سر بھاری لگ رہا تھا۔ اس نے پلنگ پر بیٹھ کر شکیلہ کو آوازیں دیں شکیلہ کا جواب نہیں آیا تو اس نے تمام کمروں اور کونوں میں جھانک لیا۔ شکیلہ کا پتہ تھا اور نہ اس کی کار کا۔ وہ سمجھ گیا کہ شکیلہ اسے سوتا پا کر کہیں نکل گئی ہے۔

شاید تنویر بیگ کے پاس چلی گئی ہو گی یورپ کی سیر و سیاحت کا پروگرام بنانے کے لئے۔ مگر وہ یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ شکیلہ نے اسے جگایا کیوں نہیں۔ الارم کیوں نہیں بجا اور پھر وہ اتنی دیر تک سوتا کیسے رہ گیا ہے۔

وہ شکیلہ کو فلیٹ میں تلاش کر کے اپنی خواب گاہ میں آیا تو معاً اس کی نظر اس خط پر پڑی جو شکیلہ اس کے نام چھوڑ گئی تھی۔ وہ خط تکیہ کے نیچے دبا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے جھک کر وہ خط اٹھا لیا۔ اس خط کو دیکھ کر وہ بڑا متعجب ہوا تھا۔ وہ بستر پر نیم دراز ہو کر خط پڑھنے لگا۔ شکیلہ نے لکھا تھا۔

سجاد! میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں تمہیں کن القاب سے نوازوں۔ کس نام سے پکاروں۔ تم سے میرا کیا رشتہ ناطہ ہے۔ گو تم میرے شوہر ہو' میرے مجازی خدا ہو اور سب سے بڑھ کر سب سے پہلے میرے خوابوں کے شہزادے رہے ہو جس کی خاطر میں نے اپنے عظیم ماں باپ کی عزت و ناموس کو خاک میں ملا دیا مگر اب تم سے میرا کوئی رشتہ ناطہ نہیں رہا ہے۔ نہ تم میرے محبوب ہو اور نہ میرا سپنا ہو۔ البتہ میرے شوہر ضرور ہو۔ شوہر کم ایک ضمیر فروش زیادہ ہو۔ ایسے ذلیل شخص جو انسانیت کے نام پر دھبہ ہو۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں معاف کیا جا سکے۔ اگر میں نے معاف کر بھی دیا تو کیا ہو گا۔ میرا خدا تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔

جس وقت تم نیند سے بیدار ہو کر میرا خط پڑھ رہے ہو گے میں نہ صرف اس شہر بلکہ تمہاری گھناؤنی زندگی سے بھی بہت دور جا چکی ہوں گی۔ اتنی دور کہ اب تم کبھی مجھے پا نہ سکو گے۔ تم نے مجھے ڈھونڈنے کی کوشش بھی کی تو اس سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اگر اتفاق سے تم نے مجھے ڈھونڈ لیا تو اس سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔ اس لئے کہ میں تمہارے ساتھ کسی قیمت پر چل نہ سکوں گی۔ تمہارے ساتھ زندگی گزارنے سے تو بہتر ہے کہ میں خودکشی کر لوں۔ دریا میں یا کسی کنویں میں چھلانگ لگا دوں۔ کاش میں پہلی ہی ملاقات میں تمہیں جان چکی ہوتی۔ تم نے پہلی ہی ملاقات میں مجھے اپنی وجاہت اور خوبصورتی سے مرعوب اور متاثر کیا۔ میں ان احمق لڑکیوں میں ایک تھی جو خوابوں کے پیچھے بھاگتی ہیں۔ ایک وجیہہ و خوبصورت مرد کو اپنے خوابوں کا شہزادہ سمجھتی ہیں۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ ایک خوبصورت

زندگی گزارنے کے لئے ایک خوبصورت مرد کا شوہر ہونا ضروری ہے۔ میں نے بھی کچھ ایسی ہی غلطی کی۔ غلطی نہیں کی بلکہ جرم کیا۔ میں نے اپنے ماں باپ کو اپنا دشمن جانا جو میری شادی ایک ایسے لڑکے سے کر رہے تھے جو بظاہر خوبصورت نہیں تھا لیکن اس کا دل بہت خوبصورت تھا اور پھر میں ایک شہزادے کی تلاش میں خوار ہو رہی تھی جو مجھے کسی شہزادی کی طرح بنا کر رکھے۔ پھر تم مجھے مل گئے۔ میں اپنے ان ماں باپ کو چھوڑ کر ان کی عزت خاک میں ملا کر تمہارے ساتھ چلی آئی جو میرا مستقبل تابناک بنانا چاہتے تھے۔ تم نے مجھے یہاں لا کر سحر زدہ سا کر دیا۔ زندگی کی ان روشنیوں کو دکھایا جو میں نے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ ان رنگینیوں کا سحر کچھ ایسا تھا کہ میں اس میں کھو کر رہ گئی۔ مگر میں یہ بھول گئی تھی کہ مجھے اس کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ پھر میں نے اس کی بڑی بھاری قیمت ادا کی اور ادا کرتی رہی۔ تمہاری دولت میں اضافے کے لئے افضال احمد کے بستر کی چادر کی شکن بنتی رہی۔

تم .... دولت کے حصول کی خاطر اتنے اندھے ہو گئے کہ بیوی کو بہن بنا کر بھیڑیوں کے آگے ڈال دیا تاکہ میری قیمت زیادہ سے زیادہ وصول ہو۔ تم نے مجھے بیوی نہیں بلکہ ایک بازاری عورت بنا دیا۔ میں یہ سمجھتی رہی کہ یہ سب کچھ نادانستگی میں ہوا ہے۔ مگر ایک روز میری آنکھیں کھل گئیں۔ تمہارا اصل مکروہ اور گھناؤنا چہرہ چھپا ہوا تھا وہ میرے سامنے آ گیا۔ میں نے سوچا کہ افضال احمد اور تم جیسے مردوں کو سبق ملنا چاہئے۔ ایک روز میں افضال احمد کے گھر پہنچ گئی۔ اس کی نیک سیرت بیوی اور معصوم بچوں کو دیکھا تو میرے دل پر ایک چرکہ سا لگا۔ پھر میں نے ساری دولت بیگم افضال احمد کے نام اس شرط پر لکھ دی کہ وہ اپنے شوہر کو کسی پالتو کتے کی طرح رکھیں گی۔ اسے میں نے افضال کا اصل روپ دکھا دیا تھا اور وہ راضی ہو گئی تھی کہ اپنے شوہر کو ایک غلام کی طرح رکھے گی۔ بیگم افضال احمد نے کاروبار سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے تم پر ضرب لگائی تھی۔ ایک ایسی شدید ضرب جو تم برداشت نہ کر سکے۔ افضال احمد اور تم نے مل کر بیگم ناہید کے خلاف ایک گھناؤنی سازش تیار کی۔ افضال احمد اور تم جیسے کمینے شوہر میں نے

اپنی زندگی میں شاید ہی دیکھے ہوں گے۔

اتفاق اور بدقسمتی سے تم دونوں کی گھناؤنی سازش ناکام ہو گئی۔ میں تم پر کچھ انکشافات کرنا چاہتی ہوں تاکہ تمہیں اندازہ اور یہ احساس ہو کہ خدا غریبوں اور مظلوموں کی کس طرح مدد کرتا ہے۔ میں نے اس روز تمہیں اور افضال احمد کو ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا تو میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ میرے دل میں شک کی لہر ا اٹھی تھی کہ بیگم ناہید کو اغوا کر کے ان کے ساتھ تم نے جو انتہائی شرمناک حرکت کی تھی اس میں افضال احمد کا بھی ہاتھ ہے۔ پھر میں نے تم دونوں کی باتیں سننے کے لئے بہروپ بھرا۔ برقع اور تاریک شیشے کا چشمہ پہن کر ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی تھی اور قریب ہی میز پر بیٹھ کر تم دونوں کی گفتگو بھی سنی تھی۔ تم نے مجھے سونے کی نئی چڑیا سمجھ کر پھانسنے کی کوشش کی تھی۔ مگر میں نے تمہیں بری طرح دھتکار دیا تھا۔ پھر تمہاری ہمت نہیں ہوئی تھی کہ تم میری طرف اپنا ہاتھ بڑھا سکو۔

اس برقع میں مَیں تھی میری جان! مَیں' اور پھر میں نے اس دن تمہیں نسرین کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس دن تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ تم تنویر بیگ کے ساتھ حیدر آباد جا رہے ہو بلکہ تم نسرین کے ساتھ رنگ رلیاں منانے اور اسے سمجھانے کے لئے گئے تھے۔ تم یہ سن کر نسرین کو فلیٹ میں لے آئے تھے کہ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اپنی سہیلی کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے جا رہی ہوں۔ رات کو آؤں گی۔ میں نے اپنی کار ایک پٹرول پمپ پر پارک کی اور ٹیکسی لے کر گھر پہنچی تھی۔ میں نے تم دونوں کو خواب گاہ میں دیکھا تھا۔ تم دونوں کی آواز سنی تھی۔ باتیں سنی تھیں۔ مگر تم دونوں کو میری آمد کی خبر تک نہ ہو سکی تھی۔ میں نے تمہاری اور نسرین کی ساری گفتگو سنی۔ پھر مجھ پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی کہ تم میرے ساتھ گھناؤنا کھیل کھیل رہے ہو۔ میری نظر بریف کیس پر پڑی۔ میرا خیال ان شرمناک تصویروں کی طرف گیا جو بیگم ناہید کی تھیں۔ ان تصویروں سے تم اور افضال احمد اس نیک سیرت عورت کو بلیک میل کرنے اور اس کا کاروبار' جائیداد اور دولت ہتھیانے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ جس وقت تم اور نسرین کھوئے ہوئے تھے میں نے بریف کیس کھول کر وہ لفافہ نکال لیا اور جا کر بیگم ناہید کے حوالے کر

دیا۔

میں اس گھر اور اس زندگی سے خالی ہاتھ نہیں جا رہی ہوں۔ میں نہ صرف سارے زیورات بلکہ گھر میں جو رقم بھی موجود ہے وہ بھی لے جا رہی ہوں۔ اس کے علاوہ بینک میں جو دو اکاؤنٹ ہیں ان میں سے ساری رقم بھی نکال کر لے جا رہی ہوں۔ اس لئے کہ یہ سب کچھ تم نے میری بدولت حاصل کیا ہے۔ اس پر میرا حق ہے اور میں یہ ساری دولت غریبوں' محتاجوں اور ضرورت مندوں میں بانٹ دوں گی۔ اس لئے کہ یہ کیڑے مکوڑے ہیں۔ ان کا پاس نہ رہنا زیادہ بہتر ہو گا۔ اچھا یہ ہے کہ یہ رقم کسی غریب کے کام آ جائے۔

تمہیں باپ بننے کی خبر سن کر اس لئے کوئی خوشی نہیں ہوئی کہ میرے ماں بننے سے تمہارے کاروبار پر اثر پڑتا ہے۔ دنیا یہ کہے گی کہ "ایک کنواری بہن" کس طرح سے ماں بن رہی ہے۔ تم نے دنیا کے سامنے مجھے اپنی بہن بنا کر پیش کیا۔ میرے ماں بننے کی خبر نے تمہارے اوسان خطا کر دیئے ہیں۔ تم یہ چاہتے ہو میں اس بچے کو ضائع کر دوں۔ مگر میں ایسا نہیں کروں گی۔ کوئی عورت ایسا نہیں کر سکتی ہے۔

صبح سپید نمودار ہو رہی ہے' مجھے اذان کی آواز بھی سنائی دے رہی ہے۔ میں یہ خط ختم کرنے کے بعد خدا کے حضور میں حاضری دینا چاہتی ہوں۔ کتنی بڑی گنہگار ہوں کہ میں نے اپنے اس رب العزت کو بھولے سے بھی یاد نہیں کیا جو خالق ہے' رحیم ہے۔ شاید میرے گناہوں اور غلطیوں کو معاف کر دے۔ میں تمہارے لئے بھی دعا کروں گی کہ خدا تمہیں سیدھی راہ دکھائے۔ بہتر یہ ہے کہ تم انسان بن جاؤ۔

فقط شکیلہ

سجاد کے ہاتھ سے خط چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ اس پر بجلی سی آ گری تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا تھا۔ ساری دنیا چکر کھاتی اور ڈولتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ چند لمحے بعد وہ غش کھا کر بستر پر گر پڑا۔ جب اسے ہوش آیا تو کمرے میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ایسا ہی اندھیرا اس کی زندگی میں بھی آ گیا تھا۔ شکیلہ اس کی زندگی کی تمام تر رنگینیوں اور اجالوں کو اپنی جھولی میں سمیٹ کر لے گئی تھیں اب اس کے پاس

کچھ رہنے نہیں دیا تھا۔

اس نے اپنی اور شکیلہ کی الماریاں چھان ماریں۔ شکیلہ نے جو کچھ لکھا تھا وہ جھوٹ نہیں تھا۔ اس نے دوسرے دن بینک جا کر معلومات کیں تو اسے پتہ چلا کہ شکیلہ نے واقعی اکاؤنٹ میں ایک روپیہ تک نہیں چھوڑا ہے۔ وہ جاتے جاتے اسے ساری دنیا کے سامنے ننگا کر گئی تھی۔

☆======☆======☆

شکیلہ پشاور جانے والی ٹرین کے زنانہ ڈبے میں سوار ہوئی تو وہ کالے رنگ کے برقع میں ملبوس تھی اور اس کے ہاتھ میں اٹیچی تھا۔ گو اس نے ٹکٹ پشاور تک کا لیا ہوا تھا مگر اسے خود خبر نہیں تھی کہ اس کی منزل کون سی ہے' کہاں ہے۔ وہ ہر قیمت پر اس شہر سے نکل جانا چاہتی تھی جو اسے کسی سانپ کی طرح ڈستا چلا آ رہا تھا اور اسے ہر طرف پھنکارتے ہوئے زہریلے ناگ دکھائی دیتے تھے۔ سجاد اور افضال احمد کسی ناگ سے کم نہیں تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ کراچی شہر کے کسی کونے میں جا کر بس جائے۔ کراچی شہر میں رہنے سے کسی بھی دن آمنا سامنا ہو سکتا ہے۔ وہ اب کبھی سجاد کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے جا رہی تھی۔ وہ ایک نئی دنیا میں قدم رکھنا چاہتی تھی۔ جہاں صرف وہ ہو۔ وہاں دولت کے ناگ اور ہوس پرست نہ ہوں۔ محبت کرنے والے بے غرض انسان ہوں۔ دکھ' درد بانٹنے والے ہوں' مصیبت میں ساتھ دینے والے ہوں۔ وہ جانتی تھی کہ دنیا ابھی ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی ہے۔ ایسے لوگ ابھی بھی موجود ہیں اور انہی کے دم سے یہ دنیا قائم ہے اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو یہ دنیا کب کی غارت ہو چکی ہوتی۔

شکیلہ نے ڈبے میں داخل ہو کر اپنا اٹیچی فرش پر رکھ دیا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے مسافر عورتوں کا جائزہ لیا۔ ڈبے میں بچیاں' لڑکیاں اور عورتیں تھیں مگر وہ پوری طرح بھرا ہوا نہیں تھا۔ اس میں مسافروں کی گنجائش تھی۔ یہ تیسرا درجہ تھا۔ اس نے دانستہ تیسرے درجے کا انتخاب کیا تھا۔ اب وہ خود بھی ایک عام سی زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ بستیوں میں رہنا چاہتی تھی۔

شکیلہ کی نظریں بھٹکتی ہوئی ایک عورت کے چہرے پر جم کر رہ گئیں جو کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی اور وہ برقع میں ملبوس تھی۔ اس نے ابھی اپنا برقع نہیں اتارا تھا مگر اس کا چہرہ بے نقاب تھا۔ شکیلہ کی نظریں اس عورت کا چہرہ پڑھ رہی تھیں۔ جیسے وہ کھلی کتاب ہو۔

وہ عورت پینتیس برس کے لگ بھگ لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر نرمی' شفقت اور ممتا کی لکیریں تھیں۔ مگر وہ بے حد پریشان متفکر اور مغموم سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سوچ تھی۔ اس کے چہرے پر سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہی تھی۔ اسے کیا فکر تھی۔ کیا غم تھا۔ اس کے اپنے کیا مسائل تھے۔ وہ کن حالات کی زد میں تھی۔ اسے ایسی کون سی پریشانی کھائے جا رہی تھی جو وہ سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔

شکیلہ کچھ سوچ کر اس عورت کی طرف بڑھی۔ قریب پہنچ کر رکی۔ اس عورت کے پاس بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ اس عورت کے قریب اور سامنے والی نشست پر سندھی لڑکیاں' عورتیں اور ان کے بچے تھے۔ اس نے عورت سے پوچھا۔ "کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟"

عورت' شکیلہ کی رسیلی کھنکتی آواز سن کر چونکی۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اس کے کانوں میں کسی نے اچانک رس گھول دیا ہو۔ اس نے نظریں ہٹا کر دیکھا تو شکیلہ دیکھتی رہی گئی۔ شکیلہ نے اپنا چہرہ بے نقاب نہیں کیا تھا۔ نقاب میں سے صرف اس کی بے حد پُرکشش آنکھیں جھانک رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں جہان بھر کی محبت بھری ہوئی تھی۔ وہ شکیلہ کی آنکھوں میں محبت کے جلتے چراغوں کو دیکھ کر بڑی متاثر ہوئی۔ اس لمحے اسے ایسا لگا تھا کہ محبت کے ان چراغوں کی لو اس کے دکھ بھرے دل کو اپنائیت کی آگ دے رہی ہے۔ اس نے ہٹ اور سمٹ کر کہا۔ "تشریف رکھئے۔"

شکیلہ کے ایک ہاتھ میں اٹیچی اور دوسرے ہاتھ میں تاریک شیشے کا چشمہ تھا۔ اس نے چشمہ برقع کی جیب میں رکھا اور اٹیچی کو برتھ پر رکھ دیا۔ پھر وہ شکریہ کہہ کر اس عورت کے پاس بیٹھی گئی۔ عورت اس کی وضع قطع' لباس اور اس کی شخصیت سے بڑی متاثر نظر آ رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ یہ عورت بڑی امیر کبیر عورت ہے اور غلطی سے اس ڈبے میں آ گئی ہے اور یہ ڈبہ اس کے لائق نہیں ہے۔

شکیلہ کا ذہن بڑی تیزی سے ایسی کوئی تدبیر سوچ رہا تھا جو اس عورت کو اپنا دوست بنا لے۔ دوستی کرنا کچھ مشکل نہ تھا مگر اس عورت کا سہارا لینا اتنا آسان نہیں تھا۔ شکیلہ کو شدت سے اس بات کا احساس تھا کہ سرراہ کوئی اس کا سہارا نہیں بن سکتا ہے۔ اجنبی پر بھروسہ کرنا آسان نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ایک کوشش کر کے دیکھنا چاہتی تھی۔ جانے کیوں اسے ایک امید سی بندھ چلی تھی کہ یہ عورت اس کے لئے سہارا بن سکتی ہے۔

شکیلہ نے کچھ سوچ کر چہرے سے نقاب ہٹائی تو اس کا چاند سا چہرہ بادلوں کی اوٹ سے چاند کی طرح نکل آیا۔ وہ عورت جو کنکھیوں سے شکیلہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ شکیلہ کا چہرہ دیکھ کر اس کی شخصیت سے اور مسحور ہو گئی تھی۔ وہ عورت تھی اس نے اپنی زندگی میں بہت سی بہت حسین لڑکیاں اور عورتیں دیکھی تھیں مگر وہ کبھی کسی حسین لڑکی اور عورت سے اتنا متاثر نہیں ہوئی تھی جتنا شکیلہ سے ہو رہی تھی۔ اسے شکیلہ کے حسن ہی نے نہیں بلکہ اس کی آنکھوں میں سے جھانکتے ہوئے اپنائیت کے جذبے نے متاثر کیا تھا اور پھر اس نے محسوس کیا تھا کہ شکیلہ کے چہرے پر تکبر اور رعونت نہیں ہے جو عام طور پر حسین جوان لڑکیوں اور عورتوں کے چہرے پر ہوتی ہے۔ وہ سیدھی سادی' نرم خو و محبت کا پیکر لگ رہی تھی اور اس کے دل پر جیسے نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ شکیلہ اس عورت سے دوستی کرنے کے لئے خود سے پہل کرنا چاہتی تھی۔ یوں بھی اس عورت سے دوستی کرنے میں اس کی اپنی غرض پوشیدہ تھی۔ پہل کرنا بھی اس کے لئے بہتر تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے عورت کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "آپا! آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

لفظ آپا نے اس عورت پر بجلی کا سا اثر کیا تھا۔ یہ لفظ اس عورت کی نس نس میں آب حیات بن کر اتر گیا تھا۔ وہ اس کے دل میں اتر گیا تھا۔ شکیلہ کا آپا کہہ کر مخاطب کرنا اسے بہت اچھا لگا تھا اسے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ ایک ایسی خوشی جو بڑی سے بڑی دولت ملنے پر بھی نہیں ہوتی ہے۔ ایسی خوشی چھوٹے لوگوں کے لئے کسی انمول خزانے سے کم نہیں ہوتی ہے۔ اس نے خوشی سے نہال ہو کر شکیلہ کی بڑی بڑی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانکا۔ پھر محبت پاش لہجے میں بولی۔ "حیدر آباد جا رہی ہوں بہن! آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

"میں بھی حیدر آباد جا رہی ہوں۔" شکیلہ نے اپنے منصوبے کے مطابق اس سے جھوٹ بولا۔ "کیا آپ حیدر آباد میں رہتی ہیں؟"

"چلئے .... بڑی خوشی ہوئی کہ آپ بھی حیدر آباد جا رہی ہیں۔" اس عورت نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "میں حیدر آباد میں رہتی ہوں۔ حیدر آباد واپس جا رہی ہوں۔"

"آپ حیدر آباد میں کہاں رہتی ہیں؟" شکیلہ نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ اس لئے کہ وہ خود حیدر آباد کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ وہ دل میں ڈر رہی تھی کہ اگر اس عورت نے اس سے یہ پوچھ لیا کہ وہ حیدر آباد میں کس کے پاس جا رہی ہے یا حیدر آباد میں رہتی ہے تو کہاں رہتی ہے تو کیا جواب دے گی۔ ویسے اسے حیدر آباد کے محلے لطیف آباد کا نام یاد تھا۔ اس کی شادی وہیں ہوئی تھی اور اس نے کچھ دن گزارے تھے۔ وہ لطیف

آباد کا نام تو بتا سکتی تھی۔

"میں غریب آباد میں رہتی ہوں۔" عورت نے جواب دیا۔ "کراچی اپنی بڑی بہن کے پاس گئی تھی۔ ان کی طبیعت خراب تھی' وہ بیمار ہیں۔"

ٹرین نے اس وقت اپنی روانگی کا اشارہ دیا۔ ڈبے میں حرکت سی ہوئی تو چند لمحے کے لئے ان دونوں کی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ ٹرین چل پڑی تو اس نے کھڑے ہو کر برقع نکالا اور اسے تہہ کرنے لگی۔ شکیلہ نے اس کے برقع اور پھر لباس سے اندازہ کر لیا تھا کہ اس عورت کا تعلق اوسط گھرانے سے ہے۔ وہ زیادہ خوش حال دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ویسے وہ چھریرے مگر مضبوط بدن کی تھی۔ اس نے بھی اپنا برقع نکالا اور اسے تہہ کر کے اپنی اٹیچی کے پاس رکھ دیا۔

عورت نے شکیلہ کا بدن' سراپا اور لباس تعریفی نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ "کیا آپ بھی حیدر آباد میں رہتی ہیں یا.......... حیدر آباد کسی سے ملنے جا رہی ہیں؟"

"میں کراچی میں رہتی ہوں۔" وہ بولی۔ "حیدر آباد کسی کی تلاش میں جا رہی ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

"میرا نام صابرہ بیگم ہے۔" وہ بولی۔ "آپ حیدر آباد کس کی تلاش میں جا رہی ہیں۔ کیا اس ضمن میں مَیں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟"

شکیلہ نے عورت کے لب و لہجہ سے محسوس کیا کہ یہ عورت بڑی سمجھدار اور اچھی طبیعت کی ہے اور پھر اس کی باتوں سے محبت اور اپنائیت کی بو آ رہی تھی۔ وہ بڑی مخلص سی لگی تھی اور پھر اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ یہ عورت اس کے بڑے کام آ سکتی ہے۔ وہ اس عورت کو اپنے لئے مدد غیبی سمجھ رہی تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لئے دل میں سوچا کہ اصل بات بتانے میں اسے جلدی نہیں کرنا چاہئے۔ اس عورت کو پوری طرح اپنے اعتماد میں لینا ہو گا۔ اگر اس نے جلد بازی کی تو عورت بدک جائے گی اور اسے اچھی عورت نہیں سمجھے گی۔ وہ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "میں حیدر آباد کس کی تلاش میں جا رہی ہوں' یہ آپ کو بعد میں بتاؤں گی۔ اگر آپ نے میری مدد کی تو میں ساری زندگی آپ کا احسان نہیں بھولوں گی اور زندگی کی آخری سانس تک آپ کے لئے دعا کرتی رہوں گی۔"

"اگر میں آپ کے کسی کام آ گئی تو اس میں احسان کی کیا بات ہے۔ بہرکیف مجھے صرف دعاؤں کی ضرورت ہو گی۔ ہاں! آپ نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

"میرا نام شکیلہ ہے۔" اس نے کہا۔ "مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ یہ

خوشی رسمی نہیں ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ قدرت نے مجھے ایک پیاری سی بڑی بہن دے دی ہے۔"

"مجھے بھی جو خوشی ہو رہی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔" صابرہ بیگم کا چہرہ دمک اٹھا۔ "آپ کی بہنیں وغیرہ تو ہوں گی' کتنی بہنیں ہیں آپ کی؟"

"نہ تو میری کوئی بہن ہے اور نہ ہی کوئی بھائی ہے۔" شکیلہ نے افسردگی سے کہا۔ "میں ساری زندگی بہن بھائی کے لئے ترستی رہی ہوں۔ آج خدا نے سن لی۔"

"آپ نے مجھے بہن کہا ہے تو میں آپ کو بہن بن کر دکھاؤں گی۔" صابرہ بیگم بولیں۔ "مگر بہن! میں ایک غریب عورت ہوں' آپ کسی بڑے گھر کی.........."

"میں بھی ایک غریب اور دکھی عورت ہوں آپا!" شکیلہ نے درمیان میں کہا۔ "محبت بھرے رشتے تو اندھے ہوتے ہیں اور پُرخلوص جذبات سے پُر ہوتے ہیں۔ جب رشتے قائم ہو جاتے ہیں تو دولت دیوار نہیں بنتی ہے۔ اگر آپ نے مجھے اپنی چھوٹی بہن کی طرح سمجھا ہے تو اسے صرف رسمی نہیں حقیقی رشتہ سمجھیں۔"

"غریب کا دل بڑا ہوتا ہے اتنا بڑا ہوتا ہے کہ دنیا بھی اتنی بڑی نہ ہوتی ہو گی۔ جب بھی چاہیں آپ مجھے آزما کر دیکھ سکتی ہیں۔"

"آپ کا بہت بہت شکریہ آپا جو آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔" شکیلہ محبت سے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑی ممنونیت سے کہنے لگی۔ "میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ خدا مجھے اتنی پیاری سی بڑی بہن دے دے گا۔ میں بھی آپ کو بہن بن کر دکھاؤں گی۔ آپ سے میری ایک التجا ہے' درخواست ہے۔"

"کیسی التجا؟" صابرہ بیگم نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "جب بہن بن گئی ہو تو التجا اور درخواست کی باتیں کیوں کر رہی ہیں آپ؟"

"درخواست یہ ہے کہ آپ مجھے آپ کہہ کر نہیں بلکہ تم کہہ کر مخاطب کریں۔ اس لئے کہ میں آپ کی چھوٹی بہن ہوں۔ آپ کے تخاطب سے.........."

"اچھا!" صابرہ بیگم کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ "اتنی سی بات ہے۔ میں تو ڈر گئی تھی کہ جانے کیا بات ہے۔ کوشش کروں گی۔"

"آپ اکیلی سفر کر رہی ہیں یا آپ کے ساتھ کوئی مرد وغیرہ بھی ہے؟"

"میں اکیلی ہی جا رہی ہوں۔" انہوں نے جواب دیا۔ "میرے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ دن کا سفر ہے' دن کا سفر تنہا کرتے ہوئے ڈر نہیں لگتا ہے۔"

"آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟ آپ کے کتنے بچے وغیرہ ہیں؟"

"میرے شوہر ایک آڑھتی کے پاس منشی ہیں۔" صابرہ بیگم نے بتایا۔ "میری تین جوان لڑکیاں ہیں۔ لڑکا کوئی نہیں ہے۔"

"اس میں بھی خدا کی کوئی مصلحت ہو گی۔" وہ صابرہ بیگم کا ملول چہرہ دیکھ کر بولی۔

"وہ مائیں آج رو رہی ہیں جن کے لڑکے ہیں۔ کوئی لڑکا کام کا اور ان کا نہیں رہا۔"

"تمہاری بات سے مجھے کوئی انکار نہیں ہے۔ مگر پھر بھی لڑکے تنکے کا سہارا ہوتے ہیں اور پھر سارے لڑکے ایسے نہیں ہوتے ہیں۔ میں کتنے ایسے گھرانوں کے لڑکوں کو جانتی ہوں جہاں تین تین چار چار لڑکے ہیں۔ وہ اپنے ماں باپ کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کا حکم بجالاتے ہیں۔ ان کا ادب واحترام کرتے ہیں۔"

"لڑکیاں بھی اللہ کی دین ہے۔ لگتا ہے کہ آپ لڑکیوں سے خوش نہیں ہیں۔ آپ کے دل میں لڑکے کی آرزو ہے۔ کیوں؟"

"میں خوش تو ہوں لیکن پریشان بھی ہوں۔ اس لئے کہ یہ لڑکیاں سینے پر چٹان کے بوجھ کی طرح محسوس ہوتی ہیں۔ ان کی شادیاں بھی تو ایک مسئلہ ہیں۔"

"وقت آنے پر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" شکیلہ نے انہیں تسلی دی۔ "آپ ان کی فکر میں مبتلا نہ ہوں۔ خدا پر بھروسہ رکھیں۔"

"چھوڑو ان باتوں کو۔" صابرہ بیگم نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "اچھا' اب تم یہ بتاؤ کہ تم کس کی تلاش میں حیدر آباد جا رہی ہو؟"

شکیلہ نے چند لمحوں کے بعد تذبذب سے جواب دیا۔ "اپنے بے وفا اور دغاباز شوہر کی تلاش میں' میں نے سنا ہے کہ وہ حیدر آباد میں ہے۔"

"اپنے شوہر کی تلاش میں.........!" صابرہ بیگم کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ "تمہارا شوہر تمہیں چھوڑ کر حیدر آباد میں بس گیا ہے۔ وہ کیوں؟"

"اس نے چوری چھپے ایک لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ وہ کاروبار کے بہانے سے اس شہر میں ہے۔ میں اس کی تلاش میں نکلی ہوں۔" شکیلہ نے بتایا۔

صابرہ بیگم نے کسی قدر حیرت سے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا اور تحیر زدہ لہجے میں بولیں۔ "کیا وہ لڑکی تم سے بھی کہیں زیادہ حسین ہے جو اس نے اس لڑکی سے چوری چھپے شادی کر لی۔ میرا خیال ہے کہ وہ لڑکی شاید ہی تم اتنی حسین ہو گی۔ شاید اس کی وجہ حسن نہیں کوئی اور ہی ہو گی۔"

"مجھے کچھ پتہ نہیں کہ وہ لڑکی کیسی ہے' کون ہے اور اس نے اس لڑکی سے شادی کس لئے کی ہے۔ میں یہی کچھ معلوم کرنے کے لئے حیدر آباد جا رہی ہوں۔"

"تمہیں کس نے بتایا کہ تمہارے شوہر نے دوسری شادی کر لی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم افواہ سن کر یا محض شک کی بنا پر شک دور کرنے نکلی ہو؟"

"مجھے ایک ایسے شخص کی زبانی اس شادی کی اطلاع ملی ہے جو بڑا معتبر ہے۔ وہ ہمارا ہمدرد' خیر خواہ اور سچا دوست ہے۔"

"یہ مردوں کو کیا ہو جاتا ہے۔" صابرہ بیگم نے پہلو بدل کر کہا۔ "لگتا ہے کہ ان کی عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ تم جیسی حسین لڑکی اسے ساری زندگی نہیں مل سکتی ہے۔ عیاش فطرت مرد بہت جلد اپنی بیوی سے اکتا جاتے ہیں۔ ان کی طبیعت سیر ہو جاتی ہے۔ یہ سب کچھ دولت کا اعجاز ہوتا ہے۔ کیا تمہارے بچے وغیرہ بھی ہیں؟ کتنے بچے ہیں؟ تمہاری شادی کو کتنے سال ہوئے ہیں؟"

"میرا کوئی بچہ نہیں ہے۔" شکیلہ نے ایک لمحہ تامل کر کے بتایا۔ "ویسے میں امید سے ہوں۔ میری شادی دو سال پہلے ہوئی تھی۔"

"اوہ!" صابرہ بیگم کچھ سوچ کر چونک پڑیں۔ "صرف دو سال کے عرصے میں تمہارا شوہر تم سے اکتا گیا۔ کیا تمہارے پاس اس کا پتہ ہے؟"

"میرے پاس اس کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ میں خدا کا نام لے کر اس کی تلاش میں نکل پڑی ہوں۔" شکیلہ اداسی سے بولی۔

"مگر میری بہن!" صابرہ بیگم جزبز ہو گئیں۔ "تم بغیر پتے کے اسے کیسے تلاش کرو گی؟ کیا تمہیں امید ہے کہ اسے پالو گی؟"

"سنا ہے کہ ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔" شکیلہ نے جواب دیا۔ "مجھے امید ہے کہ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔ میں اس وقت تک اس شہر میں رہوں گی جب تک اس کا پتہ مجھے نہیں مل جاتا لیکن اس تلاش میں مجھے آپ کی مدد اور سہارے کی ضرورت ہو گی۔ کیا آپ میرا ساتھ دیں گی؟"

"کیوں نہیں۔" صابرہ بیگم نے اسے گلے سے لگایا۔ "تم میری چھوٹی بہن ہی کی طرح نہیں بلکہ میری بیٹی کی طرح ہو۔ میں ہر وقت تمہارے ساتھ ہوں۔"

"میں صرف آپ سے اتنی مدد چاہتی ہوں کہ آپ مجھے اپنے ہاں اس دن تک رکنے کی اجازت دے دیں جب تک میں اپنے بے وفا شوہر کو ڈھونڈ نہ لوں۔"

"اب جب کہ میں نے تمہیں اپنی چھوٹی بہن اور بیٹی کی طرح سمجھا ہے تو میرا گھر بھی تمہارا ہے۔ مگر بیٹی! میں ایک غریب عورت ہوں۔ میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی ہوں۔ تمہیں دیکھ کر مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم کسی اعلیٰ گھرانے کی ہو۔ میرا گھر تمہارے لائق نہیں ہے۔ ویسے تم چاہو تو برسوں رہ سکتی ہو۔"

"آپ کا گھر میرے لئے کسی جنت سے کم نہیں ہو گا۔ میرے لئے سب سے بڑی دولت آپ کا خلوص اور محبت ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

"تمہارے آنے سے میرے گھر کی رونق بڑھ جائے گی۔ میں کوشش کروں گی کہ تمہیں میرے ہاں کسی قسم کی کوئی شکایت نہ ہو۔"

"ویسے میں آپ پر کوئی بوجھ نہیں بنوں گی۔ میں اپنے پاس سے ہرماہ کچھ رقم کھانے کے اخراجات وغیرہ کے لئے دے دیا کروں گی۔"

"یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہی ہو۔" صابرہ بیگم کے چہرے پر تندی اور ناگواری کی لہر دوڑ گئی۔ "کیا کوئی ماں اپنی بیٹی سے کھانے کے پیسے لیتی ہے؟"

"یہ بات نہیں ہے۔" شکیلہ نے سر جھکا لیا۔ وہ ان کی نظروں کی تاب نہ لا سکی تھی۔ "میں اپنی خوشی سے دے رہی ہوں۔ میرے پاس روپیہ جو کچھ ہے وہ آپ ہی کا تو ہے۔ اگر میں نے اپنے گھر میں کچھ خرچ کیا تو اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ کیا مجھے اتنا حق بھی نہیں ہو گا؟"

"غریبوں کے پاس جو دولت ہوتی ہے وہ عزت اور محبت کی ہوتی ہے۔ ہم صرف محبت کے بھوکے ہوتے ہیں اور عزت پر مرتے ہیں۔"

حیدر آباد کا اسٹیشن آنے تک دونوں باتیں کرتی رہی تھیں۔ تین گھنٹوں میں وہ دونوں آپس میں خوب گھل مل گئی تھیں۔ ان دونوں کے درمیان جو ایک رشتہ قائم ہوا تھا وہ اس قدر مضبوط اور گہرا ہو گیا تھا جیسے صدیوں سے قائم ہو۔ وہ ایک دوسرے کے بے حد قریب آ گئی تھیں۔ صابرہ بیگم کی شخصیت اس کے دل و ذہن پر چھا کر رہ گئی تھی بلکہ من کے نہاں خانوں میں نقش ہو گئی تھی۔ اس نے صابرہ بیگم کو عام اور معمولی سی عورت سمجھا تھا۔ مگر وہ عام عورت نہ تھی۔ غریب ضرور تھی مگر ان کا قد بہت اونچا تھا' اتنا اونچا تھا کہ شاید ہی کوئی دوسری عورت اس قد کو چھو سکتی تھی۔

ادھر صابرہ بیگم نہ صرف شکیلہ کی دکھ بھری کہانی سے بڑی متاثر ہوئی تھیں بلکہ اس کے حُسن و جمال سے مسحور ہو گئی تھیں۔ شکیلہ نے ان کا دل اپنی باتوں سے جیت لیا تھا۔

انہیں شکیلہ نیک سیرت' سیدھی سادی اور بڑی معصوم فطرت کی لگی تھی۔ مگر ایک بات سے وہ دل میں خائف ہو رہی تھیں کہ ایک مرد شکیلہ ایسی حسین لڑکی سے بیزار ہو سکتا ہے تو ان کی لڑکیوں کا کیا ہو گا؟ جب کہ ان کی لڑکیاں اتنی حسین نہیں ہیں اور پھر آج کا زمانہ تو بڑا خراب ہے۔ مرد کا دماغ خراب ہوتے دیر نہیں لگتی ہے اور یہ فاحشہ عورتیں کس طرح گھر اجاڑتی پھرتی ہیں۔

حیدر آباد اسٹیشن پر اتر کے دونوں باہر آئیں۔ ایک تانگہ لے کر گھر پہنچیں۔ تانگہ گھر کے سامنے رکا تو شکیلہ نے تانگے سے اتر کے کرایہ ادا کرنا چاہا تو صابرہ بیگم نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا۔ کرایہ ادا کرنے کے بعد ان دونوں نے تانگے سے اپنا سامان اتارا۔
صابرہ بیگم نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ شکیلہ اس گلی کا جائزہ پہلے ہی لے چکی تھی جو تنگ تھی اور اس میں سے تانگہ بمشکل داخل ہو کر آیا تھا۔ گلی میں بچے کھیل رہے تھے۔ شام ہو رہی تھی۔ شام کا سلونا پن پھیل رہا تھا۔ اڑوس پڑوس کے مکانوں کے دروازوں اور کھڑکیوں میں سے لڑکیاں اور عورتیں جھانک جھانک کر ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔

شکیلہ کو باہر سے کچھ اندازہ نہ ہو سکا تھا کہ مکان کتنا بڑا ہے۔ دستک دینے کے چند لمحے بعد دروازہ کھلا۔ دہلیز میں ایک جوان لڑکی کا سراپا ابھرا۔ لڑکی سانولے رنگ کی تھی مگر اس کے نقش و نگار بڑے سجل اور سبک تھے۔ اس کی نظر ماں پر پڑی تو اس کا چہرہ خوشی سے دمک گیا۔ "ماں آپ..........!" جیسے ہی اس کی نظر شکیلہ پر پڑی اس نے چونک کر تعجب سے شکیلہ کو دیکھا۔

اس لڑکی نے ایک طرف ہٹ کر اندر آنے کا راستہ دیا تو سب سے پہلے صابرہ بیگم داخل ہوئیں' وہ ان کے پیچھے پیچھے داخل ہوئی ایک بڑا سا صحن تھا۔ صحن کا فرش پکا تھا اور صحن کے کنارے دیوار کے پاس نیم کا ایک گھنا درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے دو چارپائیاں پڑی تھیں۔ دائیں طرف ایک قطار میں بیت الخلا' غسل خانہ اور اس کے ساتھ بڑا سا باورچی خانہ تھا۔ باورچی خانے کے ساتھ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جو شاید اسٹور روم تھا۔ بائیں جانب تین کمرے نظر آ رہے تھے۔ یہ تینوں کمرے بے حد کشادہ تھے۔ ہر کمرے کے اندر کا منظر صاف دکھائی دے رہے تھے۔ گھر صاف ستھرا لگ رہا تھا۔
وہ لڑکی دروازہ بند کر کے پلٹی اور ان کے پاس آئی۔ جبھی دو جوان لڑکیاں سامنے والے کمرے سے نکل آئیں جو پہلی والی لڑکی سے شکل و صورت اور رنگ و روپ میں

کسی قدر مماثلت رکھتی تھیں ان کی بھی وہی حالت ہوئی تھی جو پہلی لڑکی کی ہوئی تھی۔
ان دونوں لڑکیوں نے ان دونوں کو سلام کیا اور ماں کی طرف حیرت اور سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ماں نے شکیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے' ہنس کر کہا۔ "یہ تمہاری آپا ہیں۔ یہاں کچھ دن رہیں گی۔" پھر انہوں نے توقف کر کے علی الترتیب اپنی بیٹیوں کا تعارف شکیلہ سے کرایا۔ "میری بڑی بیٹی رضیہ' منجھلی رئیسہ اور سب سے چھوٹی آسیہ ہے۔"

شکیلہ نے ان تینوں سے نہ صرف بڑی گرم جوشی اور خوش دلی سے ہاتھ ملایا بلکہ انہیں باری باری گلے سے بھی لگایا۔ تینوں بہنیں حیرت سے اس حسین پیکر کو دیکھ رہی تھیں۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے گھر میں جنت سے کوئی حور اتر آئی ہو۔ کچھ دیر رسمی باتوں کے بعد صابرہ بیگم نے شکیلہ سے کہا۔ "بہن کہتے ہوئے کچھ عجیب سا لگتا ہے اور پھر تم اتنی زیادہ عمر کی بھی نہیں ہو۔ میں تمہیں بیٹی ہی کہوں گی۔"

"جیسی آپ کی مرضی!" شکیلہ بولی۔ "یہ میری خوش قسمتی ہو گی کہ آپ مجھے اپنی بیٹی سمجھیں۔ اب مجھے کبھی اپنی ماں کی کمی محسوس نہ ہو گی۔"

"اب تم چل کر نہا لو بیٹی!" صابرہ بیگم نے کہا۔ "سفر کی تھکن بھی اتر جائے گی اور تازہ دم بھی ہو جاؤ گی۔ پھر اکٹھے چائے پیتے ہیں۔"

شکیلہ اپنے کپڑے لے کر غسل خانے میں چلی آئی۔ یہ غسل خانہ اس فلیٹ کے غسل خانے کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔ مگر اس میں شاور ضرور لگا ہوا تھا۔ شکیلہ نے خوب اچھی طرح نہایا۔ اس کی ساری تھکن دور ہو گئی۔ وہ دل میں خدا کا شکر ادا کرتی جا رہی تھی کہ حالات نے اس کی ملاقات ایک اچھی عورت سے کرا دی۔ وہ صابرہ بیگم کے ہاں آ کر بہت خوش تھی۔ اسے بڑا سکون ملا تھا۔ ایک عجیب و غریب راحت سی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے دنیا بھر کی خوشیاں پا لی ہوں۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو وہ اب اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھے گی۔ یہ اس کا نیا جنم ہے جو اس نے اس گھر میں لیا ہو۔ اب وہ نئی زندگی کا سفر اس گھر سے شروع کرے گی۔

شکیلہ غسل خانے سے نکل کر اس کمرے کی طرف بڑھی جو اسے دیا گیا تھا۔ وہ صابرہ بیگم کے کمرے کے پاس سے گزرتی ہوئی ٹھٹک کر رک گئی۔ ان کے کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ کمرے کے اندر سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ ان لوگوں کی گفتگو سنے بغیر بڑھ جاتی اگر اس کا نام نہ آیا ہوتا۔ رضیہ کی زبان سے اپنا نام سن کر وہ ایک دم سے رک گئی تھی۔ "امی جان! اس میں کوئی شک نہیں کہ شکیلہ آپا بہت اچھی ہیں

لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ ہم ان کا بوجھ کیسے اٹھا سکیں گے۔ ہم لوگ تو کسی نہ کسی طرح روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کر لیتے ہیں مگر وہ کیسے کر سکیں گی؟"

"وہ بیٹی بنی ہے اور اس گھر میں اپنی خوشی سے رہے گی تو وہ یہ سب کچھ برداشت کر لے گی اور پھر اسے کون سا یہاں سدا کے لئے رہنا ہے۔"

"مگر امی!" رئیسہ بولی۔ "ہمیں کیا اچھا لگے گا ہم ایک معزز مہمان کی ٹھیک سے خاطر تواضع نہ کریں۔ انہیں دال روٹی کھلائیں۔"

"میں تو اسے مہمان نہیں سمجھتی۔" صابرہ بیگم نے بیٹیوں کو سمجھایا۔ "میں نے اسے راستے میں اپنے بارے میں صاف صاف بتا دیا ہے کہ ہم غریب لوگ ہیں اور پھر میں اسے اپنے ساتھ اس لئے لائی ہوں کہ وہ بے حد دکھی عورت ہے۔ ابھی تمہیں بھی تو مختصر طور پر بتایا ہے نا کہ اس کا غم کیا ہے؟ اس کی کہانی کیا ہے؟"

"ابو انہیں دیکھیں گے تو اپنا سر پیٹ لیں گے۔" رضیہ نے کہا۔ "ایک تو مہینے کا آخر ہے۔ ہمارا بال بال قرض میں بندھا ہے۔ اس مکان کا مہینوں کا کرایہ سر پر چڑھا ہوا ہے۔ مالک مکان کا منشی جب بھی آتا ہے ذلیل کر کے دھمکی دے کر جاتا ہے۔ اس مہینے کے بعد وہ نازل ہو گا تو خدا معلوم کیا ہو گا۔ اس کے علاوہ گھر میں دو ایک دن کا آٹا چاول اور دالیں رہ گئی ہیں اور آپ کراچی جا کر بجلی کے بل کی رقم خرچ کر آئی ہیں۔ آئندہ مہینے' دو مہینے کا بل کیسے بھریں گے؟"

"خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" صابرہ بیگم بولیں۔ "آسیہ! تم یہ پانچ روپے لو سموسے وغیرہ لے آؤ۔ چائے کے ساتھ سموسے وغیرہ رکھ دینا۔"

شکیلہ دبے پاؤں لپک کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ ماں اور بیٹیوں کی گفتگو سے اس گھر کی زبوں حالی سامنے آ گئی تھی۔ اب اس سے کچھ پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ یہ گھر تنگ دستی سے چل رہا تھا۔ عسرت کا احساس تو لڑکیوں کے لباس اور گھر سے صاف ہو رہا تھا۔ ایک منشی کی تنخواہ بھلا کیا ہو سکتی ہے۔ اس میں گزر بسر بڑی مشکل تھی۔ آج اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ غربت و افلاس کیسا عفریت ہے جو انسانوں کو نگل لیتا ہے۔

کچھ دیر کے بعد وہ صحن میں نیم کے پیڑ کے نیچے چارپائی پر بیٹھی صابرہ بیگم اور ان کی بیٹیوں کے ساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ آج اسے صحیح معنوں میں زندگی کا حقیقی لطف رہا تھا۔ وہ کئی بار پانچ ستاروں کے ہوٹل کے سبزہ زاروں میں شام کے وقت چائے پی چکی تھی مگر اس نے کبھی ایسا لطف محسوس نہیں کیا تھا۔ اس نے اپنی باتوں' ہنسی اور اخلاق سے

لڑکیوں کا دل موہ لیا تھا۔ لڑکیاں تھیں کہ اس پر فریفتہ ہوئی جا رہی تھیں۔ انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ شکیلہ واقعی ان کی بڑی سگی بہن ہے۔ اس کا خون ان کی رگوں میں دوڑ رہا ہے۔ ان کے دلوں میں محبت کے شگوفے کھل رہے تھے۔

ادریس احمد' صابرہ بیگم کے شوہر اور ان لڑکیوں کے باپ تھے۔ وہ ایک شریف' پُرخلوص اور سیدھے سادے انسان تھے۔ وہ کولہو کے بیل بنے ہوئے تھے۔ صبح نو بجے گھر سے جاتے تو رات آٹھ بجے واپس گھر آتے تھے۔ اس رات بھی حسب معمول وہ گھر آئے۔ جب انہوں نے صحن میں قدم رکھا تو انہیں ایسا لگا کہ وہ اپنے گھر میں چودھویں کا چاند دیکھ رہے ہیں۔ شکیلہ کو دیکھ کر وہ محو حیرت ہو گئے تھے۔

صابرہ بیگم نے انہیں کمرے میں لے جا کر مختصر طور پر شکیلہ کے بارے میں بتایا تو انہیں اعتراض کے بجائے شکیلہ پر بڑا ترس آیا۔ وہ درد آشنا تھے۔ ہر کسی کے درد کو خوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے سوچا تھا کہ رات کے کھانے کے بعد وہ شکیلہ کی خوب دل جوئی کریں گے۔ اس کے زخم پر مرہم رکھیں گے اور اسے منزل پر پہنچانے کے لئے ساتھ دیں گے۔ مگر شکیلہ نے اس موضوع کو چھیڑنے کا موقع نہیں دیا۔ بلکہ وہ رات گئے تک اپنی' پُرلطف باتوں' دلچسپ لطیفوں اور واقعات سے ان سب کا دل بہلاتی رہی۔ یہ سب اپنا اپنا غم بھول گئے۔

صبح ناشتے کے بعد شکیلہ نے اٹیچی سے اپنا پرس نکال کر اس میں دس ہزار کی رقم رکھی اور کمرے سے نکل کر ادریس احمد کے کمرے میں گئی۔ وہ کام پر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ وہ ادریس احمد سے بولی۔ "ابو! میں اس شہر کے بینک میں اپنا اکاؤنٹ کھولنا چاہتی ہوں۔ آپ متعارف کرا دیں۔"

"اتفاق سے میرا اکاؤنٹ بھی بینک میں ہے۔ چلو میں چل کر وہاں تمہارا اکاؤنٹ کھلوا دیتا ہوں۔"

"اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں رضیہ کو بھی ساتھ لے لوں تاکہ واپس اس کے ساتھ آ سکوں۔"

"اس میں پوچھنے اور اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟ رضیہ تمہاری چھوٹی بہن ہے۔ جب' جس وقت اور جہاں چاہے اسے لے جا سکتی ہو۔"

وہ' ادریس احمد کا شکریہ ادا کر کے رضیہ کو مخاطب کر کے بولی۔ "چلو' جلدی سے تیار ہو جاؤ۔"

ادریس احمد' شکیلہ اور رضیہ کو ساتھ لے کر بینک پہنچے۔ انہوں نے راستے میں شکیلہ کو بتایا کہ ان کے سیونگ اکاؤنٹ میں کوئی دس بیس روپے پڑے ہوں گے۔ وہ دل میں حیران ہوئے کہ شکیلہ اپنا اکاؤنٹ کیوں کھلوا رہی ہے۔ جب کہ وہ اپنے شوہر کی تلاش میں کچھ دنوں کے لئے یہاں آئی ہوئی ہے۔ کراچی واپس جانا ہی جانا ہے۔ انہوں نے اپنے اس خیال کا اظہار نہیں کیا۔ وہ یہ سب کچھ سوچ کر خاموش رہے۔

ادریس احمد کو جلدی تھی۔ وہ روزانہ بلا ناغہ صبح آٹھ نو بجے دکان پر پہنچ جاتے تھے۔ جب کہ آج وہ نو بجے دکان پر نہیں بینک میں تھے۔ انہوں نے اکاؤنٹ کھلوانے کا فارم لے کر متعارف کی جگہ اپنا نام اور اکاؤنٹ نمبر لکھا۔ دستخط کئے اور یہ کہہ کر چلے گئے کہ اب تم اکاؤنٹ کھلوا لو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے' میں جا رہا ہوں۔ شکیلہ خود بھی یہی چاہتی تھی۔ وہ ان کے سامنے چودہ لاکھ کا ڈرافٹ جمع کرانا نہیں چاہتی تھی۔ شکیلہ نے رضیہ کو کیش کاؤنٹر کے پاس رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بٹھایا اور وہ خود مینجر کے کمرے میں اکاؤنٹ کھولنے کی غرض سے چلی گئی۔

مینجر صاحب نے حسن و جمال کے اس پیکر کو دیکھا تو دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔ انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ حیدر آباد جیسے شہر میں ایسا حسین' ایسا صبیح اور ایسا ملیح چہرہ بھی ہے۔ شکیلہ سامنے بیٹھی تو وہ چند لمحوں کے لئے اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہے۔ شکیلہ ان کے ذہن پر کسی پرانی شراب کے خمار کی طرح چھا رہی تھی اور ان کی رگوں میں جیسے آگ دوڑتی جا رہی تھی۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ صدیوں ان کے سامنے اسی طرح بیٹھی رہے۔

شکیلہ کے لب و لہجے کی نفاست اور گفتگو نے انہیں بڑا متاثر کیا۔ شکیلہ کے انکار کے باوجود انہوں نے ان کی مشروبات سے خاطر تواضع کی۔ خود ہی سلپ بھری اور چیک بک بنا کر اس بت طناز کی خدمت میں پیش کی۔ چودہ لاکھ کی رقم کوئی معمولی رقم نہ تھی۔ اس رقم اور شکیلہ کے حُسن نے بڑا متاثر کر کے رکھ دیا۔ وہ غریب آباد کا پتہ دیکھ کر بڑے حیران اور متذبذب ہو رہے تھے۔ شکیلہ کو اس بات کا احساس تھا۔ اس نے تاڑ لیا تھا کہ مینجر صاحب شک و شبے میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ اس نے بات بنائی۔ "لطیف آباد نمبر ایک میں میرا ایک بنگلہ زیر تعمیر ہے۔ میں یہاں صرف بنگلے کی تعمیر کا کام دیکھنے اور ایک رشتہ دار کے ہاں شادی میں شرکت کرنے آئی تھی تو سوچا کہ کیوں نہ اکاؤنٹ کھول لوں۔ آتے ہوئے ڈرافٹ بنا کر لے آئی۔ یہ پتہ عارضی ہے۔ میں آج شام کراچی واپس جا رہی ہوں۔

کیا آپ کو اس پتے پر کوئی اعتراض ہے؟"

"جی نہیں۔" مینجر صاحب گڑبڑا گئے۔ "آپ کا قیام کراچی میں کہاں ہے؟"

"میں ہاتھ آئی لینڈ میں رہتی ہوں۔" شکیلہ نے جواب دیا۔ "میرے شوہر حیدر آباد میں انڈسٹری لگانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہم اپنا سرمایہ یہاں منتقل کر رہے ہیں۔ یہاں رہائش کے لئے بنگلہ بھی بنا رہے ہیں۔ میرے شوہر جب کبھی میرے ساتھ آئے آپ سے ملاؤں گی۔"

وہ مینجر صاحب کے جواب کا انتظار کئے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ بھی کھڑے ہو گئے اور اسے رخصت کرنے دروازے تک آئے۔ شکیلہ نے رضیہ کو اشارے سے بلایا۔ بینک سے باہر آ کر مینجر نے پوچھا۔ "کیا آپ کراچی سے بذریعہ کار آئی ہیں؟"

"جی نہیں۔" شکیلہ نے جواب دیا۔ "ٹرین سے آئی ہوں۔ میں لمبے سفر کار میں نہیں کرتی ہوں۔ ٹرین کا سفر زیادہ پسند ہے۔"

شکیلہ کے لاکھ انکار کے باوجود مینجر صاحب نہیں مانے۔ انہوں نے اپنے ڈرائیور کو بلا کر کہا۔ "بیگم صاحبہ جہاں جانا چاہیں وہاں انہیں چھوڑ آؤ۔"

شکیلہ بازار کے قریب اتر گئی اور اس نے ڈرائیور کو دس کا ایک نوٹ دے کر رخصت کر دیا۔ رضیہ یہ سب کچھ بڑی حیرانی سے دیکھ رہی تھی۔ اس پذیرائی پر وہ ششدر تھی۔ خوش بھی ہو رہی تھی۔ شکیلہ نے اسے کسی نہ کسی طرح مطمئن کر دیا تھا۔ شکیلہ نے بازار پہنچ کر بہت سارا سودا سلف خریدا۔ عمدہ قسم کے باسمتی چاول' گھی' بکرے کا گوشت اور تین دیسی مرغ خریدے۔ رضیہ نے اس خریداری پر شکیلہ کو ٹوکا اور روکا تو اس نے رضیہ کو پیار بھری خفگی سے ڈانٹا۔ "دیکھو! تم مجھ سے چھوٹی ہو' میرے معاملات میں دخل مت دو۔"

جس وقت بہت سارا سودا سلف لے کر دونوں گھر پہنچیں تو صابرہ بیگم ششدر رہ گئیں۔ "بیٹی! یہ کیا ہے؟ تم یہ سب کچھ کیوں اٹھا لائی ہو؟"

"یہ ساری چیزیں گھر کی ضروریات کی ہیں۔" شکیلہ نے جواب دیا۔ "یہ میرا گھر ہے۔ میں اپنے گھر کے لئے لائی ہوں۔ آج میں رات کو مرغ پلاؤ پکاؤں گی۔ میں بہت اچھا مرغ پلاؤ پکاتی ہوں۔ بہت دن ہو گئے ہیں مرغ پلاؤ کھائے۔ آپ بھی کھائیں گی تو یاد کریں گی۔"

شکیلہ کی اس محبت اور جذبے پر صابرہ بیگم کی آنکھیں بھر آئیں۔ پھر چھلک پڑیں۔

وہ آج یوں بھی بے حد پریشان تھیں کہ گھر میں سودا سلف بالکل نہ رہا تھا۔ آٹا' دال' شکر' تیل اور چائے وغیرہ تک ختم ہو گئی تھی۔ وہ پڑوس کی ایک عورت سے دس روپے قرض لے کر آئی تھیں۔ دس روپے بمشکل دو ایک دن ہی چل سکتے تھے۔ پہلی تاریخ آنے میں دو دن باقی تھے۔ انہوں نے اپنے میاں سے کہا تھا کہ وہ اپنے مالک سے کہہ کر کچھ رقم قرض لیتے آئیں تاکہ شکیلہ کی کچھ خاطر مدارت بھی کر سکیں۔ ان کے میاں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ وہ کوشش تو کریں گے لیکن اس کی ذرا برابر بھی امید نہ رکھیں۔ میرا مالک کسی یہودی سے کم نہیں۔ زیادہ اصرار اور منت سماجت کرو تو وہ بڑی بے رحمی سے ملازمت سے نکال دینے کی دھمکی دیتا ہے۔ وہ دس روپے قرض لا کر سوچ رہی تھیں کہ کیا پکائیں۔ شکیلہ بازار سے سودا سلف لے کر پہنچ گئی تھی۔ یہ سودا سلف دو ایک مہینے کے لئے کافی تھا۔ ان میں روزمرہ کی ساری چیزیں تھیں۔

سارا سامان تانگے والا صحن میں رکھ گیا تھا۔ صابرہ بیگم اور تینوں لڑکیاں سامان کے پاس کھڑی تھیں جیسے یہ سامان نہیں بلکہ جہیز ہو۔ شکیلہ اپنا برقع اتارتے ہوئے رئیسہ اور آسیہ سے بولی۔ "بھئی جلدی سے یہ سارا سامان باورچی خانے میں لے جاؤ۔ میں کپڑے بدل کر آتی ہوں۔ آج دونوں وقت کا کھانا میں پکاؤں گی۔"

صابرہ بیگم نے شکیلہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "بیٹی!" ان کی آواز بھرا گئی۔ "میری سگی بیٹی بھی ہوتی تو شاید ایسا نہیں کرتی۔ لگتا ہے کہ تم نے ہماری باتیں سن لیں یا پھر تمہیں کسی طرح پتہ چل گیا ہے کہ ہم کن حالات سے دوچار ہیں۔ پھر بھی بیٹی تم نے ضرورت سے زیادہ.........."

شکیلہ نے جھٹ سے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "اب میں اس گھر میں رہ رہی ہوں تو اس گھر کی فرد بن گئی ہوں۔ اب کوئی بات مجھ سے چھپی نہیں رہنا چاہئے۔ اگر آپ کی کوئی بیٹی اس قابل ہوتی تو اس سے کہیں زیادہ کرتی۔ میں جو کرتی ہوں وہ مجھے کرنے دیں۔ اس گھر پر میرا بھی تو کچھ حق ہے۔"

"مگر بیٹی! تم تو یہاں کسی اور کام کے لئے آئی ہو۔ تم وہ کام چھوڑ کر ہماری فکر میں اور ہمارے مسئلے حل کرنے میں لگ گئی ہو۔"

"میں یہاں جس کام کے لئے آئی ہوں وہ کام بھی ہوتا رہے گا۔ مجھے اس کی کوئی جلدی اور فکر نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ کچھ دنوں میں لاہور سے آنے والا ہے اور آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میرے پاس اتنا کچھ ہے کہ اس میں سے تھوڑی بہت رقم خرچ ہو

گئی تو میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

شکیلہ نے اپنا پرس لے جا کر اٹیچی میں رکھا۔ لان کا سوٹ پہن کر باورچی خانے میں آ گئی۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ دوپہر کے کھانے کی تیاری میں جٹ گئی۔ مہینوں کے بعد اچھا کھانا صابرہ بیگم کے ہاں پک رہا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے لئے بکرے کے گوشت کا قورمہ اور چپاتیاں بنائی جا رہی تھیں۔ دوپہر کے وقت سب نے مل کر کھانا کھایا۔ سبھی نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ شکیلہ ان سب کو کھاتا دیکھ کر انجانی خوشی سے نہال ہوئی جا رہی تھی۔

ادریس احمد صبح چائے اور پاپے کا ناشتہ کر کے کام پر جاتے تھے۔ جاتے وقت ساتھ دو روٹیاں لے جاتے تھے۔ ان روٹیوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی دال یا تلی ہوئی پیاز ہوتی تھی یا آلو کی بھجیا۔ رات تھکے ماندے آتے تو انہیں دو سوکھی چپاتیوں' پتلی دال یا شوربے والا گوشت کا سالن کھانے کو ملتا تھا۔ وہ خدا کا شکر ادا کر کے حلق سے نیچے اتار لیتے تھے۔ روز ہی دوپہر کے وقت ان کا مالک اور حصہ دار ہوٹلوں سے مرغن کھانے منگوا کر مزے لے کر کھاتے تھے وہ بڑی حسرت سے دیکھا کرتے تھے۔ جو کھانا جھوٹا ہوتا اور بچ جاتا تھا وہ دوسرے نوکر صاف کر جاتے تھے۔ ان کے دل میں کبھی یہ خواہش پیدا نہ ہوئی تھی کہ وہ بھی جھوٹا کھائیں۔ البتہ انہیں احساسِ محرومی ضرور تھا کہ ان کے بچے اچھے اچھے کھانوں سے محروم ہیں۔ ان کی اتنی کمائی اور استطاعت نہیں ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اچھا کھلا سکیں۔ ان کا دل اندر سے بڑا دکھتا تھا۔ وہ اپنی اس محرومی اور تنگ دستی پہ ایک سرد آہ بھر کے رہ جاتے تھے۔ کر بھی کیا سکتے تھے۔

آج رات جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو ان کے نتھنوں میں پلاؤ کی مہک نے اپنے وجود کا ثبوت دے کر انہیں چونکا دیا تھا۔ وہ ششدر تھے کہ ان کے گھر میں آج پلاؤ کیسے پک رہا ہے۔ جب کہ گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ بیوی نے ان سے سیٹھ سے ادھار مانگ کر لانے کے لئے کہا تھا۔ انہیں ادھار تو نہیں ملا البتہ دھمکی ضرور ملی تھی۔ سیٹھ نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ پہلی تاریخ میں دو دن باقی ہیں۔ تنخواہ پہلی تاریخ ہی کو ملے گی۔ وہ بڑے دل برداشتہ ہو کر آئے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ دو دن کیسے گزریں گے۔ مگر یہاں تو نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ گھر میں بڑی چہل پہل اور رونق نظر آ رہی تھی اور سبھی کے چہرے دمک رہے تھے۔ وہ اپنی بیوی اور بیٹیوں سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے مگر شکیلہ نے انہیں اس بات کا کوئی موقع ہی نہیں دیا اور بولی۔ "ابو! آپ جلدی سے نہا کر آ جائیں۔ بڑے زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ آج میں نے اپنے ہاتھوں سے پلاؤ پکایا ہے۔ آپ

کھائیں گے تو طبیعت خوش ہو جائے گی۔"

ادریس احمد نہا کر آئے تو صحن میں دری اور چاندنی بچھی تھی اور اس پر دسترخوان بچھا تھا۔ دسترخوان پر کھانا چنا ہوا تھا۔ دسترخوان پر مرغ پلاؤ' رائتہ' سلاد' دوپہر کا بچا ہوا قورمہ' روٹیاں اور سویٹ ڈش میں پڈنگ تھی۔ ادریس احمد جب کھانے کا جائزہ لے رہے تھے تب صابرہ بیگم بولیں۔ "یہ سب کچھ آپ کی بڑی بیٹی نے کیا ہے۔ بینک سے واپس آتے وقت مہینے بھر کا سودا سلف بھی لے کر آئی ہیں۔ ہمیں بہت شرمندہ کر دیا ہے' ہماری بیٹی نے۔"

"ارے ابو! آپ جلدی سے کھانا کھائیں۔ باتوں میں کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا تو پھر مزہ نہیں آئے گا۔ ذرا آپ اپنی پلیٹ تو دیجئے۔" شکیلہ نے ان کے سامنے رکھی ہوئی پلیٹ اٹھائی اور اس میں قاب سے پلاؤ نکال کر ڈالنے لگی تو ادریس احمد نے محبت پاش نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر خجالت سی چھا گئی۔ وہ بڑے آہستہ سے بڑی ندامت سے بولے۔ "بیٹی! ہم تمہاری خدمت کرتے تم الٹا ہماری خدمت کر رہی ہو۔ آخر اس تکلف اور خرچ کی کیا ضرورت تھی۔ بہرکیف تم نے جو کچھ خرچ کیا ہم اس خرچ کے ذمہ دار ہیں۔ تمہارے مقروض ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں پہلی تاریخ کو تمہارا سارا قرض ادا کر دوں گا۔ آئندہ تم ایک نیا پیسہ بھی خرچ نہیں کرو گی۔"

"کیا کبھی ایسا ہوا کہ کوئی باپ بیٹی کا کبھی مقروض ہوا ہو؟" شکیلہ نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ "آپ میرے نہیں بلکہ میں آپ کی مقروض ہوں اور پھر آپ اس موضوع پر کوئی بات نہ کریں۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ آپ ہی لوگوں کا ہے۔ آپ کے پاس جو کچھ ہے وہ میرا ہے۔ گو اس گھر میں قدم رکھے ہوئے مجھے پورا ایک دن ہی ہوا ہے۔ میں آپ کا خون نہیں ہوں' آپ سے میرا کوئی رشتہ ناطہ نہیں تھا لیکن کل سے جب سے میں نے امی کی طرف محبت سے ہاتھ بڑھایا تو ان سے میرا ایک انجانا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ گہرا اور پاکیزہ رشتہ' جیسے میں ان کی بہن ہوں' بیٹی ہوں' ماں ہوں' بھائی ہوں۔ یہاں آ کر اپنی ان بہنوں کو دیکھا اور آپ سے ملی تو ایسا لگا کہ میں بھی اسی گھر کی ایک فرد ہوں۔ آپ ہی کا خون ہوں۔ ہم سب ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔ آپ لوگوں کے ہاں اگر میں اپنا غم' اپنا دکھ اور اپنا درد بھول گئی ہوں۔ اپنے آپ کو بھول گئی ہوں۔ سب کچھ بھول جانا چاہتی ہوں۔ اب خدا کے لئے مجھے کچھ یاد نہیں دلائیے۔"

سب کے سب بڑی خاموشی سے شکیلہ کی باتیں سن رہے تھے۔ شکیلہ کی باتوں نے

انہیں بڑا متاثر کر دیا تھا۔ ایک ایک لفظ ان کے دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا تھا۔ ان سب کی آنکھیں پُرنم ہو گئی تھیں۔ ادریس احمد نے اس کے ہاتھ سے پلیٹ لے کر نیچے رکھی اور اسے سینے سے لگایا تو وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

شکیلہ دوسرے دن سہ پہر کے وقت رضیہ کو ساتھ لے کر بازار گئی جہاں اس نے اپنے لئے' صابرہ بیگم' رضیہ' رئیسہ اور آسیہ کے لئے کپڑوں کی خریداری کی' نئے برقعے خریدے۔ اس نے دیکھا تھا کہ ان لڑکیوں کے پاس پہننے کے لئے اچھے کپڑے تک نہیں ہیں۔ ان کے لباسوں میں پیوند لگے ہوئے ہیں۔ اس نے ادریس احمد کے لئے بھی کپڑوں کی خریداری کی۔ وہ دن ڈوبنے کے بعد گھر پہنچی تو ان دونوں کا انتظار ہو رہا تھا۔ اس نے ہر کسی کے لئے چھ چھ جوڑوں کے لئے کپڑا خریدا تھا۔ لڑکیاں تو بہت خوش ہو گئی تھیں۔ مگر صابرہ بیگم کا سر احسان کے بوجھ سے جھک گیا تھا۔ وہ بڑی خوددار عورت تھیں۔ وہ کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان کے لئے بہت کچھ تھا۔ شکیلہ نے معاشی مسئلہ کسی حد تک حل کر دیا تھا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر حیران تھیں کہ اس کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ جو شکیلہ اپنا پیسہ اس دریا دلی سے خرچ کر رہی ہے۔ آخر اس کے پاس کتنا پیسہ ہو گا۔ انہیں بارہا اپنی بڑی بہن کا خیال آ رہا تھا جو کراچی میں ایک سرکاری ہسپتال میں زیر علاج تھیں اور وہ خاندان کسمپرسی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اپنی بہن کے علاج معالجے کے لئے انہیں ایک بڑی رقم کی ضرورت تھی۔ وہ تو چھوٹی رقم بھی مہیا نہیں کر سکتی تھیں۔ بڑی رقم کہاں سے لاتیں اور وہ خود بھی تو تنگ دستی اور عسرت کے دن کاٹ رہی تھیں۔ انہوں نے ایک لمحے کے لئے سوچا تھا کہ اگر ان کے پاس کچھ رقم ہوتی تو وہ اپنی بہن کے علاج معالجے پر خرچ کرتیں۔ اس لئے کہ ان کی بہن پانچ بچوں کی ماں تھیں۔ وہ ضرورت مند بھی تھیں۔

شکیلہ تیسرے دن اپنے تمام زیورات لے کر اسی بینک میں پہنچی اور اس نے لاکر میں رکھوا دیا۔ زیورات لے جاتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا اور نہ اس سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ اس نے اپنے تمام زیورات اپنے بڑے چرمی پرس میں رکھ لئے تھے۔ وہ کسی وجہ سے انہیں ان زیورات کے بارے میں بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے دانستہ رضیہ کو ساتھ نہیں لیا تھا۔ اس لئے کہ اسے ایک اور کام کرنا تھا۔ اگر رضیہ ساتھ ہوتی تو اسے ٹوکتی اور منع کرتی۔

شکیلہ نے بینک سے نکل کر وہ خط پوسٹ کیا جو اس نے بیگم ناہید کے نام رات بیٹھ

کر لکھا تھا۔ پھر وہ ایک فرنیچر کی دکان پر گئی۔ وہاں آرڈر دے کر رقم کی ادائیگی کر کے ایک کراکری کی دکان میں داخل ہوئی۔ اس نے ایک فہرست دکاندار کے ہاتھ تھما دی۔ اس کے بل کی ادائیگی کر کے گھر چلی آئی۔

دوپہر کے وقت دروازے پر دستک ہوئی تو صابرہ بیگم نے جا کر دروازہ کھولا۔ ان کے گھر کے سامنے دو گاڑیاں فرنیچر سے لدی پھندی کھڑی تھیں۔ گاڑی والے نے ان کے شوہر کا نام پوچھ کر جب ان سے یہ کہا کہ یہ فرنیچر ان کا ہے تو وہ اچھل پڑی تھیں۔ وہ اس فرنیچر کو لینے سے انکار کر رہی تھیں کہ شکیلہ مسکراتی ہوئی کمرے سے نکلی۔ نیا فرنیچر' نئے بستر' چادریں اور میز کرسیاں وغیرہ آئی تھیں۔ صابرہ بیگم اور تینوں بہنیں محو حیرت بنی تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ پرانے بستر' چادریں اور چارپائیاں گاڑی والے لے گئے اور اس کے بدلے میں نیا ساز و سامان دے گئے تھے۔ ان کے ہاں نیا فرنیچر اور ساز و سامان دیکھ کر اڑوس پڑوس کی عورتیں بھی آ گئی تھیں۔ اس سامان کو دیکھ کر حسد و رشک سے جلی جا رہی تھیں۔ سرگوشیاں اور کھسر پھسر بھی کرتی جا رہی تھیں۔ ان میں وہ عورتیں بھی تھیں جو صابرہ بیگم کو قرض دے چکی تھیں۔ صابرہ بیگم مہینوں سے ان کا قرض ادا نہ کر سکی تھیں اور پھر وہ شکیلہ کو دیکھ کر الگ جل رہی تھیں۔ ان عورتوں سے رہا نہیں گیا۔ ان میں سے ایک عورت نے کہا۔ "چار مہینے ہو گئے تم نے میرے چالیس روپے نہیں لوٹائے مگر چار ہزار کا سامان لے کر آ گئیں۔"

دوسری عورت جز بز ہو کر خشونت کے لہجے میں بولی۔ "الہ دین کا چراغ ہاتھ لگ گیا تھا تو میرے ستر روپے تو دیتیں۔"

تیسری عورت بھلا چپ کیوں رہتی وہ کہنے لگی۔ "قرض لینا تو بڑا آسان ہے' قرض واپس کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ تم سے تیس روپے بھی نہیں نکلے میرے۔"

صابرہ بیگم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان عورتوں کو کیا جواب دیں اور انہیں کس طرح سمجھائیں کہ سب کچھ ان کا کیا دھرا نہیں ہے۔ ان کی زبان پر جیسے فالج گر گیا تھا۔ وہ گنگ سی کھڑی جواب موزوں کر رہی تھیں کہ شکیلہ اندر سے پرس لے آئی۔ اس نے اپنی تیوریوں پر بل ڈال کر عورتوں سے پوچھا۔ "ہاں تو آپ لوگوں کا کتنا کتنا قرض صابرہ خالہ پر باقی ہے۔" پھر اس نے پرس میں سے دس دس کے نوٹوں کی نئی گڈی نکال لی۔

شکیلہ نے ان تمام عورتوں کا قرض ادا کر دیا جن کی صابرہ بیگم مقروض تھیں۔ اس نے ان عورتوں کا قرض ادا کیا تھا کہ وہ برتن بھی پہنچ گئے جو وہ آرڈر دے کر آئی تھی۔ ان

نئے برتنوں کو دیکھ کر محلے کی عورتوں کے سینوں پر سانپ لوٹ گئے۔ ادھر صابرہ بیگم کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ شکیلہ کوئی عورت نہیں بلکہ الہ دین کے چراغ کا دیو ہے جو جادو کے زور سے ان کی قسمت بدل رہا ہے۔

رات آٹھ بجے ادریس احمد گھر میں داخل ہوئے اور اس چارپائی پر کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح گر پڑے جو نیم کے درخت کے نیچے پڑی تھی۔ شکیلہ' رضیہ اور رئیسہ کے ساتھ مل کر رات کا کھانا تیار کر رہی تھی۔ صابرہ بیگم نے اپنے شوہر کو چارپائی پر اس طرح گرتے ہوئے دیکھا تو وہ لپک کر ان کے پاس پہنچیں۔ ادریس احمد کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر عجیب سی وحشت برس رہی تھی۔ صابرہ بیگم نے ایک چیخ سی ماری۔ اپنے سینے پر دو ہتڑ مارتی ہوئی بولیں۔ "کیا ہوا رضیہ کے ابو! طبیعت تو ٹھیک ہے۔" ان کی آواز گلے میں رندھ گئی۔

شکیلہ نے صابرہ بیگم کا ہذیانی لہجہ سنا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر صابرہ بیگم کی طرف دوڑی۔ رضیہ اور رئیسہ بھی دوڑیں۔ آسیہ بھی اپنے کمرے سے نکل آئی۔ ادریس احمد نے لیٹے لیٹے مردہ لہجے میں جواب دیا۔ "ہونا کیا تھا' وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سیٹھ نے آج تنخواہ بھی دے دی اور نوکری سے جواب بھی دے دیا۔"

"کیا.........!" صابرہ بیگم کا سر تیزی سے گھوم گیا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ وہ چکرانے لگیں تو شکیلہ نے آگے بڑھ کر انہیں تھام لیا۔ "بیس برس کی نوکری سے نکال دیا گیا۔" وہ بین کرنے لگیں۔ "آخر کس لئے؟ کیا کیا تھا آپ نے؟ آپ سے کیا جرم سرزد ہوا؟"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔" وہ پھٹی پھٹی آواز میں بولے۔ "میرا قصور بھی نہیں معلوم۔ بس ان کی مرضی تھی جو انہوں نے مجھے ملازمت سے برطرف کر دیا۔"

"اب کیا ہو گا؟" صابرہ بیگم سر پکڑ کے فرش پر بیٹھ گئیں۔ "گھر کیسے چلے گا۔ گھر کا کرایہ اور قرض کیسے ادا ہو گا اور بچیوں کا کیا ہو گا؟"

"خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہو گا؟" وہ گہری سانس لیتے ہوئے زخم خوردہ لہجے میں بولے۔ "اب اس عمر میں مجھے ملازمت کون دے گا؟ ملازمت کہاں ملے گی؟"

"ہم پر تو چاروں طرف سے مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔ ایک سہارا تھا روزی کا' خدا نے وہ بھی چھین لیا۔" صابرہ بیگم سسک پڑیں۔

"آپ خدا کی ذات سے مایوس کیوں ہوتی ہیں امی!" شکیلہ نے انہیں تسلی دی۔

"ایک دروازہ بند ہوتا ہے تو وہ ستر دروازے کھول دیتا ہے۔"

"اب اس سے جھوٹی امیدیں باندھ کر کیا اپنے آپ کو دھوکا دوں۔" وہ اپنے آنسوؤں کو دوپٹے میں جذب کرتی ہوئی بولیں۔ "خدا امیروں کا ہوتا ہے غریبوں کا نہیں۔ بیس برسوں سے اس نے ہمیں کیا دیا۔ دکھ' بیماریاں' قرضے' فاقے اور تنگ دستی اور آج تو اس نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔"

"یہ تو آپ کی آزمائش تھی امی!" شکیلہ کے اندر سے کوئی اور شکیلہ بول رہی تھی۔ "میرا خیال ہے کہ آپ کی مصیبت اور آزمائش کے دن ختم ہو گئے ہیں۔ ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گا جو پچھلی زندگی سے یقیناً بہت بہتر ہو گی۔ چلئے اٹھئے .... چل کر ہم سب اس کی بارگاہ میں سربسجود ہوتے ہیں۔ گڑگڑاتے ہیں۔ اس سے اپنی کوتاہیوں' نافرمانیوں اور ناشکرانیوں کی معافی مانگتے ہیں۔ شاید وہ ہمیں معاف کر دے اور رزق کے حصول کا اسباب بنا دے۔"

"شکیلہ بیٹی سچ کہہ رہی ہے صابرہ!" ادریس احمد اٹھ گیا۔ "چلو' آج ہم اسے یاد کرتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد عشاء کی نماز کی اذان ہوئی تو ادریس احمد نماز پڑھنے مسجد چلے گئے۔ ادھر سب نے وضو کیا اور خدا کی بارگاہ میں گر گئے اور نماز کے بعد گڑگڑاتے رہے۔ صابرہ بیگم کو بڑی راحت ملی۔ ان کی آنکھوں سے نکلتے ہوئے آنسوؤں نے انہیں بڑا سکون بخشا تھا۔ ان کا دل اور اعصاب پھول کی طرح ہلکے ہو گئے تھے۔ یہی حال تینوں بہنوں اور شکیلہ کا بھی تھا۔ ادریس احمد مسجد سے واپس آئے تو وہ بھی بڑے پُرسکون نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر طمانیت تھی۔ ادریس احمد صحن ہی سے مسجد چلے گئے تھے۔ اب جو انہوں نے نماز پڑھ کر آنے کے بعد گھر کے اندر قدم رکھا اور اپنے کمرے میں گئے تو حیرت سے اچھل پڑے تھے۔ انہیں ایسا لگا تھا جیسے وہ غلطی سے کسی اور گھر میں آ گئے ہوں۔ یہ گھر ان کا اپنا نہیں ہے۔ یہ گھر ان کا کہیں ہو سکتا ہے۔ ان کے کمرے میں تو دو پرانی چارپائیاں تھیں اور ان پر میلا کچیلا بستر اور تکئے پڑے رہتے تھے۔ وہ چارپائیاں اور بستر نہ تھے۔ ان کی جگہ ایک ڈبل بیڈ پڑا تھا۔ اس پر نرم و گداز بستر تھا۔ بستر کی چادر نئی اور پھول دار تھی۔ اسی چادر کے تکیہ کے غلاف تھے۔ تکئے نئے اور بڑے سائز کے تھے۔ بیڈ کے پاس نئی میز تھی اور پھر تین کرسیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ان چیزوں نے کمرے کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ وہ ششدر سے ہو کر رضیہ کے کمرے میں آئے جہاں دسترخوان بچھایا جاتا تھا۔ اس

کمرے میں کھانے کی میز اور اس کے گرد چھ کرسیاں دیکھ کر کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ اس میز پر کھانا چنا جا رہا تھا۔ آسیہ پلیٹیں لے کر کمرے میں آئی تو انہوں نے اسے روک کر پوچھا۔ "آسیہ! کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔"

آسیہ ان کی بات کی تہہ میں پہنچ کر مسکرائی۔ "نہیں ابو! یہ خواب نہیں ہے' حقیقت ہے۔ شکیلہ آپا نے ہماری زندگی کو خواب ناک بنا دیا ہے۔ انہوں نے نہ صرف سارے گھر کو نئے اور قیمتی فرنیچر سے بھر دیا ہے بلکہ نئے برتن بھی خرید کے لائی ہیں۔ پرانا سامان اور برتن کباڑیئے آ کر لے گئے ہیں۔"

انہوں نے چونک کر میز کی طرف دیکھا تو واقعی سب کے سب نئے برتن تھے اور پھر اس کمرے میں چھوٹے دو پلنگ تھے اور ان پر بستر ویسا ہی تھا جیسا ان کا تھا۔

کھانے کی میز پر ادریس احمد' شکیلہ سے بولے۔ "بیٹی! آخر تم اپنا پیسہ ہم پر پانی کی طرح کیوں بہا رہی ہو۔ اسے سنبھال کر رکھو کل تمہارے کام آئے گا۔"

"میں یہ سب کچھ اس لئے کر رہی ہوں کہ میری بہنوں کے لئے اچھے گھروں سے رشتے آئیں۔ گھر اچھا ہو تو رشتے بھی اچھے آتے ہیں۔" شکیلہ نے کہا۔

"اب اچھے برے رشتے بھی آئے تو کیا ہو گا۔" ادریس احمد یک لخت مغموم ہو گئے۔ "میرے پاس ہے ہی کیا جو میں لڑکیوں کی شادی کر سکوں اور پھر ایک نوکری تھی وہ بھی چھوٹ گئی۔ اگر لڑکی کے لئے کوئی اچھا رشتہ آیا تو میں صاف انکار کر دوں گا۔ اس کے سوا میرے پاس چارہ بھی نہیں ہے۔"

"آپ پھر خدا کی ذات سے مایوس ہو رہے ہیں۔" شکیلہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔ "کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ بیٹھ کر کوئی ایسی تدبیر سوچتے ہیں جو آپ کی نوکری کے مسئلے کو حل کر دے۔ آپ نے اتنے برس جس آڑھت میں ملازمت کی وہاں آپ نے بہت کچھ سیکھا ہو گا۔ کاروبار کے اسرار و رموز بھی علم میں آئے ہوں گے۔ کاروباریوں سے تعلقات بھی پیدا ہوئے ہوں گے۔ گاہکوں سے بھی مراسم ہوں گے۔ کیوں؟"

"بہت کچھ سیکھا ہوں۔ کاروباریوں اور گاہکوں سے میرے تعلقات مالکان سے زیادہ ہیں۔ یہ لوگ میری بڑی عزت بھی کرتے ہیں۔"

"تو پھر ان تعلقات سے فائدہ اٹھا کر اپنا کاروبار شروع کیوں نہیں کر دیتے۔ روپے سے زیادہ تعلقات کام آتے ہیں۔"

"پھر بھی بیٹی!" ادریس احمد بولے۔ "جب تک ایک معقول رقم ہاتھ میں نہ ہو

کاروبار شروع نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ایک دکان کرائے پر لینا ہو گی اور پھر تھوڑا بہت سرمایہ بھی ہاتھ میں ہو تو کام چل سکتا ہے۔ اس لئے کہ تھوڑا بہت ادھار چلتا ہے جو آڑھتی کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔"

"دکان اور کاروبار شروع کرنے کے لئے کتنی رقم کی ضرورت ہو گی۔" شکیلہ نے پوچھا۔

"کم از کم دس ہزار روپے تو چاہئیں۔" ادریس احمد نے جواب دیا۔

شکیلہ چپ ہو گئی اور خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔ کھانے کے بعد سب لوگ صحن میں آ کر چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ رضیہ چائے بنا کر لے آئی تھی۔ شکیلہ اپنی چائے ختم کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے کمرے سے آ کر ایک پھولا ہوا لفافہ ادریس احمد کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ سب کی نگاہیں اس لفافے پر جم کر رہ گئیں۔ ادریس احمد نے پہلے لفافے کی طرف پھر شکیلہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "یہ کیا ہے بیٹی!"

"یہ دس ہزار روپے ہیں۔" شکیلہ نے جواب دیا۔ "کل صبح جائیں اور بسم اللہ کہہ کر دکان لیجئے اور اپنا کاروبار شروع کریں۔"

"مگر بیٹی!" ادریس احمد نے ششدر ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ "میں تم سے یہ رقم نہیں لوں گا۔ اس لئے کہ.........."

"آپ یہ رقم کیوں نہیں لیں گے؟" شکیلہ نے چونک کر ان کی طرف حیرت بھری نظروں سے دیکھا۔ "کیا میں آپ کی بیٹی کی جگہ نہیں ہوں' آپ کی بیٹی نہیں ہوں؟"

"میں ایک باپ ہوتے ہوئے اپنی بیٹی سے رقم کیسے لے سکتا ہوں۔ باپ' بیٹی کی مدد کرتے ہیں۔ انہیں اپنے پاس سے بہت کچھ دیتے ہیں لیکن بیٹی سے کچھ نہیں لیتے ہیں۔ ویسے ہی تمہارے احسان ہم پر کیا کم ہیں کہ میں ساری زندگی سر نہیں اٹھا سکتا۔" ادریس احمد کی آواز بھرا سی گئی۔

"آپ لوگوں نے میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس کا احسان تو میں ساری زندگی اتارنا چاہوں بھی نہیں اتار سکتی ہوں اور آپ.........."

"ہم لوگوں نے تم پر کون سا احسان کیا ہے بیٹی! ہم نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ بے حد شرمندہ ہیں ہم کہ تمہارے لئے کچھ نہ کر سکے بلکہ الٹا.........." صابرہ بیگم نے کہا۔

"میرے لئے اس سے بڑا احسان اور کیا ہو سکتا ہے کہ آپ لوگوں نے نہ صرف مجھے اس گھر میں پناہ دی بلکہ اپنی بیٹی بنا لیا۔ جبکہ میں آپ لوگوں کی کچھ بھی اور کوئی بھی نہیں ہوں۔ نہ بہن ہوں' نہ ماں ہوں اور نہ بیٹی ہوں۔ نہ خون ہوں' آپ سے سفر میں ملی اپنا دکھڑا سنایا اور آپ نے مجھے اپنے کلیجے سے لگا لیا۔ اپنے گھر میں پناہ دی۔ کیا کوئی اس دنیا میں ایک غیر کو اپنے گھر میں پناہ دے سکتا ہے؟ اپنی بیٹی بنا سکتا ہے اور پھر ان تینوں لڑکیوں نے مجھے اپنی سگی بہن کی طرح سمجھا' آپ سب نے مل کر مجھے اس قدر پیار دیا ہے کہ اس کے عوض دنیا کی ساری دولت اور اپنی زندگی آپ لوگوں پر نچھاور کر دوں تو یہ احسان اتر نہیں سکے گا۔"

"بیٹی!" صابرہ بیگم شکیلہ کی محبت بھری باتیں سن کر آبدیدہ ہو گئیں۔ "ہم لوگ غریب لوگ ہیں۔ ہمارے پاس صرف عزت' محبت اور خلوص کی دولت ہے جسے ہم بے غرضی سے ہر کسی پر لٹاتے رہتے ہیں۔ میں تمہیں دکھی سمجھ کر یہاں لے آئی یہ سوچ کر تمہیں پناہ نہیں دی کہ تم صاحب حیثیت ہو.........."

"اگر آپ نے مجھے بیٹی سمجھا ہے اور میں آپ لوگوں کی بیٹی ہوں تو پھر آپ کو میری بات ماننا ہو گی۔" شکیلہ کسی بچے کی طرح مچل گئی۔

"بیٹی مجھے زیادہ مجبور نہ کرو۔" ادریس احمد بولے۔ "یہ تمہاری ضرورت کی رقم ہے۔ کل تمہارے کام آئے گی مجھے رقم لینے میں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں ڈرتا ہوں کہ کاروبار میں یہ رقم ڈوب نہ جائے۔ اس لئے کہ کاروبار میں نفع نقصان ہوتا رہتا ہے۔ نقصان ہوا تو ساری رقم ڈوب جائے گی۔ میں کیسے اور کہاں سے واپس کر سکوں گا۔"

"بس اتنی سی بات ہے۔" شکیلہ مسکرا دی۔ "مجھے اس رقم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میرے پاس ابھی اتنی رقم موجود ہے جو میری ضرورت کے لئے کافی ہے۔ آپ نفع نقصان کی فکر نہ کریں۔ بس اللہ کا نام لے کر کام شروع کریں۔ نفع نقصان اس پر چھوڑ دیں۔ خدا نے چاہا تو وہ ضرور خیر و برکت دے گا۔"

"میں یہ رقم بطور قرض لے رہا ہوں۔" ادریس احمد نے نظریں نیچی کر کے کہا۔ "میں جیسے ہی کاروبار میں کھڑا ہو گیا یہ قرض ادا کر دوں گا۔"

"کیا ایسا کبھی ہوا ہے کہ ایک بیٹی نے اپنے باپ کو قرض دیا ہو؟ یہ قرض نہیں ہے۔ نہ یہ رقم میری ہے بلکہ یہ رقم آپ کی ہے۔" شکیلہ نے کہا۔

"ابو!" رضیہ نے اپنی زبان کھولی۔ "آپ باجی سے بحث مت کیجئے۔ یہ آپ کو جیتنے

نہیں دیں گی اور اپنی ہر بات منوا کر رہیں گی۔ آپ یہ رقم لے لیں اور کل سے نئے دن کا آغاز کریں۔ ابھی سے کہنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو بیٹی!" ادریس احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "شکیلہ بیٹی میری ضدی بیٹی ہے۔ اس سے بحث کرنا فضول ہے۔ خدا اسے سدا خوش رکھے۔" اور ادریس احمد نے توقف کر کے اس کے سر پر بڑی شفقت اور محبت سے ہاتھ پھیرا۔ "خدا ہر گھر میں ایسی بیٹیاں دے' یہ واقعی بہت بڑی دولت ہوتی ہے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ آپ نے میری بات مان لی۔" شکیلہ بولی۔ "بس آپ لوگ میرے لئے دعا کرتے رہئے گا۔ مجھے صرف دعاؤں کی ضرورت ہے۔"

"جب تم میری بیٹی بن گئی ہو تو ایک باپ ہونے کے ناطے مجھ پر یہ فرض بنتا ہے کہ میں تمہاری خوشیاں لوٹاؤں اور تمہارے شوہر کو راہ راست پر لاؤں۔"

"میں اپنے شوہر سے خود نمٹ لوں گی مگر مجھے اس کی امید بہت کم ہے کہ وہ مجھے میری خوشیاں دے سکے اور راہ راست پر آ جائے۔"

"تم اپنا دل چھوٹا کیوں کرتی ہو؟" صابرہ بیگم نے اسے تسلی دی۔ "خدا نے چاہا تو تمہاری خوشیاں پھر سے تمہیں واپس مل جائیں گی۔"

"میں اپنے شوہر کو خوب سمجھتی ہوں کہ وہ کس قماش اور فطرت کا ہے۔ خدا کسی عورت کو ایسا شوہر نہ دے' کوئی ماں ایسے بیٹے کو نہ جنے اور آپ بڑی خوش نصیب ہیں کہ خدا نے آپ کو کوئی بیٹا نہیں دیا۔ آپ کی یہ لڑکیاں لڑکوں سے لاکھ درجہ بہتر ہیں۔ نیک سیرت ہیں اور سب سے بڑی دولت ہیں۔"

"مگر بیٹی!" صابرہ بیگم نے کہا۔ "شوہر' شوہر ہی ہوتا ہے۔ شوہر کیسا ہی کیوں نہ ہو اس کے بغیر ایک بیوی کی معاشرہ میں کوئی عزت نہیں ہوتی ہے۔ اس کا کوئی مقام نہیں ہوتا ہے۔"

"میں اس بات کو تسلیم کرتی ہوں اور اسی لئے آئی ہوں کہ اپنے اس شوہر کو راہ راست پر لاؤں۔" شکیلہ نے جواب دیا۔ "میں چاہتی ہوں کہ اسے آئینہ دکھا کر اس بات پر مجبور کر دوں کہ وہ اس گھناؤنی زندگی سے توبہ کر لے۔ اگر اس نے میری بات نہیں مانی تو پھر میں اسے چھوڑ دوں گی۔"

"ازدواجی زندگی کی حقیقی مسرت دولت میں نہیں محبت میں ہوتی ہے۔ اس دولت کے آگے ساری دولت ہیچ ہے۔ تم ایک ذہین اور سمجھدار لڑکی ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم

کبھی غلط قدم نہیں اٹھاؤ گی اور کوئی ایسا فیصلہ نہیں کرو گی جس پر کل تمہیں پچھتانا پڑے۔" ادریس احمد بولے۔

"میری قسمت میں کیا لکھا ہے' یہ تو میں نہیں جانتی۔" شکیلہ بولتے بولتے اداس ہو گئی۔ "اگر میری قسمت نے میرا ساتھ نہیں دیا تو میں ساری زندگی اس گھر میں گزار دوں گی۔ مگر میں آپ پر بوجھ نہیں بنوں گی۔ کیا آپ اپنی اس بدنصیب بیٹی کو اس گھر کے کسی کونے میں جگہ دینا پسند فرمائیں گے؟"

صابرہ بیگم نے اٹھ کر اسے اپنے سینے سے لگایا۔ "یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو بیٹی! ہم تمہیں بوجھ نہیں بلکہ گلاب کا ٹکڑا سمجھیں گے۔ آج سے یہ تمہارا گھر ہے' میں تمہاری سگی ماں ہوں اور یہ سگے باپ ہیں اور یہ تمہاری سگی بہنیں ہیں۔ تم آج سے اپنے آپ کو منہ بولی بہن نہیں سگی سمجھنا۔" انہوں نے توقف کر کے شکیلہ کی آنکھوں سے چپکے چپکے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا جو ان کے محبت آمیز رویے اور گہرے جذبے سے بھر آئی تھیں۔ میری اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس نے ایک پلی پلائی بیٹی مجھے دے دی۔"

☆======☆======☆

بیگم ناہید افضال اپنے دفتر میں بیٹھی تھیں' ان کی حسین نوجوان پرسنل سیکرٹری آج کی ڈاک باری باری پیش کر رہی تھی۔ پھر اس نے ایک لفافہ ان کی طرف بڑھا دیا۔ جس پر جلی حروف سے ذاتی لکھا ہوا تھا۔ پرسنل سیکرٹری ہوتے ہوئے بھی اُسے اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ ان کی ذاتی ڈاک کھولے۔ بیگم ناہید نے سیکرٹری کے ہاتھ سے خط لے کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر لفافہ چاک کیا۔ تہہ کیا ہوا خط نکال کر اسے کھولا۔ خط لکھنے والے کا نام دیکھا تو وہ خوشی سے اچھل پڑیں اور ان کی آنکھوں میں ہیروں کی سی چمک آ گئی۔ چہرہ بھی دمک اٹھا تھا۔ انہوں نے خط سے نظریں ہٹا کر سیکرٹری کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر حیرت چھا گئی تھی اور وہ سوالیہ نظروں سے اُن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ سیکرٹری سے بولیں۔ "آپ آج کی ڈاک ایک طرف رکھ دیں۔ اسے جس وقت دیکھوں گی آپ کو بلا لوں گی۔" سیکرٹری ان کی بات کا مفہوم سمجھ گئی تھی کہ وہ تنہائی چاہتی ہیں۔ سیکرٹری جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ بولیں۔ "مجھے کسی صورت میں مخل نہ کیا جائے' چاہے کتنا ہی اہم ٹیلی فون کیوں نہ ہو اور کتنے ہی ضروری کام سے کوئی بھی آئے۔ چاہے وہ دفتر کا شخص یا ملاقاتی ہو اسے میرے پاس نہ بھیجا جائے۔ اب آپ جا

سکتی ہیں۔ شکریہ!"

سیکرٹری کے جانے کے بعد انہوں نے اپنی ٹانگیں پسار لیں اور بڑے تجسس اور اشتیاق سے خط پڑھنے لگیں۔ خط میں لکھا تھا۔

"ناہید باجی! خدا کرے آپ اور بچے اس کے فضل و کرم سے بخیریت و عافیت ہوں۔

آپ پلیز کچھ خیال نہ کیجئے گا کہ میں آپ سے ملاقات کئے بغیر ہی گدھے کے سر کے سینگ کی طرح غائب ہو گئی۔ اس طرح شہر کراچی سے غائب ہونے میں میری بہتری تھی۔ میں یہ تدبیر نہ کرتی تو زندہ نہیں رہتی۔ سجاد میرا گلا گھونٹ کر مجھے مار دیتا۔ میری بہتری اور مصلحت اسی میں تھی کہ میں اچانک غائب ہو جاؤں اور پھر اس منصوبے کا تقاضہ بھی یہی تھا جو میرے ذہن میں پیدا ہوا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ میں سجاد سے انتقام لوں۔ میں چاہتی تو اسے زہر دے کر ہلاک کر سکتی تھی۔ وہ تھا بھی بدترین موت کا مستحق' مگر میں نے سوچا کہ میں کیوں قانون کو اپنے ہاتھ میں لوں۔ جبکہ سزا دینے والا اوپر بیٹھا ہے اور وہ سارا تماشا دیکھ رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے۔ یہ سوچنے کے بعد میں نے سوچا کہ سجاد کو میں اپنی طرف سے کیا سزا دوں اور اس سے کس طرح ایسا انتقام لوں کہ وہ ساری زندگی یاد رکھے اور پھر وہ کسی معصوم لڑکی کی زندگی تباہ و برباد کرنے کے لائق نہ رہے۔

جس روز میں آپ کو تصویریں اور نیگیٹوز دے کے رات گھر آئی اس رات میں نے سجاد کا بڑی دیر تک انتظار کیا۔ گھر جانے سے پہلے بازار سے نیند کی گولیاں خرید لیں۔ انہیں پیس کر اس کا سفوف بنا لیا۔ رات سجاد آیا تو بہت پریشان اور متوحش تھا۔ دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ اس کی حالت زار پر دل کھول کر خوب ہنسوں اور قہقہے لگاؤں۔ مگر میں نے بڑا ضبط کیا۔ میں دل میں بے حد خوش تھی کہ وہ اپنی شرمناک آرزو میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کا شیطانی منصوبہ بُری طرح ناکام ہو گیا۔ میں نے اسے اس کے بچے کی ماں بننے کی خوشخبری سنائی تو وہ ایک دم سے اس طرح اچھل پڑا جیسے میں نے اس کی پشت میں خنجر بھونک دیا ہو۔ میں نے اس کی پشت میں نہیں بلکہ اس کے

گھناؤنے منصوبے اور مستقبل کی پیٹھ میں خنجر بھونک دیا تھا۔ میرے ماں بننے کی خبر سے اس پر بجلی سی گر پڑی تھی کہ اب کیا ہو گا۔ دنیا کیا سوچے گی کہ اس کی نوجوان کنواری بہن حاملہ ہو گئی ہے۔ اس لئے کہ اس نے دنیا کو یہ باور کرایا ہوا تھا کہ ہم بہن بھائی ہیں اور پھر وہ مجھے اپنے گھناؤنے مقاصد کے لئے استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں حمل ضائع کرا دوں۔ پھر اس نے مجھے اس بات پر راضی کیا کہ دوسرے دن چل کر ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس جو اعلیٰ گھرانوں کی لڑکیوں کی لغزشوں کو رسوائی کا سبب بننے سے روکتی ہے۔ چل کر آنے والے مہمان کا گلا دنیا میں آنے سے پہلے گھونٹ دیا جائے۔ میں نے اس وقت ہامی بھر لی تھی۔ اس لئے کہ فضول بحث سے کچھ حاصل نہیں تھا اور پھر اس کی یہ حسرت کبھی نہ پوری ہونے والی تھی۔ میں نے اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ حمایت کی اور پھر دودھ میں نشہ والی گولیاں ملا کر اُسے دے دیں۔ کیونکہ اس وقت وہ سخت ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھا۔ جس وقت وہ گہری نیند میں ڈوب گیا تب میں نے اس کے نام ایک تفصیلی خط لکھا۔ اس خط میں' میں نے اس پر یہ انکشاف کر دیا کہ وہ تصویریں اور نیگیٹوز اس کے بریف کیس سے میں نے اڑائی تھیں اور اسے میں نے آپ تک پہنچا دی ہیں۔ نیز میں سارے زیورات اور جن بینکوں میں جو رقم جمع ہے وہ نکال کر لے جا رہی ہوں۔ گھر میں جو رقم تھی وہ بھی لے جا رہی ہوں اور تم مجھے تلاش کرنے کی حماقت نہیں کرنا۔ مجھے تم کبھی نہ پا سکو گے۔ پھر میں نے صبح نو بجے جا کر ساری رقومات نکال لیں اور اپنے نام ڈرافٹ بنا کر کچھ رقم اپنے پرس میں رکھ لی۔ پھر کار کو سجاد کے دفتر کے سامنے پارک کر کے ریلوے اسٹیشن پہنچی۔ ٹکٹ تو میں نے پشاور کا لیا ہوا تھا مگر میں کسی ایسی عورت کی متلاشی تھی جو کراچی اور لاہور کے سوا کسی اور شہر میں رہتی ہو۔ وہ مخلص ہو' غریب ہو اور مجھے پناہ دے سکے۔

یوں تو دولت کی جھلک دکھا کر میں دنیا کی ہر عورت کی دوستی' محبت اور ہمدردی حاصل کر سکتی تھی مگر میں چاہتی تھی کہ کوئی بے غرض عورت ہو۔ خدا نے میری سن لی۔ میری ملاقات صابرہ بیگم سے ہو گئی جو کراچی سے حیدر آباد جا رہی تھی۔ میں نے انہیں ایک بڑی بہن کی طرح سمجھا لیکن اس

عورت نے مجھے بیٹی کی طرح سمجھا۔ دنیا ابھی نیک اور بے غرض لوگوں سے خالی نہیں ہوئی ہے۔ خدا نے مجھ گناہ گار کی سن لی تھی جو اس عورت کو میرے لئے گھنا درخت بنا دیا۔ میں نے اس عورت کو یہ بتایا کہ میں اپنے شوہر کی تلاش میں حیدر آباد جا رہی ہوں جو دوسری شادی کر کے یہاں رہ رہا ہے۔ وہ عورت تھی۔ ماں تھی۔ بیوی تھی۔ وہ عورت ہونے کے ناطے یہ بات جانتی تھی کہ عورت کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ پھر وہ ایک غریب اور دکھی عورت تھی۔ پھر بھی وہ مجھے اپنے گھر لے گئی اور اپنے ہاں پناہ دینا منظور کر لیا۔ جبکہ اس کے مالی حالات ایسے تھے کہ اس کے گھر دو وقت کھانے کو بھی نہیں تھا۔ بہرکیف میں نے وہ کچھ کیا جو مجھ پر فرض عائد ہوتا تھا اور میں وہ کچھ کروں گی جو مجھے کرنا چاہئے۔ میں اس چھوٹے سے اور ایک غریب گھرانے میں آ کر کتنی خوش ہوں اور کتنا راحت و سکون محسوس کر رہی ہوں اس کے اظہار کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ صابرہ بیگم میرے لئے سگی ماں سے کم نہیں ہیں۔ اسی طرح ادریس احمد بھی میرے لئے سگے باپ کی طرح ہیں۔ اُن کی تینوں جوان لڑکیاں چھوٹی بہنوں کی طرح ہیں۔ ان لڑکیوں نے میری جھولی میں اپنا سارا پیار ڈال دیا ہے۔ میں نے اپنے ماں باپ کے ساتھ جو کچھ کیا آج بھی اس کی خلش میرے سینے میں ہے اور مرتے دم تک رہے گی۔ خواب کی اسیر بن کر میں نے انہیں جو دکھ دیا ہے دنیا کی کوئی بیٹی نہیں دے سکتی ہے۔ تاہم میں آج اپنے کئے پر شرمسار ہوں اور خدا سے ہمیشہ گڑگڑا کے دعا مانگتی رہتی ہوں۔ آخری سانس تک مانگتی رہوں گی۔ سجاد نے مجھے ایک طوائف عورت کی طرح بنا کر رکھ دیا تھا۔ اب میں اس کے چنگل سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکل چکی ہوں۔ خدا معلوم اس موذی سانپ کا کیا حال ہے۔ اس کا کیا حشر ہوا ہو گا۔

میں آپ سے ایک استدعا کرنا چاہتی ہوں۔ آپ کو ایک زحمت دینا چاہتی ہوں۔ ایک خدمت سپرد کر دینا چاہتی ہوں۔ اس پر جو کچھ اخراجات ہوں گے وہ میں آپ کو بعد میں ادا کر دوں گی۔ کراچی میں صابرہ آپا کی ایک بڑی بہن عابدہ بیگم ہیں جو سول ہسپتال میں جنرل وارڈ میں زیر علاج ہیں۔ ان کے شوہر کسی دفتر میں کلرک ہیں۔ عابدہ بیگم کے پانچ بچے ہیں۔ عابدہ بیگم کا

علاج غریب، اور سرکاری ہسپتال میں ڈاکٹروں کی بے توجہی کی وجہ سے ٹھیک سے نہیں ہو پا رہا ہے۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ آپ عابدہ بیگم کو کسی اچھے پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کرا دیں۔ ان کے علاج معالجے پر خرچ کی بالکل بھی پرواہ نہ کریں۔ نیز اس گھرانے کی مالی امداد بھی کر دیں۔ عابدہ بیگم کے شوہر باقری صاحب کو کسی ایسی جگہ ملازمت دلوا دیں کہ وہ اپنے مالی حالات پر قابو پا سکیں۔ اس کے لئے مجھے مایوس نہ کریں۔ میں کسی دن آپ کو یہاں آنے کی زحمت دوں گی۔ کبھی یہاں آ کر آپ دیکھیں کہ غریبی اور سادگی کی زندگی میں کیسا سکون اور کتنی راحت ہے اور یہ لوگ کس قدر بے غرض ہوتے ہیں۔ جب وہ کسی کے کام آتے ہیں تو اس میں ان کی کوئی غرض پوشیدہ نہیں ہوتی اور ہاں! اگر آپ کو سجاد کے حشر کے بارے میں کچھ معلوم ہو تو لکھیں۔ بچے خیریت سے ہوں گے۔ انہیں میری طرف سے پیار کریں۔

میں نے اور صابرہ بیگم نے یہاں اپنے بارے میں یہ بات مشہور کر رکھی ہے کہ میں عابدہ بیگم کے بڑے بھائی کی لڑکی ہوں۔ میرا شوہر ملازمت کے سلسلے میں کینیڈا میں مقیم ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے مشہور کرنا پڑا ہے کہ میں بچے کی ماں جو بننے والی ہوں۔ اگر یہ ظاہر نہ کیا جاتا تو میرے لئے بڑی مشکل پیدا ہو جاتی۔ آپ مجھے بہت یاد آتی ہیں۔ آپ کو دیکھنے کے لئے میرا بڑا دل کرتا ہے۔ آپ کے گھر کے کیا حالات ہیں۔ زندگی کیسی گزر رہی ہے۔ ضرور جواب دیں۔ میرا پتا اور مجھے راز ہی میں رکھیں۔ میں سجاد کے سامنے ابھی آنا نہیں چاہتی ہوں اور میں نے ابھی کچھ نہیں سوچا ہے کہ مجھے سجاد کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے۔ میں بچے کی پیدائش کے بعد ہی کوئی فیصلہ اور اس خبیث شخص سے سامنا کروں گی۔ اچھا اب اجازت دیں۔ آپ کا بہت سارا قیمتی وقت لے لیا۔ باقی باتیں بعد میں۔ انشاء اللہ!

فقط صرف آپ کی اپنی شکیلہ

بیگم ناہید، شکیلہ کا خط پڑھ کر بہت خوش اور متاثر ہوئی تھیں۔ انہوں نے اس خط کو دو بار پڑھا۔ بڑی دیر تک شکیلہ کے بارے میں سوچتی رہی تھیں۔ شکیلہ ان کی سب سے بڑی محسن تھی۔ اگر شکیلہ کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو آج ان کی زندگی، ان کا گھر اور بچے تباہ و برباد ہو کر رہ جاتے۔ ان کے شوہر اس قابل نہ رہے کہ وہ ایک باعزت زندگی

گزار سکیں۔ انہوں نے خیالوں سے چونک کر لیٹر پیڈ اٹھایا اور شکیلہ کے نام خط لکھنا شروع کیا۔

میری عزیز از جان بہن شکیلہ!

آج تمہارا خط غیر متوقع طور پر ملا تو مجھے کس قدر خوشی ہوئی تم اُس کا اندازہ نہیں کر سکتی ہو۔ مجھے یوں لگا کہ کوئی انمول دولت مل گئی ہے۔ میں تمہارے لئے بے حد پریشان تھی کہ یہ تم اچانک کہاں غائب ہو گئیں۔ میں اس شک اور تشویش میں مبتلا ہو گئی کہ کہیں سجاد نے تمہارے ساتھ کوئی بے رحمانہ سلوک تو نہیں کیا؟ کہیں اس نے تمہیں قتل کر کے تمہاری لاش کسی نالے میں تو نہیں پھینک دی ہے۔ اس خبیث شخص کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ یہ شخص آدمی نہیں درندہ ہے۔ ہم ایک سانپ پر تو بھروسہ کر سکتے ہیں لیکن اس شخص پر نہیں۔ اس شخص سے کوئی وحشیانہ اور شرمناک فعل بعید نہیں ہے۔ میں یہ سمجھی تھی کہ ان تصویروں کو غائب کرنے کے بارے میں اسے تم پر شک ہو گیا ہو گا اور اس نے تمہیں بخشا نہیں ہے۔ میں نے ایک ریٹائر سی آئی ڈی افسر کو ایک معقول معاوضہ دے کر اس بات پر مامور کر دیا تھا کہ وہ پتا چلائے کہ تم کہاں ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سجاد نے تمہیں قتل کر دیا ہو۔ تمہیں قتل کر کے وہ ڈرامہ کرتا پھر رہا ہے۔

جس دن سے تم گئی ہو سجاد کی حالت بہت غیر ہو گئی ہے۔ ایک تو اس کی پہلی بیوی نسرین نے اس سے طلاق لے لی ہے اور وہ تنویر بیگ کے ساتھ یورپ چلی گئی ہے۔ اس نے اپنے شوہر کو نہ صرف لات مار کر اسے گھر سے نکال دیا تھا بلکہ اپنی زندگی سے بھی نکال دیا۔ اس لئے کہ اب سجاد کے پاس کچھ نہیں رہا تھا۔ اس کی شاہانہ زندگی اور ٹھاٹ باٹھ دھرا رہ گیا تھا۔ قرض خواہوں نے اسے تنگ کرنا اور جان سے مار دینے کی دھمکی دینا شروع کر دیا تھا۔ اس نے اپنی کاریں اور کچھ چیزیں بیچ کر اپنی جان بچائی۔ وہ آج کل پاگلوں کی طرح تمہاری تلاش میں گھوم رہا ہے۔ اب وہ ایک معمولی سے فلیٹ میں رہ رہا ہے۔ اب تو شاید اس کے پاس کھانے کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں۔ جب مجھے تسلی ہوئی کہ تم نے اس سے خوب انتقام لیا ہے اور غائب ہو گئی ہو تب میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

اب تم میرے شوہر کی کہانی سنو۔ وہ ہسپتال سے صحت یاب ہو کر صادق آباد اپنے بڑے بھائی کے پاس چلے گئے ہیں۔ میں نے ہر مہینے دو سو روپے جیب خرچ کا بندوبست کر دیا ہے۔ میں یہ سب کچھ اس لئے بھی کر رہی ہوں کہ یہ ذلیل اور کمینہ شخص نہ صرف میرا شوہر بلکہ میرے بچوں کا باپ بھی ہے۔ اسے اور کیا ذلیل کیا جا سکتا ہے۔ نہ صرف اسے بلکہ مجھے بھی ایک طرح کی سزا مل رہی ہے۔ کیا یہ شخص اس قابل ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے؟ اس کے باوجود کہ اس شخص نے میرے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا میں نے اسے معاف کر دیا خدا بھی اسے معاف کر دے۔ ہو سکے تو تم بھی اسے معاف کر دینا۔ گو وہ معافی کے قابل نہیں ہیں۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔ میں آج کل نماز نہ صرف بڑی باقاعدگی سے پڑھتی ہوں بلکہ تمہارے لئے بھی ہر نماز میں دعا کرتی رہتی ہوں۔

مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ تمہیں صابرہ بیگم جیسی عورت مل گئی۔ دراصل تمہاری نیکیاں تمہارے کام آ رہی ہیں۔ جو خدا نے تمہیں ایک فرشتہ صفت عورت کی پناہ میں دے دیا۔ اس پناہ کو غنیمت ہی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا بہت بڑا احسان سمجھنا۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم اسی گھر میں رہو۔ اس وقت تک کراچی شہر میں نہیں آنا تاوقتیکہ سجاد سدھر نہیں جاتا یا اس کا جنونی پن کم نہیں ہو جاتا۔ وہ انتقام کے جنون میں اندھا ہو کر تمہیں تلاش کر رہا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ تم کراچی ہی میں روپوش ہو گئی ہو۔

صرف ایک تم ہی میری محسن نہیں ہو بلکہ وہ ہر شخص میرا محسن ہے جو تمہارے ساتھ بھلائی کرے۔ صابرہ بیگم بھی میری محسن ہیں اور ان کی بڑی بہن عابدہ بیگم بھی' میں اس 'عظیم' بے غرض اور بے لوث عورت صابرہ بیگم کو دیکھنے اور ان سے ملنے حیدر آباد ضرور آؤں گی۔ اس دور میں ایسے لوگ اور عورتیں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ گو اس بات کا اعادہ نہیں کرنا چاہئے کہ تم نے میرے ساتھ کیا کیا۔ تم نے میرے ساتھ جو بھلائی کی اور احسان کیا وہ اتنا بڑا ہے کہ اس کا صلہ اور اجر تو تمہیں دنیا اور آخرت میں خدا ہی دے گا۔ میرا بال بال تمہارے اس عظیم احسان کا مقروض ہے۔ یہ وہ قرض اور احسان ہے جو میں چاہوں تو ساری زندگی بھی ادا نہیں کر سکوں

گی۔

میں اس خط کے لکھنے کے بعد فوراً ہسپتال عابدہ بیگم کے پاس جا رہی ہوں۔ تم یہ لکھ کر مجھے کیوں شرمندہ کرتی ہو کہ عابدہ بیگم کے علاج معالجے پر جو رقم خرچ ہو گی وہ روانہ کروں گی اور ان کے شوہر کو اپنے دفتر میں نہ صرف اچھے عہدے پر مامور کروں گی بلکہ ان کے لئے بہت کچھ کروں گی۔ مجھے پہلی بار یہ شرف حاصل ہو رہا ہے کہ اپنی چھوٹی بہن کا ایک چھوٹا سا کام کر رہی ہوں۔ شکیلہ میری بہن! خدا کی قسم 'میرا سارا کاروبار' جائیداد اور دولت میں تمہارے ایک اشارہ پر تمہارے قدموں میں ڈال سکتی ہوں۔ تم حکم دے کر تو دیکھو۔ تم خط و کتابت جاری رکھنا۔ میں آئندہ خط سے تمہیں عابدہ بیگم اور باقری صاحب کے بارے میں لکھوں گی۔ بہت سے پیار اور دعاؤں کے ساتھ تمہاری دعاگو۔ بیگم ناہید

بیگم ناہید نے خط لکھنے کے بعد اسے اپنے پرس میں رکھ لیا۔ یہ خط وہ اپنے ہاتھوں سے پوسٹ کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے چپڑاسی کو طلب کیا اور حکم دیا کہ وہ شوفر سے کہہ کر آئے کہ گاڑی تیار رکھے۔ چپڑاسی کے جانے کے بعد انہوں نے اپنے پرس کا جائزہ لیا۔ اس میں دو ہزار کی رقم پڑی تھی۔ یہ رقم فوری طور پر بہت کام دے سکتی تھی مگر انہوں نے انٹر کام پر کیشئر سے دس ہزار کی رقم منگوا کر پرس میں رکھ لی اور پھر اپنی پرسنل سیکرٹری کو طلب کر کے بولیں۔

"مس شبانہ حسن! میں اس وقت بے حد ضروری کام سے باہر جا رہی ہوں۔ آج کی میٹنگ منسوخ کر دی جائیں۔ جن جن لوگوں کو ملاقات کا وقت دیا گیا ہے ان سے معذرت کر لی جائے۔ میں شاید ہی جلد لوٹ سکوں۔"

ناہید بیگم اپنی قیمتی گاڑی میں سول ہسپتال کی طرف جا رہی تھیں۔ ان کے ذہن میں شکیلہ کا چہرہ گھوم رہا تھا اور ان کی نس نس میں خوشی کی لہریں اترتی جا رہی تھیں۔ انہیں اس بات کی بڑی خوشی ہو رہی تھی کہ وہ کسی ضرورت مند کی مدد کرنے جا رہی ہیں۔ اس جذبے نے ان کے سارے وجود کو سرشار کر دیا تھا۔ انہیں جیسے کوئی انمول دولت مل گئی ہو۔ جبکہ ان کا عابدہ بیگم سے کوئی رشتہ ناطہ نہ تھا۔ انہوں نے دیکھا تک نہیں تھا۔ جانتی تک نہیں تھیں۔ مگر پھر بھی انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ عابدہ بیگم سے ان کا صدیوں کا پرانا رشتہ ناطہ ہے۔ محبت کا' چاہت اور اپنائیت کا' انسانیت اور خلوص کا۔ دنیا میں اس سے بڑا

کوئی رشتہ نہیں تھا۔ شاید خون کا بھی نہیں۔

سول ہسپتال کے جنرل وارڈ میں وہ داخل ہوئیں تو انہیں ایسے لگا کہ وہ کسی جہنم میں داخل ہو گئی ہوں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہسپتال ہے۔ ایک ہسپتال کا جنرل وارڈ ایسا ہوتا ہے۔ انہیں اس سے اچھا تو گھوڑوں کا اصطبل معلوم ہوا تھا جو انہوں نے کہیں دیکھا ہوا تھا یہ جگہ تو جانوروں کے لئے بھی موزوں نہ تھی مگر یہاں انسان پڑے ہوئے تھے۔ فرش بے حد گندا تھا۔ جیسے کئی دنوں سے جھاڑو نہ لگی ہو اور پوچا نہیں لگایا گیا ہو۔ بستر بھی بے حد میلے کچیلے تھے۔ فضا میں تعفن تھا۔ ماحول بڑا ہیبت ناک اور سوگوار سا تھا۔ مریضوں کی حالت دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں کوئی پُرسان نہیں ہے۔ وہ نرس اور ڈاکٹر جو دکھی انسانیت کی خدمت کا دعویٰ کرتے کرتے اپنا گلا سکھا لیتے تھے مریض ان کی بے توجہی کا شکار نظر آ رہے تھے۔ یہ جنرل وارڈ مریض عورتوں کا تھا۔ انہوں نے ایک نرس کا راستہ روک کر پوچھا۔ "عابدہ بیگم کس بیڈ نمبر پر ہیں؟"

نرس نے رک کر منہ بنا کر بڑی بیزارگی اور ناگواری سے انہیں دیکھا۔ پھر اپنے شانے اچکا کر بے پرواہی سے جواب دیا۔ "مجھے کیا معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔"

"اگر تمہیں یہ نہیں معلوم تو پھر کیا معلوم ہے؟" انہوں نے سختی سے کہا۔ "تم ڈیوٹی پر ہو، تمہیں اس وارڈ کی ہر مریضہ کے بارے میں معلوم ہونا چاہئے۔"

"آپ کون ہوتی ہیں مجھے سمجھانے اور بتانے والی۔" نرس بڑی بدتمیزی سے پیش آنے لگی۔ "میں نے کوئی ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے۔ آپ کسی اور سے پوچھیں۔"

"شٹ اپ!" بیگم ناہید آپے سے باہر ہو گئیں۔ "تمہیں بات کرنے کی بالکل تمیز نہیں ہے تو میں تمہیں سکھا سکتی ہوں۔ تم اس وارڈ کی نرس ہو۔ تمہاری یہ ڈیوٹی ہے کہ تم ہر مریض کے نام سے واقف ہو۔ میں کرنل صاحب سے مل کر تمہاری شکایت کرتی ہوں۔ پھر تمہیں پتا چل جائے گا کہ تمہیں ٹھیکہ ملا ہے کہ نہیں۔"

جس جگہ کھڑے ہو کر وہ بات کر رہی تھیں وہاں ایک مریضہ کا پلنگ تھا۔ اس پلنگ پر ایک جوان مریضہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے بیگم ناہید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "آپا جی! عابدہ بیگم کا بیڈ نمبر پینتالیس ہے۔" نرس ان کی ڈانٹ اور دھمکی سن کر رفو چکر ہو گئی تو وہ مریضہ بولی۔ "یہ نرس بڑی بدمزاج ہے۔ چٹی اللہ میاں نے ذرا سفید کیا بنا دی اس کے مزاج نہیں ملتے ہیں۔ وہ مریضوں کو جھڑکتی رہتی ہے اور ان کے ساتھ بدتمیزی سے پیش آتی رہتی ہے اس لئے کہ ایک ڈاکٹر کی منظور نظر ہے۔"

"شکریہ بہن!" بیگم ناہید اس عورت کی طرف گھوم کر بولیں۔ "آپ فکر نہ کریں۔ میں آج ہی اس کی رپورٹ کر کے اس کی بدتمیزی کا مزا چکھاتی ہوں۔ دراصل ان گوری چٹی اور جوان نرسوں کا مزاج اوباش اور عاشق مزاج قسم کے ڈاکٹر خراب کر کے رکھ دیتے ہیں۔ یہ نرسیں غلط جگہ کیوں آ جاتی ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا ہے۔"

بیگم ناہید بیڈ نمبر پینتالیس کی طرف تیزی سے بڑھ گئیں۔ پلنگ کے قریب پہنچیں تو انہوں نے دیکھا ایک عورت جس کی عمر پینتالیس برس کے لگ بھگ ہو گی بستر پر لیٹی کراہ رہی ہے۔ یہ عابدہ بیگم تھیں۔ پلنگ پر سرہانے ان کی بڑی بیٹی صفیہ بیٹھی اپنی ماں کا سر دبا رہی تھی۔ ماں بیٹی نے انہیں حیرت سے دیکھا۔ یہ وقت ملاقاتیوں کا نہیں تھا۔ وہ سمجھیں کہ شاید کسی کو پوچھتی آئی ہیں۔ عابدہ بیگم نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو انہوں نے پوچھا۔ "آپ عابدہ بیگم ہیں۔"

"جی........." عابدہ بیگم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ انہوں نے نیچے سے اُوپر تک بیگم ناہید کو دیکھا۔ "جی میرا نام ہی عابدہ بیگم ہے۔ فرمایئے۔"

"آپ کے شوہر کا نام باقری صاحب ہے؟" بیگم ناہید پلنگ پر ان کے پاس بیٹھ گئیں۔ پھر ان کی بیٹی سے پوچھا۔ "آپ ان کی بیٹی ہیں' کیا نام ہے آپ کا؟"

"میرے ابو کا نام باقری صاحب ہے۔" عابدہ بیگم کے بجائے ان کی بیٹی صفیہ نے جواب دیا۔ "میں ان کی سب سے بڑی بیٹی صفیہ ہوں۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

"میں آپ کی بہن صابرہ بیگم کی سہیلی ہوں۔" بیگم ناہید نے بتایا۔ "میں آپ کی مزاج پرسی کے لئے آئی ہوں۔ میرا نام ناہید ہے۔ اب آپ کیسی ہیں؟"

"آپ صابرہ کی سہیلی ہیں؟" عابدہ بیگم کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ "صابرہ نے کبھی آپ کا ذکر مجھ سے نہیں کیا۔ وہ چند دنوں پہلے تو حیدر آباد سے........"

"شاید انہیں کسی وجہ سے میرا ذکر کرنا یاد نہیں رہا ہو گا۔" بیگم ناہید نے درمیان میں کہا۔ "ان کا خط آیا تھا کہ میں جا کر آپ کی خیر خیریت معلوم کروں۔"

"میں کوئی ایک مہینے سے سخت بیمار ہوں اور پندرہ دن سے اس ہسپتال میں پڑی ہوں۔ مجھے نہ تو موت آتی ہے اور نہ صحت یاب ہونے کا نام لے رہی ہوں۔"

بیگم ناہید نے دیکھا کہ عابدہ بیگم کی سانسیں سینے میں پھول گئی ہیں اور ان سے بات کرنا مشکل ہو رہا ہے اور پھر وہ بے حد لاغر اور کمزور نظر آ رہی تھیں۔ صحت خاصی گر چکی تھی۔ چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ وہ کسی مُردے سے بدتر دکھائی دے رہے تھیں۔

"آپ پندرہ دنوں سے ہسپتال میں زیر علاج ہیں آپ کو کوئی فائدہ اور آرام نہیں ہوا؟" بیگم ناہید نے پوچھا۔

"جی نہیں۔" صفیہ نے جواب دیا۔ "بلکہ ہسپتال آ کر تو امی کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ ہسپتال میں ان کا علاج نہ ہونے کے برابر ہے۔ ڈاکٹر آتے ہیں تو مریض کی پوری بات نہیں سنتے ہیں کہ اسے کیا تکلیف ہے۔ کیا شکایت ہے۔ اس کے علاوہ نرسوں کے مزاج ہی نہیں ملتے ہیں۔ صرف ایک نرس ایسی ہے جو مریضوں سے بڑی محبت اور اخلاق سے پیش آتی ہے۔ ان کا خیال رکھتی ہے جو تکلیف ہو اسے رفع کرنے کی کوشش کرتی ہے۔"

"جب ہسپتال میں صحیح علاج نہیں ہو رہا ہے تو آپ گھر جا کر کیوں نہیں علاج کروا لیتیں۔ یہاں ذہنی کوفت اٹھانے سے کیا حاصل؟"

"یہاں کسی امید پر امی داخل ہیں۔" صفیہ بولی تو اس کی آواز میں افسردگی تھی۔ "کچھ دنوں میں اگر افاقہ نہیں ہوا تو پھر گھر واپس چلے جائیں گے۔"

"سرکاری ہسپتال میں یہی ایک بڑی خرابی ہے کہ غریب مریضوں کے علاج معالجے پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی ہے۔ حکومت مریضوں پر جو خرچ کرتی ہے اس کا دس فیصد بھی مریضوں پر خرچ ہو نہیں پاتا ہے۔ نرس ڈاکٹر اور عملہ اس سے فیضیاب ہوتا ہے اور بے چارہ غریب مریض مارا جاتا ہے۔"

"ڈاکٹر نے یہ دوائیاں لکھ کر دی ہیں۔" صفیہ نے تکیئے کے نیچے سے پرچہ نکال کر دکھایا۔ "اتنی مہنگی دوائیاں ہم کیسے خرید سکتے ہیں۔ کہاں سے لائیں۔"

بیگم ناہید نے پرچہ لے کر دیکھا۔ انہوں نے پرچے پر سے نظریں ہٹا کر صفیہ سے پوچھا۔ "آپ کی امی کو کیا شکایت ہے؟"

"میری امی انجائنا اور بلڈ شوگر کی مریضہ ہیں۔ ان دونوں بیماریوں نے مل کر میری امی کا حال آدھا کر دیا ہے۔" صفیہ نے زخم خوردہ لہجے میں کہا۔

"بیماریوں نے نہیں بہن بلکہ غربت اور تنگ دستی نے اس حال کو پہنچا دیا ہے۔" عابدہ بیگم مردہ لہجے میں بولیں۔

بیگم ناہید نے صفیہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے کنائیوں میں دو موتی دمک رہے تھے۔ اس نے فوراً ہی گھوم کر دوپٹہ کے کونے سے پونچھ لیا تھا۔ جب وہ ان کی طرف گھومی تو انہوں نے صفیہ سے کہا۔ "بیٹی! گھبرانے کی اور فکر کرنے کی کوئی ضرورت

نہیں ہے۔ خدا بڑا کارساز ہے آپ کی امی کی بیماری تشویش ناک نہیں ہے۔ تشویش کی بات جو ہے وہ یہ کہ یہاں مریضوں کے علاج معالجے پر توجہ نہیں دی جاتی ہے اور ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔

"آپ ایسا کریں' اپنا سامان سمیٹیں' میں ابھی ڈاکٹر سے مل کر آتی ہوں۔ آپ کی امی کی چھٹی کی پرچی بنوا کر لے آتی ہوں۔"

"کیا آپ امی کو اس ہسپتال سے ڈسچارج کروا رہی ہیں؟" صفیہ کے چہرے پر حیرت چھا گئی۔ بیگم ناہید نے ہاں کہاں تو وہ بولی۔ "انہیں گھر جا کر آرام نہیں ملے گا بلکہ........"

"میں آپ کی امی کو اس ہسپتال سے دوسرے ہسپتال لے جا رہی ہوں تاکہ ان کا علاج بہتر طریقے سے ہو سکے اور وہ جلد صحت یاب ہو جائیں۔" کوئی ایک گھنٹے کے بعد کراچی شہر کے سب سے بڑے اور مشہور پرائیویٹ کلینک میں وہ تینوں موجود تھیں۔ فوری طور پر عابدہ بیگم کے خون کا ٹسٹ کیا گیا۔ بڑی توجہ سے معائنہ کرنے کے بعد انجکشن اور دوائیاں دی گئیں۔ معائنے کے مراحل سے گزرنے کے بعد انہیں ایک بڑے اور ائرکنڈیشنڈ کمرے میں لے جایا گیا۔ بے حد آرام دہ بستر پر لے جا کر لٹا دیا گیا۔ بیگم ناہید' ماں بیٹی کو کمرے میں چھوڑ کر ڈاکٹر کے پاس چلی گئیں۔

جب ماں بیٹی کمرے میں رہ گئیں تو عابدہ بیگم نے بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ "صفیہ بیٹی! کہیں میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔"

"مجھے بھی ایسا لگ رہا ہے امی!" صفیہ نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "یہ کلینک تو کراچی کا سب سے بڑا' مہنگا اور مشہور کلینک ہے۔"

"انجکشن اور دوائیوں سے مجھے اس قدر آرام' سکون اور توانائی محسوس ہو رہی ہے جیسے نئی زندگی مل گئی ہو۔ ڈاکٹر کتنی نرمی' محبت' اپنائیت اور توجہ سے میرا معائنہ کر رہے تھے۔ پورا ایک گھنٹہ صرف کیا ہے میرے معائنے پر' جبکہ اس ہسپتال میں مجھے کسی ڈاکٹر نے ایک منٹ تک بھی دیکھنا گوارا نہیں کیا۔"

"یہ سب دولت کا اعجاز ہے امی جان!" صفیہ نے گہرا سانس لیا۔ "دولت ہو تو زندگی کا ہر آرام میسر ہے۔ اچھے سے اچھا علاج ممکن ہے۔ اس دولت کی بدولت ڈاکٹروں کے رویے میں بھی فرق آ جاتا ہے۔ غریبوں کی طرف ڈاکٹر تو ڈاکٹر خدا تک نظر کرم نہیں کرتا ہے۔ اسے ذرہ برابر رحم نہیں آتا ہے۔"

"نہیں بیٹی نہیں .... ایسی باتیں نہیں کرتے۔" ماں نے بیٹی کو محبت بھرے انداز سے سمجھایا۔ "خدا نے ہم پر نظر کرم کی کہ اس نے بیگم ناہید کے دل میں مدد کا جذبہ پیدا کر دیا۔ ورنہ ہم تو اس کا خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے۔ اس کے ہاں دیر ضرور ہے اور ہمیں اس کی ذات سے ناامید نہیں ہونا چاہئے۔"

"معلوم نہیں ہماری کون سی نیکی تھی جو آج کام آ گئی۔" عابدہ بیگم بولیں۔ "یہ کمرہ کتنا ٹھنڈا ہے۔ کتنی فرحت محسوس ہو رہی ہے اور کتنا آرام سا ہے۔"

"یہ ائرکنڈیشنڈ کمرہ ہے امی!" صفیہ نے بتایا۔ "اس کلینک میں تو امیروں' وزیروں اور دولت مندوں کا علاج ہوتا ہے۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ بیگم ناہید صاحبہ ہم پر اس قدر مہربان کیوں ہو گئی ہیں۔ وہ کس لئے ہم غریبوں پر اس قدر عنایت کر رہی ہیں۔"

"شاید اس لئے کہ وہ صابرہ کی سہیلی ہے۔" عابدہ بیگم نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ "انہیں ہماری حالت دیکھ کر بہت افسوس اور دکھ ہوا ہو گا۔ صابرہ کی سہیلی ہونے کی وجہ سے انہوں نے ہماری مدد کی ہے۔ وہ ایک امیر کبیر عورت ہے۔ خدا اُسے سدا خوش رکھے۔"

"ہمارے رشتہ داروں میں ایسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے جن کے پاس روپے پیسے کی افراط ہے۔" صفیہ کہنے لگی۔ "مگر ان میں سے کسی نے جھوٹے منہ کسی بھی موقع پر ہماری مدد کرنے کی خواہش ظاہر نہیں کی اور نہ رسمی طور پر کوئی پیشکش کی۔ جبکہ ہر ایک کے علم میں یہ بات ہے کہ ہم لٹ گئے ہیں۔ بڑی تنگ دستی سے گزارہ کر رہے ہیں۔ کوئی دن فاقے سے بھی گزر جاتا ہے اور پھر آپ ایک سرکاری ہسپتال میں ڈاکٹروں کے رحم و کرم پر ہیں۔"

"چلو اچھا ہوا کہ ایک غیر ہمارے کام آیا۔" عابدہ بیگم نے گہری سانس لی۔ "رشتہ داروں میں سب سے بڑی خرابی ہے کہ وہ کسی کے ذرہ برابر کام آ جائیں گے تو ساری زندگی اس کا احسان جتاتے رہیں گے اور سارے خاندان میں اس کا ڈھنڈورا پیٹتے رہیں گے اور اس غریب کو شرمندہ کرتے رہیں گے۔"

"مگر امی!" صفیہ نے تعجب سے کہا۔ "صابرہ خالہ نے کبھی بھولے سے بھی اپنی اس امیر کبیر سہیلی کا ذکر تک نہیں کیا۔ وہ جب بھی کراچی آئیں یہاں کچھ دن رہیں مگر وہ کبھی ایک دن کے لئے بھی اس سہیلی سے ملنے نہیں گئیں۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا

ہے۔ یہ ہماری محسن میرے لئے تو معمہ بنتی جا رہی ہیں۔"

جبھی کمرے کا دروازہ کھلا' بیگم ناہید کمرے میں داخل ہوئیں اور پلنگ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔ وہ مسکراتی ہوئی کہنے لگیں۔ "اب آپ کو کسی قسم کی فکر اور پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ یہاں آرام سے اپنا علاج کرایئے۔ خرچ کی فکر مت کیجئے' نہ دوائیوں کی' کھانا پینا اور تمام دوائیاں ہسپتال سے ملیں گی۔ اگر آپ چاہیں تو صفیہ بیٹی کو گھر بھیج دیں۔ یہاں آپ کی خدمت کے لئے ہمہ وقت ایک نرس موجود رہے گی۔ کوئی چاہے تو رہ بھی سکتا ہے' صبح شام آ کر دیکھ بھی سکتا ہے۔ آپ کو یہاں گھر جیسا ماحول ملے گا اور نرس بھی بیٹی کی طرح محبت سے پیش آئے گی۔ اب آپ کو کوئی تکلیف اور پریشانی نہیں ہو گی۔"

"میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں بہن!" عابدہ بیگم نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ "آپ نے جو کچھ میرے لئے کیا ہے میں تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اور آپ کا یہ احسان تو ہم ساری زندگی بھی ادا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکیں گے۔ آپ مجھے کسی معمولی ہسپتال میں بھی داخل کرا سکتی تھیں۔ کیا ضرورت تھی اتنے بڑے............"

"اگر میں اپنی سہیلی کی بہن کے کام نہیں آؤں گی تو پھر کس کے کام آؤں گی۔ میں صابرہ بیگم کو ایک عزیز بہن کی طرح سمجھتی ہوں۔ اس ناطے آپ میری بہن کی طرح ہوئیں۔ میں یہ سب کچھ اپنا فرض سمجھ کر کر رہی ہوں۔ میں آپ کے لئے جتنا بھی کروں گی وہ کم ہو گا۔ اگر میری بہن ہوتی تو میں اس کے ساتھ بھی اسی طرح پیش آتی جس طرح آپ کے ساتھ آ رہی ہوں۔ اس میں احسان کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں جو کچھ کرنا چاہتی ہوں وہ مجھے کرنے دیں۔" بیگم ناہید ایک ہی سانس میں بولتی گئیں۔

"امی!" صفیہ نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔ "ابو کو اور گھر میں کسی کو خبر نہیں ہے کہ آپ اس ہسپتال سے اس کلینک میں آ گئی ہیں۔ ابو ہسپتال پہنچیں گے تو............"

"تم ابھی اور اسی وقت اپنے ابو کو دفتر ٹیلی فون کر کے بتا دو کہ ہم یہاں موجود ہیں۔ وہ دفتر سے سیدھے یہاں آ جائیں۔" بیگم ناہید نے مشورہ دیا۔

"دن کا ایک بج رہا ہے وہ دفتر سے نکل چکے ہوں گے۔" صفیہ کمرے میں لگی دیواری گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے بولی۔ "ابو کا دفتر ہسپتال سے قریب ہے وہ کھانے کے وقفے میں خیر خیریت پوچھنے کے لئے دفتر سے ہسپتال چلے آتے ہیں۔ پانچ دس منٹ رک کر چلے جاتے ہیں۔ وہ ہمیں ہسپتال میں نہ پا کر پریشان ہو جائیں گے۔"

"تم میرے ساتھ گاڑی میں ہسپتال چلو۔" بیگم ناہید نے صفیہ سے کہا۔ "ہم جلدی سے چل کر انہیں جالیں واقعی وہ پریشان ہو جائیں گے۔"

"تم واپسی میں دوسرے دھلے ہوئے کپڑے لیتی آنا اور سامان اور میلے کپڑے بھی گھر چھوڑ آؤ۔" عابدہ بیگم نے اپنی بیٹی سے کہا۔

بیگم ناہید نے اپنے پرس سے پانچ ہزار کی رقم نکال کر عابدہ بیگم کے ہاتھ پر رکھ دی۔

"یہ ایک حقیر سا نذرانہ ہے اسے میری طرف سے قبول کرلیں۔ آپ اس رقم میں کلینک کے اخراجات نہیں کریں گی بلکہ گھریلو اخراجات کے لئے یہ رقم ہے۔ اس کلینک کے تمام اخراجات میں ادا کروں گی اور ہاں' کل آپ باقری صاحب کو اس پتے پر ضرور بھیج دیں۔ ان سے کہیں کہ وہ دفتر کا ناغہ کر کے مجھ سے آ کر ضرور ملیں۔ شاید میں ان کے کچھ کام آ سکوں۔"

عابدہ بیگم نے حیرت اور خوشی سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے نئے نوٹوں کی گڈی کو دیکھا جس میں عجیب سی خوشبو کی مہک اٹھ رہی تھی۔ رقم کتنی ہے انہیں اندازہ نہ ہو سکا تھا۔ تاہم انہوں نے یہ اندازہ ضرور کر لیا تھا کہ ہزاروں کی رقم ہے۔ سو سو روپے کے نئے نوٹ تھے۔ انہوں نے بیگم ناہید کا ہاتھ پکڑ کر نوٹوں کی گڈی لوٹاتے ہوئے کہا۔ "نہیں بہن! نہیں آپ نے جو یہ احسان مجھ پر کیا ہے وہ کیا کم ہے۔ مجھ پر اتنا بوجھ ہے کہ میں ہزار سال بھی اتار نہ سکوں گی اور پھر یہ رقم تو مجھے اتنا زیر بار کر دے گی کہ میرا وجود دب کر رہ جائے گا۔ میں بے حد غریب عورت ہوں بہن! ذرا سوچیں تو سہی میں اتنا بڑا بوجھ اپنے کندھوں پر کیسے سہار سکوں گی؟؟"

"میں آپ پر کوئی احسان نہیں کر رہی ہوں۔ کوئی بہن' بہن کے کام آتی ہے تو وہ احسان نہیں ہوتا ہے۔ اگر آپ نے رقم نہ لی تو مجھے بڑا دکھ ہو گا۔ میں صابرہ کو اپنی شکل تک دکھا نہ سکوں گی۔ میں یہ سب کچھ آپ کو اپنا سمجھ کر کر رہی ہوں۔" بیگم ناہید نے نوٹوں کی گڈی ان کے تکئے کے نیچے رکھ دی۔ "اچھا تو میں صفیہ کو لے کر بھائی صاحب کی تلاش میں جا رہی ہوں۔ جاتے جاتے نرس کو بھیج کر جا رہی ہوں۔ وہ کسی کے آ کر یہاں ٹھہرنے تک ڈیوٹی دیتی رہے گی۔"

بیگم ناہید' صفیہ کو ساتھ لے کر نکل گئیں۔ صفیہ نے سامان کی ٹوکری اٹھائی۔ اس لئے کہ کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ ان دونوں کے جانے کے بعد ایک حسین اور نوجوان نرس مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ اس نے انہیں

بڑے اخلاق سے سلام کیا اور ان کی خیر خیریت دریافت کی اور ترنم ریز لہجے میں کہا۔ "ایک بج چکا ہے' میں آپ کے لئے کھانا لے آؤں۔"

☆======☆======☆

ایک بجتے ہی باقری صاحب دفتر سے نکلے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے ہسپتال کی طرف چل پڑے۔ ان کا ذہن الجھا ہوا تھا اور بیوی کی پریشانی' گھریلو مسائل اور مالی پریشانیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی کی بیماری کی وجہ سے بہت زیادہ پریشان اور غمگین تھے۔ ان کی بیوی کو جو دو بیماریاں تھیں وہ بڑے لوگوں کی تھیں اور آج کل غریبوں کو بھی ہوئے جا رہی تھیں۔ ان کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ اس میں ایک معقول رقم پس انداز کر کے بیوی کا اچھی طرح سے علاج کرا سکیں۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح بیوی کو ہسپتال میں داخل تو کرا دیا تھا مگر ہسپتال میں جو بیوی کا علاج ہو رہا تھا اس سے قطعی مطمئن نہیں تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ بیوی کی طبیعت روز بہ روز بگڑتی جا رہی ہے اور پھر ان کا کلیجہ اس خیال سے کٹا جا رہا تھا کہ خدا نخواستہ کل اُن کی بیوی کو کچھ ہو گیا تو وہ کیا کریں گے۔ بچوں کا کیا ہو گا۔ گھر کا کیا بنے گا انہیں امید نہیں تھی کہ ہسپتال میں ان کی بیوی صحت یاب ہو جائے گی۔ اس لئے کہ یہاں توجہ سے اور خاطرخواہ علاج نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بڑی حسرت سے سوچ رہے تھے کہ اگر ان کے پاس دولت کی افراط ہوتی تو وہ اپنی اس دکھ سکھ کی ساتھی کے علاج معالجے پر ساری دولت پانی کی طرح بہا دیتے اور اسے صحت یاب بنا دیتے۔

جنرل وارڈ میں قدم رکھتے ہی ان کا دل سینے میں دھک سے ہو کر رہ گیا۔ انہوں نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا کہ ان کی بیوی کا بستر خالی ہے اور ان کی بیٹی صفیہ بھی وہاں موجود نہیں ہے۔ اللہ خیر کرے۔ ان کی زبان سے نکل گیا۔ پھر ایک اندیشے نے انہیں ڈس لیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کی بیوی کی طبیعت اچانک بہت زیادہ خراب ہو جانے کی صورت میں انہیں یہاں سے لے جایا گیا ہو یا پھر وہ اس دنیا سے .... وہ اس سے آگے کچھ سوچنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا سر چکرایا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا لیکن جلد ہی انہوں نے خود پر قابو پا لیا۔ بستر کے پاس پہنچ کر پاس والے پلنگ کی مریضہ سے پوچھا تو اس نے انہیں بڑی تفصیل سے بتایا کہ ایک بیگم صاحبہ آئی تھیں۔ وہ ان کی بیوی اور بیٹی کو اپنے ساتھ لے گئی ہیں۔ کیوں لے گئیں' کس لئے لے گئیں اسے کچھ پتا نہیں ہے۔

ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کون بیگم صاحبہ تھیں؟ وہ دل میں بڑے ششدر تھے کہ یہ کون بیگم صاحبہ تھیں اچانک کہاں سے ٹپک پڑیں۔ انہوں نے لاکھ سر پٹخا ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ کون بیگم صاحبہ تھیں۔ وہ کسی ایسی بیگم صاحبہ کو نہیں جانتے تھے اور نہ دور دور تک ایسی کوئی بیگم صاحبہ تھیں اور پھر وہ بیگم صاحبہ ان کی بیوی اور بیٹی کو ساتھ لے کر کہاں گئیں۔ کیوں گئیں۔ کس لئے گئیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ انہیں اپنی بیوی اور بیٹی پر سخت غصہ آ رہا تھا کہ وہ ہسپتال میں کسی کو کچھ بتا کر نہیں گئی تھیں۔ ہر کوئی ان کی بیوی اور بیٹی کے اس طرح اچانک چلے جانے سے حیران اور لاعلم تھا۔ اُن کی غم وغصے سے بُری حالت ہو رہی تھی۔

وہ ایک رکشا لے کر فوراً ہی گھر پہنچے۔ وہ رکشا میں جانے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ استطاعت رکھتے تو یہ سواری اس لئے استعمال نہیں کرتے تھے کہ اس سے گھر کے بجٹ کا توازن بگڑ جاتا تھا۔ گھر پہنچے تو پتا چلا کہ ان کی بیوی اور بیٹی یہاں بھی موجود نہیں ہیں۔ ان کے پیروں تلے زمین نکل گئی اور ان کے بچے بھی بہت پریشان ہو گئے تھے اور وہ اپنا سر پکڑ کے بیٹھ گئے۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا چکر ہے اور یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔

ایک خیال بجلی کی طرح ذہن میں آیا تو وہ اچھل پڑے کہیں ایسا تو نہیں کہ .... وہ اس سے آگے سوچنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی بڑی بیٹی صفیہ بہت حسین اور نوجوان تھی۔ اس عورت نے شاید ان کی بیٹی سے کوئی فائدہ اٹھانے کی غرض سے کوئی گھناؤنا منصوبہ بنایا اور ان دونوں کو بے وقوف بنا کر اپنے ساتھ لے گئی۔ اس خیال نے ان کے بدن کا سارا خون نچوڑ لیا۔ وہ جانتے تھے کہ کراچی میں کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔ یہاں ایک سے ایک بڑا شاطر پڑا ہوا ہے۔

جبھی ان کی بیٹی صفیہ مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی تو وہ اسے دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑے۔ بیٹی کا دمکتا چہرہ دیکھ کر ان کے دل کو بڑی خوشی ہوئی تھی۔ بہت دنوں بعد انہوں نے اپنی بیٹی کے چہرے پر مسکراہٹ اور اس کے چہرے کو کسی پھول کی طرح تر و تازہ دیکھا تھا۔ دوسرے لمحے ان پر حیرت اور غصہ چھا گیا۔ ان کے دل میں کئی سوالات اپنا سر اٹھانے لگے۔ انہوں نے اپنا غصہ دباتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ "تم دونوں ہسپتال سے کہاں چلی گئی تھیں؟ یہ تم اکیلی کہاں سے آ رہی ہو تمہاری ماں کہاں ہے؟"

"امی عباس کلینک میں داخل ہیں۔" صفیہ نے جواب دیا۔ "آج صبح گیارہ بجے

صابرہ خالہ کی ایک سہیلی آئی تھیں۔ انہوں نے لے جا کر اس کلینک میں داخل کرا دیا ہے۔ امی اسی ہسپتال میں داخل ہیں۔"

"عباس کلینک.........!" باقری صاحب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "تم ہوش میں تو ہو بیٹی! عباس کلینک کی حدود میں ہم جیسوں کو گھسنے بھی نہیں دیا جاتا ہے۔ اس کلینک کے جنرل وارڈ میں کھاتے پیتے گھرانے کے لوگ ہی داخل ہو سکتے ہیں۔ وہ تو دولت مندوں کا کلینک ہے۔ غریبوں کے لئے سرکاری ہسپتال ہوتے ہیں۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں ابو!" صفیہ بولی۔ "اس کلینک میں لے جاتے ہی امی کا فوری طور پر معائنہ کیا گیا۔ انہیں انجکشن اور دوائیاں دی گئیں اور پھر ایک بڑے کمرے میں داخل کیا گیا ہے۔ یہ کمرہ ائرکنڈیشنڈ بھی ہے اور پھر امی کے پاس ایک نرس بھی موجود ہے جو ہماری غیر حاضری میں موجود رہے گی۔"

"کیا تم مجھے اپنا کوئی خواب سنا رہی ہو؟ صابرہ کی ایسی کون سی رئیس سہیلی ہے۔ اگر ہے بھی تو وہ ہم پر اس قدر مہربان کیوں ہونے لگی۔ ہم ٹھہرے غریب' بڑے لوگ تو بغیر کسی غرض کے ایک غریب پر مہربان ہو ہی نہیں سکتے ہیں اور پھر صابرہ بھی ایک غریب عورت ہے۔" باقری صاحب بولے۔

"ان کا نام بیگم ناہید ہے۔ باہر ان کی کار کھڑی ہے اور وہ کار میں موجود ہیں۔" صفیہ نے انہیں مختصر طور پر بتایا کہ وہ کس لئے اس کے ساتھ آئی ہیں۔

باقری صاحب فوراً ہی باہر آئے۔ انہوں نے بیگم ناہید' ان کی قیمتی گاڑی اور باوردی ڈرائیور کو دیکھا تو وہ مرعوب اور متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے بڑے تپاک سے سلام کیا تو بیگم ناہید نیچے اتر آئیں۔ پھر وہ باقری صاحب کے اصرار پر ان کے گھر کے اندر چلی آئیں۔ باقری صاحب ایک معمولی آدمی تھے مگر گھر اور اولاد کے معاملے میں بڑے خوش قسمت آدمی تھے۔ بیگم ناہید کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ تنگ دستی کے باوجود گھر بے حد صاف ستھرا ہے۔ ان کی لڑکیاں نفاست پسند اور سلیقہ مند ہیں۔ لڑکے بھی بڑے بااخلاق دکھائی دے رہے تھے۔ باقری صاحب کی تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ باقری صاحب نے انہیں بتایا کہ مالی مشکلات کی وجہ سے انہوں نے لڑکیوں کی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرا دیا ہے جبکہ لڑکے پڑھ رہے ہیں۔

کچھ دیر کے بعد ایک لڑکی ان کے لئے چائے بنا کر لے آئی۔ چائے پی کر ان کا دل خوش ہو گیا۔ چائے بہت اچھی بنی ہوئی تھی۔ ادھر باقری صاحب اس عورت کو عقیدت کی

نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ چائے پی کر اٹھ کھڑی ہوئیں صفیہ بھی ٹوکری میں کپڑے لے آئی۔ انہوں نے صفیہ اور باقری صاحب کو کلینک پر چھوڑ دیا اور خود دفتر کی طرف روزانہ ہو گئیں۔ اس لمحے وہ ایک عجیب سی روحانی مسرت سے دوچار ہو رہی تھیں۔ انہیں آج سے پہلے کبھی ایسی مسرت نہیں ملی تھی۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ حقیقی خوشی تو ضرورت مندوں کی مدد کر کے ہی حاصل ہوتی ہے۔ کاروبار میں منافع کما کر نہیں۔

باقری صاحب خواب کی سی حالت میں اس کمرے میں پہنچے جہاں عابدہ بیگم داخل تھیں۔ وہ بڑے سکون سے سو رہی تھیں اور ان کے چہرے پر طمانیت سی چھائی ہوئی تھی۔ وہ صبح کے مقابلے میں بڑی صحت مند نظر آ رہی تھیں۔ بروقت اور صحیح علاج سے صرف چند گھنٹے میں اثر پڑ گیا تھا۔ نرس ان دونوں کو دیکھ کر اور کچھ ہدایات کر کے چلی گئی۔ باقری صاحب اس کمرے میں کھڑے اس کے طلسم کے اسیر ہو رہے تھے۔

باقری صاحب دوسرے دن عابدہ بیگم کے کہنے پر اپنے دفتر سے چھٹی لے کر بیگم ناہید کے دفتر پہنچے۔ ایک طرف تو وہ بیگم ناہید کی نوازش سے بے حد متاثر ہوئے تھے کہ ان کی بیوی کے علاج معالجے کے نہ صرف اخراجات برداشت کر رہی ہیں بلکہ پانچ ہزار کی رقم بھی دے گئی ہیں۔ دوسری طرف ان کے دل کے کسی کونے میں شک کی لہر اٹھ رہی تھی کہ بیگم ناہید کو آخر ان سے ایسی کیا غرض ہو سکتی ہے جو انہوں نے ان کے لئے اتنا کچھ کیا ہے۔ جبکہ ایک سگی بہن بھی اپنی بہن کے لئے اتنا نہیں کر سکتی اور پھر بیگم ناہید تو ان کی سالی کی سہیلی ہے۔ بیگم ناہید نے انہیں اپنے دفتر اس لئے بلایا ہے کہ اپنی نوازشات کا صلہ حاصل کر سکیں۔ اپنی غرض بیان کر سکیں۔ ورنہ فوری طور پر بلانے کا سبب یہ ہے کہ اس میں بیگم ناہید کی کوئی غرض پوشیدہ ہے۔

باقری صاحب یہ سب کچھ سوچتے ہوئے بیگم ناہید کی پرسنل سیکرٹری کے پاس پہنچے۔ وہ بھی ایک پرائیویٹ دفتر میں ملازم تھے مگر ان کا دفتر اتنا شاندار نہیں تھا۔ بیگم ناہید کے دفتر کا ماحول اور دبدبہ ہی کچھ اور تھا۔ بیگم ناہید کی سیکرٹری نے انہیں ذرا حیرت سے دیکھا۔ اس لئے کہ بیگم ناہید بہت کم لوگوں سے ملتی تھیں اور اس وقت بے حد مصروف تھیں۔ بیگم ناہید کے کمرے میں اس وقت فنانس منیجر اور پرچیز منیجر میٹنگ کر رہے تھے۔ سیکرٹری جانتی تھی کہ یہ میٹنگ ابھی ایک گھنٹہ سے زیادہ جاری رہے گی۔ لہٰذا اس نے باقری صاحب سے کہا آپ کل تشریف لائیں۔ آج وہ کسی سے نہ مل سکیں گی۔

باقری صاحب دفتری آدمی تھے ان پرائیویٹ سیکرٹریوں کی رگ رگ سے خوب

واقف تھے اور پھر اس پرائیویٹ دفتر میں پندرہ برس سے جھک مار رہے تھے۔ وہ سیکرٹری سے بولے۔ "کل آپ کی باس نے مجھے آج گیارہ بجے بلایا تھا۔ آپ انہیں صرف بتا دیں کہ باقری صاحب آئے ہیں۔"

سیکرٹری ان کی بات سن کر مرعوب ہو گئی۔ اس نے انٹرکام پر باقری صاحب کی آمد کی اطلاع دی تو بیگم ناہید نے فوراً انہیں اندر بھیجنے کے لئے کہا۔ سیکرٹری کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ دونوں منیجرز میٹنگ منقطع کر کے باہر آئے تھے باقری صاحب کے اندر جاتے ہی' اسے کچھ اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ باقری صاحب کیا چیز ہیں جو اس کی باس نے انہیں اس قدر اہمیت دی تھی۔ دونوں منیجرز کے چہروں پر بھی کچھ ایسے ہی تاثرات تھے۔

بیگم ناہید نے انہیں بڑی عزت و احترام سے بٹھایا' سیکرٹری سے کہہ کر ان کے لئے چائے منگوائی۔ رسمی باتوں کے بعد وہ بولیں۔ "آپ اپنی لڑکیوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری کرا دیں۔ آج کل لڑکیوں کو کم از کم میٹرک تک ضرور پڑھنا چاہئے۔ آپ کی لڑکیاں اپنی تعلیم تو مکمل کر لیں۔"

باقری صاحب کو جواب دینے میں کچھ تذبذب تھا۔ صفیہ بی اے کے دوسرے سال میں تھی۔ منجھلی لڑکی نجمہ انٹر سائنس میں اور تیسری میٹرک کا امتحان نہ دے سکی تھی۔ ان کا ایک لڑکا انٹر سائنس میں تھا اور ایک بی کام کے سال اول میں تھا۔ وہ چند لمحوں کے بعد بولے۔ "بات یہ ہے بیگم صاحبہ! میری تنخواہ اتنی ہے کہ میں پانچوں کے تعلیمی اخراجات کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا ہوں۔ کرایہ کا مکان جس کا کرایہ ہر سال بڑھتا جاتا ہے۔ مہنگائی میں الگ اضافہ ہو رہا ہے۔ میں ایک معمولی ملازم پیشہ آدمی ہوں کہاں تک اخراجات برداشت کر سکتا ہوں۔"

"آپ اپنے دفتر میں کس ڈیپارٹمنٹ میں ہیں؟"

"میں اکاؤنٹ میں ہوں۔ بل اور چیک بنانے کی ذمہ داری میری ہے۔ پندرہ برس سے یہی کام کر رہا ہوں۔" انہوں نے جواب دیا۔

"میرے ہاں ایک اسسٹنٹ اکاؤنٹینٹ کی جگہ خالی ہے۔ اگر آپ پسند فرمائیں تو میں وہ جگہ آپ کو دے سکتی ہوں۔" بیگم ناہید بولیں۔

"آپ حکم دیں۔ میں آپ کی ہر خدمت بجا لانے کے لئے تیار ہوں۔" باقری صاحب نے ممنونیت کے انداز میں کہا۔ "آپ کے احسانات پہلے ہی کیا کم ہیں مجھ پر اور میرے گھر پر' آپ کا یہ ایک اور احسان ہو گا میرے گھر پر' مجھے بڑی خوشی ہو گی آپ کی

خدمت کر کے۔"

"آپ جس کمپنی میں پندرہ برس سے ملازمت کر رہے ہیں اس کمپنی کے باس شیخ مجاہد میرے دور کے عزیزوں میں سے ہیں۔" بیگم ناہید کہنے لگیں۔ "کل میں نے ٹیلی فون پر آپ کے متعلق پوچھا تھا۔ وہ آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر اور جان کر بڑا افسوس ہوا کہ شیخ مجاہد کی کمپنی میں آپ کی فرض شناسی' محنت اور دیانت داری کی کوئی قدر نہیں کی گئی۔ بہرکیف آپ ایک ہفتہ کے بعد سے میرے یہاں اپنے فرائض کی ادائیگی شروع کر دیں۔ اس ایک ہفتے کے اندر آپ اپنے لئے نہ صرف چند اچھے جوڑے بنوا لیں بلکہ اس گھر کو چھوڑ کر نئے گھر میں منتقل ہو جائیں۔ اس کمپنی میں اپنا استعفیٰ بھی پیش کر دیں۔ میں نے شیخ مجاہد سے بات کر لی ہے۔"

"میں اپنے لئے اچھے کپڑے بنوا لوں گا اور دفتر کے ماحول کا خیال رکھوں گا۔ گھر بدلنے کے لئے مہلت دیں تو بڑی نوازش ہو گی۔" باقری صاحب نے استدعا کی۔

"آپ کو کمپنی کی طرف سے ایک گھر ناظم آباد کے علاقے میں دیا جا رہا ہے۔ یہ کمپنی کا بنگلہ ہے جو چار سو گز پر بنا ہوا ہے۔ آپ کی فیملی کے لئے کافی ہو گا نا!"

"آپ تو ہمیں جھونپڑی سے نکال کر محل میں پہنچا رہی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کن الفاظ میں آپ کا شکریہ ادا کروں۔" ان کی آواز شدتِ جذبات سے مغلوب ہو گئی۔

"آپ کو تین ہزار روپے کی تنخواہ کے علاوہ اور بھی سہولتیں حاصل ہوں گی۔ جس میں مکان کی سہولت بھی حاصل ہے۔" بیگم ناہید نے توقف کر کے میز کی دراز کھولی اس میں سے نئے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اسے لفافے میں رکھ کر ان کی طرف بڑھائی۔

"یہ دس ہزار روپے ہیں۔ اس رقم میں نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنی بیوی اور بچوں کے لئے بھی اچھے کپڑے بنوا لیں۔ تین دن کے بعد آپ کو کمپنی کی طرف سے گھر مل جائے گا۔ یہ گھر مکمل طور پر آراستہ و پیراستہ اور ضرورت کی تمام چیزوں کے لوازمات سے لیس ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ایک نئی اور خوشگوار زندگی کا آغاز بہت ہی اچھے طریقے سے ہو۔"

"سچ پوچھئے تو مجھے یہ سب کچھ کسی خواب کی طرح لگ رہا ہے۔" باقری صاحب جذباتی ہو کر بولے۔ "مجھے اس رقم کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ جو کل ہسپتال میں پانچ ہزار کی رقم دے گئی ہیں وہی میرے لئے بہت کافی ہے۔ آپ اس قدر نوازشات کر کے

مجھے میری اوقات سے محروم نہ کریں آخر میں ایک غریب آدمی ہوں۔"

"میں جانتی ہوں کہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو لالچی نہیں ہوتے' قناعت پسند ہوتے ہیں۔ اپنے کام سے مطلب ہوتا ہے۔ میں ایسے لوگوں کو ایک نظر میں پہچان لیتی ہوں۔ آپ کی بدقسمتی تھی کہ کسی نے آپ کی قدر نہیں کی۔ اب یہ بدقسمتی کے دن گزر گئے۔ خوش قسمتی کے دَر خدا نے کھول دیئے ہیں۔ اس کا ہر وقت شکر ادا کرتے رہئے گا۔"

"آپ یہ سب کچھ کس جذبے کے ناطے کر رہی ہیں؟" باقری صاحب نے بڑی حیرت سے پوچھا۔

"میں صابرہ بیگم کا وہ احسان اتارنے کی کوشش کر رہی ہوں جو انہوں نے میری ذات پر کیا ہے۔ پھر بھی مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں اس احسان کا عشر عشیر بھی اتار نہیں سکوں گی۔ خدا مجھے اس بات کی توفیق دے کہ میں ان کے احسان کا بدلہ قرض سمجھ کر اتارتی رہوں۔"

باقری صاحب بڑی دیر تک حیران ہو کر دل میں یہ سوچتے رہے کہ صابرہ بیگم نے اس امیر کبیر عورت پر ایسا کون سا احسان کیا ہو گا جس کی وجہ سے یہ ان کی زندگی کو جنت کی سی حسین زندگی بنانے پر تلی ہوئی ہیں۔ یہ بات صابرہ بیگم سے پوچھنا ہی پڑے گی۔

باقری صاحب' ناہید بیگم کے دفتر سے نکل کر سیدھے کلینک پہنچے۔ دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ عابدہ بیگم دوپہر کا کھانا کھا رہی تھیں۔ کمرے میں صفیہ تھی۔ نرس کھانا دے کر جا چکی تھی۔ باقری صاحب نے کرسی پر بیٹھ کر عابدہ بیگم کو آج کا احوال سنایا تو ماں اور بیٹی خوش ہو گئیں۔ عابدہ بیگم بولیں۔ "خدا نے اس عورت کو ہمارے لئے فرشتہ بنا کر بھیج دیا ہے۔ اس نیک عورت نے دو ہی دن میں ہماری کایا پلٹ کر رکھ دی ہے اور وہ خوشیاں دی ہیں جو ہمیں ساری زندگی بھی نہیں مل سکتی تھیں۔"

"مگر میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔" باقری صاحب بولے۔ "صابرہ نے اس عورت پر آخر ایسا کون سا احسان کیا ہو گا جو وہ ہم پر اس قدر مہربان ہو گئی ہیں۔"

"میں کل خود سارا دن یہی کچھ سوچتی رہی ہوں۔" عابدہ بیگم نے کہا۔ "اگر صابرہ نے بیگم ناہید پر کوئی احسان کیا ہے تو انہوں نے صابرہ بیگم کے دن کیوں نہیں پھیرے؟"

"ہو سکتا ہے بیگم ناہید نے ان کے لئے کچھ کیا ہو اور کر رہی ہوں۔" باقری صاحب بولے۔ "ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ انہیں چھوڑ کر وہ ہم پر پہلے احسان کریں۔"

"کچھ دن پہلے صابرہ آئی تھی تو اپنی محرومیوں کا بڑا رونا رو رہی تھی اور اسے اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ اس کے مالی حالات ایسے نہیں ہیں کہ ہمارے لئے کچھ کر سکے۔ وہ غریب بے حد پریشان تھی اور اپنی بے بسی پر کڑھتی اور روتی رہی تھی اور ہم سے ان کے حالات کون سے چھپے ہوئے ہیں۔"

"ہمیں ہر قیمت پر اس معمے کو حل کرنا ہو گا۔ اس وقت تک میرے دل کو تسلی و تشفی نہ ہو گی جب تک میں یہ معمہ حل نہ کرلوں۔" باقری صاحب نے کہا۔

"میں کل ہی صابرہ خالہ کو خط لکھ کر یہاں کے حالات سے آگاہ کرتی ہوں۔ کیا معلوم صابرہ خالہ کو ان حالات کی خبر نہ ہو۔" صفیہ بولی۔

"کل نہیں آج اور ابھی اپنی خالہ کو خط لکھو۔ میں نئے گھر میں منتقل ہونے کے دوسرے دن حیدر آباد کا ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔" باقری صاحب بولتے بولتے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

☆-------☆-------☆

سہ پہر کا وقت تھا۔ صابرہ بیگم کے ہاں بڑی چہل پہل اور رونق تھی۔ آج کچھ عورتیں رضیہ کو دیکھنے آ رہی تھیں۔ رضیہ کا رشتہ زینب خالہ لگا رہی تھیں جو دور کی رشتہ دار تھیں اور فی سبیل اللہ یہ کام کرتی تھیں۔ تین دن پہلے وہی رشتہ لے کر آئی تھیں۔ صابرہ بیگم اس رشتے کے حق میں اس لئے نہیں تھیں کہ بیٹی کی شادی کرنے کے لئے ان کے پاس پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ ادھر ان کے میاں کی نوکری چھوٹی تھی اور وہ شکیلہ کی رقم سے کاروبار کر رہے تھے۔ کاروبار شروع کئے صرف تین دن ہوئے تھے۔ وہ اس بات سے پریشان تھیں کہ کاروبار نہیں چلا تو آئندہ گھر کیسے چلے گا۔ اب جو گھر چل رہا ہے وہ ایسے کہ شکیلہ نے ان کے گھر بہت سارا سامان لا کر ڈال دیا تھا۔ وہ دو ایک مہینے کے لئے کافی تھا۔ ان کے میاں جو آخری تنخواہ لے آئے تھے اس سے بڑی سہولت ہو گئی تھی۔ لڑکی کی شادی کے لئے نہ صرف زیورات کی ضرورت تھی بلکہ جوڑے بھی بنانے تھے۔ جہیز کے لئے خاص رقم کی ضرورت تھی۔ مگر شکیلہ کا اصرار تھا کہ لڑکے والوں کو آنے دیں۔ لڑکی کو پسند کرنے دیں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ لڑکا اور خاندان اچھا ہو تو ان لوگوں سے کچھ دنوں کی مہلت لے کر کسی نہ کسی طرح جہیز اور شادی کے اخراجات کا بندوبست کرلیں گے۔ وہ شکیلہ کی کسی بات کو انکار کرنا نہیں چاہتی تھیں اور ان کی سمجھ میں شکیلہ کی باتیں آ گئی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ شکیلہ ایک سگی بیٹی کی طرح اس گھر کی

بھلائی چاہتی ہے۔

گھر میں نیا ساز و سامان آنے کے بعد شکیلہ نے ان کی لڑکیوں کے ساتھ مل کر گھر میں ایسا شاندار رنگ و روغن کیا تھا کہ اس گھر کا روپ ایسے غضب کا نکھر آیا تھا کہ یہ گھر نیا اور بڑے غضب کا لگ رہا تھا۔ بالکل نیا دکھائی دے رہا تھا۔ نئے ساز و سامان نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔ محلے میں کچھ لوگوں نے صابرہ بیگم کے گھر میں نمایاں تبدیلی دیکھی تو ان کے سینوں پر سانپ لوٹ گئے۔ بہت زیادہ لوگ ایسے تھے جو یہ دیکھ کر خوش ہوئے تھے کہ صابرہ بیگم کو اچھے دن دیکھنا نصیب ہو رہے ہیں اور ادریس احمد اپنا کاروبار کر رہے ہیں۔ مہمانوں کے آنے میں کچھ دیر باقی تھی۔ شکیلہ نے تینوں بہنوں کے ساتھ مل کر نہ صرف گھر چمکا دیا تھا بلکہ خود بھی مہمانوں کے انتظار میں تیار ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔ یہ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ دروازے پر بڑے زور سے دستک ہوئی۔ رضیہ یہ سمجھ کر اندر کی طرف لپکی کہ مہمان عورتیں اسے دیکھنے آ گئی ہیں۔ رئیسہ دروازہ کھولنے بڑھی۔ شکیلہ صحن میں عابدہ بیگم اور آسیہ کے ساتھ کھڑی ہوئیں دروازے کی طرف دیکھنے لگیں۔ رئیسہ دروازے کے پاس پہنچی بھی نہیں تھی کہ کسی نے پھر بڑی بدتمیزی اور زور سے دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔

رئیسہ دروازہ کھول کر حواس باختہ ہو کر دو ایک قدم پیچھے اس طرح ہٹی جیسے اس نے کوئی سانپ دروازے میں لہراتا ہوا دیکھ لیا ہو۔ وہ پیچھے ہٹی تھی کہ مالک مکان نجم احمد اپنے دو آدمیوں کے ساتھ غراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ جو دو آدمی تھے وہ اپنی وضع قطع اور چہرے سے بدمعاش لگ رہے تھے۔ وہ بھی دندناتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔ ان تینوں کے پیچھے پیچھے منشی جی رجسٹر اور کاغذات اٹھائے اندر داخل ہوئے۔ مالک مکان کو بے موقع آتے دیکھ کر صابرہ بیگم کو چکر سے آ گئے۔ اگر وہ آسیہ کا سہارا نہ لیتی تو تیورا کھا کر زمین پر گر پڑتیں۔

مالک مکان نے جو اپنے مکان کی حالت دیکھی تو اسے یقین نہیں آیا کہ وہ اس مکان کا مالک ہے۔ اس لئے کہ اس نے جب سے یہ مکان کرائے پر دیا تھا تب سے اس نے اس مکان میں رنگ و روغن نہیں کرایا تھا۔ رنگ و روغن اور نئے ساز و سامان نے اس گھر کا نقشہ ہی بدل دیا تھا۔ یہ گھر شاندار نظر آ رہا تھا۔ اس نے جیسا دوسروں سے سنا تھا ویسا ہی پایا تھا۔ آسیہ نے شکیلہ کو سرگوشی میں بتا دیا تھا کہ یہ مالک مکان ہے۔

مالک مکان کی نظر اب تک شکیلہ پر نہیں پڑی تھی۔ وہ تو اپنے گھر اور کمروں سے

جھانکتے ہوئے سامان کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جیسے ہی نشست گاہ کی طرف بڑھا شکیلہ کی کڑک دار آواز فضا میں گونجی۔ "خبردار! جو کوئی کمرے کے اندر گیا۔" وہ تیزی سے اس کمرے کی دہلیز پر جاکر کھڑی ہو گئی۔

مالک مکان نے ایک حسین چہرے کو اپنے راستے میں حائل دیکھا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ شکیلہ کی تیوریاں چڑھی ہوئی دیکھ کر ایک لمحے کے لئے وہ سانس لینا بھول گیا تھا۔ جب ذرا ہوش آیا تو اسے اپنی اس بے عزتی پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے ایک دم سے بھنا کر کہا۔ "تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے والی' یہ میرا گھر ہے۔"

"آپ ذرا زبان سنبھال کر بات کریں۔" شکیلہ بھڑک اٹھی۔ "آپ جناب سے بات کریں۔ ورنہ دماغ درست کردوں گی۔"

مالک مکان پر شکیلہ کے تیز و تند لہجے کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ وہ اس کے زیر اثر آگیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ عورت کسی بڑے گھرانے کی اور تعلیم یافتہ ہے۔ اس نے سنبھل کر مگر ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"مالک مکان ہوں اور میں اس مکان میں داخل ہونے کا پورا پورا اختیار رکھتا ہوں۔ مجھے اندر داخل ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا ہے۔"

"آپ مالک مکان ہوں یا کمشنر صاحب۔" شکیلہ نے تنک کر جواب دیا۔ "بغیر اجازت آپ اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتے ہیں۔ آپ نے جس طرح اس گھر کے اندر قدم رکھا ہے وہ قابلِ اعتراض ہے۔ بہتر ہے آپ گھر سے باہر تشریف لے جائیں اور اجازت لے کر اندر آئیں۔"

شکیلہ کی باتیں جلتی پر تیل بن کر گریں۔ مالک مکان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کی اپنے ملازموں کے سامنے اس کی بڑی سخت بے عزتی اور توہین ہوئی تھی۔ وہ آپے سے باہر ہو کر بولا۔ "آپ زیادہ بکواس نہ کریں۔ مجھے اندر جانے سے کوئی روک نہیں سکتا ہے۔ میں اندر جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا۔"

"اگر آپ کے دل میں ایسی کوئی حسرت ہے تو اندر جاکر پوری کرلیں۔ میں یہاں سے سیدھے فوجی ہیڈ کوارٹر جارہی ہوں۔ وہاں جاکر یہ شکایت کروں گی کہ مالک مکان اپنے پالتو غنڈوں کے ساتھ گھر میں عورتیں دیکھ کر گھس آیا ہے اور اس نے عورتوں کے ساتھ اہانت آمیز سلوک کیا ہے۔ آپ اتنا تو جانتے ہوں گے کہ فوجی اس کی سزا کتنے کوڑوں میں دیتے ہیں؟"

مارشل لاء کا دور دورہ تھا۔ مجرموں کو روزانہ کوڑوں کی سزا مل رہی تھی۔ مالک مکان پر اس دھمکی نے بجلی کا سا اثر کیا۔ وہ ایک دم سے نرم پڑ گیا۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کا واسطہ کسی معمولی یا جاہل قسم کی عورت سے نہیں پڑا ہے۔ اس کے سامنے ایک عورت کسی شیرنی کی طرح غضبناک ہو کر کھڑی' دہکتے انگاروں جیسی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ اس نے اپنا لہجہ بدلتے ہوئے شکیلہ سے کہا۔

"اچھی زبردستی ہے۔ ایک تو چھ مہینے سے کرایہ نہیں دیا' اوپر سے بے عزت کر کے گھر سے نکالیں۔"

"کرایہ لینا ہے تو عزت سے اندر آئیں۔ اجازت لے کر اندر آئیں۔" شکیلہ نے تند لہجے میں کہا۔ "یہ کوئی طریقہ ہے کہ جانوروں کی طرح منہ اٹھائے اندر چلے آئیں۔ کیا یہ طریقہ اس گھر کی پردہ دار عورتوں کے لئے نامناسب نہیں ہے؟ اس میں اُن کی بے عزتی کی بات نہیں ہے؟ اگر آپ کو اپنی عزت کا اتنا ہی خیال ہے تو ہمارا بھی ہونا چاہئے۔ آپ کے حق میں زیادہ بہتر یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کو لے کر باہر جائیں اور اندر آنے کی اجازت مانگیں۔ ورنہ میں آپ کے خلاف جاکر رپورٹ لکھوا دوں گی۔"

دروازے پر محلے کی لڑکیوں اور عورتوں کی بھیڑ لگ گئی تھی اور وہ سب یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔ ان میں وہ عورتیں بھی شامل تھیں جنھوں نے مالک مکان کے کان بھرے تھے۔ مالک مکان خجل ہو کر گھر سے باہر نکلا۔ پھر دروازے پر کھڑے ہو کر اندر آنے کی اجازت مانگی تو شکیلہ نے کہا۔ "آپ اور آپ کے منشی اندر آجائیں۔" جب دونوں اندر آگئے تو باہر کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

صابرہ بیگم یہ تماشا دیکھ کر دل میں بڑی خوفزدہ ہو رہی تھیں۔ شکیلہ نے مالک مکان کے ساتھ جو برتاؤ کیا تھا اس نے ان کا خون خشک کر دیا تھا۔ گو مالک مکان کا رویہ بڑا غلط تھا مگر ان کی مجبوری یہ تھی کہ وہ مکان کے مالک کو اس لئے کچھ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ ان پر چھ مہینے کا کرایہ باقی تھا۔ شکیلہ نے مالک مکان اور منشی جی کو نشست گاہ میں لے جاکر بٹھایا اور رئیسہ سے کہا کہ ان کے لئے چائے لے آئے۔ جب رئیسہ چلی گئی تو شکیلہ بولی۔

"اب فرمایئے! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"میں چھ مہینے کا کرایہ وصول کرنے آیا ہوں۔" مالک مکان نے نرم لہجے میں کہا۔

"مگر آپ ان چھٹے ہوئے بدمعاشوں کو ساتھ لے کر کیوں آئے ہیں۔ یہ کوئی شرافت ہے کہ غنڈوں کو لا کر گھر کی عورتوں کو ڈرایا دھمکایا جائے۔"

"میں یہ گھر خالی کرانے آیا تھا۔ آج مجھے پورا کرایہ چاہئے اگر کرایہ نہیں دے سکتے تو آج ابھی اور اسی وقت گھر خالی کر دیں۔" مالک مکان کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

"آپ چھ ماہ کی رسید بنائیں۔ میں آپ کو بقایا یکمشت ادا کر رہی ہوں اور اب آپ کو آئندہ کرایہ ہر ماہ کی پانچ تاریخ کو مل جائے گا۔" شکیلہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں رسید بنا کر دے رہا ہوں لیکن آپ ایک بات سن لیں کہ آپ لوگوں کو دو تین مہینے کے اندر اندر اس مکان کو خالی کر دینا ہو گا۔"

"وہ کس لئے؟" شکیلہ نے تعجب سے پوچھا۔ "میں تو آپ کو کرایہ دے رہی ہوں اور باقاعدگی سے کرایہ دیتی رہوں گی۔"

"میں یہ مکان بیچ رہا ہوں۔ میں تنگ آگیا ہوں روز روز کی چخ چخ سے۔ اب اس منحوس مکان کو بیچ کر ہی رہوں گا۔" مالک مکان جل کر بولا۔

"آپ منحوس مکان کتنے میں بیچنا چاہتے ہیں؟" شکیلہ نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "مگر ایک بات کا خیال رکھیں کہ جب آپ یہ مکان بیچیں گے ہم اس رنگ و روغن کے پیسے اور مزدوری کرائے میں سے کاٹ لیں گے۔ اگر آپ نے پیسے نہیں دیئے تو ہم سارا رنگ و روغن کھرچ کر چلے جائیں گے۔ اس لئے کہ آپ نے آج تک اس منحوس مکان میں کوئی رنگ و روغن نہیں کرایا ہے۔"

"پچیس ہزار روپے میں۔" مالک مکان نے جواب دیا۔ "میں رنگ و روغن کے پیسے دینے کو تیار ہوں۔"

"پچیس ہزار روپے اس مکان کے زیادہ ہیں۔" شکیلہ نے کاروباری انداز میں کہا۔ "پندرہ ہزار روپے میں دینے کی بات کریں تو ابھی سودا ہوا جاتا ہے۔"

آخر اس مکان کا سودا اٹھارہ ہزار روپے میں ہو گیا۔ شکیلہ [illegible] پڑوس کے دو بزرگوں کو بلا کر ان کی موجودگی میں کاغذی کارروائی مکمل کی اور دس ہزار کی رقم گن کر مالک مکان کو دے دی۔ ایک آدمی کو بھیج کر اوتھ کمشنر کو بلوایا گیا جو اسی محلے میں رہتا تھا۔ اگلے دن رجسٹرار کے پاس جا کر دستخط کرنے کے بعد باقی آٹھ ہزار کی رقم ادا کرنا طے پایا۔

شکیلہ نے یہ مکان صابرہ بیگم کے نام کر دیا۔ صابرہ بیگم کو یہ سب کچھ ایک خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ لڑکیاں بھی بہت حیران اور خوش تھیں کہ یہ مکان انہیں مل گیا۔ شکیلہ نے فوراً ہی پانچ سیر مٹھائی منگوائی اور سارے محلے میں تقسیم کرا دی۔

جب سب لوگ چلے گئے تو صابرہ بیگم' شکیلہ کو سینے سے لگا کر رو پڑیں۔ "بیٹی! آخر

تم اپنا پیسہ اس گھر پر کیوں لٹا رہی ہو۔ اسے سنبھال کر رکھو بیٹی! یہ کل تمہارے کام آئے گا۔ تم نے ہم پر جو احسان پہلے کئے ہیں وہ اتنے ہیں کہ ساری زندگی........" جبھی دروازے پر دستک ہوئی تو شکیلہ ان کے سینے سے الگ ہو کر بولی۔ "لڑکا اور مہمان عورتیں آگئی ہیں شاید' آپ چل کر جلدی سے آئیں۔ میں مہمان عورتوں کو دیکھتی ہوں۔"

رئیسہ نے جا کر دروازہ کھولا تو زینب خالہ ایک جوان لڑکے' لڑکے کے باپ' دو لڑکیوں اور دو عورتوں کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔ شکیلہ نے آگے بڑھ کر ان مہمانوں کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور انہیں بڑے تپاک سے بٹھایا۔ سبھی شکیلہ کو دیکھ رہے تھے اور اس کے حُسن و جمال سے بڑے متاثر ہو رہے تھے۔ شکیلہ نے لڑکے کا تنقیدی جائزہ لے لیا تھا۔ وہ ایک وجیہہ اور خوبصورت جوان تھا۔ کسی بینک میں سیکنڈ افسر تھا۔ شائستہ اور مہذب لگ رہا تھا۔

شکیلہ نے لڑکے سے گفتگو کی تو اسے یہ لڑکا نسیم بہت پسند آیا۔ یہ لڑکا ہر لحاظ سے رضیہ کے لئے موزوں تھا۔ صابرہ بیگم اور بیٹیوں کو بھی نسیم پسند آیا تھا۔ لڑکے کی ماں' خالہ اور بہنیں رضیہ کو اندر جا کر دیکھ آئی تھیں۔ جب دونوں طرف سے پسندیدگی کا اظہار ہو گیا تو شکیلہ نے لڑکے کی ماں اور باپ سے پوچھا۔

"آپ لوگوں کی جانب سے لین دین' جہیز اور جوڑوں کا کوئی مطالبہ وغیرہ ہے؟"

"ہمارا نہ تو کوئی مطالبہ ہے اور نہ ہی ہمیں جہیز وغیرہ کی ضرورت ہے۔" لڑکے کے باپ ظہیر خان نے جواب دیا۔ "اگر آپ لڑکی کو ایک جوڑے میں بھی رخصت کریں گے تو بخدا ہم ہنسی خوشی لے جائیں گے۔ ہمارا صرف ایک چھوٹا سا مطالبہ ہے کہ شادی کی تاریخ اس مہینے کے آخر میں یا پھر آئندہ مہینے کے پہلے ہفتے میں رکھی جائے۔ اس لئے کہ میں آئندہ مہینے کے وسط میں اپنی بیوی اور دونوں لڑکیوں کے ساتھ بھائی کی بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے ہندوستان جا رہا ہوں۔ لڑکے کو پندرہ دن سے زیادہ کی چھٹی نہیں مل رہی ہے' جبکہ ہمیں ہندوستان میں دو ماہ قیام کرنا ہو گا۔ اس لئے کہ وہاں خاندان میں اور بھی شادیاں ہو رہی ہیں۔ ان میں بھی شرکت کرنا ہے۔"

"آپ ہندوستان سے واپسی پر شادی کیوں نہیں رکھ لیتے ہیں؟" صابرہ بیگم نے تجویز پیش کی۔ "اس طرح ہمیں جہیز کی تیاری کے لئے وقت مل جائے گا۔"

"جب ہم آپ سے جہیز اور کسی چیز کا مطالبہ نہیں کر رہے ہیں تو پھر آپ دیر کس لئے کرنا چاہ رہی ہیں؟" لڑکے کی ماں نے کہا۔

"ہم لڑکی والے ہیں۔ کوئی ماں باپ اپنی بیٹی کو خالی ہاتھ رخصت نہیں کرتے۔"

صابرہ بیگم نے جواب دیا۔ "اس دور میں آپ کا یہ جذبہ قابل قدر ہے کہ آپ کسی چیز کا مطالبہ نہیں کر رہے ہیں۔ خدا آپ لوگوں کو خوش رکھے۔ کتنا اچھا ہو لوگ آپ کے اس عظیم جذبے سے سبق سیکھیں۔ سچ پوچھئے تو آپ لوگوں نے ہمارے دل جیت لئے ہیں۔ ہم اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہمارے ہندوستان جانے کے بعد لڑکا اکیلا رہ جاتا ہے اور پھر اس کے کام پر جانے کے بعد گھر بند رہے گا جس سے چوری کا خطرہ درپیش ہو گا۔ لڑکے کو کھانے پینے کی تکلیف بھی ہو جائے گی۔ اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد اس کی شادی کر کے ہندوستان چلے جائیں۔" ظہیر خان نے اپنی مجبوری کی وضاحت کی۔

شکیلہ نے محسوس کر لیا تھا کہ لڑکے والے تاخیر کو کسی صورت میں برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ صابرہ بیگم جلدی کے لئے تیار نہیں ہیں اور نہ وہ تیار ہوں گی اور اس صورت میں یہ رشتہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اتنا اچھا رشتہ اور خاندان ہاتھ سے نکل جائے۔ شکیلہ کو لڑکے والے بہت پسند آئے تھے۔ اچھے لگ رہے تھے۔ نیک اور سیدھے سادے تھے۔ ان میں ہوس اور لالچ بالکل نہ تھا جو عموماً دیکھنے میں آتا تھا۔ بات چیت اس موڑ پر جا رہی تھی جہاں بگڑنے والی تھی۔ اس نے فوراً ہی مداخلت کی۔ "ہم لوگ آپ کی بات مان لیتے ہیں۔ اس مہینے میں تو نہیں آئندہ مہینے کی پہلی تاریخ یا پہلے ہفتے میں شادی کی تاریخ رکھ لیں۔ ایسا کریں آپ جمعہ کے دن آ کر شادی کی تاریخ طے کر لیں۔ اس روز ابو بھی گھر پر ہوں گے۔ یہ سارے معاملات تو وہی طے کریں گے۔"

صابرہ بیگم نے چونک کر اور گھبرا کر شکیلہ کی طرف دیکھا۔ شکیلہ نے مسکراتے ہوئے غیر محسوس انداز سے انہیں چپ رہنے کی تاکید کی۔ مگر وہ یہ سوچ کر سن سی ہو رہی تھیں کہ اتنی جلدی وہ بیٹی کی شادی کیسے کر سکیں گیں۔ پلے تو کچھ نہیں ہے۔ شکیلہ نے انہیں جیسے کسی بھنور میں گرا دیا تھا۔ انہیں غصہ بھی آ رہا تھا مگر وہ اس غصے کا اظہار نہ اب کر سکتی تھیں نہ بعد میں۔ اس لئے کہ شکیلہ کے تو ان پر اور ان کے گھر پر ان گنت احسانات تھے۔ سب کے سب ان احسانوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ شکیلہ نے آج ہی اور کچھ ہی دیر پہلے مکان خرید کر جو ان کے نام کر دیا تھا وہ اتنا بڑا احسان تھا کہ بھائی ہوتا تو بھی شاید نہیں کرتا۔

مہمانوں نے ناشتہ کیا۔ رخصت ہونے سے قبل انہوں نے رضیہ کے ہاتھ میں سو کا نوٹ رکھ دیا۔ جو اس رشتے کے پکا ہونے اور لڑکی اپنے لئے بک کر لینے کا رسمی اظہار تھا۔ مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی صابرہ بیگم بول پڑیں۔ "شکیلہ بیٹی! یہ تم نے کیا کیا؟ تم نے بغیر سوچے سمجھے آئندہ مہینے شادی کر دینے کی ہامی بھر لی۔"

"امی! اگر میں ایسا نہ کرتی تو یہ رشتہ ہاتھ سے نکل جاتا اور ہم منہ دیکھتے رہ جاتے۔ ایسے رشتے بار بار نہیں آتے ہیں۔"

"مگر بیٹی!" صابرہ بیگم بولیں۔ "تم سے تو ہمارے گھر کی حالت کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ پلے کچھ ہے نہیں۔ اس کی شادی بھلا کیسے ہو گی۔ جہیز اور مہمانوں کی دعوت وغیرہ کے اخراجات کہاں سے ادا ہوں گے۔ سادگی سے بھی شادی کرو تو ہزاروں روپے کا خرچ آتا ہے۔"

"امی! آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔" شکیلہ نے انہیں تسلی دی۔ "اس کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر کرتے ہیں۔ خدا نے چاہا تو کوئی صورت نکل آئے گی۔"

"تدبیر سے کیا ہو گا بیٹی!" صابرہ بیگم نے گہری سانس لی۔ "شادی کے لئے روپیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تدبیر کی نہیں' ادھر تقدیر ہی خراب ہے۔"

شکیلہ نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اور ان کے پاس جا کر صابرہ بیگم کے گلے میں اپنے بازو حمائل کر دیئے۔ ان کے شانے پر اپنی ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے بڑے بڑے پیار بھرے انداز میں کہا۔ "میں جب تک زندہ ہوں آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا نے چاہا تو شادی وقت پر ہو گی اور ضرور ہو گی۔ انشاء اللہ دھوم دھام سے ہو گی۔"

رات ادریس احمد جب گھر آئے تو انہوں نے دو خوشخبریاں سنیں۔ وہ کچھ پریشان سے بھی تھے۔ ان خوشخبریوں کو سن کر وہ شکیلہ سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔ شکیلہ نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر انہیں کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ دل میں حیران تھے کہ یہ عجیب لڑکی ہے جو اپنی ساری دولت اُن پر لٹانے کے لئے بے چین ہو رہی ہے۔ اپنا خون ہے اور نہ کوئی رشتہ ناطہ ہے۔ پھر بھی اپنوں سے بڑھ کر اس گھر کے لئے بہت کچھ کر رہی ہے۔ ان کا بیٹا بھی ہوتا تو شاید اتنا کچھ نہیں کرتا۔

رات کے کھانے کے بعد سب لوگ صحن میں بیٹھ کر خوش گپیوں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ چائے یا شربت' کسی بھی ٹھنڈے مشروب کا دور چلتا تھا۔ شکیلہ اس گھر میں بہار بن کر آئی تھی۔ اس گھر میں جو ایک سوگواری سی چھائی رہتی تھی اب وہ خوشیوں میں

بدل گئی تھی۔ اب اس گھر میں قہقہوں کی گونج' نغموں کی طرح سنائی دیتی تھی۔ اب زندگی بڑی خواب ناک ہو گئی تھی۔ اندھیروں کی جگہ اجالوں نے لے لی تھی۔ ہر ایک کو اس گھر پر جنت کا گمان ہونے لگا تھا۔

ادریس احمد آج متفکر اور پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ دو دن سے جو مسئلہ پریشان کر رہا تھا وہ اس کا اظہار کرنا نہیں چاہ رہے تھے۔ کل رات صابرہ بیگم نے انہیں جاگتے دیکھ کر کہا بھی تھا۔ "آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں؟" انہوں نے بڑی خوبصورتی سے اپنی بیوی کو ٹال دیا تھا۔ وہ دل میں سوچ رہے تھے کہ اس مسئلے کو کس طرح حل کریں۔ ان کی پیشانی اور چہرے پر سوچ کی لکیریں بڑی گہری تھیں۔ شکیلہ نے ان کی پریشانی کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے اچانک ان سے پوچھا۔ "ابو! کیا بات ہے؟ آج آپ بہت پریشان نظر آ رہے ہیں۔ ذرا ہمیں بھی تو بتائیں۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے بیٹی!" انہوں نے شکیلہ کو ٹالنا چاہا۔ "میں آج کچھ زیادہ ہی تھک گیا ہوں۔ دکان میں ایک نوکر ہے اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے مجھے بھی کام کرنا پڑتا ہے۔"

"تھکن اور پریشانی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔" شکیلہ بولی۔ "میں دو دن سے آپ کو سوچ میں غرق اور پریشان دیکھ رہی ہوں۔"

"تم بہت ہی تیز اور ذہین ہو۔" ادریس احمد ہنس پڑے۔ "کاروبار میں کچھ پریشانیاں ہوتی رہتی ہیں۔ مسئلے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ دو دنوں سے میں اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"مسئلہ کیا ہے' ذرا مجھے بھی تو بتائیں۔" شکیلہ بولی۔ "میں تھوڑا بہت کاروبار کے بارے میں جانتی ہوں۔ شاید کوئی مفید مشورہ دے سکوں۔"

"میری دکان کے خلاف میرے سابق مالک اور اس کے چند دوستوں نے محاذ بنا لیا ہے اور وہ میرے کاروبار کو نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔"

"تو آپ ان کے مقابلے میں تنہا نہیں۔" شکیلہ نے کہا۔ "ان لوگوں کا مقابلہ کس طرح سے کیا جا سکتا ہے؟ مجھے بتائیں۔"

"ان سے مقابلہ کرنے کے لئے رقم کی ضرورت ہے۔ مقابلہ اصل میں پیسوں کا ہے۔ ان کے پاس پیسہ ہے جبکہ میرے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے۔"

"ان موقع پرستوں سے مقابلہ کرنے کے لئے آپ کو کس قدر رقم کی ضرورت

ہے؟"

"پچاس ہزار۔" ادریس احمد بولے۔ "بہرکیف میں خدا پر بھروسہ کر کے ان کے خلاف ڈٹا ہوا ہوں۔ مجھے اپنی دیانت داری' صاف ستھرے لین دین اور سچائی سے پوری پوری امید ہے کہ جیت میری ہی ہو گی۔ ان کا پیسہ ان کے کام نہیں آئے گا بلکہ میرے اصول میرے کام آئیں گے۔"

"آپ اسی طرح ان کے خلاف ڈٹے رہیں۔ خدا نے چاہا تو ان کا ذلیل منصوبہ خاک میں مل کر رہ جائے گا اور وہ منہ کی کھا کر رہیں گے۔" شکیلہ نے ان کا حوصلہ بڑھایا۔

دوسرے دن' مکان صابرہ بیگم کے نام منتقل کرنے کی قانونی کارروائی مکمل ہوئی۔ شکیلہ نے باقی رقم ادا کر دی۔ اب صابرہ بیگم ایک مکان کی مالک ہو گئیں۔ سر چھپانے کی جگہ ہو گئی تھی۔ کرائے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات مل گئی تھی۔ اب کوئی ان کے مکان میں اس طرح سے داخل نہیں ہو سکتا تھا جس طرح مالک مکان داخل ہوا تھا۔ خدا نے ان کی دیرینہ آرزو پوری کر دی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شکیلہ کا یہ احسان عظیم کیسے' کب اور کس طرح اتار سکیں گی۔

تیسرے دن شکیلہ ضروری کام سے تنہا ہی نکل گئی۔ وہ یہ کہہ کر گئی تھی کہ وہ اپنے شوہر کو تلاش کرنے اور اس کے ٹھکانے کا پتہ لگانے جا رہی ہے۔ دوپہر گھر آئی۔ رات کے وقت چوپال میں بیٹھی تو صابرہ بیگم سب سے زیادہ پریشان تھیں۔ اس لئے کہ پرسوں جمعہ کا دن تھا۔ لڑکے والے تاریخ لینے آ رہے تھے۔ اب تک اس شادی کے لئے کوئی تدبیر سوچی نہیں گئی تھی۔ وہ شکیلہ سے کچھ کہنا اور اسے یاد دلانا نہیں چاہتی تھیں۔ پھر بھی ان سے رہا نہ گیا۔ وہ اپنے شوہر سے بولیں۔ "پرسوں شام کے وقت لڑکے والے تاریخ لینے آ رہے ہیں۔ پندرہ بیس دنوں میں لڑکی کی شادی کر کے دینا ہو گی۔ ورنہ رشتہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ آپ ذرا کوشش کر کے اِدھر اُدھر ہاتھ پیر ماریں۔ پانچ سات ہزار کا بندوبست تو کریں۔ خدا نے چاہا تو جلد ہی واپس کر دیں گے۔"

رضیہ نے شادی کے موضوع کو چھڑتے ہوئے دیکھا تو وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ پھر شکیلہ بھی اپنے کمرے میں چلی گئی جیسے وہ ان کی نجی گفتگو میں مخل ہونا نہیں چاہتی ہو۔ میاں بیوی میں اس موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی کہ شکیلہ اپنے کمرے سے پرس لے کر آئی۔ اس نے اپنا پرس کھول کر اس میں ایک چھوٹی سی پوٹلی نکالی۔ وہ بینک کے لاکر میں سے اپنے زیورات کے دس بارہ سیٹوں میں سے دو سیٹ نکال کر لائی تھی۔ اس نے وہ

پوٹلی اور ایک پھولا ہوا لفافہ نکال کر صابرہ بیگم کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ "اس میں میری بہن کی شادی کے لئے زیورات ہیں اور لفافے میں دس ہزار روپے ہیں۔ اب تو رضیہ کی شادی مسئلہ نہیں ہے نا امی!"

"شکیلہ بیٹی!" صابرہ بیگم' ادریس احمد اور دونوں بیٹیوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ صابرہ بیگم کی زبان پر جیسے فالج گر گیا تھا۔

"اگر آپ میں سے کسی نے اس ضمن میں کوئی شکریہ یا انکار کیا تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔" شکیلہ سنجیدہ ہو گئی اور اس نے پرس میں سے ایک اور لفافہ نکال کر ادریس احمد کی طرف بڑھایا۔ "ابو! اس میں پچاس ہزار کی رقم ہے۔ اب آپ اپنے مخالفوں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں' اور رقم کی ضرورت ہو تو میں دے سکتی ہوں۔"

سبھی نے حیرت سے ایک دوسرے کی صورتیں دیکھیں۔ ادریس احمد کتنی ہی دیر تک سناٹے میں رہے اور چونک کر بولے۔ "بیٹی! تم کسی لکھ پتی گھرانے کی لگتی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ یہ رقم تم اس بے دردی سے کیوں خرچ کر رہی ہو؟ اس طرح قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جائے گا۔ تم نے ہمارے لئے جو کچھ کیا ہے بیٹی وہ اپنا خون ہو تا بھی تو نہیں کرتا۔ بس کرو بیٹی اور یہ سب کچھ لے لو۔ ہمارے لئے تمہاری محبت ہی بہت بڑی دولت ہے۔"

"ابو!" شکیلہ جذباتی سی ہو گئی۔ "اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے پاس خاصی دولت ہے بلکہ میں ایک لاکھ پتی عورت ہوں۔ مگر میں دولت کے ہوتے ہوئے بھی محبت کی دولت سے محروم تھی۔ میرا شوہر ایک ایسا شخص ہے جس کے بارے میں کسی اور وقت بتاؤں گی کہ وہ کس قماش کا ہے۔ اس کے بارے میں' میں صرف اتنا کہوں گی کہ وہ ایسا شخص ہے جو ننگ انسانیت ہے۔ میں محبت کی تلاش میں نکلی تو امی مجھے ٹھنڈے میٹھے پانی کے اس چشمے کی طرح مل گئیں جس کی تلاش میں' میں لق و دق اور تپتے ہوئے صحرا میں بھٹک رہی تھی اور پیاس سے جان بلب ہو رہی تھی۔ اس گھر میں آئی تو مجھے ہر کوئی کسی چشمے کی طرح نظر آیا۔ آپ سب نے مل کر میرے وجود کو بھگو دیا۔ اس دنیا میں نہ تو میری ماں ہے اور نہ باپ' نہ بہن' نہ بھائی' اس گھر میں قدم رکھ کر میں نے ایسا محسوس کیا کہ میں نے اس گھر میں نیا جنم لیا ہے اور ابو!" شکیلہ سانس لینے کو رکی اور اس نے باری باری سب کے چہروں پر نظر ڈالی۔ ان کے چہروں پر اس کے لئے محبت کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور آنکھوں میں پیار کے چراغ جل رہے تھے۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس دنیا

میں وہ لوگ بھی بغیر کسی غرض کے سہارا نہیں دیتے ہیں جو اپنے ہوتے ہیں جن سے خون کا رشتہ ناطہ ہوتا ہے۔ مگر آپ لوگوں نے مجھے اس گھر میں پناہ دی۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ آپ لوگ تنگ دستی کے انتہائی نازک دور سے گزر رہے تھے اور پھر مجھے کسی نے بھی بوجھ نہیں سمجھا۔ کیا اس بے غرض محبت کا کوئی صلہ دولت کی صورت میں دیا جا سکتا ہے۔ ہرگز نہیں' اس محبت کے صلے کے لئے قارون کا خزانہ بھی کم ہے۔ اب جبکہ میں نے اس گھر کو اپنا گھر سمجھ لیا ہے۔ آپ سب کو اپنا مان لیا ہے۔ اپنا خون سمجھ رہی ہوں تو کیا مجھے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ آپ لوگوں کے لئے کچھ کروں۔ میں آپ لوگوں کے لئے جتنا بھی کروں وہ کم ہے۔ اگر میں اپنی جان بھی دے دوں تو وہ بھی کم ہے۔ لہٰذا اب آپ مجھے روکیں گے نہیں۔"

ادریس احمد نے آگے بڑھ کر شکیلہ کو سینے سے لگایا تو اُسے بے اختیار اپنے ماں باپ یاد آ گئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ اس کی آنکھوں سے اتنے آنسو نکلے کہ اس نے ادریس احمد کا سینہ بھگو دیا۔ ادریس احمد اور تمام لوگوں کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں۔

خاصی دیر کے بعد صابرہ بیگم نے شکیلہ سے کہا۔ "بیٹی! اگر تم کچھ خیال نہ کرو تو دس ہزار کی اس رقم میں سے ایک ہزار روپے اپنی بیمار بڑی بہن کو بھیج دوں جو آج کل سخت بیمار ہیں۔ زبوں حالی کی وجہ سے ایک سرکاری ہسپتال میں زیر علاج ہیں اور خاطر خواہ علاج نہیں ہو رہا ہے۔"

شکیلہ کو دو دن پہلے ہی بیگم ناہید کا خط ملا تھا۔ اس خط سے وہ مطمئن ہو گئی تھی کہ صابرہ بیگم کی بہن عابدہ بیگم ناہید کی نگرانی میں کسی ہسپتال میں زیر علاج ہوں گی۔ وہ اپنی اس نیکی کو ان پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ بولی۔ "میں آپ کو کل پانچ ہزار روپے دوں گی۔ بہتر ہے وہ رقم آپ کل ہی جا کر اپنی آپ کو پہنچا آئیں۔ جس طرح آپ میرے لئے عزیز اور محترم ہیں اسی طرح عابدہ خالہ بھی ہیں۔"

"ارے ہاں یاد آیا۔" ادریس احمد ایک دم سے چونک کر بولے۔ "صبح دکان جاتے وقت ڈاکیہ نے ایک خط دیا تھا وہ راستے میں مل گیا تھا۔ میں نے وہ خط پڑھا نہیں' دکان پر پہنچ کر مجھے کچھ یاد نہیں رہا تھا۔ میں نے خط کی پشت پر صفیہ کا نام لکھا دیکھا ہے۔ آسیہ بیٹی! ذرا جا کر میری شیروانی کی جیب سے وہ خط تو نکال لاؤ۔"

آسیہ خط لینے چلی گئی تو صابرہ بیگم بولیں۔ "پانچ ہزار بہت بڑی رقم ہے۔ میرے خیال میں ایک ہزار کی رقم خاصی ہو گی۔"

"پانچ ہزار کی رقم سے نہ صرف اچھی طرح سے علاج ہو جائے گا بلکہ ان کے گھر کے اخراجات کے کام بھی آ جائے گی۔ پانچ ہزار کی رقم ہی زیادہ مناسب ہو گی۔"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ آسیہ لفافہ لے کر آ گئی۔ باپ کے کہنے پر آسیہ نے لفافہ چاک کیا اور خط نکال کر بلند آواز سے پڑھنا شروع کیا۔

"خالہ جان! آداب عرض۔

آج میں آپ کو خط لکھ رہی ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ اسے کہاں سے اور کن الفاظ سے شروع کروں۔ تین دن پہلے ہماری بوسیدہ زندگی کے اندھیروں میں ایک دم سے ہزاروں طاقتور برقی قمقموں کی جیسی روشنی کے چراغ جل اٹھے۔ سسکتی زندگی کو ایک نئی روح اور زندگی مل گئی۔ میں ذرا جذباتی سی ہو رہی ہوں۔ مگر کیا کروں۔ دل کے الفاظ کاغذ پر منتقل ہو رہے ہیں۔ اس روز امی کی حالت بہت خراب تھی۔ صبح سے بگڑتی جا رہی تھی۔ ہسپتال میں نرسوں اور ڈاکٹروں کا رویہ امی کے ساتھ کچھ ایسا تھا کہ جیسے وہ انسان نہیں کوئی جانور ہوں۔ ایسے میں آپ کی ایک سہیلی بیگم ناہید فرشتہ رحمت بن کر آئیں۔ وہ اسی وقت ایمبولینس میں امی کو اور مجھے لے کر کراچی کی سب سے بڑی کلینک میں پہنچیں جہاں ان کا بڑے بڑے ڈاکٹروں نے فوراً معائنہ کیا اور دوائیاں دیں جس سے امی کی بیماری میں فوری افاقہ ہوا اور طبیعت سنبھل گئی۔ پھر ایک بڑے اور ائرکنڈیشنڈ کمرے میں داخل کر دیا گیا۔ اب بھی امی اس ہسپتال میں زیر علاج ہیں اور سارے اخراجات بیگم ناہید برداشت کر رہی ہیں جو یومیہ پانچ سو روپے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے نہ صرف پانچ ہزار روپے نقد ذاتی اخراجات کے لئے دیئے بلکہ ابو کو اپنے دفتر میں ایک اچھے عہدے پر مامور کر دیا۔ دس ہزار روپے بھی دیئے کہ وہ اپنے لئے نئے اور اچھے ملبوسات بنا لیں۔ اس کے علاوہ رہائش کی سہولت بھی دی۔ ہمیں ناظم آباد میں چار سو گز پر بنا ہوا بنگلہ دیا گیا ہے جو پوری طرح آراستہ و پیراستہ ہے۔ ہم اس گھر میں کل منتقل ہو رہے ہیں۔ بیگم ناہید تقریباً روز ہی امی کو دیکھنے کلینک پر آتی ہیں۔ یہاں امی کا بڑا اچھا علاج ہو رہا ہے۔ وہ تقریباً پوری طرح صحت یاب ہو چکی ہیں۔ مگر بیگم ناہید چاہتی ہیں کہ امی کچھ دن اور آرام کر لیں۔

بیگم ناہید نے جو کچھ ہم لوگوں کے ساتھ کیا وہ شاید اپنا خون بھی نہیں کرتا۔ انہوں نے اس روز آ کر ہم سے کہا تھا کہ حیدر آباد سے میری سہیلی صابرہ بیگم کا خط آیا ہے کہ وہ آپ کی عیادت کر آئیں اور علاج معالجے کے سلسلے میں یہ دیکھیں کہ کیسا علاج ہو رہا ہے۔ انہوں نے باتوں باتوں میں ایک دو مرتبہ یہ بھی کہا تھا کہ صابرہ بیگم کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ میں ساری زندگی اتارنا چاہوں تو اتار نہیں سکتی ہوں۔ بیگم ناہید بڑی امیر کبیر عورت ہیں۔ وہ اس شہر کے بڑے تاجروں میں شمار کی جاتی ہیں۔ وہ ایک کمپنی کی مالک ہیں جہاں ایک سو سے زائد لوگ کام کرتے ہیں۔ وہ بڑی نیک' رحم دل اور شریف خاتون ہیں۔ ہم سب کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتی ہیں۔ ان کے کہنے پر ہم اپنی تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کر رہے ہیں۔ ہم سب آپ کے بے حد ممنون ہیں اور آپ کی سہیلی کی نوازشات کے بھی۔ آپ ہماری طرف سے ان کا شکریہ ادا کریں۔ ابو دو تین دن میں آپ سے ملنے آنے والے ہیں۔ موقع ملے تو آپ سب کو ساتھ لے کر کچھ دنوں کے لئے آ جائیں۔ ابو کہہ رہے تھے کہ وہ دو ایک مہینے کے بعد خالو کے لئے بھی اس کمپنی میں ملازمت کے لئے بات کریں گے۔ امی کو اس بات کا افسوس ہے کہ اتنی اچھی سہیلی سے آپ نے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا۔

ہم سب کی جانب سے ہر ایک کی خدمت میں حسب مراتب سلام کہہ دیں۔

فقط آپ کی بھانجی صفیہ بیگم

خط سن کر شکیلہ نے گہرا سانس لیا اور دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بیگم ناہید نے اس کی توقع سے کہیں بڑھ کر عابدہ بیگم کی خدمت کر دی۔ بلکہ بہت کچھ کر دیا۔ وہ دل میں بہت خوش ہو رہی تھی۔ ادھر صابرہ بیگم' ادریس احمد اور ان کی لڑکیاں متحیر تھیں کہ یہ بیگم ناہید کون ہیں۔ صابرہ بیگم شدت حیرت سے اپنے شوہر کا چہرہ دیکھ رہی تھیں اس سے کہیں زیادہ حیرانی تو ادریس احمد کی آنکھوں میں بھری تھی۔ صابرہ بیگم دل میں حیران تھیں کہ بیگم ناہید ان کی کون سی سہیلی ہے۔ نہ تو اس نام کی ان کی کوئی سہیلی کراچی میں تھی اور نہ ہی کوئی سہیلی اتنی امیر و کبیر تھی اور نہ ہی انہوں نے اپنی کسی سہیلی پر کوئی احسان کیا تھا۔

ادریس احمد ذہن پر زور دیتے ہوئے بولے۔ "اس عورت کو کوئی غلط فہمی ہو گئی ہو گی۔ اس غلط فہمی سے تمہاری آپا کو فائدہ پہنچ گیا ہے۔"

"ہاں! یہ ممکن ہے۔" صابرہ بیگم نے سوچتے ہوئے اپنا سر ہلایا۔ "غلط فہمی کی وجہ سے آپا کی ذات کو فائدہ پہنچ گیا اور ان کی کایا پلٹ گئی۔"

"اگر کسی دن بیگم ناہید کو یہ پتا چل گیا جیسا کہ اس بات کا امکان بھی ہے' تب ہو گا کیا؟ ان سے گھر اور ملازمت چھین لی جائے گی؟" رئیسہ نے پوچھا۔

"اس بات کا تو امکان ہے کہ ایک دن ایسا ہو گا۔" ادریس احمد نے جواب دیا۔

"تب یہ بات بہت بری ہو گی کہ عابدہ نے ان سے فائدہ اٹھایا تھا۔"

"اس میں خالہ جان کا کیا قصور ہے۔" آسیہ نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ "جو کچھ بھی کیا وہ بیگم ناہید نے اپنی غلط فہمی کی بنا پر کیا ہے۔"

"اب کیا کیا جائے؟" صابرہ بیگم نے بڑے فکرمند لہجے میں کہا۔ "آپا کے ساتھ کل کے دن بہت برا ہو گا۔ خدا نہ کرے ان کے ساتھ کل کچھ ہو۔ وہ ویسے ہی دل کی مریضہ ہیں۔ وہ اس بات کا گہرا اثر لیں گی۔ اگر ان کی طبیعت پھر خراب ہو گئی تو سنبھلنا مشکل ہو جائے گا۔"

"میرے خیال میں انہیں کل ہی ایک خط لکھ کر صاف طور پر یہ بتا دیا جائے کہ ناہید بیگم سہیلی نہیں ہیں ان پر ہمارا کوئی احسان نہیں ہے اور نہ ہی ہم انہیں جانتے ہیں۔ وہ غلط فہمی کا شکار ہو گئی ہیں۔ لہٰذا ان کی غلط فہمی دور کر کے باعزت طور پر.........."

"مگر ابو!" رئیسہ درمیان میں بولی۔ "جب تک چلتا ہے چلنے دیں۔ خالہ جان پوری طرح صحت یاب ہو جائیں گی اور وہ اچھے دن بھی دیکھ لیں گی۔"

"نہیں بیٹی!" ادریس احمد نے اپنی بیٹی کو سمجھایا۔ "یہ غلط بات ہے اور شرمناک بھی' معلوم نہیں اصل عابدہ بیگم کس حالت میں ہوں گی۔ تمہاری خالہ جان نے اگر اصل حقیقت بیگم ناہید کو بتا دی تو اس سے ہو سکتا ہے کہ بیگم ناہید کے دل میں ان کی عزت بڑھ جائے۔ وہ شاید یہ ساری سہولتیں اور مراعات واپس نہ لیں۔"

رضیہ جو اپنے کمرے میں کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ موضوع کے بدل جانے پر خاموشی سے آ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے اپنے ابو کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "ابو صحیح کہہ رہے ہیں۔ ہمیں کل ہی خالہ جان کو خط لکھ کر سمجھا دینا چاہئے کہ وہ بیگم ناہید کو اصل حقیقت سے آگاہ کر دیں۔ خالو یوں بھی بڑے اصول پسند اور خوددار آدمی ہیں۔ وہ ایک

لمحے کے لئے بھی نہیں چاہیں گے کہ بیگم ناہید کو دھوکے میں رکھا جائے اور نہ ایسا ہونا چاہئے۔"

شکیلہ ان لوگوں کی باتیں سن کر دل میں نہ صرف مسکرا رہی تھی بلکہ خوش بھی ہو رہی تھی کہ یہ لوگ کتنے اچھے ہیں' ان کی سوچ کتنی بلند ہے۔ وہ انہیں بتانا نہیں چاہتی تھی کہ یہ سب کچھ اس کی ایما پر ہوا ہے۔ وہ اس لمحے یہ سوچ رہی تھی کہ کس طرح اس راز کو راز رکھا جا سکتا ہے۔ وہ اپنا کیا ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"ابو.......... ابو..........!" رضیہ اچانک چیخ پڑی۔ "میں نے چور پکڑ لیا ہے۔ اب وہ بچ کر نہیں جا سکتا ہے۔"

سبھی نے گھبرا کے رضیہ کی طرف دیکھا جیسے وہ پاگل ہو گئی ہو۔ ادریس احمد نے متوحش ہو کر پوچھا۔ "چور.......... کیسا چور..........؟"

"شکیلہ باجی چور ہیں ابو!" رضیہ معنی خیز مسکراہٹ سے بولی۔

"کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے جو میری بیٹی کو چور کہہ رہی ہو۔ کیا چرایا ہے میری بیٹی نے۔"

"تم نے انہیں چور کہہ کر ہم سب کو ذلیل کر دیا ہے رضیہ!" ادریس احمد بڑے افسوس اور دکھ بھرے لہجے میں بولے۔

"آپ لوگ میری بات سمجھ نہیں رہے ہیں۔" رضیہ نے جواب دیا۔ "میں انہیں اس لئے چور کہہ رہی ہوں کہ انہوں نے خالہ جان کی چوری چھپے مدد کی ہے۔ خالہ جان اور ان کے گھر پر جو احسانات کئے گئے ہیں وہ شکیلہ باجی نے کئے ہیں۔"

"تم بہت دور کی کوڑی لائیں۔" شکیلہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں حیدر آباد میں ہوں' سامنے بیٹھی ہوں۔ نہ عابدہ خالہ کو جانتی ہوں اور نہ ان کے پتے سے واقف ہوں۔ یہاں جب سے آئی ہوں تب سے ایک دن کے لئے بھی کراچی نہیں گئی۔"

"اگر میں نے ثبوت پیش کر دیا تو؟" رضیہ کے لبوں پر تبسم ناچ گیا۔

"میں تمہیں پانچ ہزار روپے دوں گی۔"

"مجھے روپے نہیں چاہئیں بلکہ آپ کی زبان سے اقرار چاہئے۔ آپ کا اقرار میرے لئے لاکھوں روپے سے کہیں بڑھ کر ہے۔"

"اگر تم ثبوت نہ پیش کر پائیں تو میں تمہیں الزام تراشی کے جرم میں سخت سزا دوں گی۔" شکیلہ مسکرا دی۔

"باجی! سزا کیا ہو گی؟" رئیسہ نے پوچھا۔

"سزا جرم ثابت ہونے کے بعد سناؤں گی۔" شکیلہ نے جواب دیا۔ "ویسے سزا بڑی کڑی ہو گی۔ ساری زندگی یاد کرے گی یہ رضیہ کی بچی۔"

"آپ مجھے ڈرائیں نہیں۔" رضیہ ہنس پڑی۔ "آپ ڈر رہی ہیں کہ آپ کا راز افشا ہو رہا ہے۔" وہ ادریس احمد کی طرف گردن گھما کر بولی۔ "ابو! باجی نے پانچ چھ دن پہلے رات کے وقت بیٹھ کر بیگم ناہید کے نام خط لکھا تھا۔ اس خط کو لفافے میں بند کر کے اس پر پتا لکھا اور اسے میز پر رکھ کر سو گئیں۔ اس خط پر معاً میری نظر پڑی تھی۔ اس پر مسز ناہید افضال اور ذاتی بھی لکھا ہوا تھا۔ دو دن پہلے باجی کے نام جو خط آیا تھا اس کی پشت پر مسز ناہید افضال لکھا ہوا تھا۔ اب آپ باجی سے خود پوچھ لیں' کیا میں غلط کہہ رہی ہوں۔"

شکیلہ نے کھسیا کر رضیہ کا کان پکڑ لیا۔ "اصل چور تو تم ہو جو چوری چوری خطوں پر لکھے ہوئے نام و پتے پڑھ رہی ہو۔"

"باجی! میں چور نہیں ہوں بلکہ جاسوس ہوں۔" رضیہ ہنستی ہوئی بولی۔ "آپ نے ایک روز عابدہ خالہ کے بارے میں بہت کریدا بھی تھا نا؟"

ادریس احمد اور صابرہ بیگم نے ششدر ہو کر شکیلہ کی طرف دیکھا۔ صابرہ بیگم نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ "سچ پوچھو تو بیٹی! ایسے الفاظ کا وجود نہیں ہے جو تمہارے ان احسانات کے بدلے میں ادا کئے جا سکیں۔ تم نے میری بہن پر جو احسان اور نیکی کی ہے اس کا اجر تو خدا ہی دے گا۔ میری بہن مجھ سے کہیں زیادہ اس مدد کی مستحق تھی۔ میں پل پل تمہیں دعائیں دیتی رہوں گی۔"

"آپ مجھے نہیں بلکہ بیگم ناہید کو دعائیں دیں۔ انہوں نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ اپنی طرف سے کیا ہے۔ میں اپنی طرف سے عابدہ خالہ کی خدمت کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اس نیک کام میں خود ہی بازی لے گئیں۔ مجھے ذرہ برابر بھی حصہ لینے کا موقع نہیں دیا۔ آپ ان کا شکریہ ادا کریں اور ان کے لئے دعا کریں۔"

"یہ بیگم ناہید کون ہے بیٹی!" ادریس احمد نے پوچھا۔ "ہمارا رواں رواں تم دونوں کا احسان مند رہے گا۔"

"یہ میری بڑی بہن کی طرح ہیں بلکہ میری بہن ہیں۔ وہ کروڑ پتی ہیں لیکن بے حد دکھی ہیں۔ بڑی نیک طبیعت کی ہیں۔ وہ کسی دن آنے والی ہیں بلکہ میں سوچ رہی ہوں کہ انہیں رضیہ کی شادی کے موقع پر بلاؤں۔ آپ سب اُن سے مل کر بہت خوش ہوں

گے۔"

"بڑی حیرت اور خوشی کی بات ہے کہ انہوں نے بڑے بے لوث جذبے سے عابدہ بیگم اور باقری صاحب کے لئے بہت کچھ کیا۔ جو کچھ بھی کیا وہ تمہارے کہنے پر' یہ بہت بڑی بات ہے کہ وہ بہت کچھ اور اتنا کچھ کر گئیں اور کر رہی ہیں کہ ہم اس کا بدلہ کبھی اور کسی صورت میں چکا نہیں سکتے ہیں۔ اگر وہ دکھی ہیں تو ہم ان کے سکھ کے لئے بہت دعا کریں گے اور لمحہ لمحہ ان کی خوشیوں کے لئے دعا کرتے رہیں گے۔ سچی بات تو یہ ہے بیٹی! وہی لوگ کام آتے ہیں جو دکھی ہوتے ہیں۔ جو دکھی ہوتے ہیں وہی درد آشنا ہوتے ہیں۔ انہیں کے دل میں گداز اور دکھی لوگوں کے لئے محبت بھری ہوتی ہے۔ تم دونوں کتنی خوش نصیب ہو کہ آخرت کے لئے بھی نیکیوں کی دولت جمع کر لی۔ خدا تم دونوں کو سلامت رکھے۔ وہ آئیں گی تو ہم انہیں دل میں بٹھائیں گے۔" ادریس احمد بڑے جذباتی ہو کر بولے۔

رضیہ کی شادی بڑی دھوم دھام اور روایتی انداز سے ہوئی تھی۔ اس شادی میں نہ صرف عابدہ بیگم' باقری صاحب اور ان کا پورا گھر شریک تھا بلکہ بیگم ناہید بھی آئی تھیں۔ انہیں بھی یہ محلّہ' یہ گھر اور اس گھر کا ماحول بہت اچھا لگا تھا۔ انہیں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی تھی کہ ان چھوٹے لوگوں میں کوئی تصنع اور بناوٹ نہیں ہے۔ سیدھے سادے بے حد مخلص اور بے لوث لوگ ہیں۔ اس شادی میں دکھاوا اور نمائش نہ تھی۔ سچی خوشی اور بے پایاں جذبے کا اظہار تھا۔

بیگم ناہید نے رضیہ کو اپنی طرف سے لطیف آباد میں ایک مکان خرید کر تحفے میں دیا اور لڑکے کو سلامی میں پانچ ہزار کی رقم بھی دی۔ یہ سب کچھ انہوں نے ان لوگوں کی خوشیاں دوبالا کرنے کے لئے دیا تھا۔ جبکہ ادریس احمد ان تحائف کے لئے بیگم ناہید کو منع کر رہے تھے۔ شادی میں بیگم ناہید کی شرکت ہی بہت بڑا اعزاز تھا۔ مگر بیگم ناہید نے ان کی ایک نہ سنی تھی۔ وہ یہ سب کچھ اپنی خوشی سے کر رہی تھیں۔

بیگم ناہید نے شکیلہ کو سجاد کے بارے میں بتایا کہ وہ کراچی شہر چھوڑ کر کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ اس کے قرض خواہوں نے اسے تنگ کرنا اور جان سے مارنے کی دھمکی دینا شروع کر دیا تھا۔ بیگم ناہید تین دن رکی رہی تھیں۔ ولیمے کی تقریب میں شرکت کر کے کراچی واپس چلی گئیں۔ پانچویں دن باقری صاحب بھی بیوی بچوں کو لے کر کراچی چلے گئے۔ چھٹے دن گھر مہمانوں سے خالی ہو گیا تھا۔ ایک رضیہ کے گھر سے دلہن بن کر

جانے کے بعد گھر سُونا سُونا سا ہو گیا تھا۔ یہ کیفیت کئی دنوں تک جاری رہی تھی۔ رضیہ اپنے شوہر کے ساتھ آ جاتی تو گھر کی رونق اس کی موجودگی تک لوٹ آتی تھی۔

رفتہ رفتہ گھر کا سُونا پن دور ہوتا گیا۔ ادھر شکیلہ روز ہی اپنے مستقبل کے بارے میں راتوں کو جاگ جاگ کر سوچتی رہتی' اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ آخر وہ کب تک اس گھر میں رہے گی۔ اس کا کیا بنے گا۔ وہ گھر میں اس طرح پڑے رہنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر اس نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ بچے کی پیدائش کے بعد وہ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے کوئی اسکول کھول لے گی۔

اس نے ایک روز صابرہ بیگم کو پوری طرح اپنے اعتماد میں لے کر اپنی بپتا سنا ڈالی۔ صابرہ بیگم کو اس کی کہانی سن کر بڑا دکھ اور رنج پہنچا تھا۔ انہوں نے اسے سینے سے لگا کر حوصلہ دلایا اور تسلی دی کہ وہ جب تک زندہ ہیں اس کا یہ راز اور کہانی دل میں دفن رہے گی۔ صابرہ بیگم کے مشورے سے یہ طے پایا کہ اس محلے کو چھوڑ کر کسی نئے محلے میں جا کر بس جانا زیادہ بہتر ہو گا۔ وہاں نئے سرے سے ایک نئی زندگی کا آغاز آسانی سے کیا جا سکتا ہے اور وہاں یہ کہانی گھڑی جا سکتی ہے کہ وہ بیوہ ہے۔

ایک روز شکیلہ نے ایک خوبصورت اور صحت مند بچے کو جنم دیا۔ اس روز وہ خوب روئی تھی۔ اسے وہ بے وفا اور بدکار شوہر اس روز بہت یاد آیا تھا۔ اسے یاد کیوں نہیں آتا۔ آخر وہ عورت تھی۔ عورت اپنے مرد کی ہر برائی کو سر کا تاج سمجھ کر پہن لیتی ہے۔ جبکہ مرد' عورت کی ایک خطا بھی ساری زندگی معاف نہیں کرتا ہے بلکہ اسے اپنے دل اور دنیا سے مکھی کی طرح نکال پھینکتا ہے اور پھر اس نے سجاد سے محبت بھی تو کی تھی۔ وہ محبت جو عورت اپنی زندگی میں ایک بار کرتی ہے۔ صرف ایک بار۔

دس برس' دس دن کی طرح پلک جھپکتے گزر گئے۔ وقت پَر لگا کر اڑ گیا۔ افضال احمد کا انتقال ہو گیا۔ بیگم ناہید بدستور اپنے کاروبار میں مصروف رہیں۔ اپنے لڑکوں کی شادیاں کر کے انہیں اسی کمپنی میں اونچے عہدوں پر فائز کر دیا تھا مگر انہیں اپنے زیرِ نگرانی رکھا۔ ان کی لڑکی کی بھی شادی ہو گئی تھی' وہ نانی اور دادی بن کر ایک پُرسکون زندگی گزار رہی تھیں۔ اپنا زیادہ تر وقت ضرورت مندوں' محتاجوں اور غریبوں کی خدمت میں گزارتی تھیں۔ یہی درس وہ اپنی اولاد کو بھی دیتی رہتی تھیں۔

ادھر باقری صاحب ریٹائر زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی لڑکیوں کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ لڑکوں میں صرف ایک لڑکے کی شادی ہوئی تھی۔ دونوں لڑکے ملازمت کر کے گھر

چلا رہے تھے۔ عابدہ بیگم اپنا زیادہ تر وقت عبادتِ الٰہی میں گزار دیتی تھیں۔

آج ادریس احمد ایک عام آدمی نہ رہے تھے۔ وہ ایک بڑے تاجر بن گئے تھے۔ حیدر آباد شہر میں ان کی دولت سے زیادہ ان کی ایمانداری اور انسانیت کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ رئیسہ اور آسیہ کی بھی شادیاں ہو چکی تھیں۔ وہ اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں اور ایک خوشگوار زندگی گزار رہی تھیں۔

وقت سے بڑا مرہم کوئی نہیں ہوتا ہے۔ شکیلہ نے لڑکے کی پیدائش کے بعد لطیف آباد میں ایک گھر خرید لیا تھا۔ وہ آج بھی ادریس احمد اور صابرہ بیگم کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس نے لطیف آباد میں ایک اسکول کھول لیا تھا۔ وہ اس اسکول کی پرنسپل تھی۔ یہ پرائمری اسکول تھا۔ اس میں چھوٹے چھوٹے بچے پڑھتے تھے۔ وقت' اس کے بیٹے شاہد اور اسکول کے معصوم بچوں نے اس کے زخموں پر مرہم رکھ دیا تھا۔ کبھی ان زخموں میں درد کی لہر اٹھتی تھی مگر وہ انہیں دبا دیتی تھی۔ سجاد کہاں گیا .... وہ کہاں ہے .... وقت کے پہیے نے اُسے کہاں سے کہاں پھینک دیا۔ شکیلہ کو کچھ خبر نہیں تھی۔ دس برس پہلے سجاد کسی شکاری کتے کی طرح شکیلہ کی بو سونگھتا پھرتا رہا تھا۔ اس نے کراچی کا چپہ چپہ شکیلہ کی تلاش میں چھان مارا تھا۔ ادھر اسے شکیلہ کا پتا نہ چلا ادھر قرض خواہوں نے اس کی زندگی اجیرن کر دی تو وہ شکیلہ کی تلاش میں لاہور گیا۔ اسے امید تو نہ تھی کہ شکیلہ نے لاہور کا رخ کیا ہو گا مگر لاہور میں وہ شکیلہ کو تلاش کر کے اپنا شک دور کرنا چاہتا تھا۔ لاہور میں شکیلہ نہیں ملی البتہ نسرین ملی اور اس نے سجاد کو مجبور کیا کہ وہ اسے طلاق دے دے۔ نسرین نے اس سے طلاق لے لی اور تنویر بیگ کے ساتھ یورپ کی سیاحت پر چلی گئی۔ سجاد نے پھر اسلام آباد' راولپنڈی' سوات' مری اور پشاور شکیلہ کی تلاش میں چھان مارا۔ مگر اسے شکیلہ نہ ملی۔

پھر بھی اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔ وہ شکیلہ کی تلاش میں رائے ونڈ پہنچا تو ایک روز وقت گزاری کے لئے اس جگہ چلا گیا جہاں تبلیغی اجتماع ہو رہا تھا۔ دراصل وہ اپنے ایک دوست کی تلاش میں گیا تھا جس نے وہاں کتابوں کا اسٹال لگایا ہوا تھا۔ اس کا دوست کہیں گیا ہوا تھا۔ اس کے انتظار میں وہ ایک عالم کی تقریر سننے لگا۔ زندگی میں پہلی بار اسے یہ احساس ہوا کہ وہ ایک ایسی ہستی کو بھول چکا ہے جو زندگی' موت' عزت اور ذلت کا مالک ہے۔ اس عالم کی تقریر نے اس کے دل پر کچھ ایسا اثر کیا کہ اس کا ذہن یکسر بدل کر رہ گیا۔ جس وقت مغرب کی نماز ہو رہی تھی وہ بھی اس نماز میں شامل تھا۔ جب وہ خدا کی

بارگاہ میں سجدہ ریز ہوا تو اس کا دل اس قدر بھر آیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ پھر وہ عشاء کی نماز کے بعد سے فجر کی نماز تک خدا کے حضور گڑگڑا کے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا اور توبہ استغفار کرتا رہا۔ صبح ہوئی تو اس کی دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ وہ ایک نیا انسان بن چکا تھا۔

اس اجتماع میں ایک تاجر شیخ رشید بھی شریک تھے۔ وہ بھی ساری رات مسجد میں تہجد پڑھتے اور قرآن شریف کی تلاوت کرتے رہے تھے۔ انہوں نے سجاد کو پورے خضوع و خشوع سے عبادت کرتے' گڑگڑاتے اور توبہ و استغفار کرتے دیکھا تو بڑے متاثر ہوئے۔ پھر انہوں نے خود ہی سجاد سے راہ و رسم بڑھائی۔ وہ سجاد سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسے اپنے ساتھ حیدر آباد شہر لے آئے۔

حیدر آباد شہر میں شیخ رشید کی کپڑے کی دکان تھی اور پھر ان کی کوئی اولاد نرینہ نہیں تھیں صرف ایک بیٹی تھی جو دونوں پیروں سے معذور تھی۔

سجاد نے ان کے سہارے کو غنیمت جان کر حیدر آباد ہی میں رہائش اختیار کرلی۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اپنی باقی ماندہ زندگی اس شہر اور اس گھر میں گزار دے گا۔ دو سال کے بعد اس نے شیخ رشید کے احسان کا بدلہ یہ دیا کہ ان کی معذور بیٹی سے شادی کرلی تاکہ اپنے ان گناہوں کا کفارہ ادا کرسکے جو اس نے شکیلہ کے ساتھ کئے تھے۔ اس کی بڑی تمنا تھی کہ شکیلہ اسے صرف ایک بار مل جائے تاکہ وہ اس سے اپنے کئے کی معاف مانگ سکے۔ آج اُسے اپنے کئے کا پچھتاوا ہوتا تھا اور وہ اذیت کے جہنم میں جلتا رہتا تھا۔ بے آب ماہی کی طرح تڑپتا تھا۔ قدرت کی عجیب ستم ظریفی تھی کہ ایک ہی شہر میں دونوں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے بے خبر تھے۔ شاہی بازار میں دکان تھی شکیلہ کتنی ہی بار شاہی بازار گئی تھی۔ اس کی دکان کے سامنے سے گزری بھی تھی بلکہ اس کی دکان پر دو ایک بار گئی بھی تھی۔ اتفاق سے اس وقت سجاد نماز پڑھنے کے لئے گیا ہوا تھا۔

کوئی پانچ برس بعد شیخ رشید کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ اس کے بعد شیخ رشید کا' پھر سجاد کی بیوی پانچ سال کی ایک بچی کو چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگئی۔ سجاد کو کئی لوگوں نے شادی کے لئے جوان اور خوبصورت لڑکیاں دکھائیں مگر سجاد شادی کے لئے آمادہ نہ ہوا۔ وہ اپنی زندگی عبادت میں گزار دینا چاہتا تھا۔ اس نے اللہ سے لو لگالی تھی۔ اب وہ صرف اپنی بیٹی کے لئے جی رہا تھا۔ اس کی آرزو اور خدا سے ہمیشہ یہ دعا رہتی تھی کہ وہ اسے اس وقت تک زندگی کی مہلت دے تاوقتیکہ اس کی بیٹی عنبرین کی شادی نہیں ہو جاتی۔

ایک دن سجاد اپنے پڑوس کے دکاندار کی بیٹی کی شادی کی تقریب میں گیا ہوا تھا۔ اس شادی میں شکیلہ بھی آئی ہوئی تھی۔ ادریس احمد اور صابرہ بیگم بھی تھیں۔ شاہد بھی تھا۔ شاہد نو سال کا تھا۔ وہ سجاد پر گیا تھا۔ سجاد نے داڑھی رکھی ہوئی تھی جو خاصی گھنی تھی۔ اگر اس کی داڑھی نہ ہوتی تو لوگ دونوں کو باپ بیٹا سمجھتے۔ درحقیقت دونوں تھے بھی باپ بیٹا۔ نکاح شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے سجاد نے شاہد کو دیکھا وہ بُری طرح چونکا۔ اس کے سینے میں دل بُری طرح دھڑکنے لگا تھا۔ خون نے خون کو پہچان لیا تھا۔ مگر جب اس نے شاہد کو ادریس احمد کے ساتھ دیکھا تو اس کے ارمانوں پر اوس پڑگئی۔ وہ سمجھا کہ شاہد ادریس احمد کا بیٹا ہے۔

مگر اسے ایک لمحے کے لئے چین نصیب نہیں ہوسکا تھا۔ ایک موقع پر جیسے ہی شاہد' ادریس احمد سے الگ ہو کر پنڈال سے باہر نکلا۔ سجاد نے اسے لپک کر جالیا۔ "سنو بیٹے!" یہ کہتے ہوئے سجاد کا سینہ شدت جذبات سے بھر گیا۔ "ادھر آؤ۔"

شاید نے اس کے قریب آکر اسے بڑی شائستگی سے سلام کیا اور پوچھا۔ "جی! آپ نے مجھے پکارا تھا؟"

"آپ کا نام کیا ہے بیٹے؟" سجاد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے پوچھا۔

"شاہد احمد۔" اس نے بڑے تپاک سے جواب دیا۔

"آپ کے ساتھ جو تھے وہ آپ کے والد تھے؟"

"جی نہیں .... وہ میرے نانا تھے۔"

"آپ کے والد صاحب کا کیا نام ہے؟"

"سجاد احمد۔"

"سجاد احمد!" سجاد ایک دم سے اچھل پڑا۔ "آپ کے والد کہاں ہیں؟"

"وہ یورپ میں ہیں اور وہاں کاروبار کرتے ہیں۔"

"اوہ!" سجاد کے ارمانوں پر اداسی پڑگئی۔ اس کا دل بجھ سا گیا تھا۔ پھر بھی اس نے بے دلی سے پوچھا۔ "آپ کی امی کا کیا نام ہے؟"

"شکیلہ جہاں!"

"شکیلہ جہاں!" سجاد کے سینے میں جیسے کوئی خنجر سا پیوست ہوگیا۔ اس نے اپنا سینہ دبا لیا۔ "کیا تم امی کو..........." اس نے ادریس احمد کو اپنی سمت آتے دیکھا تو اپنی گفتگو کا

سلسلہ منقطع کر دیا۔ وہ ایک طرف بڑھ گیا۔ اس کے سینے میں ایک آگ سی لگ گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا ایسا اتفاق ممکن ہے کہ ایک عورت اور اس کے شوہر کا نام' شکیلہ اور سجاد احمد ہو۔ اس کے حساب سے اس کے لڑکے کی عمر بھی نو سال کی ہوتی تھی۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ جب شادی کی تقریب اختتام کو پہنچے گی اور عورتیں رخصت ہونے لگیں گی تب وہ اس لڑکے کی ماں کو دیکھنے کی کوشش کرے گا۔

ادھر سجاد کی بیٹی عنبرین بھی اپنی چھوٹی نانی کے ساتھ اس شادی میں آئی ہوئی تھی۔ عنبرین ہو بہو اپنے باپ کا عکس تھی۔ شباہت' اور خال و خد میں حیرت انگیز مماثلت تھی۔ شکیلہ نے اس گڑیا سی بچی کو دیکھا تو وہ بھی دل تھام کر رہ گئی۔ اس لڑکی نے اس کے زخموں کو جیسے پھر سے ہرا کر دیا تھا۔ اس کا دل اندر سے جیسے چیخ چیخ کر گواہی دے رہا تھا کہ یہ سجاد کی بیٹی ہے۔ اس کے اپنے محبوب اور شوہر کا خون ہے۔ اس کے سیاہ کار شوہر کی خوبصورت نشانی ہے۔ خیالوں کے سنپولیے اس کے وجود کو ڈسنے لگے۔ کیا سجاد نے تیسری شادی کر لی ہے؟ کیا وہ بھی اسی شہر میں رہتا ہے؟

شکیلہ نے عنبرین کو کسی نہ کسی طرح گھیر لیا اور اُسے ایک سمت لے گئی۔ بڑے پیار اور نرمی سے اس سے پوچھا تو اس نے شکیلہ کو بتایا کہ اس کے ابو کا نام سجاد احمد ہے وہ چھوٹی نانی کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کی امی' نانی اور نانا کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس بچی نے شکیلہ کو چھت پر لے جا کر دور سے سجاد کو دکھایا تو شکیلہ سجاد کو پہچان نہ سکی اس لئے کہ سجاد نے گھنی داڑھی رکھ لی تھی۔ اس کی وضع قطع اور چہرہ مہرہ ایک دم بدل گیا تھا اور پھر اتنی دور سے دیکھنے پر سجاد کچھ واضح نہیں ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ محض اتفاق ہے کہ اس بچی کا چہرہ سجاد سے مماثلت رکھتا ہے اور پھر سجاد ایک مذہبی شخص بننے سے رہا۔

شادی کی تقریب کے اختتام پر سجاد ایک ایسی جگہ چھپ کر کھڑا ہو گیا تھا جہاں سے وہ ان لڑکیوں اور عورتوں پر نظر رکھ سکتا تھا جو زنانہ حصے سے باہر آ رہی تھیں۔ پھر اس نے شکیلہ کو دیکھا جو ادریس احمد' صابرہ بیگم اور شہاد کے ساتھ کار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ شکیلہ کو دیکھتے ہی اس کے دل نے دھڑکنا بند کر دیا۔ شکیلہ کا حسن و جمال آج بھی ایسا ہی تھا جیسا کل تھا۔ بلکہ وہ کل سے آج زیادہ پُرکشش اور گداز ہو گئی تھی۔ مگر اس کے چہرے پر ایک حزن و ملال چھایا ہوا تھا۔ وہ کسی خیال سے اسے بجھی بجھی نظر آ رہی تھی۔ اس کا دل تو چاہ رہا تھا کہ وہ لپک کر شکیلہ کے سامنے پہنچ جائے مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بہ وقت تمام اپنے آپ کو روکا ہوا تھا۔ اس طرح اچانک سامنے چلے جانے سے اس کی

تکذیب ہونے کا امکان تھا۔

وہ ساری رات ایک پل کے لئے بھی نہ سو سکا تھا۔ ساری رات وہ ایک عجیب سی کشمکش سے دوچار تھا۔ وہ شکیلہ کا گنہگار تھا۔ وہ صرف ایک بار شکیلہ سے مل کر اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا چاہتا تھا۔ اب اسے نہیں معلوم تھا کہ شکیلہ اس سے ملنا اور بات کرنا بھی پسند کرتی ہے یا نہیں۔ اس سے مل کر وہ اپنے دل کی خلش دور کرنا چاہتا تھا۔ اسی میں اس کے قلب کو سکون اور طمانیت نصیب ہو سکتی تھی۔

اس نے ادریس احمد کے بارے میں شادی کی تقریب کے بارے میں معلوم کر لیا تھا۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری میں ان کا پتہ درج تھا جو اس نے نوٹ کر لیا۔ وہ دس گیارہ بجے لطیف آباد ایک نمبر پہنچا جہاں ادریس احمد کا وسیع و عریض بنگلہ تھا۔ جس وقت وہ گاڑی سے نیچے اتر رہا تھا اس نے ایک کار کو تیزی سے بنگلے سے باہر نکلتے دیکھا۔ اس کار میں شاہد آگے والی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ پچھلی نشست پر ادریس احمد اور صابرہ بیگم بیٹھی تھیں۔ باوردی ڈرائیور کار چلا رہا تھا۔ اپنے بیٹے شاہد کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک ہوک اور محبت اٹھی تھی۔

ادریس احمد' صابرہ بیگم اور شاہد کو ساتھ جاتا دیکھ کر اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اس کے خیال میں شکیلہ گھر پر تنہا تھی۔ اس نے کل ہی اندازہ کر لیا تھا کہ شکیلہ نے دوسری شادی نہیں کی بلکہ وہ اس کی نشانی کے سہارے اپنی زندگی گزار رہی تھی۔ گویا آج بھی شکیلہ کے دل کے کسی کونے میں اس کی محبت کی رمق موجود ہے۔ مگر وہ زیادہ پُرامید نہیں تھا کہ شکیلہ اُسے قبول کرے گی۔ وہ عورت کی نفرت اور محبت سے خوب واقف ہو چکا تھا۔ آج قدرت نے شکیلہ سے تنہائی میں ملنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ وہ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔

گاڑی جب بنگلے سے باہر نکلی تھی تو گیٹ کھلا رہ گیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد ایک ملازمہ اندر سے آ کر اسے بند کر رہی تھی۔ سجاد لپک کر گیٹ پر پہنچا اور اس سے پوچھا۔ ”شکیلہ بیگم صاحبہ گھر پر ہیں؟“

”جی ہیں۔“ ملازمہ نے اسے نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ ”کیا آپ ان سے ملنا چاہتے ہیں؟“

”ہاں۔“ سجاد نے جواب دیا۔

ملازمہ نے اسے نشست گاہ میں لے جا کر بٹھایا اور اندر جا کر شکیلہ کو بتایا۔ شکیلہ

سمجھی کہ اسکول میں داخلہ کے سلسلے میں اس سے ملنے کوئی آیا ہو گا۔ اکثر کوئی نہ کوئی آتا رہتا تھا۔ وہ چند لمحوں کے بعد نشست گاہ میں داخل ہوئی تو ایک دم سے ٹھٹک کر رہ گئی۔ اس کے سامنے سجاد کھڑا تھا۔ وہی سجاد جو کل اس کا خواب تھا۔ اس کا سب کچھ تھا۔ اس کی محبت تھا۔ وجود تھا۔ آج اس کا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کے لئے انتہائی نفرت کا سبب بن گیا تھا ایک ایسی نفرت جس کی کوئی انتہا نہ تھی کل وہ سجاد کو پہچان نہ سکی تھی۔ مگر آج اس نے پہچان لیا تھا۔ اس لمحے وقت کی نبض رک گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو برسوں کے بعد سامنے پا کر لمحے کے لئے اپنے آپ کو بھول گئے تھے۔ وہ جیسے کوئی خواب دیکھ رہے تھے۔ شکیلہ ایک دم سے چونک پڑی۔ "سجاد تم.........!"

"ہاں میں.........." وہ خیالوں کی دنیا سے نکل کر بولا۔

"تم کس لئے آئے ہو.......... کیا لینے آئے ہو؟" شکیلہ نے تلخی سے پوچھا۔

"میں یہاں کس لئے آ سکتا ہوں؟" سجاد نے جواب دے کر سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "میں دس برس سے تمہیں تلاش کرتا رہا ہوں۔"

"تم ان زیورات اور دولت کے لئے آئے ہو نا جو میں لے کر بھاگ گئی تھی؟ تم کل آکر وہ سب کچھ لے جا سکتے ہو۔"

"نہیں شکیلہ!" سجاد نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "میں دولت اور زیورات کے لئے نہیں آیا ہوں۔ میں اب وہ سجاد نہیں رہا جو کل تھا۔ وہ سجاد تو برسوں پہلے مر گیا۔ تمہارے سامنے ایک نیا سجاد کھڑا ہے جس کے نزدیک دولت' عورت اور ہوس کوئی چیز نہیں رہی ہے۔ کوئی معنی نہیں رکھتی ہے میں تو اپنی محبت اور بیٹے کو پانے کے لئے آیا ہوں۔ کل میں نے اپنے بیٹے کو دیکھا تھا۔ خون نے خون کو پہچان لیا تھا۔"

"تمہیں یہاں کچھ نہیں ملے گا۔ نہ محبت مل سکتی ہے نہ بیٹا۔ تم جا سکتے ہو۔"

"کیوں؟"

"کیوں؟" شکیلہ ایک دم سے بھڑک اٹھی۔ "یہ تم پوچھ رہے ہو کہ کیوں؟ کیا کبھی تم نے اپنے گریبان میں جھانک کر نہیں دیکھا؟"

"مگر شکیلہ سارا قصور میرا اپنا تو نہیں ہے۔ اس میں تمہارا اپنا دوش بھی تو ہے۔ صرف تم مجھے ایک گناہ گار ٹھہرا نہیں سکتی ہو۔"

"میرا کوئی دوش نہیں ہے۔ تم نے خواب ناک زندگی اور دولت کے حصول کے اندھے جنون میں مبتلا ہو کر مجھے افضال احمد کے بستر کی شکن بنا دیا تھا اور دوسرے مردوں

کے بستر میں میرا وجود میلا کرنا چاہتے تھے۔ مگر میں تمہیں ٹھکرا کے اپنی دنیا سجانے چلی آئی۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"تم نے اپنے خوابوں کے پانے کے لئے ماں باپ جیسی عظیم ہستیوں کو کھو دیا۔ میرے ساتھ چلی آئیں تو میں یہی سمجھا کہ تم بھی ان لڑکیوں میں سے ہو جو اسیر خواب ہوتی ہیں اور ہر اس راستے پر چل پڑتی ہیں جو انہیں منزل تک لے جاتا ہے۔ بہت کچھ پانے کے لئے اپنا سب کچھ کھونے کے لئے تیار رہتی ہیں۔"

"تم نے مجھے ورغلایا تھا' فریب دیا تھا۔" شکیلہ فرش پر پیر پٹخ کر بولی۔

"مگر تم کوئی بچی تو نہیں تھیں۔" سجاد نے پُرسکون انداز میں کہا۔ "تم نے اپنے ماں باپ کی پسند کو اس لئے ٹھکرایا تھا کہ وہ بدصورت تھا اور دولت مند نہیں تھا۔ تمہیں اپنے حُسن و شباب پر بڑا ناز و غرور تھا۔ تم اپنے حُسن جیسی حسین زندگی کی طلبگار تھیں۔ ہر چیز اپنی قیمت مانگتی ہے۔ لہٰذا خواب ناک زندگی میں تمہیں پوری پوری قیمت چکانا پڑی۔ اگر تم خوابوں کے پیچھے نہیں بھاگتیں' ماں باپ کی پسند سے شادی کر کے گھر بسا لیتیں' گھر سے نہیں بھاگتیں تو آج تم کسی انمول ہیرے کی طرح ہوتیں۔ پھر بھی تم خدا کا شکر ادا کرو کہ تم عزت کی زندگی گزار رہی ہو۔ شاید تمہاری کوئی نیکی تمہارے کام آ گئی.........."

"میرے دل میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔" شکیلہ لاجواب سی ہو کر بولی۔ "اور نہ میں اپنا بیٹا تمہیں دے سکتی ہوں' تم جا سکتے ہو۔"

"میں خدا سے دعا کرتا رہتا تھا کہ تم سے میری صرف ایک بار ملاقات ہو جائے۔ خدا نے میری سن لی۔ میں تم سے اس لئے ملنا چاہتا تھا کہ اپنے کیے کی تم سے معافی مانگ لوں۔ میں نے تمہارے ساتھ جو کچھ کیا وہ اچھا نہیں کیا۔ ہو سکے تو تم مجھے معاف کر دینا۔ اب میں یہاں کبھی نہیں آؤں گا' تم سے نہیں ملوں گا۔ البتہ اپنے بیٹے کو دور سے دیکھ لیا کروں گا۔ میرے لئے اس سے بڑی سزا اور کیا ہو سکتی ہے کہ میں اپنے لختِ جگر کو اپنے سینے سے نہیں لگا سکتا ہوں۔ اسے اپنا بیٹا نہیں کہہ سکتا ہوں۔ شاید میں اسی سزا کا مستحق بھی ہوں خدا نے مجھے ایک بیٹی دی ہے لیکن میری بیٹی بھی میری طرح بدنصیب ہے۔ تمہارے بیٹے کی طرح بدنصیب ہے۔ ایک بیٹا باپ کے پیار سے محروم ہے اور تو دوسری طرف ایک بیٹی ماں کے پیار سے محروم ہے۔ قدرت کے کھیل بھی کیسے عجیب اور نرالے ہوتے ہیں۔ اچھا' میں جا رہا ہوں۔ خدا حافظ!"

سجاد رکا نہیں' اس پر اچٹتی سی نظر ڈالی کر نکل گیا۔ شکیلہ بت بنی کھڑی رہی۔ اس

نے سجاد کو روکنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ وہ اسے روکنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ دوسرے لمحے وہ صوفے پر گر کر کسی بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سجاد نے عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد عنبرین کو ایک کہانی سنا کر سلا دیا۔ کچھ دیر بعد وہ نشست گاہ میں آ گیا۔ کبھی کبھی اس کے پڑوسی شرف الدین عشاء کی نماز کے بعد کچھ دیر کے لئے اس کے ہاں آتے تھے۔ ایک گھنٹہ گپ شپ کر کے چلے جاتے تھے۔ ادھر دروازے پر دستک ہوئی اور ادھر عنبرین نے نیند سے بیدار ہو کر اُسے پکارا۔ "ابو.......... ابو!"

سجاد نے لپک کر دروازے کی چٹخنی کھولی' دروازہ کھولے بغیر وہ بولا۔ "اندر آ جایئے شرف الدین بھائی!" پھر کمرے کی طرف لپک گیا۔ اس لئے کہ عنبرین خوفزدہ لہجے میں اسے پکار رہی تھی۔ اس نے کمرے میں جا کر دیکھا کہ عنبرین نیند کی حالت میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھتی ہوئی پکار رہی تھی۔ سجاد نے بستر پر اس کے پاس بیٹھ کر اس کی پشت تھپکی۔ چند لمحوں بعد عنبرین پُرسکون ہو کر سو گئی۔

وہ نشست گاہ میں آیا تو ایک دم اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ کمرے میں شرف الدین کی جگہ شکیلہ موجود تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

"شکیلہ!" اس کی خوشی اور تحیر میں ڈوبی آواز کانپنے لگی۔

شکیلہ جو خجل ہو کر کھڑی تھی اور اس کے چہرے پر محبت کی سرخی پھیلی ہوئی تھی وہ مجسم محبت بنی ہوئی تھی۔ "ہاں میں!" وہ آہستگی سے بولی۔

"کس لئے آئی ہو؟"

"کس لئے آئی ہوں۔" اس نے نظریں اٹھا کر سجاد کو دیکھا۔ "ایک عورت' ایک بیوی کیا اپنے گھر نہیں آ سکتی ہے؟ میں اپنے گھر آئی ہوں۔ کیا میں اس گھر میں نہیں آ سکتی ہوں۔ جو میرا بھی ہے؟ کیا صبح کا بھولا شام کو گھر نہیں آتا اور پھر میں ماں بھی بن کر آئی ہوں۔ عنبرین کہاں ہے؟"

"سچ شکیلہ!" سجاد نے فضا میں اپنے بازو پھیلا دیئے۔ اسے یہ سب کچھ کسی خواب کی طرح لگ رہا تھا۔

شکیلہ کا چہرہ حیا سے سرخ ہو گیا۔ اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے سے باہر' برابر والے کمرے میں شاہد' ادریس احمد اور صابرہ بیگم کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ سب ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔

ان دونوں کو اپنی کھوئی ہوئی منزل مل گئی تھیں یہ منزل سراب نہ تھی۔ یہ تو اس آبشار کی طرح تھی جس کا ٹھنڈا میٹھا پانی ساری زندگی وجود کو بھگوتا رہے گا اور اس وقت بھی بھگو رہا تھا۔

☆====== ختم شد ======☆